گھر کے ہر فرد کے لئے

پاکیزہ
کراچی

اگست 2014

عید مبارک

نگران اعلیٰ معراج رسول

عنیزہ سید

رفعت سراج

کے دلچسپ ناول

ناہید سلطانہ اختر کی خصوصی تحریر

[illegible] "منزل شنید" سے افسانوی ملاقات



پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول ۔ مقامِ اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن ۔ مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



مستقل عنوانات

شعبہ اشتہارات — منیجر اشتہارات: محمد شہزاد خان 0333-2256789 — نمائندہ کراچی: محمد رضوان خان 0333-2168391
نمائندہ ملتان: سید فراز علی نازش 0332-4214400 — رانا اے حمید 0323-2895528
ماڈل: رابعہ .... میک اپ: روز بیوٹی پارلر .... فوٹو گرافر: موسیٰ رضا

جلد 42 • شمارہ 05 • اگست 2014 • زرِ سالانہ 700 روپے • قیمت فی پرچہ پاکستان 60 روپے •

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

کی ایک اور قابلِ فخر اور دلنواز
پیش کش پاکیزہ کی دیرینہ
ساتھی اور مایہ ناز قلم کار

نگہت سیما

کے مشاق قلم کا حسین شاہکار

اعتبارِ وفا

قسط وار کہانی کی صورت بہت
جلد اپنے خوش ذوق قارئین کے لیے
ان صفحات کی زینت بننے جا رہا ہے



ایک دلنشیں اور پُراثر کہانی آپ کے اعلیٰ ذوق کی نذر



مجھے کچھ کہنا ہے!

دنیا میں ہر قوم کا ایک دن خوشی اور اظہار مسرت کا ہوتا ہے۔ ہر قوم اپنے خوشی کے دن اپنے مذہب وملت کی تعلیمات کے مطابق مناتی ہے اور ہمارے پیارے مذہب اسلام نے بھی مسلم امہ کے لیے دو ایسے دن مقرر کیے ہیں جو خوشی اور شادمانی سے مزین ہیں۔ وہ دن عیدالفطر اور عیدالاضحی کے ہیں۔ عیدالفطر اسلام کی عظمت و رفعت کی علامت، مسلم امہ کے اتحاد و یگانت کا مظہر اور ہماری عظیم روایات کا یوم مسرت ہے۔ یہ ایسا مذہبی تہوار ہے جس میں اسلامی برادری کا ہر فرد خواہ وہ کسی بھی مکتبہ فکر یا عقیدے سے تعلق رکھتا ہو اجتماعی زندگی کے اس عظیم الشان اور ایمان افروز اجتماع عید میں حسب توفیق شامل ہوتا ہے اور اس بات کو ثابت کرتا ہے مسلمان مذہبی طور پر ایک ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔ عیدالفطر کا دن بڑا ہی پُر سعادت دن ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے بہشت کو پیدا فرمایا۔ جبرئیل امین کو پیغام خداوندی لے جانے کے لیے عید کا دن منتخب کیا۔ فرعون کے جادوگروں نے عید کے دن نور ہدایت پایا اور اللہ نے انہیں بخشش سے نوازا۔ یہ دن روزے داروں کے لیے بھی مسلسل مجاہدے کے بعد انعام کے طور پر اپنے دامن میں ہزاروں خوشیوں اور مسرتوں کا پیغام لے کر آتا ہے۔ آئیں آج کے بابرکت دن ہم اس بات کا عہد کریں کہ آج سے ہمارا جو بھی اقدام عمل ہوگا وہ اسلام کی سربلندی، امت مسلمہ کی بہبود اور فلاح انسانیت کے لیے ہوگا۔ ہم معاشرے کے اندر پیدا شدہ ہر قسم کی برائیوں، نفرتوں، عداوتوں اور تعصبات کو ختم کر دیں گے اور باہمی صلح اور رواداری کی فضا قائم کریں گے تاکہ ہمیں پھر پوری دنیا میں باعزت، باوقار اور قابل احترام قوم کے طور پر جانا جائے جیسا کہ ماضی میں ملت اسلامیہ کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

مدیرہ
انجم انصار



علم... معرفتِ الٰہی

ایک مرتبہ دس آدمیوں کے ایک گروہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے ایک ہی سوال کیا مگر جواب جدا گانہ چاہا آپ نے سوال "علم بہتر ہے یا مال" کے جوابات کچھ اس طرح فرمائے۔

4۔علم......اس لیے بہتر ہے کہ مال دیر تک رکھنے سے فرسودہ ہو جاتا ہے مگر علم کو کچھ نقصان نہیں پہنچتا۔

5۔علم......اس لیے بہتر ہے کہ اس سے دل کو روشنی ملتی ہے اور مال سے دل تیرہ وتار ہو جاتا ہے۔

6۔علم......اس لیے بہتر ہے کہ کثرتِ مال سے فرعون نے دعویٰ خدائی کیا مگر کثرتِ علم سے رسول ﷺ نے ماعبدناک حق عبادتک کہا۔

7۔علم......اس لیے بہتر ہے کہ مال کو ہر وقت چوری کا خطرہ ہے مگر علم کو نہیں۔

8۔علم......اس لیے بہتر ہے کہ صاحب مال کبھی بخیل بھی کہلاتا ہے مگر صاحب علم کریم ہی کہلاتا ہے۔

9۔علم......اس لیے بہتر ہے کہ مال وزر سے بے شمار دشمن پیدا ہوتے ہیں مگر علم سے ہر دل عزیزی حاصل ہوتی ہے۔

10۔علم......اس لیے بہتر ہے کہ یوم قیامت کو مال کا حساب ہوگا مگر علم کا کوئی حساب نہ ہوگا۔

☆☆☆

علم عقل ودانش کا منبع ہے۔

اس طرح حضرت امام جعفر صادقؒ کی زندگی کے چند سالوں میں دنیا آپ کے علوم سے معمور اور احادیث و آراء سے روشن وتابندہ ہوگئی......آپ کے گھر کو ایک یونیورسٹی سے تعبیر کیا گیا۔

استاد محمد صادق نشات جو جامعہ الازہر قاہرہ کے کلیۃ الآداب کے استاد ہیں۔ کہتے ہیں کہ خلاصہ یہ ہے کہ حضرت جعفر صادقؒ کا گھر ایک بہت بڑی یونیورسٹی تھا......جو علما، فضلا، مفسر اور اہل علم کے ہجوم سے چھلک رہا تھا۔ آپؒ ان کے سوالوں کے جواب دیتے، ان کے مذاہب ومسالک ومکاتب فکر اور مقاصد کی طرف توجہ کیے بغیر ان کی مشکلات کو حل فرماتے تھے۔ آپؒ کے مدرسے کا معیار فیض علم یہ تھا کہ مسلمان ہر علاقہ اور مقام سے آ کر آپ کے شیریں چشمۂ علم سے سیراب ہوتے......آپ نے اپنے شاگرد جابر بن حیان میں استعداد ولیاقت دیکھی تو اسے مخصوص وقت دیا، جس میں اسے علم کیمیا اور دیگر علوم تعلیم فرمائے۔ یہاں تک کہ جابر بن حیان نے امام کے مختلف دروس اور اجلاس سے کئی سو رسائل تحریر کیے۔ امام نے اسے چمکنے والی سیاہی بنانے کا طریقہ سکھایا جس سے وہ قیمتی کتب کے مخطوطات پڑھنے میں فائدہ اٹھاتا تھا......کیونکہ انہیں تاریکی میں پڑھا جا سکتا۔

آپؒ مسلمانوں کے ساتھ کتاب وسنت سے اور فلسفیوں کے ساتھ فلسفہ وحکمت سے اور طبیب کے ساتھ طب کے ذریعے گفتگو فرماتے۔

ایک دفعہ ایک ہندوستانی نے منصور کے پاس طب کی کتاب کی قرأت کی اس وقت حضرت امام جعفر صادقؒ بھی موجود تھے۔ آپ خاموشی سے سنتے رہے جب وہ فارغ ہوا تو اس نے عرض کیا۔ "اے ابا عبداللہؓ کیا آپ اس

میں سے کچھ چاہتے ہیں جو میرے پاس ہے۔"

آپؑ نے فرمایا......"نہیں! کیونکہ جو میرے پاس ہے وہ اس سے بہتر ہے جو تیرے پاس ہے۔" پھر آپؑ نے فرمایا ..."میں گرم کا سرد سے اور سرد کا گرم سے اور تر کا خشک سے اور خشک کا تر سے علاج کرتا ہوں اور ہر چیز کو میں خدا کی طرف پلٹاتا ہوں اور میں اس پر عمل کرتا ہوں جو کچھ رسول ﷺ نے فرمایا ہے اور یہ بات جان لے کہ معدہ بیماریوں کا گھر ہے اور احتیاط ہی بہت بڑی دوا ہے اور میں بدن کو جس چیز کا چاہتا ہوں عادی بناتا ہوں۔"

تب اس طبیب نے کہا" کہ کیا طب میں اس کے علاوہ کچھ ہے؟"

آپؑ نے فرمایا کہ "میں طب کو زیادہ جانتا ہوں یا تم......؟" اس نے کہا کہ......"میں زیادہ جانتا ہوں۔"

آپؑ نے فرمایا۔"میں تجھ سے کچھ سوالات کرتا ہوں تو مجھے بتا......

۱۔آنسوؤں اور رطوبتوں کی جگہ سر میں کیوں ہے؟ اور سر پر بال کیوں ہیں ـــ.....؟

۲۔پیشانی بالوں سے خالی کیوں ہے......؟ نیز اس پر خط اور شکن کیوں ہیں......؟

۳۔دونوں پلکیں آنکھوں کے اوپر کیوں ہیں......؟

۴۔ناک دونوں آنکھوں کے درمیان کیوں ہے......؟

۵۔آنکھیں بادامی شکل کی کیوں ہیں......؟

۶۔ناک کا سوراخ نیچے کی طرف کیوں ہے......؟

۷۔منہ پر دو ہونٹ کیوں بنائے گئے ہیں......؟

۸۔سامنے کے دانت تیز اور داڑھ چوڑی کیوں ہے......؟

۹۔دونوں ہتھیلیاں بالوں سے خالی کیوں ہیں......؟

۱۰۔مردوں کی داڑھی کیوں ہے......؟

۱۱۔ناخن اور بال میں جان کیوں نہیں......؟

۱۲۔دل صنوبری شکل کا کیوں ہے......؟

۱۳۔پھیپھڑوں کے دو ٹکڑے کیوں ہیں......؟

۱۴۔جگر کی شکل محدب کیوں ہے......؟

۱۵۔گھٹنے آگے کو جھکتے ہیں پیچھے کو کیوں نہیں جھکتے......؟

۱۶۔دونوں پاؤں کے تلوے بیچ سے خالی کیوں ہیں......؟"

طبیب نے یہ سب سن کر کہا۔"میں ان تمام باتوں کا جواب نہیں دے سکتا۔"

امام نے فرمایا......"بفضلِ خدا تعالیٰ میں ان سب کا جواب جانتا ہوں۔"

طبیب نے کہا تو پھر فرمائیں۔

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا کہ......

(جاری ہے)

امانت

رفعت سراج

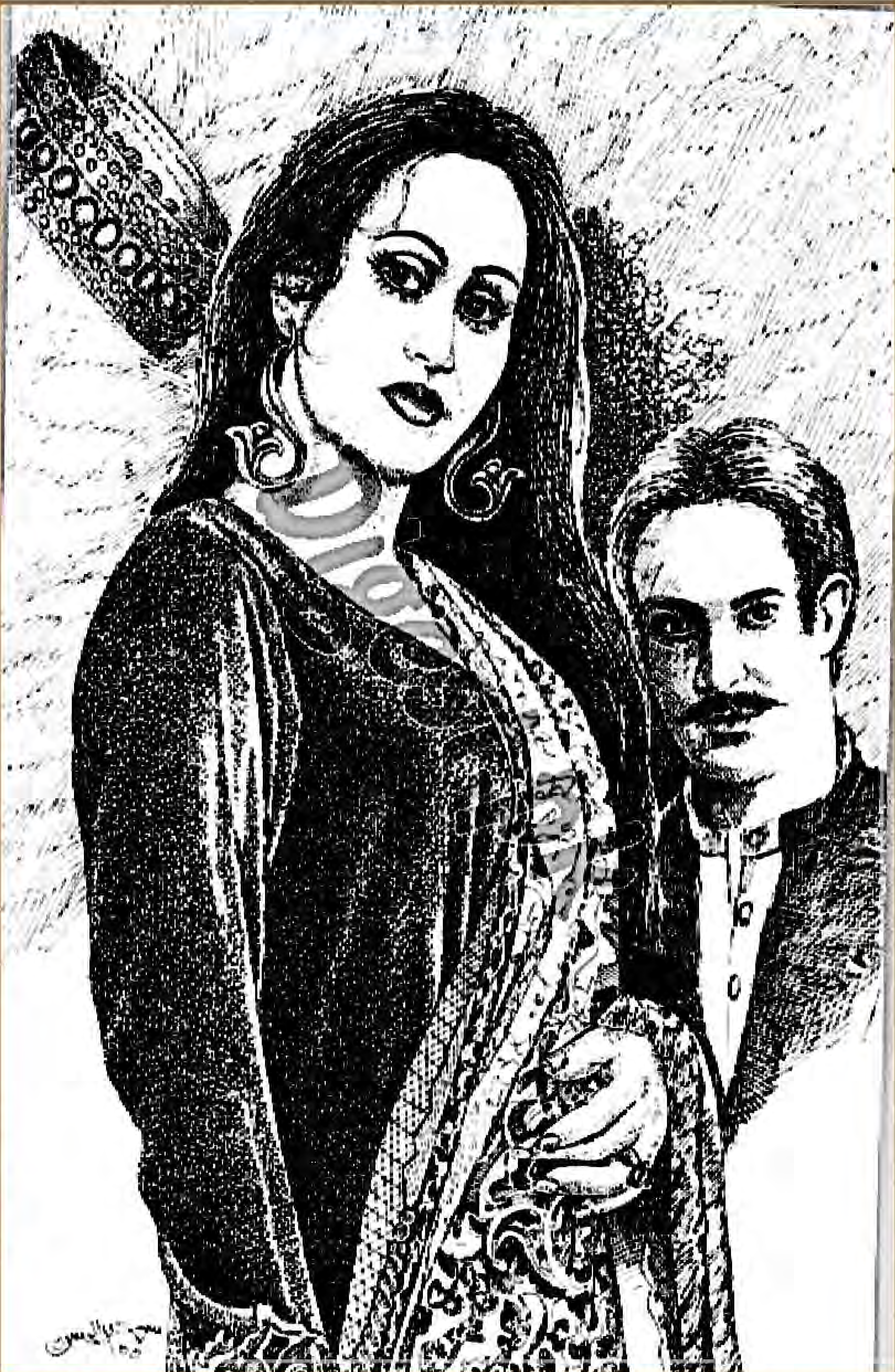
قسط 20

لہو سے سینچے پڑتے ہیں برگ و بار کے موسم
بظاہر یوں لگا دینا شجر آسان کتنا ہے
جنھوں نے دھوپ کی دشواریاں جھیلیں بتائیں گے
بدن پہ سایۂ دیوار و در آسان کتنا ہے
شکستِ خاک سے لے کر نمو یابی کے منظر تک
ذرا دشوار ہے رستہ مگر آسان کتنا ہے

بات ایک امانت ہے، ذات ایک امانت ہے عفت ایک امانت ہے، زندگی خدا کی امانت ہے، زمین کے وجود پر سورج کی روشنی امانت ہے، تاروں کا نور..... چاند کی چاندنی امانت..... امانت کو خیانت سے بدل دیا جائے تو چہار سو اندھیروں کا راج ہے اسی اندھیرے میں امانت کی تابانیاں پھر سے روشنی کی کرنیں بکھیرتے ہوئے چہار سو اجالا کردیتی ہیں۔

امانت و خیانت کو واضح کرتی ایک پُردرد مگر خوبصورت تحریر





گزشتہ اقساط کا خلاصہ

ڈاکٹر مہر جان نیورو سرجن تھیں۔ اپنی بہن گل جان اور بیٹیوں رابعہ اور روما نہ کے لیے ایک سخت گیر بہن اور ماں تھیں۔ اسمٰعیل خان ان کے گھر کا ایک ملازم اور معتبر خاص تھا۔ کاشناز اپنے دادا شاہ عالم کے ساتھ ڈاکٹر مہر جان کے پڑوس میں رہتی ہے وہ اور روما بیسٹ فرینڈز ہیں۔ ایس پی شاہ زمان خان، جابر علی کو اپنے قابو میں کرنے کے لیے اس کی بیٹی کی شادی کے لیے اپنے ایک شریک کاروبار وارث علی کا رشتہ دیتا ہے جو برہان کو نا قابل قبول ہوتا ہے۔ رابی، شاہ عالم کے گھر چلی جاتی ہے۔ مہر جان کو ہوش آتا ہے تو گل جان کو پتا چلتا کہ وہ حال کو فراموش کر چکی ہیں۔ صابرہ، ستارہ سے ملنے کے لیے بے چین ہوتی ہے۔ روما شاہ عالم کے گھر آ جاتی ہے۔ جابر علی، ستارہ سے اپنے ساتھ چلنے کو کہتا ہے تو وہ منع کر دیتی ہے۔ شاہ عالم اخبار میں کسی خبر میں برہان کا نام پڑھ کر چونکتے ہیں۔ برہان، شاہ عالم کا فون آنے پر انہیں بتاتا ہے کہ اس کی بہن کا مرڈر ہو گیا ہے وہ اب روما کو نہیں پڑھا سکے گا۔ مہر جان اپنے مرحوم باپ کو صدائیں دیتی ہیں وہ گل جان سے کہتی ہیں کہ بابا ان سے ملے بغیر کبھی نہیں گئے تو اب کیسے چلے گئے۔ ایس پی، وارث علی کو خبردار کرتا ہے۔ رابی کو برہان کی بہن کے مرڈر کی خبر ہوتی ہے تو وہ سوچتی ہے کہ شاید اب وہ اسے نہیں دیکھ پائے۔ شاہ عالم، رابی کی ہمت بندھاتے ہیں شاہ عالم، برہان کے گھر جاتے ہیں اسے تسلی دیتے ہیں۔ شبینہ، برہان سے جابر علی کے بارے میں پوچھتی ہے تو برہان کہتا ہے کہ وہ اب ان سے نہیں ملے گا۔ رابی، کاشناز اور روما کو برہان کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بارے میں بتاتی ہے تو وہ حیران رہ جاتی ہیں۔ وارث علی، ایس پی شاہ زمان سے کہتا ہے کہ وہ جابر کے قبضے سے وہ فائل نکلوائے..... ستارہ کی تدفین ہو جاتی ہے۔ رابی، شاہ عالم سے کہتی ہے کہ وہ کاشناز کو بتائیں کہ اب برہان انہیں پڑھانے نہیں آئے گا تو شاہ عالم کہتے ہیں کہ وہ برہان کو سمجھانے کی کوشش کریں گے۔ روما، کاشناز کے ساتھ اپنے گھر جاتی ہے تو مہر جان اسے نہیں پہچانتیں۔ ایس پی جابر علی سے بات کرتا ہے کہ وہ فائل اسے دے دے۔ وارث علی، برہان سے فائل کی بات کرتا ہے کہ اگر وہ فائل اسے نہ ملی تو ان کے لیے اچھا نہیں ہوگا...... برہان فائل کے بارے میں شبینہ سے پوچھتا ہے تو وہ بھی پریشان ہو جاتی ہے۔ احمر، شائستہ بیگم کی اس بات سے بہت ڈپریسڈ ہوتا ہے کہ فائزہ، شبینہ سے کوئی تعلق نہ رکھے۔ وارث علی ایس پی سے کہتا ہے کہ وہ جابر علی کی بیٹی کو اٹھا لے گا۔ روما، اسمٰعیل خان سے کہتی ہے وہ اس کے باپ کے بارے میں بتائے۔ اسمٰعیل خان اسے صرف اتنا بتاتا ہے کہ اس نے روما کے باپ کو دیکھا ہے۔ شبینہ، صابرہ کو نیند کی دوا دیتی ہے، وہ وارث علی کا فون سنتی ہے تو وارث علی، برہان کو دھمکی دیتا ہے تو برہان، شبینہ کو شاہ عالم کے گھر لے جاتا ہے۔ وہ گارڈ سے کہہ کر کاشناز کو بلاتا ہے اسے بتاتا ہے کہ شبینہ اس کی بہن ہے وہ اسے یہاں رکھے صبح وہ شاہ عالم سے بات کرلے گا۔ فائزہ، احمر سے کہتی ہے کہ وہ شائستہ بیگم کو سمجھائے کہ وہ شبینہ سے دوستی ختم نہیں کر سکتی۔ کاشناز اور روما، شبینہ کے آنے پر بہت حیران ہوتی ہیں۔ شاہ عالم کو صبح کاشناز، برہان کی بہن کے آنے کا بتاتی ہے۔ برہان، صابرہ کو بھی شاہ عالم کے گھر لے آتا ہے۔ برہان، شاہ عالم سے کہتا ہے کہ وہ ایکسی کرائے پر لے کر تو نہیں رہ سکتا لیکن وہ اس مد میں کچھ پیسے ضرور دے گا...... برہان، شاہ زمان کے پاس وارث علی کے خلاف ایف آئی آر درج کرانے جاتا ہے۔ وارث علی آ کر شاہ زمان کو بتاتا ہے کہ وہ لوگ گھر چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں۔ رابی اب فوراً سے پیشتر اپنا پہلے والا چہرہ حاصل کرنا چاہتی ہے لیکن گل جان اسے اکیلے بھیجنے پر متامل ہوتی ہے۔ مسٹر جمیل، شاہ عالم کو کہتے ہیں کہ وہ کاشناز کے لیے ان کی پسند کے مطابق رشتہ تلاش کر رہے ہیں۔ کاشناز، صابرہ کو روما کی والدہ کی طبیعت کا بتاتی ہے تو وہ روما کی دلجوئی کرتی ہے۔ گل جان، اسمٰعیل خان کو بتاتی ہے کہ رابی باہر جانا چاہتی ہے تو وہ کہتا ہے کہ جہاں جانا چاہ رہی ہے اسے جانے دیں نہ روکیں...... وارث علی، ایس پی کو بتاتا ہے کہ جابر کے گھر والے کہیں روپوش ہو گئے ہیں اور اب انہیں اپنی جان بچانے کے لیے جابر علی کی دوسری بیٹی کو اپنے قابو میں کرنا ہے۔ برہان، رابی کو دیکھتا ہے تو حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔ جابر علی کے ساتھ لاک اپ میں تین قیدی اور آ گئے تھے جو اس سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ روما، شاہ عالم سے کہتی ہے کہ وہ گل جان کو سمجھائیں کہ وہ مہر جان کا علاج کرائیں۔ کاشناز، صابرہ سے کہتی ہے کہ وہ برہان سے کہے کہ وہ انہیں پڑھانا شروع کر دے۔ شائستہ بیگم، اسلام آباد جاتی ہیں تو موقع غنیمت جان کر احمر اور فائزہ، شبینہ کے گھر آتے ہیں لیکن ان کا گھر بند ملتا ہے...... شاہ عالم، صابرہ اور برہان سے کہتے ہیں کہ وہ ان کی کوئی مدد کر سکتے ہیں تو ضرور کریں گے۔ صابرہ کہتی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کو لے کر گاؤں چلی جائے گی۔ برہان رات کو لان میں روما کو روتے دیکھ کر پریشان ہو جاتا ہے۔ اگلی رات کو روما اور برہان کو لان میں دیکھ کر رابی کو بے چینی لگ جاتی ہے۔ وارث علی، شاہ عالم کو جابر علی کا سسر سمجھتا ہے۔ برہان یونیورسٹی جاتا ہے تو اسے ہر چیز اجنبی محسوس ہوتی ہے۔

اب آگے پڑھیں

"ہمارے مذہب میں والدین کے حقوق کے بارے میں بہت واضح احکامات ہیں..... یہاں تک کہا گیا ہے کہ ہر حال میں والدین کے حقوق ادا کرنا ہیں اور اس وقت تک ادا کرنے ہیں جس وقت تک وہ کفر کے راستے پر چلنے کے لیے مجبور نہ کریں..... صرف اسی صورت میں والدین کی بات نہیں ماننی ہے لیکن..... اس کے علاوہ والدین کے حقوق ادا نہ کرنے کے معاملے کو کھلی نافرمانی سے تعبیر کیا گیا ہے۔" شاہ صاحب اس وقت صابرہ سے ہم کلام تھے جو تھوڑی دیر قبل شاہ صاحب کو سلام کرنے حاضر ہوئی تھی۔ جب سے وہ اس گھر میں آئی تھی اظہارِ تشکر کے طور پر وہ دن میں ایک مرتبہ شاہ صاحب کو سلام کرنے ضرور آتی تھی۔

وہ بات جو شاہ صاحب کے ذہن میں ہر وقت رہتی تھی آج انہوں نے اس کا برملا اظہار کر دیا تھا..... چونکہ برہان نے اپنے طور سے ان سے مزید کسی قسم کی مدد نہیں چاہی تھی..... لیکن وہ منتظر تھے کہ برہان اپنے باپ کے بارے میں ان سے کوئی بات کرے..... کوئی اخلاقی مدد مانگے یا اس معاملے میں اپنی ذمے داری کا احساس کرتا ہوا دکھائی دے..... کئی دن گزرنے کے بعد ایسا کچھ نہیں ہوا تو انہوں نے خود ہی سے بات شروع کی تھی۔

شاہ صاحب کی یہ بات سن کر صابرہ کے چہرے پر کئی رنگ آ کر گزر گئے..... اور ایک گہرے غم کا تاثر اس کے چہرے پر ٹھہر گیا..... چند لمحے سر جھکائے سوچتی رہی..... پھر رقت بھری آواز میں گویا ہوئی۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں شاہ صاحب..... میرا اور برہان کے باپ کا رشتہ دنیاوی رشتہ ہے اور صرف ہم دونوں کی زندگی تک باقی ہے لیکن بچوں کا رشتہ..... ہاں، باپ کا رشتہ قیامت تک کا رشتہ ہے۔ برہان بہت اچھا بچہ ہے، اس نے کبھی اونچی آواز میں میرے ساتھ بات تک نہیں کی..... لیکن شاید بہن کی مظلومیت پر وہ بہت غمزدہ ہے..... اور باپ کی طرف سے اس کا دل بھر گیا ہے..... میں نے کئی دفعہ اس سے بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ اس معاملے میں یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے کہ آپ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔ کسی بات پر مجبور نہ کریں....." صابرہ کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"وہ تو ٹھیک ہے، بچہ ہے..... اتنا بڑا حادثہ ایک بلا کی طرح نازل ہوا ہے۔ سنبھلنے میں وقت تو لگے گا مگر مجھے اور آپ کو اس کی دنیا ہی کی نہیں آخرت کی بھی فکر کرنی ہے..... جیسا کہ ہم اپنی دنیا اور آخرت کی فکر کرتے ہیں..... آپ کے شوہر نے جو کچھ بھی کیا..... وہ دنیا کے کٹہرے میں تو کھڑے ہو گئے ہیں..... ایک دن آخرت کے کٹہرے میں بھی کھڑے ہوں گے اور صرف انہی سوالات کا جواب دیں گے جن کا تعلق ان کے اپنے اعمال سے ہوگا..... مجھے آپ کو، ہم سب کو صرف اور صرف اپنے، اپنے عمل کا جواب دینا ہے۔"

"میں بھی اسی طرح سوچتی ہوں شاہ صاحب..... لیکن اس کے باوجود کہ دیکھتے ہی دیکھتے اپنی ہنستی کھیلتی اولاد سے محروم ہو گئی۔ اپنی اس بچی کا چہرہ ہر وقت میری نگاہ میں رہتا ہے..... پھر بھی میں نے سوچا ان بچوں کے باپ کے ساتھ ایک عمر گزار دی..... اسی کی محنت کی کمائی کھا کر آج تک زندہ تھی اور اس کے وسیلے سے ملنے والی عزت کی وجہ سے سر چھپا کر بیٹھی ہوئی تھی۔" صابرہ بدقت کہہ رہی تھی۔

شاہ صاحب چند لمحے کھوئی، کھوئی گم صم کیفیت میں بیٹھے رہے پھر اس کی طرف دیکھے بغیر بولے کہ صابرہ کی بات نے انہیں از حد متاثر کیا تھا۔

"میں آپ کی ہر قسم کی اخلاقی اور مالی مدد کرنے کے لیے تیار رہوں..... بس آپ برہان کو سمجھانے کی کوشش کیجیے۔ بچوں کو بہر حال اپنے باپ سے ملاقات کرنی چاہیے۔ ایسا بھی تو ہوتا ہے ناں کہ بعض اوقات انسان کوئی غلطی کرنے کے بعد بہت پچھتاتا ہے..... اور رو رو کر اللہ سے توبہ کرتا ہے استغفار کرتا ہے..... کیا خبر

غلطی کرنے والے کی غلطی کب معاف کردی جائے اور ہم بندے اس غلطی کو پکڑے بیٹھے رہیں۔ جبکہ ہم میں سے کسی کو اس کا فائدہ نہیں...... ہوسکتا ہے جس کا نقصان ہوا تھا اسے کسی فائدے سے بدل دیا گیا ہو اور ہمارے فرشتوں کو خبر بھی نہ ہوئی ہو۔" شاہ عالم بہت غور وخوض کرتے ہوئے اس طرح سے بات کررہے تھے کہ ان کے منہ سے نکلنے والا ایک، ایک لفظ گنا جاسکتا تھا۔ شاہ صاحب کی یہ بات سن کر صابرہ اب ضبط نہ کرسکی..... ہچکیاں لے کر رونے لگی..... پھر روتے روتے بولی۔

"شاہ صاحب ہم تو اگر اس بات پر اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کریں کم ہے کہ اس گھپ اندھیرے میں آپ جیسے اللہ کا خوف رکھنے والے بندے نے ہمارے سر پر ہاتھ رکھ دیا..... اگر آپ بھی دنیا داروں کی طرح اپنے دروازے ہم پر بند کردیتے تو ہم بھلا کہاں جاتے؟" صابرہ کی یہ بات سن کر شاہ صاحب کے جسم پر ایک لرزہ سا طاری ہوگیا۔ ایک دم ہاتھ اٹھا کر تڑپ کر بولے۔

"نہیں..... نہیں، میں کسی قابل نہیں ہوں..... آپ میرے بارے میں اس طرح نہ سوچیں..... میں صرف اپنے گناہوں سے ڈرتا ہوں..... وہ گناہ جن کا مجھے ہر حال میں جواب دینا ہے اور صرف جواب دینا ہے اس عدالت میں جہاں صرف جواب طلب کیے جائیں گے جواز نہیں۔"

صابرہ اب کچھ نہ بولی اسی طرح ہچکیاں لے کر روتی رہی..... عین اسی لمحے گھر کے ایک ملازم نے شاہ صاحب کو آ کر اطلاع دی تھی۔

"صاحب کوئی مہمان آئے ہیں....." شاہ صاحب نے چونک کر ملازم کی شکل دیکھی۔

"مہمان..... کیا نام بتاتے ہیں؟" شاہ صاحب اپنے ملازم سے سوال کررہے تھے اور صابرہ اپنے بہنے والے آنسو پونچھ رہی تھی..... لیکن اس کی سسکیاں اب بھی فضا میں بکھری ہوئی تھیں۔

"صاحب، وارث علی نام بتا رہے ہیں۔"

"وارث علی....." شاہ صاحب کے منہ سے نکلا..... صابرہ بدحواس ہوکر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور خوف زدہ انداز میں شاہ صاحب کی طرف دیکھ کر بولی۔

"شاہ صاحب..... یہ..... یہ وہی..... وہی ہے جس کی وجہ سے ہم آج آپ کے گھر میں آ کر بیٹھ گئے ہیں..... یہ یہاں بھی پہنچ گیا..... یہ کتنا بڑا شیطان ہے۔ اسے کیسے خبر مل گئی کہ ہم یہاں ہیں۔ شاہ صاحب آپ اسے منع کردیں..... اسے گھر میں نہ بلائیں، یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔" صابرہ اپنا رونا، دھونا بھول کر بہت خوف زدہ دکھائی دے رہی تھی۔ شاہ صاحب کے چہرے پر بھی تفکرات کی لکیریں نمودار ہوئیں۔ ملازم ابھی حکم کا منتظر کھڑا ہوا تھا۔

"آپ اپنے کمرے میں جا کر آرام کیجیے..... میں اس شخص سے بات کرتا ہوں..... بقول آپ کے یہ خطرناک آدمی ہے اگر اس سے بات نہ کی گئی تو پھر یہ دوبارہ بھی آئے گا..... پلیز آپ جا کر آرام کیجیے، میں اس سے بات کرتا ہوں اور ڈرنے، گھبرانے کی بالکل ضرورت نہیں..... جس اللہ نے آپ کو آج تک زندہ اور محفوظ رکھا، آگے بھی اسی کی ذمے داری ہے، ہمیں اسی پر بھروسا کرنا چاہیے..... اور جو اللہ سے نہیں ڈرتا ہمیں اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔" شاہ صاحب نے بہت وقار اور بے خوفی سے اس طرح بات کی تھی کہ صابرہ کے دل کو بڑی تقویت پہنچی تھی۔ وہ چپ چاپ سر جھکا کر اس طرف نکل گئی جس طرف کا راستہ انیکسی کو جاتا تھا۔

"اسے بھیج دو....." شاہ صاحب نے ملازم کی طرف دیکھا اور آہستگی سے بولے۔

ملازم واپس چلا گیا۔ شاہ صاحب اپنی جگہ ٹہلنے لگے۔ ان کے چہرے پر اسی طرح سے تفکرات کا جال بچھا ہوا تھا۔ دو، تین منٹ گزرے اور وارث علی اندر داخل ہوا۔

"السلام علیکم نانا جان......" شاہ صاحب قدرے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگے...... وہ سر سے پاؤں تک وارث علی کا جائزہ لے رہے تھے جو اس وقت بڑی نک سک سے تیار تھا..... اس کے چہرے پر پھیلی خباثتیں اس کے دل کی کیفیات کو منعکس کر رہی تھی۔

"وعلیکم السلام...... تشریف رکھیں۔" شاہ صاحب باوقار انداز میں گویا ہوئے...... وارث علی جھٹ ان کے سامنے رکھے ہوئے بھاری بھرکم صوفے پر گرنے کے سے انداز میں دھنس گیا..... اس کے انداز میں عجیب سی بے تکلفی تھی جو شاہ صاحب کو بہت کھل رہی تھی مگر اس وقت وہ حلم و تدبر کا پیکر نظر آ رہے تھے۔

"نانا جان...... میں سمجھتا ہوں کہ آپ سے ملاقات میرے لیے بہت عزت کی بات ہے...." وارث علی نے اپنی دانست میں ادب و تہذیب کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کی تھی...... شاہ صاحب نے ایک گہری نظر اس پر ڈالی اور پھر گویا ہوئے۔

"مجھے نانا جان کہہ رہے ہیں...... کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ میں کس حوالے، کس رشتے سے آپ کا نانا ثابت ہو رہا ہوں؟" شاہ صاحب نے اس انداز میں کہا کہ ان کے چہرے پر کسی قسم کی ناگواری کا تاثر اخذ نہیں کیا جا سکتا تھا۔

"جی..... آپ میری مرحومہ بیوی کے نانا جان ہیں تو ظاہری بات ہے اس رشتے سے میرے بھی نانا جان ہیں۔"

"مرحومہ بیوی......؟" اب شاہ صاحب قدرے چکرائے تھے۔

"جی..... جی..... میں مرحومہ ستارہ بیگم کی بات کر رہا ہوں۔"

"ستارہ بیگم......!" شاہ صاحب پھر الجھ کر وارث علی کی طرف دیکھنے لگے۔

"جی وہ..... کیا کہتے ہیں..... آپ برہان کے نانا جان ہیں ناں..... تو ظاہر ہے ستارہ اور اس کی بہن کے بھی نانا جان ہیں..... لیکن..... حیرت کی بات ہے کہ میری مرحومہ بیوی نے آپ کا ذکر ہی نہیں کیا...... جب مجھے پتا چلا کہ میری مرحومہ بیوی کے نانا جان بالکل میرے قریب ہی رہتے ہیں...... تو مجھ سے رہا نہیں گیا..... میں فوراً آپ سے ملنے چلا آیا۔"

"بہت نوازش...... بڑی مہربانی کی آپ نے لیکن میں آپ کی اطلاع کے لیے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ بظاہر جو دنیاوی رشتے بنائے جاتے ہیں اس طرح کا کوئی رشتہ میرا اور آپ کی مرحومہ بیوی کا نہیں تھا۔"

"جی......!" وارث علی کو خاک سمجھ نہیں آئی، وہ آنکھیں پھاڑ کر شاہ صاحب کی طرف دیکھنے لگا۔

"میرا خیال ہے آپ کو میری بات سمجھ لینی چاہیے کہ میں برہان کا نانا نہیں ہوں البتہ..... ان کے خیر خواہوں میں سے ایک ہوں...... اب فرمائیں..... آپ کو مجھ سے کوئی کام ہے، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟" شاہ صاحب بہت تولتی ہوئی نظروں سے وارث علی کے چہرے سے کچھ اخذ کرنے کی کوشش بھی کر رہے تھے۔

"جی..... میں بس عرض کرنے لگا ہوں۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ میری بات توجہ سے سنیے گا۔" وارث علی جو شاہ صاحب کی بات سن کر بری طرح چکرا گیا تھا۔ ایک دم سنبھل کر گویا ہوا۔

"جی فرمائیں، میں سن رہا ہوں۔"

☆☆☆

''امی کیا کہہ رہی ہیں آپ، وارث علی، شاہ صاحب سے ملنے آیا ہے؟'' شبینہ بری طرح بدحواس اور خوفزدہ دکھائی دے رہی تھی...... صابرہ بری طرح لرزہ براندام تھی۔ اس کی قوتِ گویائی سلب ہو چکی تھی۔ اس نے شبینہ کو صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وارث علی، شاہ صاحب کے پاس بیٹھا ہے۔ اس کے بعد خوف سے گویا گھگی بندھ گئی تھی اور وہ بولنے کے قابل ہی نہیں رہی تھی۔ شبینہ اگرچہ خود بھی حالتِ خوف میں تھی لیکن اس نے لرزتی کانپتی ماں کو سہارا دے کر بٹھا دیا تھا۔

''وہ یہاں بھی پہنچ گیا شبینہ...... جس سے چھپ کر ہم یہاں آ کر بیٹھے تھے....'' صابرہ بڑی مشکل سے خود کو سنبھال کر اٹک اٹک کر بول رہی تھی۔ ایک، ایک لفظ جیسے کسی گہری کھائی سے گزر کر باہر آ رہا تھا...... شبینہ کا دل سوکھے پتے کی طرح لرز رہا تھا مگر اس پر دُہری افتاد تھی۔ ایک تو یہ کہ خود کو سنبھالنا تھا...... اور دوسرے یہ کہ ماں کو اب مزید ابتر حالت تک پہنچنے سے بچانا تھا۔

وہ لرزیدہ ٹانگوں کے ساتھ بہ مشکل کچن تک گئی..... گلاس میں پانی ڈالا اور اسی طرح لرزتی، کانپتی اس کے پاس آئی۔

''امی! یہ پانی پی لیں.....'' صابرہ انکار میں گردن ہلانے لگی.....وہ بری طرح خوف زدہ تھی۔ اس کے اوسان ہنوز خطا تھے۔

''امی آپ پریشان نہ ہوں...... وہ شاہ صاحب ہیں ناں، خود ان سے نمٹ لیں گے۔ ہم کوئی گھر سے باہر روڈ پر تو نہیں بیٹھے ہوئے...... وہ شاہ صاحب کی مرضی کے بغیر ہم سے نہیں مل سکتا۔ بات نہیں کر سکتا...... پلیز آپ خود کو سنبھالیں...... کچھ بھی نہیں ہوگا، مت پریشان ہوں....'' شبینہ، ماں کو سنبھالنے کے لیے ہر جتن کر رہی تھی۔ صابرہ نے گردن ہلاتے ہوئے گلاس لے لیا اور دو چار گھونٹ لے کر حلق کو تر کیا...... پھر گلاس واپس کرتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے بیٹا...... ہم گھر میں بیٹھے ہیں۔ شاہ صاحب نے ہمارے سر پر ہاتھ رکھا ہوا ہے...... مگر میرا بچہ تو باہر جاتا ہے ناں...... یہ بہت خطرناک آدمی ہے، مجھے تو اپنے بچے کی فکر پڑ گئی ہے۔'' صابرہ کو اب مختلف قسم کے اندیشوں نے ستانا شروع کر دیا۔

''امی، شاہ صاحب اس سے بات کر رہے ہیں ناں...... بس وہ اس سے نمٹ لیں گے، آپ خود کو سنبھالیں۔ خدانخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو ہمارا کیا ہوگا.....'' ماں کے پاس بیٹھ کر انہیں تسلی دیتے ہوئے اس کی آواز بھرّانے لگی۔ صابرہ نے ایک نظر بیٹی پر ڈالی اور بے اختیاری کیفیت میں اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس نے شبینہ کو زور سے بھینچا ہوا تھا۔ شبینہ کے وجود کی گرمی سے اسے عجیب سی تقویت پہنچی تو اس کے اوسان بحال ہونے لگے۔

''ہاں بیٹا...... شاہ صاحب تو بہانہ ہیں، مدد تو اللہ ہی کرتا ہے۔ سبب بناتا ہے، دعا کرو، اللہ ہم پر رحم کرے۔'' وہ شبینہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے رقت بھری آواز میں کہہ رہی تھی۔

☆☆☆

''دیکھیے میں آپ سے لمبی چوڑی بحث نہیں کرنا چاہتا۔ یہ میرا گھر ہے، یہاں پر وہی آ سکتا ہے جسے میں آنے کی اجازت دوں...... آپ اس وقت یہاں پر بیٹھ کر مجھ سے بات کر رہے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ میں نے خود چاہا تھا کہ آپ سے بات کی جائے..... اب کیونکہ میں آپ کی تمام بات سن چکا...... اس لیے

صرف اتنا کہنا چاہوں گا...... کہ برائے مہربانی آپ دوبارہ زحمت مت کیجیے گا...... ٹھیک ہے آپ کا اس خاندان سے ایک رشتہ قائم ہوا تھا۔ مگر مرحومہ کے بعد اب آپ کا اس خاندان سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہے۔ جب بیوی دنیا سے رخصت ہو جاتی ہے اسی وقت بیوی کا شوہر سے یہ رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس دنیا میں دونوں کی زندگی تک ہی باقی رہتا ہے۔"

"لیکن...... نانا جان میں اس خاندان سے اپنا رشتہ قائم رکھنا چاہتا ہوں۔ اتنے برے وقت میں ان لوگوں کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔۔۔" وارث علی نے اپنا اخلاق جتاتے ہوئے اور کمالِ ہوشیاری سے اپنی مکاری کے تاثرات چھپاتے ہوئے بڑے فدویانہ لہجے میں کہا تھا۔

"لیکن جب وہ لوگ آپ سے کسی قسم کا تعلق قائم رکھنے میں دلچسپی نہیں رکھتے تو آپ کیوں اصرار کرتے ہیں اور پھر...... کچھ سمجھ نہیں آتی آپ اس خاندان سے کس بنیاد پر تعلقات آگے بڑھانا چاہتے ہیں اگر آپ مجھے مطمئن کر سکتے ہیں تو میرے سوال کا جواب دیں۔۔۔ ورنہ برائے مہربانی تشریف لے جائیں۔" شاہ صاحب نے بے مروتی کو بھی مروت کے خوب صورت لبادے میں استعمال کیا تھا۔

"اس لیے نانا جان کہ یہ لوگ بہت اچھے ہیں، اتنے اچھے لوگ دنیا میں بہت کم ہوتے ہیں اور پھر آپ یہ دیکھیں کہ ان دونوں بچوں کا باپ جیل جا چکا ہے۔ اس پر قتل کا محض الزام نہیں ہے بلکہ اس پر قتل کا مقدمہ بن چکا ہے اور وہ اپنے جرم کا اعتراف بھی کر چکا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ اب اللہ ہی جانے کہ وہ باہر آتا ہے یا......؟ آپ میری بات سمجھ رہے ہیں ناں......؟" وارث علی نے اپنی بات ادھوری چھوڑ کر شاہ صاحب سے سوال کیا۔

"بالکل، میں آپ کی بات سمجھ گیا مگر میرا خیال ہے اس خاندان کو آپ کی ہمدردی اور آپ کے اخلاقی تعاون کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تو آپ کی ضد اور اصرار بالکل بے جا اور بے محل ہیں۔ برائے مہربانی آپ اپنے کام سے کام رکھیں اور ان لوگوں کا پیچھا چھوڑ دیجیے اور میں آپ سے پھر کہوں گا کہ آئندہ میرے گھر تشریف نہ لائیں۔"

وارث علی، شاہ صاحب کی بات سن کر قدرے سوچ میں پڑ گیا۔ اس کی سوچ کسی نئے مکر کے لیے وقفہ تھی۔ شاہ صاحب کو اس کی موجودگی کا ایک، ایک پل بہت بوجھل محسوس ہو رہا تھا یوں لگتا تھا جیسے انہوں نے کندھوں پر پہاڑ اٹھایا ہوا ہے۔ وہ بڑی بردباری اور تحمل سے اس کے اٹھ جانے کا انتظار کر رہے تھے...... اور اس پر اپنے مزید الفاظ ضائع کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ وارث علی، شاہ صاحب کی طرف سے مکمل خاموشی کا عندیہ پا کر طوعاً و کرہاً اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا اور بڑی عاجزی سے گویا ہوا۔

"آپ جیسے کہتے ہیں...... آپ کی بات مان لیتا ہوں لیکن آپ یہ نہیں سمجھیں کہ میں اتنی آسانی سے ان لوگوں سے تعلق ختم کر لوں گا...... یہ میرے اپنے ہیں، ان لوگوں کا درد میرا اپنا درد ہے۔ میں تو ان لوگوں کی ہمدردی میں یہاں تک چلا آیا تھا...... اور میری یہ ہمدردی وقتی نہیں ہے۔ میں سچ مچ اس مشکل وقت میں ان لوگوں کا ساتھ دینا چاہتا ہوں۔۔۔" وارث علی اتنا کچھ کہہ بیٹھا۔۔۔ مگر اب شاہ صاحب بالکل خاموش تھے...... اور ان کی خاموشی وارث علی کو کہہ رہی تھی کہ اسے یہاں سے چلے جانا چاہیے۔

وارث علی نے اپنی بات کا جواب نہ پا کر شاہ صاحب کی طرف دیکھا اور مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔

"آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی، مجھے نہیں پتا تھا کہ ان لوگوں کو آپ جیسا سرپرست میسر ہے اگر یہ لوگ مجھے پہلے بتا دیتے تو میں بہت پہلے آپ کو سلام کرنے حاضر ہو جاتا۔ ان لوگوں کے یہاں آنے سے پہلے......" اس

نے پھر مکروفریب سے لپٹے ہوئے الفاظ ادا کیے..... مگر شاہ صاحب ہنوز خاموش تھے۔ بہرحال انہوں نے وارث علی کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا..... اور مصافحے کے انداز سے اسے جتا دیا کہ یہ اس کا ان کے ساتھ آخری مصافحہ ہے۔

☆☆☆

برہان اب انیکسی جانے کے لیے وہی راستہ اختیار کرتا تھا جو صرف انیکسی کے لیے مخصوص تھا۔ اس لیے آج جب وہ شاہ صاحب کے گھر میں داخل ہوا تو شاہ صاحب سے اس کا آمنا سامنا نہیں ہوا..... وہ غالباً اپنے کمرے میں تھے..... گھر میں مکمل خاموشی پھیلی ہوئی تھی۔

شام ڈھلنے کا وقت تھا۔ برہان شل اعصاب کے ساتھ جب ماں کے سامنے آیا تو جیسے اس کے چہرے پر کچھ لکھا ہوا تھا..... وہ الجھن بھری نظروں سے ماں کے چہرے سے کچھ اخذ کرنے لگا..... مگر کچھ سمجھ نہ آئی..... جبکہ صابرہ دم بخود کیفیت میں اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"امی کیا بات ہے؟ آپ اس طرح سے مجھے کیوں دیکھ رہی ہیں؟" برہان کی آواز ماحول میں ابھری تو صابرہ جیسے ایک دم اپنے حواسوں میں آگئی اور بڑی تیزی سے آگے بڑھ کر اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں سے تھام لیا..... پھر اس کا سر اپنے سامنے جھکا کر پیشانی چومتے ہوئے بولی۔

"یا اللہ، تیرا لاکھ شکر ہے..... میرا بیٹا ساتھ خیریت کے واپس آگیا۔" ماں کی یہ بات سن کر برہان بری طرح چونک پڑا تھا..... اور تشویش بھری نظروں سے ماں کی طرف دیکھا تھا..... صابرہ کے اس جملے میں ان گنت معنی پوشیدہ تھے۔ ایسے معنی جو دلوں میں وسواس پیدا کرتے ہیں، اندیشے ابھارتے ہیں..... خوف کے راستوں کی طرف دھکیلنے کی کوشش کرتے ہیں..... پھر اس نے چاروں طرف نظریں دوڑا کر بہن کو تلاش کیا مگر وہ اسے دکھائی نہیں دی۔

"کیا بات ہے امی! آپ اتنی پریشان کیوں ہیں..... اور شبینہ کہاں ہے؟"

"بیٹا..... شبینہ تو چھت پر ہوگی وہ بھی کیا کرے..... دو چار کام کر کے ایک کونے میں بیٹھ جاتی ہے۔ انسان ہے، بند کمرے میں دل گھبرا جاتا ہے۔ خود ہی کہتی ہوں بیٹا چھت پر چلی جاؤ، کچھ دیر کھلی ہوا میں بیٹھو گی تو سکون ملے گا۔"

"اور آپ..... آپ کیوں پریشان ہیں؟ کوئی خبر آئی ہے یا شاہ صاحب نے کچھ کہا ہے؟ کیونکہ ہمارے ملنے جلنے والوں میں سے کوئی یہاں نہیں آسکتا..... کسی کو بھی نہیں پتا کہ ہم لوگ یہاں ہیں۔" برہان پر عجلت سی طاری ہوگئی۔ لہجہ لڑکھڑانے لگا کیونکہ اسے جلدی، جلدی بولنے کی عادت نہیں تھی..... لیکن خیالات کی یلغار نے جیسے اس کے حواسوں پر قبضہ جما لیا تھا۔

"بیٹا..... آرام سے بیٹھو بتاتی ہوں میں تمہیں..... پریشانی والی بات ہے بھی اور نہیں بھی....."

"کیا مطلب.....؟" برہان پھر الجھا۔

"بیٹا.....! وارث علی آیا تھا....." صابرہ نے گویا ایک دھماکا کیا تھا۔ برہان نے پوری آنکھیں کھول کر ماں کی طرف دیکھا۔

"وارث علی آیا تھا؟ اندر آگیا تھا وہ.....!"

"ہاں..... ہاں بیٹا اندر آگیا تھا۔ شاہ صاحب نے اندر بلوایا..... وہ تو اتفاق سے میں شاہ صاحب کے پاس بیٹھی ہوئی تھی تو ان کے نوکر نے آکر بتایا..... میری تو ٹانگیں کانپ گئیں۔ بڑی مشکل سے خود کو سنبھالا.....

شاہ صاحب سے بہت کہا کہ اسے اندر نہ بلائیں..... مگر وہ کہنے لگے اگر میں نے اسے اندر نہ بلایا تو وہ روز آئے گا..... اس سے بات کرنا بہت ضروری ہے اور اس کے آنے کا مقصد جاننا بھی بہت ضروری ہے۔"

"پھر.....؟" برہان نے بے تابی سے پوچھا۔

"پھر..... یہ کہ بیٹا میں تو اٹھ کر آ گئی تھی..... میں کیوں اس کے سامنے بیٹھتی، کیوں اس سے باتیں کرتی..... اس سے کیا لینا دینا..... شاہ صاحب سے جانے کیا بات ہوئی، وہ تو تمہیں ہی بتائیں گے..... میری تو ہمت ہی نہیں ہوئی پھر ان کے سامنے جانے کی..... حالانکہ دل تو بہت چاہ رہا تھا کہ پوچھوں کیا کہہ کر گیا ہے؟ اور کیوں آیا تھا.....؟" صابرہ کی بات سن کر اس نے ایک گہری سانس لی..... جیسے اپنے اوسان سنبھالنے کی کوشش کر رہا ہو پھر چند لمحے کی خاموشی کے بعد گویا ہوا۔

"وہ تو میں شاہ صاحب سے پتا کر لوں گا امی لیکن..... وہ یہاں کیسے پہنچ گیا۔ اسے اس گھر کا پتا کس نے بتایا، میں نے تو کسی پڑوسی سے بھی بات نہیں کی تھی..... اس لیے کہ کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔ یہ تو بڑی حیرت کی بات ہے کہ وہ یہاں تک پہنچ گیا۔"

"ہاں..... ہاں بیٹا میں تو خود پریشان ہو رہی ہوں کہ آخر اسے کس نے ہمارے ٹھکانے کا بتا دیا۔"

"یہ بھی معلوم ہو جائے گا..... لگتا ہے کہ یہ بہت بڑا کریمنل ہے اور اس طرح کے لوگوں کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں مگر میں دیکھ لوں گا۔"

"نہیں..... نہیں بیٹا..... زیادہ جوش میں مت آنا، ایسے خطرناک لوگوں کے منہ نہیں لگنا چاہیے..... ارے ہمیں کیا..... میں نے تو پہلے ہی سوچ لیا ہے..... بس ان شبینہ کو لے کر گاؤں چلی جاؤں گی..... مگر تمہاری فکر تو ہے ناں مجھے....."

"امی میری فکر آپ چھوڑیں، میں اپنا خیال خود رکھ سکتا ہوں، کیا بگاڑ لے گا وہ میرا.....؟ کیا قتل کر دے گا؟ اب ایسا بھی نہیں ہے..... وہ بہت لالچی آدمی ہے اور جو آدمی لالچی ہوتا ہے ناں..... وہ بے سوچے، سمجھے قتل و غارت گری کا بازار گرم نہیں کرتا..... چونکہ اسے تو اپنی دولت انجوائے کرنا ہوتی ہے۔ وہ تو زندگی کے مزے لوٹنا چاہتا ہے..... ایسی حرکت کیوں کرے گا کہ باقی کی عمر سلاخوں کے پیچھے گزر جائے..... اس طرح کے لوگ بڑی ہوشیاری سے کام کرتے ہیں۔"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں..... کہ وہ بہت خطرناک ہے، بڑی ہوشیاری سے کچھ بھی کر سکتا ہے....." صابرہ دھیمے، دھیمے لہجے میں بڑی بزرجنگی کے ساتھ بولی تھی۔ گویا اس نے برہان کی بات پکڑلی تھی۔

"امی دیکھیں ڈر اور خوف حقیقت میں کچھ نہیں ہوتے، یہ انسان کے اپنے اندر ہوتے ہیں..... جب کسی چیز سے بہت زیادہ ڈر لگے ناں تو اس چیز کا سامنا ضرور کرنا چاہیے..... تاکہ خوف ختم ہو جائے..... ورنہ یہ خوف انسان کو کہیں کا نہیں رہنے دیتا....."

"میں پھر کہہ رہی ہوں برہان..... بس تم شاہ صاحب سے کہو کہ اس کا بندوبست کریں..... اتنے بڑے آدمی ہیں..... بڑے، بڑے لوگوں تک ان کی پہنچ ہوگی۔"

"امی یہ پہنچ وہنچ چھوڑیں اللہ سے مدد مانگیں..... انسان تسلی دے سکتا ہے، ضمانت نہیں....." یہ کہہ کر وہ اس کمرے کی طرف بڑھ گیا..... جو آج کل اس کا ٹھکانا تھا۔

☆☆☆

''دادا جان! کیا بات ہے آج آپ کمرے سے ہی نہیں نکل رہے ..... طبیعت ٹھیک ہے ناں آپ کی؟'' کائناز بہت پریشانی کی کیفیت میں شاہ صاحب کی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر پوچھ رہی تھی۔

وہ پوتی کی طرف دیکھ کر مسکرا دیے..... اس کے ہاتھوں کا لمس ان کی روح میں زندگی بن کر دوڑنے لگا تھا..... انہوں نے کائناز کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا..... اور ہتھیلی کی پشت پر بہت محبت بھرا بوسہ لیا۔

''بیٹا..... ! بندہ بشر ہوں، کبھی کبھی ایسے بھی ہوتا ہے..... بندے کا خاموش رہنے کو دل چاہتا ہے۔ تنہائی اچھی لگتی ہے، سوچنا اچھا لگتا ہے۔''

''جی نہیں..... جی نہیں.....'' کائناز نے تیزی سے ان کی بات کاٹ دی۔ ''سوچنے کی اجازت نہیں ہے..... وہ..... ڈاکٹر انکل کہتے ہیں ناں کہ آپ فضول سی کوئی بات نہیں سوچیں گے..... سوچنے سے ڈپریشن پیدا ہوتا ہے اور ڈپریشن آپ کے لیے بہت خطرناک ہے..... چلیں اٹھیں، آئیں میرے ساتھ لان میں..... ہم وہاں بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔'' اس نے شاہ عالم کا ہاتھ پکڑ کر کھینچ لیا۔

''اچھا، اچھا بیٹا اٹھتا ہوں، اٹھتا ہوں، تم تھوڑی دیر یہاں میرے پاس تو بیٹھو اور یہ تو بتاؤ، تم آج کیا کرتی رہیں..... کالج میں کوئی تیر مارا یا سارے تیر خطا گئے..... میرا مطلب ہے یونہی الٹی سیدھی پڑھائی کر کے واپس آ گئیں؟'' شاہ صاحب نے زبردستی اپنے لہجے میں بشاشت پیدا کرنے کی کوشش کی اور اٹھ کر بیٹھ گئے۔

''کالج میں اب میرا دل ہی نہیں لگ رہا..... آپ کو پتا ہے ناں روما..... اور بیمار ہو گئی ہے ایک دن جاتی ہے..... پھر دو دن چھٹی۔ بس اسی غصے کی وجہ سے کچھ کرنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔'' کائناز منہ پھلا کر بولی..... شاہ صاحب نے اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھ کر ہلکا سا دباؤ ڈالا۔

''پھر وہی بات بیٹا، ہر انسان کی اپنی، اپنی زندگی ہے۔ یہ دو چار دن کی دوستی ..... ساری زندگی کی نہیں ہے۔''

''دادا جان آپ کیوں بددعا دیتے ہیں۔ اگر یہ فرینڈشپ نہ رہی تو ہم دونوں میں سے کوئی بھی خوش نہیں رہ سکے گا..... اتنی پکی عادت پڑ چکی ہے ہمیں ایک دوسرے کی.....'' وہ اپنے اسی لاابالی لہجے میں بولی جو اس کی ذات کا سب سے خاص حصہ بن کر رہ گیا تھا۔

''ارے نہیں، نہیں بیٹا..... خدانخواستہ میں کیوں بددعا دینے لگا، میں تو دن رات دعا کرتا ہوں کہ اللہ ان پیاری، پیاری بچیوں کو ہمیشہ ساتھ رکھے اور ان کی شادی کے بعد بھی ان کے گھر برابر ہونے چاہئیں۔ بھئی اللہ کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں ہے۔ اللہ کی ذات سے ہمیشہ امید رکھنی چاہیے کہ وہ سب کچھ کر سکتا ہے اور سب کچھ کرنے کی طاقت بھی اسی کے پاس ہے۔''

''دادا جان، آپ یہ دعا کیوں نہیں کرتے کہ اگر شادی ہونا اتنی ہی ضروری ہے تو ہم دونوں کی شادی ایک ہی گھر میں ہو۔'' کائناز اب شرارت کے انداز میں شاہ عالم سے گویا ہوئی تھی اور مسکراہٹ دبا کر روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

دادا، پوتی کی اتنی دوستی تھی کہ اس نے کبھی شاہ عالم کے سامنے اپنے ہونٹوں پر آئی ہوئی بات نہیں روکی تھی۔ اسے اپنے دادا سے کوئی خوف، کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی تھی..... اور انہوں نے بھی کوئی روک ٹوک نہیں کی تھی اس لیے اسے بولتے ہوئے احساس ہی نہیں ہوتا تھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی بول گئی ہے یا وہ کچھ بول گئی ہے جو اسے بولنا نہیں چاہیے تھا۔

''ایسا بھی ہو سکتا ہے، بھئی میں تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے سب کچھ ہونے کی امید رکھتا ہوں کیونکہ انسان تو

کچھ نہیں کرتا...... بس جو کچھ ہونا ہوتا ہے اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ تم میں سے جس کی شادی پہلے ہو جائے وہ اپنی سہیلی کے لیے پہلے اپنے گھر میں رشتے تلاش کرے...... بھئی شوہر کا کوئی کزن، بھائی جو ہو سکتا ہے اس کے ساتھ ہی رہتا ہو یا پھر قریب والے گھر میں جھانک لے...... کہ شاید اُدھر کوئی دلچسپی ہو...... ایسا ہو سکتا ہے ناں......؟" شاہ صاحب، کانتاز کے ساتھ گویا اپنے منتشر ذہن کو لاشعوری طور پر بہلانے کی کوشش کر رہے تھے...... کانتاز نے اُن خیالات کا سلسلہ تو منقطع کر دیا تھا...... جن کی یورش نے شاہ صاحب کے اعصاب شل کر دیے تھے۔ جب سے وارث علی گیا تھا تب سے ان کا ذہن صرف اور صرف اسی کی کہی ہوئی باتوں کے گرد گھوم رہا تھا لیکن اب کانتازان کا ذہن اِدھر اُدھر لگانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

"اچھا چلیں چھوڑیں، یہ تو بہت لمبی پلاننگ ہے، ابھی تو ہم چھوٹے ہیں، پڑھ رہے ہیں......" کانتاز نے شرگیں مسکراہٹ کے ساتھ دادا کی طرف دیکھا...... ان کا بازو پکڑ کر اٹھانے کی کوشش کی...... "آئیں، آپ میرے ساتھ روما کو بھی بلاتی ہوں۔"

"صرف روما کو......؟ ارے بھئی رابی کو بھی کہہ دو۔"

"چھوڑیں رابی آپا کو...... وہ تو موڈی ہیں، بس آپ آجائیں......" یہ کہہ کر اس نے جھک کر ان کے سلیپرز ان کے پاؤں میں پہنانا شروع کر دیے...... انھیں اپنی پوتی کی یہ ادا بہت بھاتی تھی۔ انہوں نے کمال شفقت سے اس کے بالوں پر بوسہ دیا تھا۔

"اللہ میری بیٹی کو ہمیشہ ہنستا، مسکراتا رکھے...... آمین۔" یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کانتازان کا بازو تھام کر باہر کی طرف قدم بڑھانے لگی۔

☆☆☆

"بیٹا ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ مذہب کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی...... ہر انسان اپنی، اپنی عقل سمجھ کے لحاظ سے مذہب کی تشریح کرتا پھرتا ہے۔ حالانکہ مذہب کا تو بہت سادہ سا فلسفہ ہے جیو اور جینے دو۔ بڑی عجیب سی صورت حال ہوتی ہے۔ مذہب دو گروہوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔ ایک گروپ وہ ہے جو ایک دو ظاہری اعمال بجالا کر خود کو مسلمان ثابت کرتا ہے۔ مثلاً جمعے اور عید کی نماز پڑھ لی۔ رمضان میں سحر و افطار کا اہتمام کر لیا...... دوسرا گروپ وہ ہے جو انتہا پسندی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جہاں سانس لینے کے عمل کو بھی شریعت کا پابند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ شریعت بھی وہ جو انہوں نے سمجھی۔" صبح کے ہلکے نورانی اجالے میں شاہ صاحب سوچ، سوچ کر بولتے ہوئے خود بھی بہت نورانی سے محسوس ہو رہے تھے۔

کچھ دیر قبل شاہ صاحب اور برہان دونوں فجر کی نماز ادا کر کے گھر لوٹے تھے۔ شاہ صاحب اپنے معمول کے مطابق اپنے بڑے سے سرسبز لان میں چہل قدمی کرنے لگے تو برہان بھی ان کی صبح کی واک میں شریک ہو گیا...... اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں کر کے شاہ صاحب جابر علی پر آ گئے...... وہ برہان کو کچھ سمجھانا چاہتے تھے مگر اس سے پہلے برہان سے کچھ سننا چاہتے تھے۔

برہان نے بہت اختصار سے جابر علی کی مذہبی انتہا پسندی کے بارے میں بتا دیا تھا۔ اب وہ اسی کو موضوع بنا کر آگے بڑھ رہے تھے۔

"قرآن کو صرف گھر میں روزی کی برکت اور مُردے کی بخشش کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔ قرآن اس لیے اتارا گیا ہے کہ اس کے مطلب پر تدبر، غور و فکر کیا جائے۔ قرآن تو خود کہتا ہے کہ سب سے اچھی راہ درمیان کی

راہ ہے۔ بہت کم نہ بہت زیادہ، مومن کی نشانی یہ ہے کہ وہ غصہ ضبط کرتا ہے...... اور مذہبی انتہا پسند ہر وقت لڑنے مرنے کو تیار رہتے ہیں۔"

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، آج کل تو انسانوں کی برداشت ہی جواب دے گئی ہے لیکن جو صبر کرتا ہے' برداشت کرتا ہے اسے بزدل اور ڈرپوک سمجھا جاتا ہے۔" برہان کے لہجے میں لاشعوری طور پر تلخی اُمڈ آئی۔

"سمجھنے دیں...... شیطان تو چاہتا ہی یہی ہے کہ برائی کا جواب برائی سے دیا جائے، خاموش رہنے کو انا و غیرت کا مسئلہ بنا لیا جائے...... بیٹا غصے میں مزید غلطیاں ہوتی ہیں۔ دشمن کو شکست دینے کے لیے دماغ کو ٹھنڈا رکھنا چاہیے۔" شاہ صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں برہان کو سمجھایا...... بات سچ کی تھی۔ برہان کے کھولتے لہو میں برف گھلنے لگی۔

☆☆☆

"تم سب کچھ چھوڑو...... فائل کی فکر کرو...... ساری توجہ فائل برآمد کرنے پر لگاؤ...... مجھے کیا ضرورت پڑی ہے کہ میں جاؤں اور چھان بین شروع کروں کہ شاہ عالم کون ہیں، کیا کرتے ہیں...... ان کے کیا کاروبار ہیں، ان کے کون، کون رشتے دار ہیں...... وارث علی لگتا ہے کہ تمہارا ذہن ٹھیک سے کام نہیں کر رہا...... خود بھی الجھ رہے ہو اور خواہ مخواہ میں مجھے بھی الجھا رہے ہو۔" ایس پی، وارث علی کے الٹے سیدھے پریشان کن خیالات سن کر چڑ سا گیا تھا۔

"سر جی...... مجھے ان لوگوں سے کیا لینا دینا...... جابر علی سلاخوں کے پیچھے نہ ہوتا، آزاد ہوتا تو بات دوسری تھی اب اس پر پریشر کیسے ڈالیں گے آپ، سارا جھگڑا اسی فائل ہی کا تو ہے...... آپ میری بات سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے جب تک اس پر پریشر نہیں ڈالا جائے گا اور وہ بھی ٹھیک ٹھاک قسم کا پریشر...... فائل ہمارے ہاتھ نہیں لگنے والی۔" وارث علی اب مارے جذبات کے جھاگ اڑانے لگا تھا۔ ایک سانس میں بولتا چلا گیا۔

"جابر علی جیسا آدمی...... اب کسی پریشر میں نہیں آئے گا۔ سارے پریشر دم توڑ چکے ہیں...... وہ اقبالی مجرم ہے، اپنے جرم کا اعتراف کر چکا ہے۔ اس کے سامنے پھانسی کا پھندا جھول رہا ہے...... سرکاری وکیل اسے بچا نہیں سکے گا...... اور جس بندے کے سامنے موت کھڑی ناچ رہی ہو وہ کس پریشر میں آئے گا...... ہاں، اس پر اسی بندے کا پریشر اثر ڈال سکتا ہے جو بندہ اسے باہر لانے کی بات کرے بلکہ گارنٹی دے...... مگر اس کے خاندان والے تو اسے ملنے تک نہیں آئے...... کون کرائے گا اس کی ضمانت اور جب bail ہی نہیں ہونے والی تو ظاہری بات ہے کہ جابر علی کسی بھی وقت پھانسی کے پھندے پر چڑھ جائے گا۔"

"سر جی! جابر علی سے فائل نکلوانی ہے، ایسی باتیں کر کے ڈرائیں نہیں...... ہماری ساری زندگی کی بھاگ دوڑ اور محنت کا سوال ہے اگر یہ فائل ہمارے ہاتھ سے نکل گئی تو سمجھیں ککھ نہیں ہے ہمارے پاس۔ اگر فرمان علی کے وارث مقابلے پر آ گئے ناں تو سمجھ لیں ہم ننانوے پر ڈسے گئے...... سانپ اور سیڑھی کا کھیل ہے یہ......" وہ ایس پی کو بہت کچھ سمجھانا چاہ رہا تھا۔ جہاں ظلم و ناانصافی، جبر و استبداد کا راج ہو وہاں اندیشوں اور وسوسوں کے سوا کچھ نہیں ہوتا، خاص طور پر جرائم پیشہ انسان کے دل میں وگرنہ جسے صالح دل ملتا ہے اُدھر تو شیطان خود منہ کے بل گر کر ہار، بار خاک چاٹتا ہے اور ایسا مجرم جو تمام حدود پھلانگ چکا ہو چھوٹے، بڑے ہر جرم کا ذائقہ چکھ چکا ہو...... وہ تو سو فیصد عقل کا اندھا ہوتا ہے اس کی شامت اور اس کی بری موت بحکم الٰہی اسے ان راستوں پر لے کر چلتی ہے جن راستوں پر چلنے کے بعد اسے اپنے طے شدہ حقیقی انجام سے دوچار ہونا ہوتا ہے اور یہ راہیں ایسے مجرموں کے لیے

بڑی پرکشش بنادی جاتی ہیں۔ وہ سارے راستے چھوڑ کر انہی راستوں پر چل پڑتے ہیں جو دنیا..... زمانے کی لبھانے دینے والی اداؤں کے ساتھ ان لوگوں کے قدموں تلے بچھی ہوتی ہیں۔

''میں آج رات ایک بجے کے بعد جابر علی سے ملوں گا اور پوری کوشش کروں گا کہ وہ فائل کا اتا پتا بتادے۔ ابھی اس کی ایک غیر شادی شدہ بیٹی موجود ہے۔ یہی وہ ترپ کا پتا ہے جو آخری پتا بھی ہے۔۔۔ اگر یہ پتا نہیں چلا تو سمجھو کہ زمین تو گئی ہمارے ہاتھ سے۔'' ایس پی اب خود کلامی میں مبتلا ہو چکا تھا کیونکہ فائل کی جتنی اہمیت وارث علی کے لیے تھی اس سے بھی زیادہ اس کے اپنے لیے تھی۔ وہ تو ایک چھکا کھیل کر پولیس ڈیپارٹمنٹ سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لینے کے خواب دیکھ رہا تھا..... اسی فائل کے بل بوتے پر۔

☆☆☆

''آپا اتنی رات کو میں سر سے کیا باتیں کروں گی آپ خود سوچیں.....؟'' روما حیران، پریشان رابی کی شکل دیکھ رہی تھی آخر کار رابی نے اسے جا لیا تھا۔ وہ شاید گل جان کے پاس جانے کے لیے گھر سے باہر جا رہی تھی۔ رابی نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے اسے دیکھا اور دوڑتے ہوئے اس کے پیچھے آئی اور اسے اپنے کمرے میں لے آئی..... چند لمحے ادھر اُدھر کی بات کرنے کے بعد اس نے اپنے مطلب کی بات شروع کردی تھی۔

پہلا سوال یہی تھا کہ وہ کل رات بریان سے کیا باتیں کر رہی تھی۔ اس نے روما پر ابھی تک کسی قسم کا شک ظاہر نہیں کیا تھا خود کو بہت سنبھال کر بات کر رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ روما اس کے سوال کو ایک عام سا سوال سمجھ کر الجھ رہی تھی۔

''آپا میں وہاں اکیلی بیٹھی تھی اور میں بچی بتاؤں، رو رہی تھی۔ مجھے پتا نہیں..... سر نے اوپر سے دیکھ لیا..... میرے پاس آگئے اور پوچھنے لگے کہ میں کیوں رو رہی ہوں.....'' روما بڑی معصومیت سے بول رہی تھی اور رابی کے غبارے سے جیسے ساری ہوا ہی نکل گئی تھی۔

''او.....'' رابی کے منہ سے نکلا تھا۔ ''یہ شک بھی کتنا بڑا عذاب ہے، کل رات سے اب تک میرے دماغ کی چولیں ہل گئیں، اتنی ایکسرسائز تو میں نے ڈاکٹر صاحبہ کے تیر ونشتر سہتے ہوئے بھی نہیں کی تھی۔'' وہ کچھ سوچتے سوچتے پھر بولی۔

''تم کیوں رو رہی تھیں.....؟''

''بس میرا دل چاہ رہا تھا.....'' روما نے جیسے چڑ کر کہا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی عندیہ دے دیا تھا کہ وہ اس ٹاپک پر بات نہیں کرنا چاہتی..... اسی لیے الٹا جواب دے رہی ہے۔

''رونے کا جب دل چاہتا ہے ناں تو کوئی خاص وجہ ہوتی ہے، کوئی ایسی بات جو انسان کو اتنا بے بس کر دے جو وہ کسی سے کہہ نہ سکے تو آخری راستہ یہی رہ جاتا ہے کہ وہ رو کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتا ہے..... کسی کو نہیں بتا سکتیں مگر مجھے تو بتا دو..... کیوں رو رہی تھیں؟''

روما اس کے سوال کے جواب میں خاموش رہی۔

''میں کیا پوچھ رہی ہوں روما، کیوں رو رہی تھیں تم.....؟''

روما نے خفا، خفا نظروں سے بہن کی طرف دیکھا اور بولی۔

''اگر آپ کو رونا نہیں آتا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دوسروں کو بھی نہیں آتا..... اور رونے کے لیے کوئی بہت بڑی بات ہونا ضروری نہیں ہے۔ کبھی کبھی بہت چھوٹی سی بات پر بھی رونا آجاتا ہے۔'' روما نے اپنی دانست میں بڑا عظیم فلسفہ جھاڑا۔

"چلو تو وہ چھوٹی بات ہی بتا دو......"

"کیوں بتاؤں......! بس میں رو چکی، اب میرے ذہن میں کچھ بھی نہیں ہے جو میں آپ کو بتاؤں......"

"بھئی تمہارے سر نے بھی تو تم سے پوچھا ہوگا ناں کہ رومہ کیا بات ہے، کیوں رو رہی ہو؟ تم نے انہیں کیا جواب دیا تھا۔" رانی اب قدرے ہلکی پھلکی ہو کر بات کر رہی تھی...... سر سے جیسے منوں ٹنوں بوجھ اتر گیا تھا۔

"کچھ بھی نہیں......"

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا...... انہوں نے تم سے کچھ پوچھا ہو اور تم نے جواب ہی نہیں دیا ہو...... بتاؤ ناں مجھے کیا جواب دیا تھا۔"

"بس دے دیا تھا ناں...... کوئی جواب...... اب آپ کو کیوں بتاؤں؟" وہ پھر چڑ گئی۔

"مجھے دلچسپی ہے کہ روتے ہوئے تم نے جو بھی جواب دیا ہوگا بڑا سچا ہوگا۔ بچی، بتاؤ کیا جواب دیا تھا۔" رانی تو جیسے ہاتھ دھو کر پیچھے ہی پڑ گئی تھی۔

"کچھ نہیں کہا تھا میں نے سر سے، ہاں یہ کہا تھا کہ ہماری تو قسمت ہی خراب ہے۔ ہمیں تو رونا ہی ہے۔" رومہ نے اتنا کہا اور پاؤں پٹختے ہوئے کمرے سے باہر چلی گئی۔ رانی کو نہ اس کا سخت جواب برا لگا اور نہ ہی پاؤں پٹخنا...... وہ تو جیسے تنگ جوتا اتار کر پُرسکون ہو گئی تھی۔

☆☆☆

رات دو بجے کا عمل تھا۔ برہان خود کو سمجھا سمجھا کر تھک گیا تھا۔ اپنی کتابیں، فائلیں سامنے رکھے یوں تک رہا تھا جیسے یہ سب فائلیں، کتابیں، نوٹ بکس پہلی بار دیکھ رہا ہو۔ آنکھوں میں عجیب سا خالی پن اس کی ذہنی کیفیت کا عکاس تھا۔ جیسے ہی کوئی کتاب کھولتا، کوئی خیال پھڑ پھڑاتا ہوا اس کے سر پر منڈلانے لگتا...... کبھی قید خانے میں مقید باپ کی طرف سوچ جاتی، کبھی وارث علی کی آج کی آمد کی طرف...... کبھی شاہ صاحب کی مہربانیوں کی طرف...... کبھی اپنی زندگی کی مشکلات کی طرف، اور ان کے بیچ، بیچ دھندلا سا ہلکا سا ایک منظر گاہے گاہے جھلک جاتا تھا۔ وہ منظر جس میں رومہ تھی...... انتہائی بے رات کو لان میں تنہا بیٹھی آنسو بہاتی ہوئی......

کئی بار رومہ کی طرف دھیان گیا تو ایک عجیب سا تجسس بیدار ہو گیا۔ وہ لاشعوری طور پر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا کھڑکی تک آیا اور باہر جھانکنے لگا۔ یوں جیسے کسی نے اسے زبردستی پکڑ کر اٹھا دیا تھا۔ تاکہ وہ رومہ کو ایک مرتبہ پھر روتا ہوا دیکھ لے۔ اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب اس کا وہم یقین میں ڈھلتا ہوا محسوس ہوا...... آج بھی رومہ اسی بینچ پر بیٹھی تھی اور رو بھی رہی تھی...... وہ ایک سکتے کی سی کیفیت میں رومہ کو دیکھنے لگا۔ دل پر ایک بوجھ سا آ پڑا...... کل کی بات اور تھی اور آج اس کے پاس اپنا سوال دُہرانے کی ہمت نہیں تھی۔ جانے کیوں اسے محسوس ہوا کہ رومہ کے آنسو اس کے دل پر ٹپک رہے ہیں۔ یہ معصوم سی لڑکی پہلے ہی دن، پہلی ہی نظر میں اس کے لیے بہت اہم ہو چکی تھی۔ اس کے اندر کسی نفسیاتی خیال کا عمل دخل نہیں تھا...... بس صرف ایک احساس تھا...... یہ لڑکی بہت معصوم ہے...... اتنی سادہ اور معصوم سی لڑکی کا آج کے زمانے میں تصور بھی نہیں کیا جا سکتا...... لڑکیاں باہر جائیں نہ گھومیں، پھریں لیکن گھروں میں وہ سب ذرائع ہوتے ہیں کہ وہ گھر بیٹھے، بیٹھے بھی ساری دنیا سے باخبر ہو سکتی ہیں۔ زندگی کے مختلف رویوں اور راستوں کو سمجھ بھی سکتی ہیں اور پہچان بھی سکتی ہیں۔

لیکن یہ تو عجیب سی لڑکی تھی۔ اس کے اندر ایک نیا پن تھا جو اس کو دوسری تمام لڑکیوں سے منفرد کرتا تھا۔ کا انداز

کے اندر اعتماد تھا، بے ساختگی تھی اور قدرے ہوشیاری بھی..... جس کو وہ سمجھداری کہتا تھا اور وہ بھی نسبتاً روما کے مقابلے میں..... اس کا جی چاہا آج پھر وہ روما کے پاس جائے اور اسے سمجھائے کہ اس طرح راتوں کو اکیلے بیٹھ کر نہیں رویا کرتے۔ کوئی بہت بڑی مشکل ہو تو اللہ کے سامنے سجدے میں گر جاتے ہیں اور پورے یقین سے دعا کرتے ہیں..... اس سے بھی انسان کو بہت سکون ملتا ہے، دل کو تسلی ہوتی ہے..... لیکن یہ سب اتنی رات کو جا کر وہ اس سے کیوں کہے..... اچھا نہیں لگتا..... یہ..... شاہ صاحب کا گھر ہے۔ قدم قدم پہ احتیاط ضروری ہے۔

وہ دیکھ رہا تھا کہ روما بار بار اپنے دوپٹے کے آنچل سے بہتے ہوئے آنسو پونچھ رہی تھی۔ اس کے کمرے میں کیونکہ روشنی ہلکی تھی صرف ایک ٹیبل لیمپ کے سیور کی روشنی..... وہ ٹیبل لیمپ جو شاہ صاحب نے کمالِ مہربانی سے رکھوا دیا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ برہان ایک اسٹوڈنٹ ہے، پڑھنے، لکھنے والا نوجوان ہے، یقیناً ٹیبل لیمپ اس کی ضرورت ہے۔ اتنی باریکیوں کا خیال وہ رکھتے ہیں جو بڑی باریکیوں کے ساتھ تنہائی میں اللہ کو سوچتے ہیں..... جوں، جوں اللہ کی طرف خیال مرتکز ہوتا جاتا ہے..... سوچ اسی طرح نفیس اور باریک بلکہ مناسب ترین لفظ تو یہ ہے کہ لطیف ہوتی جاتی ہے..... اور جب خیال لطافت کی انتہا کو چھونے لگتا ہے تو انسان شرف کی منزلوں کی طرف بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ شرفِ انسانیت یہی ہے کہ انسان دوسرے انسان کو اپنی جگہ پہ رکھ کر محسوس کرے۔

شاہ صاحب نے صرف ٹیبل لیمپ ہی نہیں رکھوایا تھا بلکہ مختلف کلر کے بال پوائنٹ، پوائنٹرز، مارکر، لیٹر پیڈ یہ ساری چیزیں بھی انہوں نے اس کی اسٹڈی ٹیبل پہ رکھوا دی تھیں۔ اور وہ بھی اس کے اس گھر میں آنے کے اگلے ہی دن..... اس نے آگے بڑھ کر ٹیبل لیمپ بھی آف کر دیا..... اب وہ اندھیرے میں کھڑا ہوا روما کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسی لمحے دروازے پہ ہلکی سی دستک ہوئی۔ وہ اپنے خیال سے چونک پڑا۔

''امی.....'' اس کی سوچ میں یکدم صابرہ کا تصور ابھرا..... آگے بڑھ کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ سامنے شبینہ کھڑی تھی۔

''او ہ تم..... ابھی تک سوئی نہیں شبینہ..... خیریت ہے۔ اس گھر میں تو تمہیں بہت آرام ہے..... پھر نیند کیوں نہیں آئی؟'' برہان کیونکہ روما کے تصور کی گہرائیوں میں اترا ہوا تھا اس لیے واپس آنے میں تھوڑا سا وقت تو لگنا تھا۔

''بس بھائی ویسے ہی نیند نہیں آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر پہلے میں نے دیکھا، دروازے کے نیچے سے روشنی باہر آ رہی تھی۔ میں نے سوچا آپ پڑھ رہے ہیں، اس لیے ڈسٹرب نہیں کیا لیکن جیسے ہی لائٹ بند ہوئی تو میں نے دروازہ بجا دیا۔''

''او ہ..... تو تم باہر بیٹھ کر میرے کمرے میں جلنے بجھنے والی روشنیوں کا نظارہ کر رہی تھیں۔'' برہان نے صرف اور صرف اس کے ذہن کو ہلکا پھلکا کرنے کی غرض سے قدرے شگفتگی کا مظاہرہ کیا..... جو حادثے کے بعد سے لے کر اب تک پہلا بے ساختہ عمل تھا..... ورنہ اس کے ہونٹ تو جیسے مسکرانا ہی بھول گئے تھے۔ جن رشتوں کو لہو میں اتارتے ہیں ان کی خاطر بہت کچھ انجانے میں بھی کر جاتے ہیں۔

''ہاں بس وہ! ایسے ہی کوشش کر رہا تھا کہ تھوڑی سی پڑھائی کر لوں مگر کتاب کھولتا ہوں تو کچھ سمجھ ہی نہیں آتا..... میرا خیال ہے کہ ابھی تھوڑا وقت لگے گا..... ابھی تک میرا ذہن اسٹڈی کی طرف نہیں جاتا۔''

''بھائی اپنا خیال کریں، آپ کا آخری سال ہے بلکہ چند مہینے ہیں، اتنے سالوں کی محنت ہے۔''

''ہاں...... یہ سب کچھ تو ٹھیک ہے شبینہ...... لیکن اتنے بڑے حادثے کے بعد انسان فوراً نہیں سنبھلتا، وقت لگے گا، آگے میری قسمت ہے...... کیونکہ انسان اپنے ذہن پر ایک حد تک ہی کنٹرول کر سکتا ہے اور بعض اوقات بالکل بھی نہیں۔ بڑی بے بسی کی کیفیت ہوتی ہے...... جاؤ تم جا کر سو جاؤ...... میں بھی سونے کی کوشش کرتا ہوں۔ ارادہ تو کیا ہے کل یونیورسٹی چلا جاؤں۔''

''ہاں بھائی......! دکھ تو ہمیشہ کے لیے ہے، یہ دکھ ہماری جان تو نہیں چھوڑیں گے ناں...... لیکن پھر بھی جب تک ہم زندہ ہیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہوگا......'' بولتے، بولتے شبینہ کی آواز رُندھ گئی۔

برہان نے بے اختیار اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا...... بے شمار انسان پلک جھپکتے میں بوڑھے ہو جاتے ہیں حالانکہ ان کے خدوخال پر بڑھاپے کا کوئی نشان دکھائی نہیں دیتا...... لیکن روح بوڑھی ہو جاتی ہے۔ دل بوڑھے ہو جاتے ہیں...... بڑھاپا آخر ہے کیا...... تجربے کی انتہا اور حالات سے جنگ کر کے تھکے ہوئے شکستہ اعصاب...... بڑھاپے کی دونوں بڑی علامتیں ان دونوں بہن بھائی کے پاس آ کر بڑی گرمجوشی سے بغل گیر ہو چکی تھیں۔ یوں جیسے برسوں کے بچھڑے ہوئے دوست والہانہ ملتے ہیں......

☆☆☆

ماحول میں جھینگروں کی آواز کا ارتعاش تھا۔ چار سُو پھیلا ہوا سناٹا ان جھینگروں کی وقفے، وقفے سے ابھرنے والی آوازوں سے لمحاتی طور پر ٹوٹتا تھا...... اور اس کے فوراً بعد یہاں سے لے کر وہاں تک رات اپنی چادر میں ہر ذی نفس کو لپیٹے تھپکیاں دے رہی تھی۔

دل کے اندر کا ماحول بیرونی ماحول سے کچھ مختلف نہیں تھا۔ البتہ باہر بے کراں تاریکی تھی۔ شاید اس میں کچھ عمل لوڈشیڈنگ کا بھی ہوگا...... لیکن جیل کے برآمدے میں ایک بہت کم پاور کا بلب روشنی پھیلانے کی ذمے داری ادا کر رہا تھا...... لاک اپ میں تمام قیدی فطری نیند کی آغوش میں پہنچ چکے تھے۔ وہ فطری نیند جو سولی پر بھی آ جاتی ہے۔ پہرے دار بھی موقع غنیمت جان کر ادھر اُدھر چھپ کر نیند کے مزے لوٹنے میں مصروف تھے۔ اپنی دانست میں تو انہوں نے کسی اوٹ کا سہارا لے کر خود کو چھپا لیا تھا لیکن ان کے حلقوں سے نکلنے والے خراٹے ان کی نشاندہی کے لیے کافی تھے۔

جابر علی دیوار سے ٹیک لگائے گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔ اسے اب نیند نہیں آتی تھی۔ یونہی بس تھوڑی دیر کے لیے آنکھ لگتی تھی اور خود بخود بغیر کسی آہٹ کے نیند ٹوٹ جاتی تھی۔ کچھ دیر پہلے وہ لیٹا ہوا...... سونے کی کوشش کر رہا تھا لیکن جب کسی طور نیند نے آنکھوں کا رخ نہ کیا تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے ساتھی قیدی اس سے خاصے فاصلے پر گہری نیند سوئے ہوئے تھے اور وہ مختلف قسم کے خیالات میں جکڑا ہوا تھا۔

''پھانسی کا پھندا تو سامنے جھول رہا ہے تو پھر میں کسی کے دباؤ کو کیوں قبول کروں...... آج مرا کل دوسرا دن...... پھر یہ سب اپنی من مانی کریں گے...... میری ایک آواز جو حق کے لیے شور مچا رہی ہے، وہ خاموش ہو جائے گی...... پھر شاید کوئی حق کی بات کرنے والا نظر نہیں آئے...... یہ لوگ کیا سوچ کر مجھ پر دباؤ ڈال رہے ہیں، بلیک میل کر رہے ہیں...... ان کا باپ بھی وہ فائل مجھ سے نہیں نکلوا سکتا۔ ایک دن یہ منہ کے بل گریں گے اور خاک ہو جائیں گے...... مگر ہمیشہ یاد رکھیں گے کہ کوئی جابر علی بھی تھا۔ جس نے ان کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ یہ سر تو بس اللہ کے آگے جھکنے کے لیے بنا تھا۔ کسی انسان کے سامنے نہیں جھکے گا۔''

یہاں تک سوچتے، سوچتے اس نے سر اٹھایا اور گہری سانس لے کر چھت کی طرف تکنے لگا...... ہونٹوں پر

ایک زہر آلود مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

''کتوں کی طرح بُو سونگھتے پھر رہے ہیں، اس فائل کی اور میں یہاں قید خانے میں بیٹھا ہوا خوشیاں منا رہا ہوں، اپنے آپ کو شاباش دے رہا ہوں، کیسی چوٹ دی ہے میں نے ان شیطانوں کو اپنی قبروں میں اترنے تک یاد رکھیں گے کہ کوئی جابر علی بھی تھا۔''

اسی وقت ماحول میں بھاری بوٹوں کی چاپ ابھری تھی۔ آہٹوں سے محسوس ہوتا تھا کہ یہ کسی عام سپاہی کی چال نہیں ہے۔ بلکہ کوئی شان والا افسر آرہا ہے اور پھر اس کی آنکھوں نے دیکھا...... ایس پی شاہ زمان خان...... یونیفارم میں ملبوس ہولسٹر میں ریوالور پھنسائے، ہاتھ میں چھڑی گھماتا ہوا اس کی طرف آرہا تھا۔ جابر علی اسے دیکھ کر انجان سا بن گیا اور دوبارہ گھٹنوں میں سر دے دیا۔ ایس پی قریب آیا اس نے اپنے دونوں ہاتھ سلاخوں پر رکھ دیے۔

''جاگ رہے ہو جابر علی سوئے نہیں......؟ ہاں، بچے یاد آ رہے ہوں گے...... یار ابھی اسی وقت یہ دروازہ کھل سکتا ہے۔ تم دوبارہ کھلی فضاؤں میں پر پھیلا کر اُڑ سکتے ہو...... یہ ضد نہیں ہے، ڈیوٹی نہیں ہے، پاگل پن ہے میری جان......'' ایس پی بہت مدھم آواز میں جابر علی سے مخاطب تھا جو ہنوز گھٹنوں میں سر دیے بیٹھا تھا۔ ایس پی اتنا کچھ کہہ گیا...... مگر جابر علی کے وجود میں ذرا بھی جنبش نہیں ہوئی۔

''میری آواز آرہی ہے ناں جابر علی...؟ یار کیوں ضد کر رہے ہو...... تم نے تو مرنے کی ٹھان لی ہے...... مگر اپنے بچوں کا تو خیال کرو...... خاص طور پر بیٹی کا...... اب تمہارے ہاتھ میں ہے فائل نہیں دو گے تو بیٹی دینا پڑے گی...... میرا مطلب یہ ہے کہ وارث علی اسے لے جائے گا...... پہلے نکاح کیا تھا اب شاید یہ تکلف بھی نہ کرے......'' اب جابر علی کے وجود میں ذرا جنبش ہوئی پھر اس نے آہستہ آہستہ سر اٹھایا اور ایس پی کی طرف دیکھا مگر اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑا نہیں ہوا۔

''وہ جابر علی کی بیٹی ہے ایس پی...... عزت کی خاطر جان دے دے گی مگر وارث علی جیسے شیطان کو اپنے اوپر اختیار نہیں دے گی۔ جاؤ جا کر سو جاؤ، حرام کی دولت سے جی بھر کر مزے اڑاؤ، میرے پاس آ کر اپنا وقت ضائع کرتے ہو اس کے علاوہ کچھ نہیں۔''

''مجھے تو یہ گیم لگ رہا ہے جابر علی، لگتا ہے فائل کے مالک نے تمہیں پچاس کروڑ کی کوٹھی انعام میں دی ہے۔'' ایس پی کی بات سن کر اب جابر علی چونکا تھا۔

''پچاس کروڑ......'' اس نے تو بینک میں بھی کبھی پچاس ہزار نہیں رکھے...... یہ لاکھوں کی بھی نہیں کروڑوں کی بات کر رہا ہے۔ پہلے تو وہ کچھ الجھا پھر بڑی طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ گویا ہوا۔

''ایسا کرو ایس پی، وہ پچاس کروڑ کی کوٹھی تم لے لو۔ لینڈ مافیا، قبضہ گروپ کا سرغنہ تمہارے ساتھ ہے ناں، تمہیں تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہوگا۔''

''تمہارے بیوی، بچے اس کوٹھی میں تو رہ رہے ہیں، یقیناً اب تم پیسے کا تماشا ضرور دکھاؤ گے کیونکہ پیسہ تو تمہارے پاس کہیں سے آرہا ہے۔ میرا خیال ہے وہیں سے آرہا ہے جس کے لیے تم ہم سے ٹکرا رہے ہو۔''

''تم لوگ اُسے موت کے گھاٹ اتار چکے ہو...... ہو سکتا ہے کہ اس کی بھٹکتی ہوئی روح تمہارے پاس آتی ہو۔'' جابر علی وہیں سے بیٹھے، بیٹھے بولا...... فاصلے پر لیٹے ہوئے دونوں قیدی جو سر سے لے کر پاؤں تک چادر اوڑھے ہوئے تھے اپنی، اپنی جگہ پر کسمسائے ان قیدیوں کی موجودگی کی پروا ایس پی کو تھی نہ جابر علی کو......

''تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ اسے ہم نے مروادیا ہے۔'' ایس پی اب قدرے متفکر انداز میں گویا ہوا تھا۔
''ثبوت ہے میرے پاس...... ہر چیز کا ثبوت ہے، میرے پاس جہاں وہ فائل موجود ہے اس کے ساتھ سارے ثبوت موجود ہیں۔ میں تو پھانسی پر چڑھنے جارہا ہوں مگر تم اور تمہارے ساتھی بہت جلد مجھ سے ملنے میرے پاس آجائیں گے۔'' جابر علی کے لہجے میں بڑی مضبوطی اور اعتماد تھا۔ اس کی آنکھوں میں یقین کی بجلیاں کوندرہی تھیں...... یہ سن کر ایس پی۔ چند لمحے کے لیے تو بیچ چکرا کر رہ گیا...... پھر اسے خود ہی کچھ خیال آگیا۔
''مجھے تم نہیں ڈرا سکتے کیونکہ اس مرڈر سے میں سیکڑوں نہیں ہزاروں میل دور تھا۔ بتا رہا ہوں مقتول سے سیکڑوں نہیں ہزاروں میل دور تھا میں اُس وقت، میرے پاسپورٹ پر لگی ہوئی مُہر مجھے بے گناہ بتاتی ہے۔''
''لیکن قتل کروانے والے کے ساتھ جو تمہارا تعلق جڑتا ہے، اس کا ایک بہت بڑا ثبوت اس فائل کے ساتھ موجود ہے...... یہ لینڈ مافیا کے چوہے اس وقت تک شیر ہیں جب تک تمہارا ہاتھ ان کے سر پر ہے۔ جس دن یہ پھنسے، اس دن تم بھی پھنس گئے...... وقت کا انتظار کرو...... اور اب میرے پاس مت آنا......'' جابر علی یہ کہہ کر اب اپنی جگہ سے اٹھا اور اس طرف جا کر فرش پر چت لیٹ گیا جس طرف نسبتاً روشنی بہت کم تھی۔ اس نے ایس پی کو اس وقت گھما کر رکھ دیا تھا۔ چند لمحوں بعد اس نے ایس پی کے بھاری بوٹوں کی چاپ سنی تھی جو واپس جارہا تھا لیکن بوٹوں کی آواز سے صاف محسوس ہورہا تھا کہ آتے وقت چال میں جو دم تھا، جاتے وقت وہ بات نہیں ہے۔

☆☆☆

''شاہ صاحب کہتے ہیں مجھے ابا جان سے ضرور ملنا چاہیے...... یہ میرا فرض ہے مگر...... وہ صرف باپ نہیں ہیں، قاتل بھی تو ہیں......'' برہان جاگ رہا تھا۔
رات گئے جاگنا اب تو اس کی عادت بن گئی تھی...... دن بھر کے واقعات گزرا ہوا وقت، آنے والے دن...... کس طرف سوچ نہیں جاتی تھی۔ اسے صرف اور صرف شینہ کی فکر تھی۔
کلاس فیلوز اسے بہت پُراعتماد اور اسٹرانگ سمجھتے تھے۔ خواہ مخواہ اس سے مرعوب رہتے تھے کہ وہ پولیس افسر کا بیٹا ہے۔ وہ کچھ کہتا تو نہیں تھا بس دل ہی دل میں ہنستا تھا۔ حالانکہ کبھی، کبھی دل چاہتا تھا کہ کہہ دے۔ ''ابا جان بس کاغذات پر ہمارے ابا جان ہیں...... ہمارا تو گھر بھی پولیس ڈپارٹمنٹ ہے۔ یہ دینِ مذہب کی کیسی presentation ہے، اللہ تو ماں سے بھی ستر گنا زیادہ پیار کرتا ہے...... محبت، نرمی، حسنِ سلوک تو مذہب کی بنیاد ہے۔ اسے یاد آیا انٹر میں اس کے اسلامیات کے لیکچرار سر منور فاروقی جب احادیث پڑھا رہے تھے تو وہ کوئی حدیث پڑھاتے ہوئے اس ضمن میں کچھ اور احادیث بھی مضبوط حوالے کے لیے استعمال کیا کرتے تھے۔
''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل وعیال کے ساتھ اچھا برتاؤ کرتا ہے...... اور میں تم میں اپنے اہل وعیال کے ساتھ سب سے اچھا ہوں...... (حدیث)'' اس روز اس کا جی چاہا تھا کہ گھر جا کر ابا جان کو بھی یہ حدیث سنائے...... مگر گھر میں گھستے ہی وہ لعن طعن اور گھن گرج سنائی دی کہ اسے یاد ہی نہیں رہا کہ اس نے کچھ سنانے کا پروگرام بنایا تھا۔ غصہ تو شیطان کا سب سے مؤثر ہتھیار ہے اور سب سے زیادہ اسی ہتھیار کا استعمال ہے۔ جس شخص میں جتنا زیادہ تکبر ہوتا ہے...... اتنا ہی غصہ اس کی ناک پر دھرا رہتا ہے۔ متکبر کو جنت کی خوشبو بھی نہیں پہنچے گی۔
نہ جانے کب، کب کی پڑھی اور سنی ہوئی باتیں ذہن میں گردش کرنے لگیں۔
''میں کیوں جاؤں ان سے ملنے......؟ ستارہ ہر وقت مجھ سے پوچھتی ہے، بھائی میرا کیا قصور تھا......؟ کیا

میں نے اللہ کی بنائی ہوئی حدود پامال کی تھیں؟ کیا میں نے ایسا جرم کیا تھا جس پر شرعی قاضی حد جاری کرتا ہے؟" برہان کے دل پر بچھو کے ڈنک لگنے لگے۔

"جاؤں گا ایک دن...... مگر ابھی نہیں...... ایک خاص وقت کا انتظار کروں گا۔"

☆☆☆

رابی گھر سے اپنی ساری فوٹو ز اٹھا لائی تھی۔ چند شاندار قسم کے کلوز اپ اس نے منتخب کرنے تھے۔

بچپن سے لے کر اب تک یہ فوٹو اپنے اندر اتنی کشش رکھتے تھے کہ وہ ہر طرف سے بے خبر ہو کر کھو سی گئی۔ بار بار دیکھ رہی تھی...... کئی بار اٹھ کر آئینے کے سامنے بھی جا کھڑی ہوئی، کبھی ہاتھ میں پکڑی فوٹو دیکھی، کبھی خود کو......

"مجھے پہلے سے بھی زیادہ خوب صورت نظر آتا ہے، کوئی دیکھے تو بس دیکھتا رہ جائے...... جب پہلی بار اس کے سامنے آؤں گی تو بے بی پنک پلین جارجٹ کی ساڑی باندھ کر آؤں گی...... گلابی رنگ محبت کا رنگ ہے ناں اس لیے...... وہ مجھے ایک بار دیکھے گا اور گلابی ہو کر رہ جائے گا۔" رابی کے اندر یقین محکم چٹان بن کر ابھر رہا تھا...... ایسی زبردست خود اعتمادی جو ہر ڈوبنے والے جہاز کے کپتان میں جہاز ڈوبنے سے پہلے تک بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہے۔ رابی نے اپنی خوب صورت تصویر کو خود ہی چوم لیا۔

☆☆☆

یوں بھی ہوتا ہے کہ کبھی، کبھی انسان اپنے دکھ کو دنیا کا سب سے بڑا دکھ سمجھ کر ساری دنیا سے کٹ کر رہ جاتا ہے...... اور...... اس کی سوچ ہر وقت اپنی ذات کے گرد گھومتی رہتی ہے۔ خود ترسی میں مبتلا ہو جاتا ہے اسے اپنے علاوہ ساری دنیا ہنستی، ناچتی گاتی نظر آتی ہے۔

بلکہ کبھی، کبھی تو ہر شخص خود پر ہنستا دکھائی دیتا ہے...... گل جان نے بھی برسوں سے صرف اپنی ذات کے کنویں میں چکر لگانے کے علاوہ کوئی کام نہ کیا تھا...... لیکن جب رابی نے گل جان کو برہان کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بارے میں بتایا تو چند لمحے گل جان کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اسے جیسے اپنے کانوں پر اعتبار نہیں آیا...... "کوئی باپ اپنی اولاد کو جاگتی ہوش و حواس موت کے گھاٹ بھی اتار سکتا ہے......؟ نہیں...... نہیں......" اس کی رگ و ریشے میں انکار لہو بن کر دوڑنے لگا۔

"ضرور کوئی اور بات ہوگی...... لیکن رابی اصرار کر رہی تھی کہ یہی بات ہے...... کیونکہ شاہ عالم اس کے ساتھ غلط بیانی کیوں کریں گے...... اور کسی کے بارے میں اندازوں پر قائم رائے کا اظہار اس کے سامنے کیوں کریں گے۔"

اس کے سامنے اسمٰعیل خان تھا...... جس کا ماضی داغ، داغ تھا...... مگر اس کے باوجود اپنی طاقت اور استطاعت کے مطابق جتنی قربانی دے سکتا تھا اس نے اس میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی...... آج بھی وہ صرف اس لیے اذیت بھری زندگی گزارنے پر مجبور تھا...... چونکہ وہ اپنی اولاد کو اپنے سامنے رکھنا چاہتا تھا...... ہر پل اپنی بیٹیوں کو دیکھنا چاہتا تھا...... وہ اسمٰعیل خان جو بے حسی کے پہاڑ کو عبور کر کے...... ضمیر کے پُر نور راستوں پر محو سفر تھا۔ گل جان کتنی دیر اپنی جگہ گم صم بیٹھی تھرتھراتی رہی...... ایک خیال آ رہا تھا ایک جا رہا تھا...... وہ اس ہولناک دل ہلا دینے والی حقیقت کو ہضم نہیں کر پا رہی تھی۔ بالآخر اس کے لبوں کو جنبش ہوئی۔

"ہو سکتا ہے...... لڑکی نے ماں، باپ کی پگ اچھالی ہو...... ہو سکتا ہے......؟" لیکن رابی نے گل جان کے اس خیال کی بھی تردید کی تھی...... کیونکہ اسے حقائق شاہ صاحب سے معلوم ہوئے تھے اور وہ شاہ صاحب کی

ایک، ایک بات پر اسی طرح یقین رکھتی تھی...... جیسے کہ اسے اس بات پر یقین تھا کہ وہ پیدا ہوئی ہے۔

رابی تو شوشہ چھوڑ کر امریکا روانہ ہوگئی تھی۔ شاہ صاحب نے اسے..... روانہ کرنے کے لیے پوری صلاحیتیں سارا اثر رسوخ استعمال کیا تھا...... کیونکہ وہ فوراً اسے چشترِ رابی کو اس اذیت ناک احساس سے چھٹکارا دلانا چاہتے تھے جو ان کے خیال میں ہر مرتبہ آئینہ دیکھنے کے بعد رابی کی روح میں نئے سرے سے تازہ ہو جاتا تھا۔

رابی کے جانے کے بعد وہ اپنے تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے ہاتھوں سے حلیم تیار کر کے پڑوسیوں کو ہدیہ کرنے کے بہانے صابرہ سے ملنے آئی تھی...... صابرہ نے گل جان کو اپنی مخصوص پُر اخلاق مسکراہٹ کے ساتھ خوش آمدید کہا...... اس کی نظر میں گل جان کی اہمیت بھی اتنی ہی تھی...... جتنی کہ شاہ صاحب کی اور اس کی وجہ روما تھی جسے برہان پڑھاتا تھا اور روما جو شاہ عالم کے لیے بہت اہمیت رکھتی تھی جسے وہ بہت پیار دیتے تھے اور اسے اپنے ہی خاندان کا حصہ کہتے تھے۔

گل جان خاصی دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی مگر جو کھوج لے کر دل میں آئی تھی...... وہ دل میں ہی رہی...... بس اس کا حوصلہ ہی نہ ہوا کہ صابرہ کے ذاتی معاملات پر گفتگو چھیڑ دے...... وہ انتظار کرتی رہی کہ شاید صابرہ کے منہ سے خود ہی کچھ نکل جائے اور اسے اپنے دل میں چھپے ہوئے سوالات زبان تک لانے کا راستہ مل جائے...... مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ صابرہ بس روما کی تعریف کرتی اور اس کی ماں کے بارے میں اظہارِ افسوس کرتی رہی کیونکہ کا ناز، روما کی ماں کے بارے میں اسے بڑی تفصیل سے بتا چکی تھی...... مگر اس کے دل کو یہ اطمینان تھا کہ راہ و رسم پیدا ہوگئی ہے، مل بیٹھنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ملتا رہے گا اور اسے صابرہ سے کسی نہ کسی وقت کچھ سننے کو مل ہی جائے گا...... وہ تو بس یہ جاننا چاہتی تھی کہ آخر ایسا ہوا کیا تھا کہ باپ نے اپنی اولاد کی جان لے لی...... اس کے نزدیک یہ ایک ناقابلِ یقین سچائی تھی مگر سچائی ضرور تھی...... لیکن اس کی تجربہ کار آنکھوں نے صابرہ کی آنکھوں میں جھانک کر اس کے دل میں چھپے ہوئے لاانتہا دکھ دیکھ لیے تھے...... اور اس بات پر اسے پورا یقین تھا کہ دو چار ملاقاتوں میں صابرہ خود ہی اس سے حالِ دل کہہ دے گی۔

دکھ سے بھرا دل تو چھلکنا چاہتا ہے بس چھلکا کر جب چھلکا...... دکھوں نے اس گھر کے مکینوں کی اگرچہ ساری شادابی چوس لی تھی...... مگر آج اس کے قدموں میں شکستگی اور نقاہت نہیں تھی اسے تو کسی کے بہت بڑے دکھ نے شرمندہ سا کر دیا تھا...... اور وہ سوچ رہی تھی کہ اچھا اس دنیا میں تو اس سے بھی بڑے دکھ موجود ہیں۔

☆☆☆

"ڈاکٹرز اب اوپن ہارٹ سرجری کی باتیں کھل کر کرنے لگے ہیں...... اب آپ ہی کہیں...... خان صاحب ایک تہتر سال کے بوڑھے پر یہ جوا کھیلنا جائز ہے؟" شاہ عالم شگفتہ انداز میں بیرسٹر جمیل خان سے کہہ رہے تھے۔

اس وقت دونوں لان میں بیٹھے ہوئے تھے۔ شام ڈھلنے کا خوب صورت منظر بس کچھ دیر بعد اختتام پذیر تھا۔

"کیسی باتیں کرتے ہیں شاہ صاحب...... امید پر دنیا قائم ہے...... عموماً یہ نوبت تو اسی عمر میں آتی ہے۔ ساری مشینری ہی ریپئرنگ کا تقاضا کر رہی ہوتی ہے۔ میں تو کہتا ہوں آپ بہت باہمت ہیں، سو دوال بند ہیں مگر فکر ہی نہیں......" بیرسٹر جمیل خان نے شاہ عالم کو گویا داد دی۔

"آہستہ بولیں وہ میری طوطی نہ سن لے......" شاہ صاحب نے مسکرا کر ٹوکا۔

"آپ کی جان تو بس یوں سمجھیں اس طوطی ہی میں اٹکی ہوئی ہے۔ پرسوں ہی ایک صاحب سے بات ہوئی بہت اچھا رشتہ بتا رہے ہیں۔ میں اسی سلسلے میں حاضر ہوا تھا۔ مجھے آپ کی فکرات کا بخوبی اندازہ ہے......

بس کوشش میں لگا رہتا ہوں۔"

"جزاک اللہ..... بہت ڈھارس رہتی ہے آپ سے۔" شاہ عالم بے ساختہ گویا ہوئے۔

"دو بھائی بیوہ ماں کے ساتھ رہتے ہیں۔ چھوٹا ابھی زیر تعلیم ہے۔ بڑے کے لیے کہہ رہے تھے۔ حال ہی میں اس نے اپنا چھوٹا سا بزنس اسٹارٹ کیا ہے۔ عمر تقریباً اٹھائیس سال بتاتے ہیں..... MS اور MBA کیے ہوئے ہے۔ سیلف میڈ ہے۔" بیرسٹر جمیل خان لڑکے کی خوبیاں گنوا رہے تھے۔ اس دوران برہان گیٹ سے اندر داخل ہوا۔ اس کی نظران دونوں پر پڑی تو سلام کیے بغیر آگے بڑھنا معیوب لگا..... سوان کی طرف چلا آیا۔

"السلام علیکم....." اس نے فائل اور کتابیں ٹیبل پر رکھ کر مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ بیرسٹر جمیل خان بہت دلچسپی سے برہان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

"آپ کی تعریف....؟ پہلی بار دیکھ رہا ہوں۔"

"تعریف بھی کرتے ہیں اور تعارف بھی کراتے ہیں، یوں سمجھیں ہمارا ہی بچہ ہے۔"

"بیٹھو برہان....." شاہ صاحب نے ساتھ رکھی ہوئی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

"آپ لوگ باتیں کیجیے..... میں ذرا فریش ہو جاؤں..... مغرب کی نماز کا وقت بھی ہونے والا ہے۔" برہان نے اپنی رسٹ واچ پر نظر ڈال کر بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھا..... بیرسٹر جمیل خان اسے سر سے پاؤں تک بغور دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظروں سے برہان کو بڑی الجھن سی ہو رہی تھی۔

"اوہ ہاں..... بالکل..... بھئی ہمیں تو خیال ہی نہیں رہا کہ آپ صبح کے نکلے اب لوٹے ہیں۔ تھک گئے ہوں گے..... جائیں بیٹا آپ اپنا کام کیجیے..... بھئی میں تو ٹھہرا ریٹائرڈ بندہ ہوں..... سب کو اپنی طرح فارغ سمجھ لیتا ہوں....." اپنی بات پر شاہ صاحب خود ہی مسکرانے لگے۔

"بہت سارے کام کرنے کے بعد ہی تو ریٹائرڈ ہوئے ہیں۔ آپ جتنا کام تو شاید ہم کر بھی نہیں سکتے...." برہان نے اپنے مخصوص نرم و مؤدب لہجے میں مسکرا کر کہا پھر ہاتھ پیشانی تک لے جا کر گویا سلامِ رخصت عرض کیا اور ٹیبل سے اپنی کتابیں اور فائل اٹھا کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔

"کتنی حیرت کی بات ہے..... یہ آپ کا اپنا بچہ ہے..... کائناز کا بھائی بھی نہیں ہے..... پھر آپ نے اس پر توجہ خصوصی نہیں فرمائی.....؟" بیرسٹر جمیل خان نے جاتے ہوئے برہان پر ایک بھرپور نظر دوڑاتے ہوئے شاہ صاحب سے کہا۔

"اپنی طرف سے تو کوشش کرتے ہیں..... جہاں تک ضمیر کی آواز سنائی دیتی ہے، کان دھرتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں۔" شاہ صاحب یہ کہہ کر خاموش ہو گئے۔

"آپ شاید میری بات کا مطلب نہیں سمجھے..... آپ کائناز کے لیے فکر مند رہتے ہیں..... گھر میں اتنا اچھا بچہ موجود ہے، حقیقتاً آپ کا قریبی رشتے دار ہے، تب ہی تو آپ اسے اپنا بچہ کہتے ہیں۔"

"اوہ....." شاہ صاحب نے چونک کر ان کی طرف دیکھا..... پھر نظریں جھکا کر جواب کے لیے الفاظ موزوں کرنے لگے۔

"میں تو حیران ہوں آپ نے کبھی اس بچے کا ذکر بھی نہیں کیا..... ایک زمانہ ہو گیا۔ مجھے اس گھر میں آتے ہوئے....." بیرسٹر ڈبل مائنڈڈ نظر آ رہے تھے۔

"آہ..... ہاں....." شاہ صاحب نے ایک آہِ سرد کھینچی۔

''اس بچے کو ہمارا بچہ بنے ہوئے زیادہ وقت نہیں گزرا.....'' شاہ صاحب کے لہجے میں ذومعنویت تھی۔
بیرسٹر جمیل خان ان کی طرف دیکھنے لگے۔

''برہان ایک پُرعزم، باحوصلہ، باکردار نوجوان ہے، عام نوجوانوں کی طرح من موجی، لاابالی نہیں..... مگر اس وقت سخت آزمائش سے گزر رہا ہے۔ قدرت اس کے صبر وضبط کا امتحان لے رہی ہے۔'' شاہ صاحب نے توقف کیا۔
''ہم آپ کو سب کچھ بتائے دیتے ہیں۔ ہم اور آپ کوئی دو تھوڑا ہی ہیں۔'' جمیل خان کی سماعتیں چوکس ہو گئیں، شاہ صاحب کے انداز غیر معمولی تھے۔

☆☆☆

رابی نے ڈاکٹر مہر جان کے دنیا سے بےخبر ہونے کے بعد پہلی فرصت میں ایک بہت قیمتی لیپ ٹاپ خرید لیا تھا..... پاکستان سے جانے سے پہلے وہ جتنی دیر جاگتی تھی اپنے لیپ ٹاپ میں مصروف دکھائی دیتی تھی اور اس نے جانے سے پہلے گل جان کو بتا دیا تھا کہ اس نے اپنے بہت سارے دوست بنا لیے ہیں، اب وہ USA میں تنہا نہیں ہوگی..... وہ اس کی فکر نہ کریں..... اس کے فون مسلسل آ رہے تھے۔ وہ وہاں پہنچ کر بہت خوش تھی۔ کھلی فضا میں کھل کر سانس لے رہی تھی۔ اب وہ ہنستی بھی تھی اور اس کی نقرئی گھنٹیاں بجاتی ہوئی ہنسی سن کر گل جان کے دل کو ایک گونہ سکون ملتا تھا..... مگر وہ تو جیسے گن، گن کر دن کاٹ رہی تھی۔ دیہات کی پروردہ گل جان جوانئر سے آگے نہیں پڑھ سکی تھی..... اور جس ماحول میں اس نے آنکھ کھولی تھی اور بہت وقت گزارا تھا اس کے حساب سے رابی کا اتنی دور چلے جانا ایک بہت بڑا واقعہ تھا..... رابی رات کو اسے بڑا تفصیلی فون کرتی..... علاج کے تمام مرحلوں سے اسے باخبر رکھ رہی تھی۔ گل جان کے ساتھ ساتھ وہ شاہ صاحب کو فون کرنا بھی نہیں بھولتی تھی۔ اس لیے کہ وہ ساری دنیا میں صرف شاہ صاحب کی احسان مند تھی جنہوں نے اسے جینے کا حوصلہ بھی دیا تھا اور زندگی کا سب سے حسین رخ بھی دکھایا تھا اور وہ حسین رخ ہے اچھی امیدوں کے ساتھ صبح، دوپہر، شام کرنا..... مایوسی اور ناکامی کے احساس سے اپنا دامن بچا کر رکھنا..... ہر، ہر مرحلے پر اس کی فوٹو بھی بنتی تھی جو وہ کائنات کو ای میل کر دیا کرتی تھی اور پھر وہ فوٹوز کائنات سب کو دکھاتی تھی۔
سب کچھ بہت اچھا ہو رہا تھا لیکن.....
صابرہ، برہان اور شبینا ابھی تک جیسے دم سادھے زندگی گزار رہے تھے..... جابر علی کو پھانسی کی سزا سنائی جا چکی تھی..... وارث علی فرار ہو کر کہیں پناہ گزین ہو چکا تھا..... شاہ صاحب کے گھر وہ کئی مرتبہ آیا لیکن شاہ صاحب نے گھر میں آنے کی اجازت نہ دی تو وہ فون پر دھمکیوں پر اتر آیا تھا۔ وہ اپنا کھیل کھیلنے میں اتنا مصروف ہو گیا کہ باقی ہر طرف سے اس کی توجہ ہٹ گئی اور اسی دوران اس کے اپنے بندے نے اس کی مخبری کر دی اور وارث علی کو راتوں رات ملک چھوڑنا پڑا۔
لیکن شاہ عالم اور برہان کو اس بات کی ابھی خبر نہیں تھی کہ وارث علی ملک چھوڑ گیا ہے اگرچہ اس بات پر حیرت ضرور تھی کہ آخر اس کی دھمکی آمیز فون کالز کا سلسلہ ایک دم کیوں رک گیا تھا۔

☆☆☆

جابر علی کو پھانسی کی سزا اگرچہ سنائی جا چکی تھی مگر ابھی وہ پھانسی کی سزا سے پہلے کے مراحل سے گزر رہا تھا۔ سزا پر عمل درآمد ہونے میں بھی ابھی کچھ وقت باقی تھا۔ کچھ ملکی، سیاسی حالات کی وجہ سے بھی عدالتی کارروائی مؤخر ہوتی رہی تھی۔
زندگی اب ڈھلان پر بہتے پانی کی طرح رواں ہوتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی کہ شاہ صاحب اپنے

دیرینہ عارضۂ قلب کی وجہ سے اسپتال میں ایڈمٹ ہو گئے اور کائناز تو گویا اپنا آپ بھول بیٹھی..... اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ آٹھ پہر ایک ٹانگ سے دادا کے سرہانے کھڑی رہے۔

اس وقت بھی وہ گھر سے بنا کر لایا ہوا سوپ انہیں پلا کر فارغ ہوئی تھی۔ بیرسٹر جمیل خان بھی زیادہ سے زیادہ وقت شاہ صاحب کے ساتھ گزار رہے تھے۔ وہ بھی وی آئی پی روم میں موجود تھے۔

شاہ صاحب کافی دیر سے گہری سوچ میں تھے..... اور ان کی خاموشی کے باعث کائناز اور بیرسٹر جمیل خان بھی عالم سکوت میں تھے..... شاہ صاحب کی خاموشی معمول کی خاموشی نہیں تھی، یہ خاموشی بہت خاص تھی گہرا تفکر مظہر تھا کہ وہ ذہنی طور پر کمرے میں موجود نہیں ہیں۔ بالآخر ان کی خاموشی ٹوٹی۔

"خان صاحب آپ ٹھیک کہتے ہیں..... برہان بہت اچھا بچہ ہے..... نیک ماں کا بیٹا ہے..... دکھی ہے، مظلوم ہے..... لیکن بہت ذمے دار ہے۔ میری وارثت بھی سنبھال سکتا ہے اور کائناز کو بھی..... اللہ کا احسان ہے کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بھی ہے۔" کائناز آنکھیں پھاڑے شاہ صاحب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی قوتِ گویائی سلب ہو چکی تھی۔ اس کی حالت کے پیشِ نظر بیرسٹر جمیل خان نے اس کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ رکھا اور بولے۔

"بیٹا..... اپنے دادا جان کی بات بہت توجہ سے سنو....."

"بیٹا تمہارا دادا بوڑھا ہو گیا ہے..... اب تمہاری ذمے داری تمہارے لائف پارٹنر کو سنبھالنی چاہیے..... اس دل پر بالکل بھروسا نہیں رہا مجھے....." شاہ صاحب رک کر اپنی سانسیں ہموار کرنے لگے۔

کائناز تو گویا سانس روک کر ان کی بات سن رہی تھی۔

"خان صاحب آپ اسے سمجھائیں بھی اور سنبھالیں بھی..... میں نے اپنی لاڈلی کے لیے ہیرا چنا ہے..... اس سے زیادہ اچھی طرح میری امانت کو کوئی نہیں سنبھال سکتا۔ بخیل مذموم ہے..... لالچی محروم ہے..... موت معلوم ہے۔" شاہ صاحب کسی خیال کے تحت زیرِ لب مسکرائے۔

"میں نے کسی رئیس داماد کی تمنا نہیں کی..... مالک کا دیا بے حساب ہے۔ مجھے ایک باکردار، باضمیر، باادب داماد چاہیے..... اور میری بیٹی جانتی ہے اس کا دادا ہمیشہ سے اس کے لیے بہترین کا انتخاب کرتا ہے۔"

کائناز کم عمر ضرور تھی، بچی نہیں تھی، خواب دیکھنے والی عمر زنجیر کر چکی تھی مگر ابھی خواب کی دنیا میں قدم نہیں پڑے تھے۔

سترہ سال کی کائناز..... لمحے میں ستر برس کی ہو گئی..... دادا اسپتال میں داخل تھا..... موت کی باتیں کر رہا تھا..... جدائی کے احساس کی شدت اتنی تھی کہ دل بیٹھنے لگا۔

اس نے آگے بڑھ کر دادا جان کے سینے پر سر رکھ دیا..... سینے میں آنسو گھٹ رہے تھے..... مگر مارے خوف کے آنسو بہانے سے گریز کر رہی تھی کہ اس کے پیارے دادا جان کو اس کے آنسو پریشان نہ کریں۔

"دادا جان ایسی باتیں نہ کریں....." وہ بہ مشکل حلق میں پڑتے پھندوں کے درمیان بولی تھی۔

"بیٹا..... اب ایسی ہی باتیں کرنے کا وقت ہے۔ ہو سکتا ہے میں ابھی بیس سال مزید زندہ رہوں..... ہو سکتا ہے بیس پل بھی نہ ملیں..... یہی زندگی ہے بیٹا۔" وہ اسے تسلی دینے کے سے انداز میں بولے۔

"میں نے کبھی مال جمع کرنے کے لیے اپنے آپ کو ہلکان نہیں کیا..... میں تو ایک سیدھا سادہ بیوروکریٹ تھا..... یہ سب کچھ تو میرے بیٹوں نے بنایا تھا..... میں تو ان کی امانت کی دیکھ بھال کرتا رہا..... اور کر رہا ہوں۔" وہ آہستہ آہستہ بول رہے تھے۔

"الحمدللہ اب ایک صحیح امانت دار مل گیا۔" آخری جملہ کہہ کر شاہ صاحب نے آنکھیں بند کرلیں۔
گھر میں یہ بات ہوتی تو کائناز جانے کیا کچھ کہہ جاتی.....مگر اسپتال کے کپڑوں میں ملبوس شاہ صاحب اسے بہت محتاط کررہے تھے اسپتال کے نام سے ہی اندیشوں کے لاتناہی سلسلے شروع ہوجاتے ہیں۔ وہ تو اس وقت حواس باختہ تھی.....اوسان خطا تھے.....اسپتال، ڈاکٹر، سرجری، موت کی باتیں.....اور فیصلے.....وہ بالکل گم صم تھی۔

☆☆☆

"امی یہ میرے لیے اتنا آسان نہیں ہے.....جتنی آسانی سے آپ نے کہہ دیا....." برہان کا سکتہ کافی دیر بعد ٹوٹا تھا۔ رات کے ڈھائی بجے کا عمل تھا۔ صابرہ اس کے کمرے میں آگئی تھی۔ وہ جاگ رہا تھا اور کب سے التوا میں پڑا ہوا ایک اسائنمنٹ مکمل کرنے کی کوشش کررہا تھا۔
صابرہ نے آکر پہلے اِدھر اُدھر کی عام سی باتیں کیں پھر بڑی ہمت کرکے شاہ صاحب کی خواہش اُس تک پہنچادی.....شاہ صاحب نے خاص طور پر صابرہ کو اسپتال بلوایا تھا۔ وہ خود بھی جانا چاہ رہی تھی لیکن یہ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ وہاں کس کے ساتھ جائے کیونکہ برہان یونیورسٹی گیا ہوا تھا۔ کائناز تو مستقل دادا کے پاس ہی تھی۔ شاہ صاحب نے گاڑی بھیج کر صابرہ کو اپنے پاس بلوایا تھا۔ وہ یہی سمجھی کہ اسپتال میں داخل ہونے کی وجہ سے شاہ صاحب پریشان ہیں۔ ظاہر ہے پوتی کے بارے میں سوچتے رہتے ہوں گے۔
لیکن ان کے پاس پہنچ کر اس کے سارے اندازے غلط ہوگئے۔ شاہ صاحب نے خیر خیریت معلوم کرنے کے بعد جو کچھ اس سے کہا اسے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ اتنے بڑے رئیس کی بیٹی اس کی بہو بنے.....کتنی دیر تک اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا.....لیکن شاہ صاحب نے جس انداز میں اس سے بات کی وہ ان کے سامنے اپنی طرف سے کوئی بات نہ کرسکی۔ گھبراہٹ اور احساسِ کمتری کی وجہ سے اس کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا تھا۔
"آپ.....آپ اس قابل ہیں کہ ہم آپ کی خاطر اپنی جان بھی دیں تو کم ہے.....آپ کا یہ احسان کیا کم ہے کہ میری بچی کو آپ کے گھر میں عزت سے سر چھپانے کی جگہ مل گئی ہے.....میرا اور برہان کا تو کچھ نہیں تھا.....ہم ماں، بیٹا تو کتنی ہی ٹھوکریں کھالیتے لیکن اصل مسئلہ تو شبینہ کا تھا.....آپ نے میرے کلیجے میں ایسا سکون اتارا ہے کہ آپ بات بھی کریں تو میرے لیے حکم کا درجہ رکھتی ہے۔" لیکن برہان یہ ساری تفصیلات سن کر بری طرح الجھ گیا تھا۔ اس نے تو پہلے مرحلے میں ہی صاف انکار کردیا تھا۔
"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا امی.....! آپ شاہ صاحب کو اطمینان دلادیجیے کہ ہم کائناز کا ہر طرح سے خیال رکھیں گے اور شاہ صاحب کے اسٹیٹس کا ہی کوئی رشتہ تلاش کرکے اس کی شادی کردیں گے۔"
"میں یہ بات نہیں کہہ سکتی برہان.....میں انہیں ایسے خواب نہیں دکھا سکتی جن کا پورا کرنا میرے اپنے اختیار کی بات نہیں ہے۔"
"لیکن امی آپ اکیلی نہیں ہیں، میں آپ کے ساتھ ہوں.....آپ خود ہی سوچیں میں.....میں اتنے بڑے احسان کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا....." برہان اسی طرح الجھی، الجھی کیفیت میں کہہ رہا تھا۔
"اللہ نے ہم پر رحم کردیا ہے برہان، اس لیے وہ کہتا ہے.....کبھی میری رحمت سے مایوس نہیں ہو۔" صابرہ نے یہ کہہ کر برہان کو اپنے سینے سے لگالیا.....گویا صابرہ نے تجربے کا قفل اس کے ہونٹوں پر ڈال کر دلائل کا راستہ بند کردیا ہو.....دونوں ماں، بیٹے کے درمیان خاموشی ہلکے سُروں کے ساتھ رقصاں تھی۔

جاری ہے



دس نمبر کا سوال

ناہید سلطانہ اختر

وارڈ میں داخل ہوتے ہی میری نظر دروازے کے عین مقابل اس بیڈ پر پڑی جو صبح دس ساڑھے دس بجے کے لگ بھگ بھائی کا فریضہ تیمارداری بھابی کو سونپ کر میرے گھر جاتے وقت تک خالی تھا مگر سہ پہر کو میری واپسی پر وہاں ایک مریضہ شنیل کے چاکلیٹی شلوار قمیض میں ملبوس اکڑوں بیٹھی اپنے دونوں بازو گھٹنوں کے گرد باندھے خائف نظروں سے چہار اور دیکھ رہی تھی۔ اس کا سر ننگا تھا۔ شانے اوڑھنی سے بے نیاز، اپنی

جسامت سے وہ بہ مشکل اٹھارہ، انیس برس کی دکھائی دیتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر وندا سے کا گہرا رنگ چڑھا ہوا تھا اور دونوں ابروؤں کے بیچ گہرے کاہی رنگ کا ایک ستارہ نما ٹیٹو گدا ہوا تھا۔ وہ انتہائی چوکنی بیٹھی تھی۔ جیسے ابھی کوئی خبر ملے گی اور وہ بستر سے چھلانگ لگا کر ایمرجنسی دوڑ لے گی۔ میں نے اسے ایک نظر دیکھا اور اس نے اپنے تمام تر چوکنے پن کے ساتھ مجھے.....

''امراضِ قلب کے وارڈ میں وہ بھلا کیا کر رہی تھی۔'' میں چپ چاپ یہ سوچتی بھائی کے بیڈ کی طرف بڑھ گئی۔ جس کے تین اطراف پردے تنے ہوئے تھے اور سرہانے دیوار تھی۔

دو دن قبل میں اپنی زندگی کے وحشت ناک ترین تجربے سے گزری تھی۔ اس روز بھائی حسب معمول گھر سے نکلے تھے اور دس منٹ سے بھی کم وقت میں بھائی کا موبائل فون نمبر میرے موبائل فون کی اسکرین پر تھا۔

''ہیلو......!'' میں نے بہت اطمینان سے کال ریسیو کی۔

''ہاں...... میری طبیعت کچھ خراب ہوئی ہے، ڈاکٹر کے پاس ہوں۔'' بھائی کی آواز مجھے بہت دور سے آتی اور ڈوبتی، ڈوبتی سی محسوس ہو رہی تھی اور میرا وجود سر تا پا لرز رہا تھا۔ گھر پر میرے اور بھائی کے سوا کوئی تیسرا فرد نہیں تھا۔ میں نے اپنا بیگ اٹھایا اور ہم دونوں اندھا دھند گھر سے نکلیں۔

''ہارٹ اٹیک......!'' مقامی کلینک کے ڈاکٹر کی تشخیص تھی اور اس نے بھائی کو فوراً قریب ترین اسپتال پہنچانے کی ہدایت کی۔

عام حالات میں، میں اپنے پیاروں کے بارے میں بہت کمزور اور رقیق رہتی ہوں مگر ہنگامی حالات میں خدا عجیب قوت دے دیتا ہے۔ بھاگم، بھاگ اسپتال پہنچے اور ایمرجنسی میں موجود ڈیوٹی ڈاکٹرز نے بھائی پر حملۂ قلب کی توثیق کے ساتھ ہی شعبۂ امراضِ قلب سے کسی سینئر معالج کے لیے کال دی۔ سینئر معالج کو بلانے کے لیے جانے والا اسپتال کا باوردی اہلکار رجسٹر ہاتھ میں لیے روانہ ہوا اور میں اس کے ساتھ، ساتھ دوڑتی چلی گئی۔ سربراہ شعبۂ امراضِ قلب اپنے ایک دوسرے ساتھی کے ہمراہ وارڈ کے راؤنڈ پر تھے۔ میں ہاتھ جوڑتی، گڑگڑاتی ان کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

''پلیز......! پلیز ڈاکٹر صاحب...... جلدی کریں۔ وہ میرا بھائی، میرا بیٹا سب کچھ ہے...... پلیز......! قارگاڈ سیک۔''

''چلتے ہیں بی بی...... چلتے ہیں......'' لہجے میں دھیمی سی ناگواری تھی۔

''پلیز...... اسے کچھ ہو گیا تو......'' جملہ ادھورا رہا، میں دونوں ہاتھ جوڑے اپنے ہونٹوں سے لگائے گڑگڑا رہی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو تھے۔

''اوکے...... اوکے......''

سربراہ شعبہ اور ساتھی ڈاکٹر راؤنڈ ادھورا چھوڑ کر میرے ساتھ چل پڑے۔ مردانہ قدموں کا ساتھ دینا مجھے مشکل تھا مگر میں تقریباً دوڑ، دوڑ کر ان کے ساتھ چل رہی تھی۔ ساتھی ڈاکٹر نے مجھے تسلی دینے کی کوشش کی۔

''ایزی...... ایزی...... اللہ پر بھروسا رکھیں۔ بھائی کو کچھ نہیں ہوتا...... سب ٹھیک ہوگا۔''

''انشاء اللہ......'' میرے دل نے کہا۔

بھائی کو ایمرجنسی سے شعبۂ نگہداشتِ قلب میں منتقل کر دیا گیا۔ اگلے چند گھنٹے ایک ناقابلِ بیان آزمائش کی صورت گزرے...... سربراہِ شعبہ کے ساتھی ڈاکٹر حقیقی معنوں میں مسیحا ثابت ہوئے۔ بھائی کے خاطر خواہ علاج کے ساتھ اہلِ خانہ کو ان کی تسلیاں اور دلاسے حوصلے کا باعث بنے رہے۔

خطرہ ٹل گیا...... پُر آشوب گھڑیاں گزر گئیں۔ مگر دل بے ایمان ہو چکے تھے۔ بھائی کی عیادت کو آنے والوں کا تانتا اور تیمارداری کے لیے ایک

کے بعد دوسرے کی بڑھ چڑھ کر خدمات..... پہلی رات ایک تیماردار بھائی کے سرہانے اور تین وارڈ کے باہر موجود رہے۔

دوسرا دن تھا۔ طبیعت کافی سنبھل چکی تھی۔ میں گھر ہو کر اسپتال واپس پہنچی تو وارڈ میں داخل ہوتے ہی میری نظر اس دوشیزہ پر پڑی جو بیڈ پر اکڑوں اور چوکنی بیٹھی غزال آنکھوں سے چہار اور تک رہی تھی۔ اسے اچٹتی نظر سے دیکھ کر میں بھائی کے سرہانے جا کر بیٹھی تو مجھے برسوں پہلے والدہ مرحومہ کی علالت کے دوران اسپتال میں لائی جانے والی وہ نوجوان لڑکی یاد آگئی جسے سینے میں شدید درد کی شکایت کے ساتھ اس کے گھر والے انتہائی پریشانی میں اسپتال لے کر آئے تھے۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ اپنی پسند کے لڑکے سے شادی کرنا چاہتی تھی اور گھر والوں نے اس کا رشتہ کہیں اور کر دیا تھا۔ لڑکی نے خود پر حملۂ قلب طاری کرنے کی کوشش کی تھی مگر ڈاکٹرز نے اس کی اس کوشش کو ناکام کر دیا اور خواب آور انجکشن لگا کر اسے اسپتال سے رخصت کیا۔ میرے ذہن نے امراض قلب کے وارڈ میں بیٹھی اس چوکنی دوشیزہ کے ڈانڈے برسوں پرانے اس واقعے سے ملانے کی کوشش کی۔

شام گہری ہوگئی۔ بتیاں جل اٹھیں، نائٹ شفٹ کا اسٹاف ڈیوٹی پر آچکا تھا۔ مریضوں کو کھانا دے دیا گیا۔ سینئر ڈاکٹر نے وارڈ کا راؤنڈ لیا، مریضوں کو دیکھا۔ جونیئر ڈیوٹی ڈاکٹرز کو مریضوں کی بابت ضروری ہدایات دیں۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد مریضوں کے بیڈز کے اردگرد پردے تن گئے اور تیمارداروں نے بیڈز کے ساتھ بڑی چھوٹی، چوبی بینچوں پر اپنے بستر جمانا شروع کر دیے۔ وارڈ نیم تیرگی میں ڈوب گیا اور سناٹا چھا گیا۔ گزشتہ دو راتوں کی طرح میں نے وارڈ کے ایک گوشے میں عشا کی نماز ادا کی اور بھائی کے بیڈ کے نزدیک چوبی بینچ پر آبیٹھی۔ گزشتہ دو راتوں کی طرح نیند کے دور، دور تک کوئی آثار نہ تھے۔ بھائی کو واش روم جانے کی حاجت ہوئی، میں نے سہارا دینا چاہا مگر انہوں نے حسب عادت مردانگی کا مظاہرہ کیا۔ میں نے وارڈ بوائے سے آہستہ سے درخواست کی کہ بھائی واش روم سے نکلیں تو وہ انہیں سہارا دے دے۔

کوئی دس بجے لگ بھگ ڈیوٹی نرس نے بھائی کے بیڈ کے اردگرد تنے پردوں سے اندر جھانکا اور انہیں سوتا دیکھ کر مجھ سے آہستگی سے بولی۔

”کیا آج بھی رات بھر جاگیں گی؟“

”نیت تو ہے۔“ میں نے دبی دبی آواز میں کہا۔

”سوتی کیوں نہیں..... اب تو آپ کے مریض کی حالت اطمینان بخش ہے۔“ وہ مسکرا دی۔

”امتحان چھوٹا ہو یا بڑا..... ہمیشہ میری نیند اڑا دیتا ہے اور یہ تو بہت ہی کٹھن امتحان ہے میرے لیے۔“

”مریضوں کو تو ہم ٹرینکولائزرز دے کر سلاتے ہیں مگر اکثر تیماردار تو ٹرینکولائزرز کے بغیر ہی مریضوں سے زیادہ گہری نیند سوتے ہیں۔“

”خدا کی دین ہے۔“

نرس مسکرا دی اور پلٹ گئی۔

ساڑھے گیارہ بجے کے لگ بھگ وارڈ کے سناٹے میں کسی مریض کے کراہنے کی دھیمی، دھیمی درد آمیز صدا شروع ہوئی، کچھ آوازیں سی سنائی دیں۔ شاید کراہنے والے مریض کو نرس یا ڈیوٹی ڈاکٹر نے آکر دیکھا ہو پھر یہ آواز تھم گئیں۔ مگر کراہنے کی آواز مسلسل آنے لگی بلکہ وقت گزرنے کے ساتھ، ساتھ اس کے درد و آہنگ میں شدت آتی چلی گئی پھر کراہنے کے ساتھ مسلسل ایک لفظ کی تکرار بھی سنائی دینے لگی۔

”گولی..... گولی..... گولی......“ آواز نسوانی تھی۔

میں بہت دیر سنتی رہی پھر اٹھنے پر مجبور ہوگئی۔ آواز کے تعاقب میں اسی بیڈ تک جا پہنچی جہاں شام کو میں نے وارڈ میں آنے والی اس نوجوان مریضہ کو اکڑوں بیٹھے انتہائی سراسیمہ نگاہوں سے چہار اور

تکتے دیکھا تھا۔ وہ اس وقت بھی بیٹھی تھی اور وحشت بھری نظروں سے چہار اور دیکھتے ہوئے مسلسل کراہ رہی تھی اور ایک ہی لفظ کی گردان کررہی تھی۔
''گولی...... گولی......گولی......'' اس نے اپنا پیٹ دونوں ہاتھوں سے پکڑ رکھا تھا چہرے پر شدید تکلیف کے آثار تھے۔ اب سوچتی ہوں تو خیال آتا ہے کہ جب کسی آزمائش میں ناکامی ہمارا مقدر ٹھہرے تو عقل پر کیونکر پردے پڑ جایا کرتے ہیں۔ خدا شاہد ہے اس کی زبان سے گولی کی گردان نے مجھے ایک لمحے کو بھی یہ سمجھنے سے قاصر رکھا کہ وہ تکلیف رفع کرنے والی گولی طلب کررہی تھی۔ اس کے بیڈ کے نزدیک اسی کی طرح گوری چٹی ہم شکل مگر بڑی عمر کی عورت کھڑی بے تابی سے کبھی اس کا کندھا دبانے لگتی، کبھی دھیرے، دھیرے اس کے زانو پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے دلاسا دینے لگتی۔ اس کے چہرے سے پریشانی کے ساتھ ناقابلِ بیان کرب ہویدا تھا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آرہا ہو کہ وہ اپنی بیمار کے لیے کیا کرے کہ اسے چین آجائے۔ مریضہ کے سرہانے لگا مانیٹر ابنارمل اعداد دکھا رہا تھا۔
''یہ آپ کی کون ہے......؟'' میں نے دوسرے مریضوں کی نیند میں خلل نہ ڈالنے کی خاطر بہت دھیمی آواز میں تیماردار خاتون سے پوچھا۔
''یہ امارا بچی ہے۔'' جواب ملا۔
''کیا تکلیف ہے؟'' میرا یہ سوال احمقانہ تھا۔ امراضِ قلب کے وارڈ میں وہ قلب کی مریضہ ہی ہوسکتی تھی۔
''دل کا تکلیف ہے۔'' جواب آیا۔
''کب سے ہے تکلیف......؟''
''آٹھ سال سے۔''
''پہلے علاج کرایا؟''
''ہاں......ہو لی فیملی۔''
''پھر......؟''
''ان لوگ نے اِدھر بھیجا ہے۔''
''آئے کہاں سے ہو آپ لوگ؟''
''حسن ابدال۔''
مریضہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ''گولی...... گولی......'' کی گردان کرتی رہی۔ میں نے مریضہ کے پائنتی دھری فائل پر درج اندراجات دیکھے۔ خولہ زوجہ زرگل عمر ستائیس سال...... فائل کھولنے سے قبل میں نے ایک نظر اسے دیکھا۔ کسی صورت وہ اٹھارہ، انیس سال سے زائد نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے چہرے پر نوعمر بچیوں کی سی معصومیت تھی۔
''گولی...... گولی......'' اس کی آنکھوں میں وحشت تھی۔
''آپ نرس کو جا کر بتائیں آپ کی پیشنٹ کی طبیعت خراب ہے۔'' میں نے تیماردار خاتون سے کہا۔
''بولا تھا......گولی دیا تھا۔'' میں نے مانیٹر کی طرف دیکھا۔ بلڈ پریشر، دل کی دھڑکن سب ابنارمل تھا۔
نرسز اسٹیشن کی طرف دیکھا۔ وارڈ کے عین وسط میں شیشے کا کرا نیم تیرگی میں تھا، میں اس کمرے کی طرف بڑھی بند دروازے پر ٹھٹک کر اندر کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ سینئر ڈیوٹی نرس ایک کرسی پر بیٹھی دوسری پر اپنی ٹانگیں پھیلائے شانوں سے پیروں تک سفید چادر اوڑھے سو رہی تھی۔ جونیئر نرس قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھی محوِ استراحت تھی۔ میں نے شیشے کے بند دروازے پر دستک دی۔ جونیئر نرس کلبلائی۔ دروازے کی سمت دیکھا، اٹھی اور دروازہ کھول کر باہر جھانکتے ہوئے مخمور آواز میں بولی۔ ''کیا بات ہے؟''
''وہ......سسٹر...... بیڈ نمبر بارہ کی پیشنٹ کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔'' میں نے کہا۔
''اسے دوا دے دی تھی۔'' نرس نے کہا۔
''مگر وہ بہت تکلیف میں دکھائی دیتی ہے۔''
''میں کیا کرسکتی ہوں...... ہارٹ پیشنٹ کو ہم ڈاکٹر کی مرضی کے بغیر کوئی دوا نہیں دے سکتے۔''

نرس کی بات معقول تھی۔ دل کو لگی۔

"آپ دیکھ تو لیں......"

نرس بادلِ ناخواستہ شیشے کے کمرے سے نکلی۔ بیڈ نمبر بارہ تک گئی۔ مریضہ سے کہا۔ "بی بی لیٹ جاؤ...... سونے کی کوشش کرو۔" مریضہ کچھ اس طرح منہ پھاڑ پھاڑ کر جیسے اسے سانس لینے میں دقت ہو رہی ہو۔ کہتی رہی۔ "گولی...... گولی......"

"سو جاؤ......" نرس نے پھر کہا۔ "دوسرے مریض تمہاری آواز سے ڈسٹرب ہو رہے ہیں۔"

مریضہ کی آنکھوں میں ان کہی وحشت تھی۔

نرس دوبارہ اسی شیشے کے کمرے میں جا کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ میں نے سوچا سینئر نرس کو جگاؤں مگر یہ خیال مانع رہا کہ کہیں وہ نیند میں خلل پڑنے پر خفا نہ ہو۔ ایک نظر مریضہ کو دیکھتی میں اپنی جگہ پر واپس جانے کو پلٹی۔

"گولی...... گولی......" درد میں ڈوبی صدا نے میرا تعاقب کیا۔ میں اپنی جگہ پر واپس آ بیٹھی۔

مریضہ کے کراہنے اور گاہے بگاہے "گولی...... گولی......" کی صدا کافی دیر اسی طرح جاری رہی...... پھر یہ صدا بتدریج دھیمی پڑنے لگی۔ "گولی...... گولی......" کی گردان رک گئی۔ کراہنے کی آواز کم ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ رک گئی۔ میں نے اسے مریضہ کو آرام آ جانے پر محمول کیا...... اور کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ گھڑی میں وقت دیکھا۔ پونے چار کا عمل تھا۔ فجر کی اذان ہونے میں کوئی سوا گھنٹا باقی تھا۔ اسپتال کی راتیں کتنی طویل ہوتی ہیں اور دل دکھانے والی بھی...... میں تہجد کے نوافل ادا کرنے کی غرض سے وضو کرنے واش روم میں چلی گئی۔ وضو کر کے نکلی تو میں نے ڈیوٹی پر موجود سینئر نرس کو تیزی سے اس طرف جاتے دیکھا۔ جہاں تین وارڈ بوائز کو میں تین راتوں سے ہر رات پہلو بہ پہلو سوتے دیکھتی تھی۔ نرس نے ایک وارڈ بوائے پر تنی چادر کا کونا جھٹک کر جھنجوڑا۔ نرس نے کچھ کہا۔ وہ اور اس کے ساتھ سوئے باقی دونوں نوجوان بھی یک لخت اٹھ بیٹھے۔

نرس وارڈ کے انتہائی مغربی کونے میں واقع اس کمرے کی طرف لپکی جہاں سے میں نے گزشتہ دو دنوں میں جونیئر ڈاکٹرز کو آتے جاتے اور کھانے کے اوقات میں اسپتال کے اہلکاروں کو کھانا اندر لے جاتے دیکھا تھا۔ نرس کمرے میں گئی اور ذرا سی دیر میں دو نوجوان ڈاکٹر خوابیدہ آنکھوں کے ساتھ کمرے سے نکل آئے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں اسٹیتھو اسکوپ بھی تھا۔ سب کے سب آگے پیچھے بیڈ نمبر بارہ کی طرف لپکے۔ میں تہجد کے لیے وضو کیے دم بخود مریضہ کے سرہانے لگے مانیٹر کو دیکھ رہی تھی۔ وہاں زندگی کے کوئی آثار نہیں تھے۔ بیڈ کے عین اوپر چھت سے لگی مرکزی لائٹ روشن ہو چکی تھی۔

شیشے کی دیوار کے اس پار بیڈ نمبر بارہ کے گرد اس وقت وارڈ کا تمام عملہ موجود تھا۔ دونوں ڈاکٹرز اس پر جھکے ہوئے تھے۔ اتنے انہماک سے جیسے اس وقت اس بیڈ پر موجود مریضہ ان کے لیے کائنات کی اہم ترین چیز تھی۔ کچھ دیر بعد دونوں سیدھے کھڑے ہو گئے اور انہوں نے سینئر نرس سے کچھ کہا۔ سینئر نرس نکلی اور اس کے ساتھ، ساتھ اس کی جونیئر بھی...... ایک الماری کھول کر انہوں نے اس میں سے دو سفید چادریں نکالیں اور تیزی سے بیڈ نمبر بارہ کی طرف بڑھیں۔

تکلیف کی شدت سے اکڑا ہوا جسم سیدھا کرنے کی کوششیں ہونے لگیں۔ رات بھر اذیت میں گزارنے والی مریضہ اب پرسکون ہو چکی تھی۔ مردہ جسم کو ایک سفید چادر میں لپیٹ دیا گیا۔ مریضہ کی تیمار دار صدمے کی کیفیت میں یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔

"کوئی اور تمہارے ساتھ ہے؟" میں نے سینئر نرس کو تیمار دار عورت سے پوچھتے سنا۔

عورت جس کی آنکھوں میں اب وہی وحشت اتری ہوئی تھی جو میں نے مریضہ کی آنکھوں میں

دیکھی تھی اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"بلاؤ......" تیمار دار عورت وحشت اور صدمے کی کیفیت میں باہر گئی۔

نرس بند زندگی کی حد پار کر جانے والی مردہ عورت کو ڈھاٹا باندھنے لگی۔ مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا لگ رہا تھا۔

تیماردار عورت ایک نوجوان مرد کے ساتھ لوٹ آئی۔ مرد نے ایک بچہ گود میں اٹھا رکھا تھا جس کا سر اس کے شانے پر تھا۔ بچہ نیند میں تھا۔ مرد نے بیڈ کے نزدیک پہنچ کر پھٹی، پھٹی آنکھوں سے بیڈ پر پڑی مردہ عورت کو دیکھا...... اور اپنی ایک آنکھ ہاتھ کے انگوٹھے سے دوسری ایک انگلی سے دبالی۔ پھر چشم زدن میں اس نے آنکھوں پر سے ہاتھ ہٹایا اور بولا۔

"ایمبولینس مل جائے گی۔" اس کی آواز مجھے دنیا کے دوسرے کنارے سے آتی لگی۔

ڈاکٹر نے اثبات میں سر ہلایا اور ایک وارڈ بوائے سے کچھ کہا جو میں سن نہ سکی۔ غالباً اس نے وارڈ بوائے کو اس شخص کے ہمراہ جانے اور ایمبولینس کا بندوبست کرنے کی ہدایت کی تھی۔ مذکورہ شخص نے بچہ اپنی گود سے تیماردار عورت کے سپرد کر دیا۔

"یہ آپ کی کون تھی؟" دونوں میرے نزدیک سے گزرے تو میں نے اس شخص سے پوچھا۔

"بیوی!" اس نے بیڈ پر پڑے مردہ جسم کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ پھر اس نے میرے پوچھے بنا خود ہی تیماردار عورت کے شانے سے لگے بچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ "وہ میرا بیٹا ہے۔"

"کتنے بچے ہیں تمہارے؟"

"ایک......!" اس شخص کی آنکھوں میں بے تحاشا سرخی امنڈ آئی۔ پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا وارڈ بوائے کے ہمراہ وارڈ سے باہر نکل گیا۔

وارڈ میں سناٹا تھا۔ اکا دکا مریضوں کے سوا سب سو رہے تھے اور اسی طرح مریضوں کے تیماردار بھی...... اور جو جاگ رہے تھے وہ دم بخود یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ مرنے والی کو ڈھاٹا باندھ کر اسے سرتاپا چادر سے ڈھانپ دینے کے بعد دونوں نرسیں اور ڈیوٹی ڈاکٹرز شیشے کے کمرے میں جا بیٹھے۔ سینئر نرس کے چہرے پر اپنے فرض سے غفلت اور خجالت کا احساس تھا۔ جونیئر نرس اسے کن انکھیوں سے دیکھ رہی تھی۔ ڈیوٹی ڈاکٹرز میں سے ایک جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو کی تفسیر بنا ہوا تھا جبکہ دوسرا اپنی بائیں کہنی کرسی کے ہتھے پر ٹیک کر اپنی ہتھیلی کے ہالے میں ٹھوڑی دبا کر سر جھکائے یوں بیٹھ گیا تھا جیسے گہرے دکھ میں ہو...... مرنے والی کا بچہ حال و مستقبل کی ہر فکر سے بے نیاز اپنی نانی کے سینے سے لگا اس کے کندھے پر مزے سے سو رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہوئے میرا دل کٹنے لگا۔ اسے خبر ہی نہیں تھی کہ وہ کس قدر المناک سانحے کا شکار ہو چکا تھا۔ موت کا بے رحم ہاتھ اس کے سر سے وہ مہربان ہاتھ کھینچ لے گیا تھا جس نے اسے زمانے کے گرم و سرد سے اور لوگوں کی دست برد سے محفوظ و مامون رکھنا تھا۔

"اس معصوم کو کون بتائے گا کہ اس کی ماں نے اپنی زندگی کی آخری رات کتنی تکلیف اور اذیت میں گزاری تھی۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔

"گولی...... گولی......" کی کرب آمیز صدا میری سماعت میں ابھر رہی تھی ڈوب رہی تھی۔

رات بھر لمبی تان کر سونے والے وارڈ بوائز سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ان کے چہروں پر فرض سے غفلت کا احساس اور شرمساری تھی۔

مسجدوں سے اذانِ فجر کی صدائیں بلند ہونے لگی تھیں۔ میں بھائی کے بیڈ کی جانب پلٹی۔ مصلیٰ اٹھایا اور وارڈ کے اس مخصوص گوشے میں قیام و سجود کے لیے جا کھڑی ہوئی جہاں میں گزشتہ دو دن نماز ادا کرتی رہی تھی۔

نماز کے دوران مجھے وارڈ میں لوگوں کی آمد و رفت اور کچھ ہلچل کا احساس ہوتا رہا تھا۔ نماز کی

ادائیگی کے بعد رب کریم کے حضور دست دعا اٹھانے سے قبل میری نظر بیڈ نمبر بارہ کی طرف اٹھی۔ بیڈ خالی تھا...... مجھے گزشتہ شام اسی بیڈ پر اس کے اکڑوں بیٹھ کر ہراساں نظروں سے چہار اور تکنے کا منظر یاد آ گیا.....تو موت اس کے تعاقب میں تھی۔

دفعتاً اک احساس جرم نے مجھے آ دبوچا۔

دو دن قبل بھائی کو اٹیک ہونے پر میں کس بری طرح بولائی، بولائی پھری تھی۔ ایمرجنسی میں موجود ڈیوٹی ڈاکٹر کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ جوڑ کر میں نے گڑگڑاتے ہوئے کہا تھا۔

"پلیز......! پلیز ڈاکٹر...... پہلے میرے پیشنٹ کو دیکھ لیں۔" مجھے روتے گڑگڑاتے دیکھ کر ڈیوٹی ڈاکٹر فوراً ہی اپنی سیٹ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ شعبۂ امراض قلب سے سینئر ڈاکٹر کو کال دینے پر میں کس وحشت کے عالم میں کال رجسٹر...... لے کر جانے والے اہلکار کے ساتھ اس سے بھی ایک قدم آگے دوڑتی چلی گئی تھی۔ سربراہ شعبہ اور ان کے ساتھی ڈاکٹر میرے گڑگڑانے اور رونے پر میرے ساتھ، ساتھ ایمرجنسی میں چلے آئے تھے۔ بھائی کو آناً فاناً وارڈ میں شفٹ کیا گیا تھا۔ خون کو پتلا کرنے والا انجکشن لگایا گیا تھا۔ جس کا متبادل ہم نے دس منٹ کے اندر، اندر کیمسٹ سے خرید کر اسپتال کو فراہم بھی کر دیا تھا۔ سب کچھ کس قدر عجلت اور میکانیکی انداز میں ہوا تھا۔ اور اسی وارڈ میں ایک معصوم بچے کی نوجوان ماں رات بھر "گولی...... گولی......" کی دہائی دیتی مر گئی تھی۔

مجھے یوں لگا جیسے وارڈ کا عملہ ہی نہیں میں بھی اپنے فرض سے غفلت کا شکار ہوئی تھی۔ مانیٹر کی ریڈنگز ابنارمل دیکھ کر مجھے سینئر نرس کو جھنجھوڑ کر جگانا چاہیے تھا۔ ڈیوٹی ڈاکٹرز ہی کو خواب غفلت سے نہیں جگانا چاہیے تھا بلکہ مریضہ کی بگڑی حالت کے پیش نظر سینئر ڈاکٹر کو بلانے کے لیے زمین آسمان ایک کر دینا چاہیے تھا اور اگر اسے زندگی بچانے والی کسی دوا کی ضرورت تھی اور اسپتال ایسی دوا کی فراہمی سے قاصر تھا مجھے بھاگ کر باہر سے دوا خرید لانی چاہیے تھی۔ مرنے والی کی جگہ میرا اپنا کوئی پیارا ہوتا تو کیا میں یہ سب کچھ نہ کرتی۔ کیا رات بھر اسے اس اذیت میں مبتلا رہنے دیتی۔

میرا سارا وجود لرز رہا تھا۔ جائے نماز پر بیٹھی میں اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپائے رو رہی تھی۔ عرقِ ندامت رس رہا تھا۔

"دس نمبر کا سوال...... دس نمبر کا سوال......"

میرا ضمیر مجھے کچوکے دے رہا تھا۔ دس نمبر کا سوال تھا جو گزری رات نے میرے سامنے رکھا تھا۔ میں نے خالی پرچہ ممتحن کو لوٹا دیا تھا۔ صفر میرا مقدر بن گیا تھا۔ میں فیل ہو گئی تھی۔

بھیگی آنکھوں سے میں نے شیشے کے کمرے کی طرف دیکھا...... نرسیں...... ڈاکٹرز سب مجرموں کی طرح سر جھکائے بیٹھے تھے اور وارڈ کے ایک گوشے میں تینوں وارڈ بوائز دوبارہ اپنی، اپنی جگہوں پر لیٹ چکے تھے۔ شاید اس لیے کہ ابھی باہر تیرگی تھی...... ان کی نیند شاید پوری نہیں تھی۔

انہیں تو شاید ہر روز دس نمبر کا سوال ملتا ہوگا...... مجھے تو زندگی میں پہلی بار دس نمبر کا سوال ملا تھا۔ مجھے ان پر رشک اور اپنی بے بضاعتی پر افسوس محسوس ہونے لگا۔ مرنے والی کی تو ہر حال آنی تھی مگر اس کی واپسی کے سفر میں قدرے آسانی فراہم کر کے اپنی، اپنی جگہ ہم سب ناکامی کے اس ملال سے تو بچ سکتے تھے جو اس وقت ان سب کے چہروں ہی کو دھواں، دھواں نہیں کیے ہوئے تھا بلکہ میرے اپنے دل کو بھی نارسائی اور ناکامی کے احساس سے دوچار کیے دے رہا تھا۔

دس نمبر کا سوال تھا اور مجھ سمیت تمام امیدوار ہی اس امتحان میں فیل ہو گئے تھے۔



ناولٹ

ترکِ وفا

نایاب جیلانی



ساتواں حصہ

"پیاری ملا! لگتا ہے، رات کو سہیلیوں کے ساتھ لمبی ملاقات ہوئی ہے۔" وہ جو مسلسل ان آوازوں کے بارے میں سوچتے ہوئے سخت اذیت میں مبتلا تھی، عیسیٰ کی شوخ آواز سن کر بالکل ڈھے گئی تھی۔ کیا وہ کبھی آفاق کا گھناؤنا چہرہ عیسیٰ کو دکھا پائے گی؟ کیا عیسیٰ کو یہ انکشاف ہلا کر نہ رکھ دے گا؟ وہ کس قدر اذیت محسوس کرے گا، اسے کتنا دکھ ہوگا؟ مگر ملا اسے آفاق کا کریہہ روپ ہر صورت دکھانا چاہتی تھی، چاہے کچھ بھی



ہو جاتا، چاہے عیسٰی یقین کرتا یا نہ کرتا...... مگر وہ آفاق اور سوزن کے ہاتھوں خود کو مزید بے وقوف نہیں بننے دے سکتی تھی۔ اسے آفاق کے دھوکے نے اتنی ٹھیس نہیں پہنچائی تھی جس قدر سوزن کی غلیظ سوچ نے دکھ اور اذیت میں مبتلا کیا تھا۔ بظاہر کیسی ہمدرد، پُر خلوص اور نیک نیت نظر آتی تھی مگر در پردہ سوزن کیا تھی؟ مالا کچھ تو جان چکی تھی اور کچھ جاننے کے قریب تھی۔ ایک بات تو طے تھی، مالا اب سوزن اور آفاق کے جھانسے میں آنے والی نہیں تھی۔

"ویسے یار! یہ خوب صورت روحیں اور پریاں مالا کو نظر آتی ہیں، ہمیں کیوں نہیں ----" آفاق کی شوخ کھنکناتی آواز مالا کو پُر اذیت سوچوں کے بھنور سے کھینچ لائی تھی، وہ گم صم سی آفاق کو دیکھنے لگی تھی۔ کیا کوئی اتنا ڈرامے باز ہو سکتا ہے؟

"سوچنے کی بات ہے، پریاں ہمیں نظر کیوں نہیں آتیں؟ ہماری غیر موجودگی ہی میں کیوں آتی ہیں۔" عیسٰی بھولپن کا مظاہرہ کرتا آفاق سے پوچھ رہا تھا۔ اس بات سے بے نیاز کہ سامنے بیٹھا لڑکا کتنا مکار اور ہوشیار ہے اور کس طرح آستین میں بیٹھ کر ڈسنے کے ارادے باندھے ہوئے ہے، مالا کو ایک مرتبہ پھر سوزن اور آفاق کی باتیں زہر آلود کرنے لگی تھیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہیں پل دو پل میں آفاق کے چہرے پر سے نقاب کھینچ دے۔ وہ کسی غیر مرئی نکتے پر نظر جما کر ان الفاظ کو ترتیب دے رہی تھی جو اسے کچھ دیر بعد عیسٰی کے گوش گزار کرنے تھے۔ مالا کو اتنی سوچ بچار میں گم دیکھ کر عیسٰی نے کھنکھار کر شرارتاً کہا۔

"مالا ڈیئر! پھر تو نہیں کوئی سہیلی دکھائی دے رہی؟" عیسٰی پلیٹ میں چمچ بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا۔ "کیا پھر کوئی پری نظر آئی؟ حسین و جمیل اور نازک اندام سی؟" وہ اسے چھیڑ رہا تھا۔ تنگ کر رہا تھا جبکہ مالا بہت اذیت میں تھی۔ وہ اسے اپنی تکلیف فوراً بتا دیتی اگر آفاق سامنے نہ بیٹھا ہوتا...... وہ محض آفاق کے منظر سے ہٹنے کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ جوں ہی اٹھ کر وہاں سے جاتا، مالا عیسٰی کو اس کی حقیقت فوراً کھول کر بتا دیتی۔ چاہے نتائج کچھ بھی نکلتے...... اسے پکا یقین تھا، اس گھر پر کسی آسیب کا سایہ نہیں ---- یہ آفاق اور سوزن کی کوئی ملی بھگت تھی۔ یقیناً سوزن، عیسٰی سے کوئی پرانا بدلہ لے رہی تھی...... اور مالا کو خوفزدہ کر کے اسے ٹیز کر رہی تھی مگر آفاق کیوں اس گھناؤنے کھیل میں شامل تھا؟؟ اپنے محسن اور دوست کے ساتھ کھلا دھوکا کر رہا تھا۔

"مالا! کیا ہو گیا ہے تمہیں یار؟" اسے پھر کسی سوچ میں گم دیکھ کر اب کے عیسٰی کچھ متفکر ہو گیا تھا۔ مالا گویا ایک وہم پر بضد ہو گئی تھی۔

"تم اس معاملے میں اتنی سیریس کیوں ہو رہی ہو؟ ایسا کچھ بھی نہیں، وہم ہے بس تمہارا۔" اس نے جب عیسٰی مالا کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا تب مالا کچھ سانجھے میں چونکی تھی۔

"میرا وہم نہیں، حقیقت ہے یہ سب......" وہ آفاق کو چبھتی نظر سے دیکھ رہی تھی، عیسٰی سمجھے بغیر نرمی سے بولا تھا۔

"ایک ہی بات کو بار بار سوچو گی تو یہ حقیقت ہی لگے گا۔ آنکھیں، آوازیں، دیکھو، مالا! ایک وہم کو سر پر سوار کرنے سے یوں ہی محسوس ہوتا ہے گویا سب کچھ حقیقت میں ہو رہا ہے، کبھی تم نے خیال کیا، اکیلے بیٹھنے سے ہمارے کان خاموشی کے سناٹوں کو محسوس کرتے ہیں، جیسے رنگ برنگ کی آوازیں آنے لگتی ہیں، اسی طرح آنکھوں کو سختی سے بند کر لینے کے بعد اندھیرے میں آہستہ آہستہ عکس ابھرتے ہیں، ہماری تصوراتی دنیا کے کئی طرح نئے اور کسی قسم کے منظر ابھرتے ہیں۔ یہ ہمارا خیال ہوتا ہے۔ حقیقت سے قطعاً دور......" عیسٰی بہت نرمی سے اسے سمجھا رہا تھا۔ وہ بہت سنجیدہ ہو گیا تھا۔ گویا پہلے والی مذاق کی کیفیت

ختم ہو چکی تھی۔ اسی طرح آفاق بھی تائیدی انداز میں سر ہلاتا گویا عیسیٰ سے متفق تھا اور مالا کو وہ سراسر ڈراما کرتا دکھائی دے رہا تھا۔

"ویسے عیسیٰ! مالا کچھ زیادہ وہمی ہو رہی ہے، یہ سب ٹھیک نہیں، اسی طرح تو انسانی نفسیات بھی متاثر ہوتی ہے۔" وہ چالاک بڑی ہمدردی کے ساتھ عیسیٰ سے مخاطب تھا جبکہ عیسیٰ سنجیدگی کے ساتھ اثبات میں سر ہلا رہا تھا..... اور مالا کا دل چاہ رہا تھا کہ آفاق کا کریہہ منہ نوچ لے۔ اس نے ایسا منافق زندگی میں پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

"یہی تو اسے سمجھا رہا ہوں، جو یہ فیل کر رہی ہے، ایسا کبھی نہیں ہوا، کیا آفاق! تم نے کبھی محسوس کیا ہے؟" عیسیٰ نے آفاق کی طرف دیکھ کر پوچھا تھا، اس نے بے ساختہ نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں تو...... مجھے کبھی پریاں نظر نہیں آئیں..... حالانکہ مجھے پریاں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔" آفاق نے بے چارہ سا منہ بنا لیا تھا جیسے اس کی سب سے بڑی زندگی کی خواہش ابھی تک ادھوری تھی۔ مالا کو اس کی مکاری پر اور بھی غصہ آ گیا تھا مگر فی الحال وہ کچھ بھی بولنے سے قاصر تھی۔

"کاش پریاں مالا کے بجائے مجھے نظر آتیں....." آفاق نے پھر مصنوعی حسرت کا مظاہرہ کیا تھا۔ تب عیسیٰ نے اس کے کندھے پر دھپ لگائی۔

"مت اتنی آہیں بھرو..... یہ نہ ہو کہ آج رات تمہاری باری ہو۔" عیسیٰ نے اسے دھمکایا اور وہ دھمک بھی گیا۔

"نہیں یار! مت ڈراؤ..... میرا دل پہلے ہی کمزور ہے، پریوں کی تاب نہیں لا سکے گا۔" وہ مسمنا کر بول رہا تھا۔

"اتنی مت تھی بس۔" عیسیٰ نے اس کا مذاق اڑایا۔

"تم بھی زیادہ بہادر نہ بنو، کیا پتا آج تمہارے امتحان کی باری ہو۔" آفاق نے اسے چڑایا۔

"مجھے پریاں کچھ نہیں کہتیں..... بڑا پیار آتا ہے انہیں مجھ پر۔" عیسیٰ اترایا۔

"ہونہہ، دھیان سے یار.....! کہیں پیار، پیار کے کھیل میں تمہیں لے نہ اڑیں....." آفاق نے منہ بنا کر کہا تھا..... ادھر مالا دہل گئی۔

"اللہ نہ کرے....." اس نے چیختے ہوئے لہجے میں غصے سے کہا۔ اس کا ردعمل خاصا جارحانہ تھا۔ تبھی عیسیٰ اور آفاق دونوں چونک گئے تھے۔ آفاق تھوڑا خفت زدہ رہ گیا تھا جبکہ عیسیٰ کو بات سنبھالنی مشکل ہو گئی تھی۔

"آفاق مذاق کر رہا ہے مالا!" عیسیٰ نے نرمی سے کہا۔

"مذاق بھی سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے۔" وہ روکھے لہجے میں بولتی اٹھ گئی تھی جبکہ وہ دونوں کچھ ہونق رہ گئے تھے۔

"کیا اس کے مزاج اور دماغ پر بھی تو اثر نہیں ہو گیا.....؟" عیسیٰ انتہائی متفکر سا مالا کو کچن کی طرف جاتا دیکھ کر سوچ رہا تھا۔ جبکہ آفاق کچھ خفت زدہ سا عیسیٰ کا کندھا تھپتھپا کر اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

"کیا بات ہے مالا.....؟" عیسیٰ جو اپنے کمرے میں آ کر کسی کام میں مصروف تھا اب مالا کے کمرے میں داخل ہوتے ہی نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ وہ اس کی ذہنی ابتری سمجھ سکتا تھا۔ ان دنوں وہ نہ جانے کن وہموں میں پڑ گئی تھی۔

"مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔" بہت دیر کی کوشش کے بعد مالا نے بالآخر بولنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ اسے آفاق کے کرتوت کھول کر بتانے کا ارادہ کر چکی تھی۔

"کیا.....؟" عیسیٰ بھی کچھ پریشان ہو گیا تھا۔ مالا کے تاثرات ہی کچھ ایسے تھے اور جو کچھ مالا نے بتایا اسے سن کر تو عیسیٰ کا پورا وجود ہل گیا تھا۔ اس نے بے یقینی کے ساتھ مالا کی طرف دیکھا تھا آیا وہ

حواسوں میں ہے یا پھر سچ مچ میں خبطی ہو چکی ہے۔

"یہ تم کیا کہہ رہی ہو......؟" عیسٰی کا پورا وجود جھنجھنا اٹھا۔

"میں سچ کہہ رہی ہوں۔ اس کھڑکی کے باہر کوئی سایہ تھا جسے میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا پھر میں نے آفاق اور سوزن کی آواز سنی تھی۔ میں نیند میں نہیں تھی، نہ کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی تھی، میں نے خود ان دونوں کی باتیں سنی تھیں۔" مالا نے ہونٹ کچلتے ہوئے ایک، ایک بات بتا دی تھی مگر سامنے تو بے یقینی کا عالم ہی کوئی اور تھا۔ عیسٰی پہلے تو ششدر رہ گیا پھر اس کے چہرے پر ناقابل فہم تاثرات ابھرے تھے۔ وہ آنکھیں پھاڑے مالا کو دیکھے جا رہا تھا۔ اتنی حیرت اور بے یقینی کے ساتھ گویا اسے پورا یقین تھا کہ مالا جھوٹ بول رہی ہے یا پھر غلط بیانی سے کام لے رہی ہے۔

"یہ کیا بکواس ہے مالا؟" عیسٰی کی آنکھوں میں ناگواری کا تاثر تھا۔ اسے ایک دم مالا کی بات سن کر غصہ آ گیا۔

"پلیز آپ میری بات کا یقین کریں......" مالا ایک دم گھبرا اٹھی تھی۔ اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ عیسٰی اتنی شدت کے ساتھ بے یقینی کا اظہار کرے گا۔ وہ حیرت زدہ ہو جاتا تو اور بات تھی مگر وہ تو ایک دم غصے میں آ گیا تھا جیسے اسے مالا کی غلط بیانی پر غصہ آیا تھا اور مالا کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے تھے۔ عیسٰی کی ناگواری بھلا وہ برداشت کر سکتی تھی؟

"کس بات کا یقین کروں؟ تمہیں نہ جانے کیا ہو گیا ہے؟ اتنی بہکی بہکی باتیں کرنے لگی ہو، بس لگتا ہوں.... کسی سائیکاٹرسٹ سے ٹائم......" عیسٰی نے جیسے پریشانی اور تفکر کے عالم میں سر تھام لیا تھا جبکہ مالا حق دق سی بیٹھی رہ گئی۔

"تو آپ کو لگتا ہے، میں جھوٹ بول رہی ہوں؟" مالا کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ عیسٰی سے یہ دردناک منظر بھی دیکھا نہیں گیا تھا مگر اس نے دل پر پتھر رکھ کر کٹھور لہجے میں کہا۔

"پھر "سچ" بہانے سے بول رہی ہو......؟" وہ رکھائی سے بولا۔

"میں جھوٹی ہوں......؟" اسے انتہا کا صدمہ ہوا۔

"مجھے نہیں پتا......" عیسٰی نے سختی سے کہتے ہوئے اپنا سر تھام لیا تھا۔ "جب تم ایک ایسی بات کرو گی جس کا سر ہو گا نہ پیر...... اور جس بات پر میں قیامت تک یقین نہیں کر سکتا اسے سچ کیسے کہوں...... مجھے انتہائی تکلیف سے کہنا پڑ رہا ہے تم نے پھر سے کوئی خواب دیکھا ہے۔" وہ اتنا متفکر اور پریشان ہو گیا تھا کہ اسے سامنے چھم چھم آنسو بہاتی مالا کی موجودگی بھی لمحے بھر کے لیے بھول گئی تھی۔

"میں نے اپنی آنکھوں سے سایہ دیکھا اور ان دونوں کی باتیں خود سنی تھیں۔" وہ بھرائے لہجے میں بولتی بہت اذیت میں تھی۔ عیسٰی اتنی بے دردی سے اس کی بات رد کر دے گا، یہ تو اس کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ وہ اتنی تکلیف محسوس کر رہی تھی جس کی انتہا کوئی نہیں تھی۔

"میں کیسے یقین کروں...... تم...... تم پاگل تو نہیں ہو گئیں؟" عیسٰی تیز لہجے میں غصے سے بولا۔

"سوزن اور آفاق ہی تھے، میں ان کی آواز لاکھوں میں بھی پہچان سکتی ہوں۔" مالا اب کمزور ہو کر عیسٰی کو خود سے بدگمان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اب اسے ہر صورت عیسٰی کو یقین دلانا تھا، چاہے کچھ بھی ہو جاتا۔ عیسٰی اسے جھوٹا سمجھنے لگتا یہ تو وہ کبھی گوارا نہیں کر سکتی تھی۔

"سوزن اور آفاق کیسے ہو سکتے تھے؟" عیسٰی گویا زچ ہو اٹھا۔ "سوزن سنڈیکیٹ کے ہمراہ شہر سے باہر ہے اور آفاق......" عیسٰی بولتے ہوئے ایک دم لب بھینچ کر غصہ ضبط کرنے لگا تھا پھر کچھ دیر کی

خاموشی کے بعد بولا۔

''اور آفاق میرے ساتھ تھا۔ ہم دونوں اسپین (سٹی) میں تھے۔ ایک پل کے لیے وہ میری نظر سے دور نہیں ہوا اور نہ وہ چھلاوا ہے جو رات کے چند گھنٹے مجھے چکما دے کر دوبارہ میرے ہی گھر میں آ کر سوزن سے ملاقات کرے...... پھر اسے سوزن سے ملاقات کی ضرورت ہی کیا ہے؟ سوزی کسی غیر مسلم سے ہی شادی کرے گی، کسی مسلمان سے کبھی نہیں...... پھر وہ ایسی لڑکی نہیں جو بوائے فرینڈز کے ساتھ وقت گزاری کرے...... اور سب سے بڑی بات ان دونوں کو ''ملاقات'' کرنا ہوتی تو کم از کم میرا گھر استعمال نہیں کرتے...... پھر بتاؤ، جب آفاق سارا وقت میرے ساتھ رہا...... ہم پوری رات ٹرین میں سفر کرتے رہے ہیں، نہ اسے نیند آتی ہے سفر میں نہ مجھے...... تو پھر آفاق کوئی جنات کی قوم سے ہے جو لمحوں میں اڑتا ہوا ہر جگہ پہنچ جائے۔'' عیسیٰ کا تلخ لہجہ اور کھری، کھری باتوں نے مالا کی پوری آنکھیں کھول دی تھیں۔ اس پہلو پہ مالا نے سوچا ہی کہاں تھا......؟ بلکہ ان دونوں کی آوازیں سن کر وہ ایسی حواس باختہ ہوئی تھی کہ فقط ایک ہی پہلو پر سوچ رہی تھی۔

''عیسیٰ! آپ مجھے غلط سمجھ رہے ہیں۔'' وہ بھل بھل رونے لگی تھی۔ عیسیٰ سر اٹھا کر جیسے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگا تھا پھر کرنٹ کھا کر سیدھا ہوا۔ دوسرے ہی پل وہ کارپٹ پہ جھکا مالا کو چپ کروا رہا تھا۔

''کیا پاگل پن ہے مالا......! میں نے یہ سب کہا تم سے......؟'' وہ اس کے آنسو پونچھتا خود بھی جیسے الجھ رہا تھا۔ گویا یقین اور بے یقینی کے درمیان معلق تھا۔ مالا کے چہرے کو دیکھتا تو وہاں سچائی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور اگر دوسری طرف غور کرتا تو دماغ چکرانے لگتا تھا۔ آفاق اور سوزن دو الگ دنیاؤں کے لوگ تھے۔ ان کے درمیان کبھی ملاقاتوں کا ریلیشن نہیں رہا تھا پھر عیسیٰ کے گھر میں ملاقات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا جبکہ مالا جو بات کر رہی تھی اسے عیسیٰ بھلا کیسے مان لیتا......؟

☆☆☆

اس کی اتنی ابتر کنڈیشن دیکھ کر علی عیسیٰ نے ماہر نفسیات سے رجوع کرنا شروع کیا۔ وہ ہر ڈاکٹر سے یہی کہتا...... ''میری بیوی وہم اور خوف کا شکار ہے۔'' اس کے لیے مالا کی صحت ہر دنیاوی کام سے اہم ہوتی چلی گئی تھی۔ وہ دفتر میں کم اور ڈاکٹرز کے کلینک میں زیادہ خوار ہونے لگا تھا۔ کبھی پاپا کو اسپتال لے کر بھاگتا، کبھی مالا کو...... اس کی زندگی کا مقصد گویا یہی رہ گیا تھا۔ مالا عیسیٰ کی حالت دیکھ، دیکھ کر کڑھتی تھی پھر خود ہی اس نے ایک پہاڑ جتنا فیصلہ کرلیا تھا۔ یہی کہ وہ عیسیٰ کو اپنے خوف کے متعلق کچھ نہیں بتائے گی۔ اس فیصلے نے مالا کو مطمئن کر دیا تھا اور اب وہ اندر ہی اندر چٹختی رہتی مگر عیسیٰ کو کچھ نہ بتاتی۔ اس کی بہتر حالت کو دیکھ کر آفاق سمیت چاچو اور عیسیٰ نے بھی سکھ کی سانس لی تھی۔ پھر کچھ دن بہت اچھے گزرے...... عیسیٰ نے مالا کو دوبارہ شو لے جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب وہ پھر سے شو لے چلی جاتی۔ کلاسز اٹینڈ کرتی...... اس کا کورس بھی مکمل ہونے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ پھر ایک دن اس نے میکس کو پکڑ لیا...... وہ اور ہیرا کینٹے سے لوٹ کر آئیں تو میکس پر ان دونوں کی نظر پڑ گئی تھی پھر مالا نے میکس کے وہ لتے لیے کہ وہ تو بے چارہ حق دق رہ گیا تھا۔

''تم بوواریا کے انسٹی ٹیوٹ میں ڈچ پڑھاتے تھے اور اب یہاں ڈچ سیکھتے ہو، یہ بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی؟'' مالا کے تیور نے میکس کو بوکھلا دیا تھا تاہم وہ گھبرایا نہیں تھا۔ مالا جو سمجھ رہی تھی وہ میکس کو لاجواب کر دے گی، اس کا جواب سن کر چپ سی ہو گئی۔

''میں یہاں ڈچ پڑھنے نہیں آتا، یہ تم سے کس نے کہہ دیا، ضروری تو نہیں، میں یہاں ڈچ ہی

پڑھوں...... مجھے کچھ اور زبانیں سیکھنے کا بھی چسکا ہے۔ میں آج کل، عربی اور افریقی لینگویج کورس کر رہا ہوں......'' میکس نے اطمینان سے کہا تھا۔ مالا اپنا سا منہ لے کر رہ گئی تھی اور میکس یوں دانت نکال رہا تھا جیسے مالا کو لاجواب کر کے لطف اندوز ہو رہا ہو۔

''اور تم موں کو کب سے جانتے ہو......؟'' مالا نے پھر سے ذرا چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''کافی عرصہ پہلے سے......'' میکس نے.... بے پروائی سے بتایا تھا پھر جیسے کچھ یاد آنے پر بولا۔

''تم نے میری برتھ ڈے پارٹی پر ضرور آنا ہے......اور ہیرا کو تو کہنے کی ضرورت نہیں۔'' اب وہ ہمیشہ کی طرح سادگی سے بتا رہا تھا بلکہ یاد دلا رہا تھا کہ مالا کہیں بھول نہ جائے...... ہیرا نے پرجوش انداز میں حامی بھر لی تھی جبکہ مالا کچھ الجھتی ہوئی پلٹ آئی۔

جب وہ گھر آئی تو ممی نے بتایا کہ چاچو کے کچھ مہمان آئے ہیں، مالا نے یہی سمجھا تھا کہ مہمان دو چار تو ضرور ہوں گے مگر ڈرائنگ روم میں جھانکنے کے بعد اسے پتا چلا کہ مہمان صرف ایک ہی ہے اور وہ بھی عیسیٰ کا انتہائی ناپسندیدہ...... مالا کو مہمان کی خصوصیات کے بارے میں علم نہیں تھا۔ وہ کون تھا......؟ اور اتنے عرصے میں پہلے کیوں نہیں آیا؟ مالا کو ان باتوں کی طرف دھیان دینے کی بھلا ضرورت ہی کیا تھی۔ اس نے معمول کے مطابق ڈرائنگ روم میں چائے کے لوازمات بھیجے اور پھر خود نمازِ ظہر ادا کرنے لگی تھی۔ آخری سلام پھیرنے کے بعد اس نے کوئی ناگوار سی آوازیں ابھرتی سنی تھیں جیسے کوئی غصے میں تیز تیز بول رہا تھا۔ مالا نے جانماز لپیٹ کر شیلف پر رکھی پھر سلیپر پہن کر جلدی سے باہر آگئی۔ ممی کچن میں مصروف تھیں اور اس شور سے قطعاً بے نیاز اپنے کام میں مصروف تھیں گویا جو کچھ ہو رہا تھا اس کی بلا سے ہوتا رہتا۔ مالا تقریباً بھاگتے ہوئے لاؤنج میں پہنچی تو وہاں عیسیٰ اور چاچو دونوں کو دیکھ کر ایک دم رک سی گئی۔ لاؤنج کے ایک صوفے پر سر جھکائے آفاق بھی بیٹھا تھا جبکہ عیسیٰ بہت غصے کے عالم میں زیرلب کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اس کی بڑبڑاہٹ مالا کے کانوں تک بھی پہنچ گئی تھی۔

''پروفیسر کیوں آیا تھا یہاں......؟ آپ نے اسے دھکے دے کر کیوں نہیں نکالا......؟'' عیسیٰ کی زہر میں بجھی آواز سن کر مالا ٹھٹک گئی تھی۔

''تو کیا وہ آدمی پروفیسر بشر تھا......؟'' مالا گویا سرتاپا حیران رہ گئی تھی۔ پروفیسر بشر کو دیکھنے کی سعادت سے محروم رہنے کا بھی اسے قلق تھا۔ وہ ذرا آگے بڑھ کر پردے کی اوٹ میں ہو گئی تھی۔ اس نے کان اندر کی آواز پر لگا دیے تھے۔ چاچو بھی آواز میں گویا صفائی پیش کر رہے تھے۔

''پرانی دوستی کا لحاظ تھا...... پھر گھر سے کیسے نکال دیتا......؟ میری احوال پرسی کے لیے آیا تھا۔'' چاچو کی آواز بہت ہلکی تھی جیسے انہیں بھی پروفیسر کا آنا پسند نہیں آیا تھا مگر وہ مہمان کا لحاظ کر کے خاموش ہو گئے تھے۔

''شیطان کی اولاد ہے...... ایک دم خبیث انسان...... پھر کسی سازش کے تحت آیا ہوگا...... آئندہ مجھے پتا چلا کہ وہ میرے گھر آیا ہے تو یہ اس کے حق میں بالکل اچھا نہیں ہوگا......'' عیسیٰ نے گویا وارننگ دی تھی پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتا باہر نکل گیا تھا۔ چاچو بے چارے سنجیدہ سے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئے تھے۔ بس لاؤنج میں آفاق رہ گیا تھا۔ جس نے مالا کی موجودگی محسوس کر لی تھی پھر اسے باہر کی طرف جاتا دیکھ کر خود بھی پیچھے آگیا تھا۔ مالا تالاب کی طرف جا رہی تھی۔ پھر تالاب کے اونچے کنگرے پر بیٹھ کر سر جھکائے کسی سوچ میں ڈوب گئی۔ آفاق بھی چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا اس کے قریب آگیا تھا پھر جس طرح مالا قدموں کی آہٹ پر حواس باختہ ہو

کر چکی تھی۔ آفاق سے یہ منظر بھلائے نہیں بھولا تھا۔ وہ بہت خوف زدہ نظر آئی تھی...... یعنی اس کے چہرے پر جو پہلا تاثر ابھرا تھا وہ خوف کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ وہ سہم گئی تھی۔ یعنی آہٹیں اسے سہا دیتی تھیں۔ وہ ذہنی طور پر شکستہ ہو رہی تھی۔ اس بات سے کوئی واقف نہیں تھا، وہ اپنے خول میں سمٹ رہی تھی اس بات سے بھی کوئی واقف نہیں تھا۔ فی الوقت مالا، آفاق کو دیکھ کر کچھ سنبھلی تھی۔ یہ قدموں کی چاپ کسی غیر مرئی مخلوق کی نہیں تھی، تبھی اس کے چہرے پر سکون اتر آیا تھا مگر یہ سکون لمحاتی تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ غصے کے ساتھ آفاق سے مخاطب تھی۔

"کیوں آئے ہو......؟ کوئی کام تھا تو نینی سے کہتے......؟" مالا کے چہرے پر غصے کی شکنیں تھیں۔ آفاق کچھ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا تھا۔ وہ وجہ جاننے سے قاصر تھا کہ مالا کی اسے دیکھ کر طبیعت کیوں بگڑ جاتی ہے اور مالا کو پچھلی کئی راتوں کی اذیت بھلائے نہیں بھولتی تھی پھر اس کی مکاری اور موذن کے ساتھ اس گھر میں ملاقات نے تو مالا کے حواس معطل کر دیے تھے پھر سونے پر سہاگا عیسٰی اس کی بات سرے سے مانتا ہی نہیں تھا۔

"مالا! تمہیں کوئی الجھن ہے تو بتاتی کیوں نہیں......؟ کیا حقیقت میں تمہیں کچھ سنائی یا دکھائی دیتا ہے؟" وہ متفکر سا پوچھ رہا تھا۔ تب مالا نے سر جھٹک کر کہا۔

"ہاں...... نظر تو بہت کچھ آتا ہے......" اس کا انداز بلا کا معنی خیز تھا۔

"کیا......؟" وہ سمجھے بغیر بولا۔

"بہت جلد جان جاؤ گے......" مالا نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا تھا تب آفاق ایک مرتبہ پھر سمجھے بغیر کہہ رہا تھا۔

"کیا مجھے بھی کچھ نظر آئے گا......؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

"کچھ نہیں، بہت کچھ......" مالا دو ٹوک لب، لہجے میں بولی تھی تب آفاق شوخ سا ہو گیا۔

"پریاں نظر آئیں تو بات بھی بنے......" وہ مسکراتے ہوئے من ہائیم کے بادلوں کو دیکھنے لگا...... گہرے ہوتے بادل...... جیسے برسنے کو...... بیتاب ہوں...... مرغابیوں کے غول محو رقص تھے، سفید دودھ جیسی کونجیں گا رہی تھیں۔

"پریاں بھی دکھائی دے جائیں گی۔ تمہیں فکر کس بات کی ہے؟" مالا نے تلخی سے پوچھا۔ آفاق کے انجان پن پر اسے سخت تاؤ آ رہا تھا۔ جبکہ وہ اس کا تلخ مزاج سمجھے بغیر اپنی جون میں بولے جا رہا تھا۔

"میں انی سے مخلص ہوں، محبت کرتا ہوں اور منتظر ہوں عیسٰی ہماری شادی کروا رہا ہے، تم روحوں اور پریوں کے چکر سے نکلو تو کچھ نظر بھی آئے۔ تمہیں اپنی چھوٹی بہن بنایا تھا اور پہلی پانچ سگی بہنوں سے زیادہ پروٹوکول دیا...... پر تم تو سوتیلی بہنوں سے بھی بڑھ کر بے مروت نکلی ہو۔" آفاق بے ساختہ شکوہ کر اٹھا۔ دراصل مالا کے بدلتے تلخ رویے نے عیسٰی کے ساتھ ساتھ آفاق کو بھی خاصا اپ سیٹ کر رکھا تھا۔ کہاں تو وہ اتنی دلچسپی لیا...... کرتی تھی۔ اس کی شادی اور محبت کی اسٹوری میں اور کہاں اتنی بیزار ہو چکی تھی کہ بات بھی کرتی تو سات پتھر اٹھا کر...... یہ صورتِ حال آفاق کے لیے بھی بہت پریشان کن تھی۔

"تمہاری بات طے ہو گئی......؟" مالا گویا چیخ پڑی۔ یعنی اس کی بے خبری میں انی کی ذات پر کیسا ظلم ہونے والا تھا۔ مالا کی تو گویا جان ہی نکل گئی تھی۔ وہ تو کسی بھی صورت آفاق جیسے منافق کے ساتھ انی کو برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔

"نہیں...... ہونے کے قریب پہنچ گئی تھی مگر تمہاری وجہ سے سب پروگرام چوپٹ ہو گیا۔" آفاق کا منہ اتر گیا تھا۔ تاہم وہ اسی بات پر خوش تھا

کہ مالا اس کے ساتھ بات تو کر رہی ہے۔ ورنہ اتنے دن سے آفاق کو دیکھ کر راستہ بدل جاتی تھی۔ سیدھے منہ بات نہیں کر رہی تھی۔ جانے اسے کیا ہو گیا تھا۔

"میری وجہ سے؟" مالا چونکی۔

"تو اور کیا....؟" آفاق نے پھر سے برا سا منہ بنایا۔

"کیوں؟" وہ حیران ہوئی تھی۔

"لو جی..... کیوں کا بھلا کیا سوال.....؟ عیسیٰ کو ڈاکٹرز کے ہاں چکر لگانے سے فرصت ملے تب ناں....." آفاق پھولے منہ سے گویا ہوا۔ وہ سر جھکائے گھاس نوچ رہا تھا جبکہ چہرے پر مصنوعی خفگی تھی۔

"تمہارے گھر والے مان گئے.....؟" مالا متحیر رہ گئی۔ تو گویا اس کی بے خبری میں اتنا بڑا نقصان ہونے والا تھا۔ صد شکر کہ اس کی بیماری میں معاملہ التوا میں پڑ گیا تھا۔

"عیسیٰ نے بات کی تھی، مانتے کیوں نہیں....." وہ اترایا۔ "اب تم روحوں کو بھاڑ میں جھونک کر جلدی سے ٹھیک ہو جاؤ..... پھر چھوٹی سی نکاح کی تقریب رکھیں گے۔" آفاق لہجوں میں پرجوش ہو چکا تھا۔ مالا کی کیفیات سمجھے بغیر اپنا اگلا پروگرام اسے بتا رہا تھا جبکہ مالا کچھ دیر کے لیے تو گم صم ہو کر رہ گئی تھی۔ تو گویا انی کو ڈوبنے سے وہ ہرگز بچا نہیں سکتی تھی۔

☆☆☆

وہ انی کو بھلا بچاتی بھی کیسے؟ اس کی ممی تو گویا سب تیاریاں مکمل کر چکی تھیں..... عیسیٰ اور آفاق کے جاتے ہی وہ انی کے گھر آ گئی۔ ہمیشہ کی طرح انی کی ممی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھیں۔ وہ ایک با اخلاق، مہمان نواز خاتون تھیں اور مالا کو تو خصوصی اہمیت دیتی تھیں۔

تھوڑی دیر بعد ہنستی مسکراتی انی بھی آ گئی تھی۔ اس کے انتہائی نفیس نقوش میں سرخیاں اتر آئی تھیں۔ چمکیلی آنکھیں اور مسکراتے ہوئے لب بتا رہے تھے کہ وہ اپنی شادی کے قریب آنے پر بہت خوش تھی۔ مالا سے اس کی خوشی میں بدمزگی گوارا نہ ہو سکی تھی مگر وہ اتنی پیاری لڑکی کو بے خبری کے عالم میں برباد ہوتا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ بہت دیر اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد مالا کو بالآخر بولنے کے لیے کچھ الفاظ مل ہی گئے تھے پھر اس نے جھجکتے ہوئے گفتگو کا آغاز کر لیا تھا۔

"تمہیں آفاق سے بہت محبت ہے انی.....؟" مالا نے ذرا جھجک کر پوچھا تھا۔ حالانکہ یہ سوال پوچھنے کی ضرورت تو ہرگز نہیں تھی۔ انی کی خوشی اس کے اندر کا حال بتا رہی تھی پھر اس کی ہر بات آفاق سے شروع ہو کر آفاق پر ختم ہوتی تھی۔ مالا کا سوال سن کر وہ اس وقت بھی چونکی نہیں تھی بلکہ بہت جوش کے عالم میں بتانے لگی۔

"ہاں..... بہت محبت کرتی ہوں، آفاق ہے بھی تو بہت اچھا....." اس نے چمکتی آنکھوں سے بتایا۔ وہ اتنی خوش اور پرجوش تھی کہ مالا کا ارادہ ڈانوا ڈول سا ہو گیا۔

"کسی کے اچھا ہونے کی سب کوئی دلیل ہوتی ہے؟" مالا نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

"یار! کسی کی اچھائی کو دیکھنے کے لیے دلیل نہیں ڈھونڈتے بلکہ اس کی شخصیت کی اچھائیاں دیکھتے ہیں اور آفاق بہت اچھا ہے۔" انی نے گویا اسے سمجھانے کے ساتھ، ساتھ آفاق کی تعریف کرنا بھی ضروری سمجھا تھا۔

"اور اچھائی کو ناپنے والا کوئی پیمانہ ہوتا ہے؟" مالا نے الجھ کر بھی پوچھا تھا۔ انی اس کی بات پر کسی سوچ میں ڈوب گئی۔

"میڈیشن مالا.....! اچھائی کو ناپنے والا کوئی پیمانہ نہیں ہوتا۔ بس دیکھنے والی آنکھ ہوتی ہے جو اچھائی اور برائی کو کھوج لیتی ہے۔" انی نے کچھ دیر بعد بہت نرمی سے گویا اسے سمجھایا تھا جبکہ مالا کچھ اور الجھ گئی تھی۔

"ضروری تو نہیں ہر اچھا دکھائی دینے والا بندہ مخلص ہو۔۔۔ کیا خبر، وہ ڈراما کرتا ہو یا اچھائی کے لباس کو پہن کر بھیس بدل کے کسی کو اپنے سازشی جال میں پھنسانا چاہتا ہو۔" مالا کی گہری کاٹ دار سی بات نے انی کو کچھ چونکا دیا تھا۔ تاہم وہ کندھے جھٹک کر بے پروائی سے بولی تھی۔

"دلوں کے بھید تو بس اللہ ہی جانتا ہے۔" وہ شاید مزید بحث نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مگر مالا کا دل ابھی مطمئن نہیں ہوا تھا۔ وہ بات کو کسی نہ کسی طرح سے گھما پھرا کر آفاق تک لانا چاہتی تھی مگر ہمت یوں نہیں ہو رہی تھی کہ اسے انی کی خوشی کو ختم کر دینے کی تکلیف بھی تھی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ انی کا دل ٹوٹے یا وہ پریشان ہو۔

"ویسے بھی کسی کی اچھائی جاننے کے لیے دل کا مطمئن ہونا بھی ضروری ہے جیسا کہ میں نے خود آفاق کو پروپوز کیا تھا اور یہ اس کی اچھائی تھی جو آج تک اس نے کسی کو بتایا نہیں.... حتیٰ کہ ممی کو بھی نہیں.... تمہاری فیملی سے تو وہ سب کچھ شیئر کر لیتا ہے پھر یہ بھی تو دیکھو، وہ کتنا پُرخلوص ہے۔ اس کی موجودگی میں کوئی مسئلہ جنم لے اور وہ اسے حل نہ کرے یہ ممکن نہیں..... میرا بھائی یہاں نہیں اور سمجھو، اس نے بہت سے ہمارے بوجھ بانٹ رکھے ہیں۔" انی نے نہایت عقیدت کے ساتھ آفاق کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا۔ ویسے بھی مالا کو لگ رہا تھا کہ انی کی آنکھوں پر آفاق کی محبت اور اچھائیوں کی پٹی بندھ چکی ہے۔ وہ اس کی بات کبھی نہیں سمجھے گی۔

"ضروری تو نہیں ہر بلند نظر آنے والا بندہ حقیقت میں بھی بلند ہو..... ہر چمکتی چیز سونا بھی تو نہیں ہوتی۔" مالا دبے لفظوں میں بالآخر کہہ ہی گئی تھی۔

"شاید تم بھی ٹھیک کہتی ہو، پر آفاق نے کوئی دکھاوا نہیں کیا۔" انی سنجیدگی سے بولی تھی۔ شاید وہ مالا کی بات کے اندر کی گہرائی میں اتر گئی تھی پھر اس نے کچھ سنجیدگی بھرے لہجے میں جتایا تھا۔ "تم وہ بات کرو جو کہنا چاہتی ہو۔" وہ سنجیدہ تھی جبکہ مالا نے بھی چپ رہنا مناسب نہیں سمجھا۔

"پیاری انی! تم مجھے بہت عزیز ہو...... میں چاہتی ہوں تمہارا بھائی واپس آ جائے، آفاق کے حوالے سے کچھ اور چھان بین کر لو، عمر بھر کے فیصلے اتنی عجلت میں نہیں کرنے چاہئیں۔" مالا نے اسے رسان سے سمجھایا تھا تب انی گویا اس کے خدشات سمجھ گئی تھی۔

"مجھے تمہارا تفکر بہت اچھا لگا...... میرے دل میں تمہاری محبت اور بھی بڑھ گئی ہے۔" انی نے سچے دل سے محبت بھرے لہجے میں کہا تھا۔

"مگر یار! میرے بھائی کے آنے میں بہت وقت ہے۔ پھر بھائی اور ممی دونوں کا مشترکہ فیصلہ ہے۔ آفاق نے بھائی سے بات کر لی ہے۔ اسے بھی آفاق بہت اچھا لگا ہے کیونکہ نیشنلٹی کی گارنٹی بھی موجود ہے۔" وہ مسکرا کر گویا اسے تسلی دے رہی تھی۔

"انی...... کیا خبر، وہ نیشنلٹی کا لالچ بھی رکھتا ہو۔" مالا نے کچھ اور وسوسوں کا اظہار کیا تھا جس پر انی کچھ اور بھی مسکرائی تھی بلکہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑی تھی۔ اس کے قہقہے نے مالا کو کچھ اور ہونق کر دیا تھا۔ وہ اس کے قہقہے کو سمجھ نہ پائی تھی۔

"اگر ایسی بات ہے تو کچھ غلط نہیں...... اسے نیشنلٹی مل جائے گی مگر اتنی آسانی سے نہیں۔" انی ابھی تک ہنس رہی تھی پھر اسے مزید بتانے لگی۔

"یار! میری نانی بھی میرے پاپا کو نیشنلٹی ملنے پر خدشات کا شکار تھیں۔ وہ پاپا کے پیپرز نہیں بننے دے رہی تھیں۔ انہیں خدشہ تھا پیپرز بننے کے بعد پاپا، ممی کو اور ہمیں چھوڑ جائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا۔ پاپا ہمیشہ ہمارے رہے، نانی کے خدشے بے بنیاد تھے۔ سو آفاق بھی مجھے کبھی دھوکا نہیں دے گا۔" وہ اتنی مطمئن تھی کہ مالا کو اس کے اطمینان پر رشک آیا تھا۔

اس نے دل ہی دل میں اس کا اعتماد قائم رہنے اور خوشیاں برقرار رہنے کی دعا کی تھی۔

"اللہ کرے، آفاق بہت اچھا رہے تمہارے ساتھ۔" مالا نے سچے دل سے دعا دی اور جانے کی اجازت چاہی۔

وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو عیسیٰ مسکراتا ہوا اسے سامنے سے آتا نظر آیا۔ اس نے ہاتھ میں ٹرے پکڑ رکھی تھی۔ شاید وہ کچن سے نکل کر باہر آ رہا تھا۔ ٹرے میں کیک، چائے اور سنیکس تھے۔ مالا نے فوراً آگے بڑھ کر ٹرے پکڑ لی تھی۔

"گھر میں کوئی آیا ہے؟" اس نے حیران ہو کر پوچھا تھا۔ وہ عیسیٰ کے پیچھے سٹنگ روم کی طرف جا رہی تھی۔ عیسیٰ نے اثبات میں سر ہلایا۔

"سوزی آئی ہے۔" عیسیٰ کی مسکراہٹ گہری ہوگئی تھی۔ وہ اور سوزن جانے کس موضوع پر بات کر رہے تھے۔ دونوں کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔ تاہم مالا نے نوٹ کیا تھا، سوزی کچھ ابھی، الجھی سی بیٹھی ہے، مالا کو دیکھ کر اگرچہ اس نے جوش اور محبت کا مظاہرہ کیا تھا مگر وہ کچھ بجھی بجھی سی لگ رہی تھی جبکہ مالا کے تو اندر باہر آگ کے بھانبڑ بھڑکنے لگے تھے۔ جیسے اس رات کا ایک، ایک منظر دوبارہ اس کی نگاہ میں جم گیا تھا۔ سوزی اور آفاق کی آوازیں کھیوں کی طرح بھنبھنا رہی تھیں۔ مالا کی آنکھوں میں سرخی اترنے لگی۔

"دھوکے باز، منافق لڑکی۔" اس نے زیر لب بڑبڑا کر کہا۔ وہ دونوں پھر سے باتوں میں مصروف ہو چکے تھے۔ جبکہ مالا اس پر لعنت بھیج کر جانے کے بجائے وہیں صوفے پر ٹک گئی تھی۔ اب وہ بڑے غور سے سوزن کے سرخ ابھرے گالوں کو دیکھ رہی تھی۔ چکنا سا مکھن کی ٹکیہ جیسا چہرہ ..... سر کو سکارف سے اب بھی ڈھکا ہوا تھا، پیچھے کی طرف جیسے رومال کو گرہ لگا رکھی تھی۔ اس کی سوتی روک کی فرل فرش کو چھوتی تھی۔ مالا بنا دیکھے بھی جانتی تھی اس نے گھریلو آرام دہ چپل پہنی ہوگی۔ وہ قدرے مضطرب تھی اور عیسیٰ سے گفتگو کے دوران کبھی کبھی مالا پر بھی نگاہ ڈال لیتی تھی۔ جانے وہ دونوں کس ٹاپک پر بات کر رہے تھے۔ مالا چونکی تو تب جب عیسیٰ نے ایک ایسا موضوع چھیڑا جس کی مالا کو توقع تھی اور نہ سوزن کو..... وہ دونوں کچھ متحیر سی عیسیٰ کو سن رہی تھیں۔

"میری سالگرہ والی شام تحفہ تم نے مجھے دینا تھا یا مالا کو......؟ کتنی کنجوس ہو تم...... اگر ایک سینٹ یا شرٹ مجھے بھیج دیتیں تو میری بیوی کے سامنے کچھ عزت بن جاتی۔ کیا سوچتی ہوگی مالا! ان لوگوں میں کزنز فرینڈشپ تو ہے ہی نہیں۔" عیسیٰ نے جس قدر سادگی بھرے لہجے میں شکوہ کیا تھا سوزی کے جواب نے عیسیٰ اور مالا کو اسی قدر سن کر کے رکھ دیا۔

"تحفہ......؟ کون سا تحفہ......؟ میں تو آج تک شرمندہ ہوں۔ مالا کو کوئی تحفہ نہیں دے سکی۔" سوزن نے سر جھکا کر جیسے اعتراف جرم کیا تھا۔ مالا کی سانس تک حلق میں اٹک گئی...... یہ سوزی کیا کہہ رہی تھی۔ سوزی ... کتنی جھوٹی تھی۔ کتنی منافق تھی؟ اس نے خود فون پر مالا کو بتایا تھا کہ اس نے اسے تحفہ بھیجا ہے پھر اب عیسیٰ کے سامنے کیوں مکر رہی تھی؟ سوزی یہ سب کیا کر رہی تھی؟ مالا کے ساتھ کون سا کھیل کھیلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اتنا بڑا جھوٹ وہ بھی ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر...... اتنی شدید غلط بیانی؟ تحفہ بھیج کر مکر جانا کوئی معمولی بات تھی۔ مالا کو لگا وہ دھڑام، دھڑام تباہ و برباد ہو جائے گی۔ وہ فنا ہو جائے گی۔ اس نے بے یقینی کے عالم میں سوزن کو دیکھا تھا۔ وہ اب بھی انکاری تھی اور عیسیٰ جیسے سنبھل کر کچھ سوچ رہا تھا۔

"پھر مالا کو تحفہ کس نے بھیجا؟" عیسیٰ کے ماتھے پر شکنیں تھیں اور لہجہ اتنا سخت اور کھردرا تھا کہ مالا کا اندر تک ہل گیا۔

"یہ تو تم مالا سے پوچھو، پر یقین مانو..... میں نے مالا کو تحفہ کچھ بھی نہیں بھیجا۔" وہ سادگی بھرے لہجے میں کہہ رہی تھی جبکہ مالا کو وہ کوئی چالاک لومڑی نظر آرہی تھی۔ اس کا دل چاہا، وہ اٹھ کر سوزن کا منہ نوچ لے۔ مگر اس کی ہمت جیسے بجھ کر رہ گئی تھی۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے عیسیٰ کو دیکھا تھا۔ وہ مالا کو ہی دیکھ رہا تھا۔ گویا اس کے کچھ بولنے کا منتظر تھا۔

"بولو مالا..... تم نے تو کہا تھا سوزن سے فون پر بات ہوئی، تحفہ سوزن نے ہی بھیجا تھا۔ پھر یہ کیوں غلط بات کر رہی ہے۔" عیسیٰ کے لہجے میں نرمی تھی۔ وہ بڑے مان بھرے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ جیسے ابھی مالا تردید کر دے گی۔ جیسے ابھی مالا، سوزن کو جھوٹا ثابت کر دے گی مگر مالا کچھ بھی نہیں کر سکی..... اسے لگا، وہ گہری آنکھیں جو اس کی تاک میں لگی رہتی تھیں، اسے لمحہ بہ لمحہ عیسیٰ کی نظر سے گرا رہی تھیں۔ وہ گرتی جا رہی تھی..... گرتی جا رہی تھی۔ وہ کھائی میں گرتی جا رہی تھی۔

"بولتی کیوں نہیں ہو مالا!" عیسیٰ اٹھ کر اس کے برابر آ بیٹھا تھا۔ وہ تو سوچ بھی نہیں سکتا تھا، اس کی مذاق میں کہی بات اتنی سنجیدہ صورت اختیار کر جائے گی۔ وہ تو سوزن کو سمجھ رہا تھا کہ کبھی اسے عیسیٰ کو برتھ ڈے وش کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ مگر یہاں تو معاملہ ہی الٹ گیا۔ وہ بے نام تحفہ جو اس وقت بھی اس کے ذہن کو الجھا گیا تھا۔ ایک مرتبہ پھر سوالیہ نشان بن کر پلکوں کے سامنے ناچنے لگا تھا۔ مالا نے بتایا تھا وہ بے نام تحفہ سوزن کی طرف سے آیا ہے۔ اس کی سوزن سے فون پر بات ہوئی تھی۔ سوزی نے شکریہ بھی وصول کر لیا اور اب وہ عیسیٰ کے مقابل بیٹھ کر صاف مکر رہی تھی۔ عیسیٰ کو غصہ نہ آتا تو وہ اور کیا کرتا..... وہ اٹھا کر بریسلیٹ لے آیا تھا۔ جو توڑ مروڑ دیا گیا تھا۔ بھلا مالا نے سوزن کا تحفہ کوڑے میں کیوں پھینکا؟ اس نے تب نہیں سوچا تھا۔ وہ اب سوچ رہا تھا۔ آخر یہ تحفہ آیا کہاں سے

تھا؟ اسے یقین تھا مالا جھوٹ نہیں بول رہی..... اور اسے یہ بھی یقین تھا سوزی غلط بیانی نہیں کرتی۔ پھر مالا کے منہ پر کیوں مکرتی؟ پھر جانے اصل "سچ" کیا تھا؟ عیسیٰ کا سر تو چکرانے لگا۔

ادھر مالا نفرت آمیز نظروں سے سوزی کو گھور رہی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ اس کے سرخ چکنے ابھرے گال نوچ دے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ سوزی کی آنکھوں کو بھی پھوڑ دے..... بلکہ کوئی ایسا بھالا اس کے اندر اتار دے کہ سوزی کو اس بھیانک جھوٹ بولنے کی سزا مل جائے۔ اس نے عیسیٰ کی آنکھوں میں بے یقینی اتری دیکھی تھی وہ بھلا چپ رہ سکتی تھی۔

"کتنی مکار لڑکی ہو تم..... ایک دم شاطر اور چالباز..... عیسیٰ کی نظر سے مجھے گرانے کے لیے کتنی گھٹیا حرکت کی ہے تم نے..... آئی ہیٹ یو..... دل چاہتا ہے تمہارے منہ پر تیزاب پھینک دوں..... تم نے خود فون پر مجھے بتایا، میں نے تمہارا شکریہ ادا کیا تھا تب تم نے انکار کیوں نہ کیا.....؟ تم نے آج انکار کر دیا۔ تم آج عیسیٰ کے سامنے مکر گئی ہو تا کہ عیسیٰ کا اعتبار مجھ پر قائم نہ رہ سکے، عیسیٰ مجھ سے نفرت کرنے لگے۔ عیسیٰ سمجھے کہ میں ایک جھوٹی لڑکی ہوں..... یہ مجھ پر کبھی اعتبار نہ کرے اور میں عیسیٰ کے دل اور نگاہ سے اتر جاؤں۔" مالا ہذیانی انداز میں چیخنے لگی تھی۔ اس کے آنسو بھل بھل گر رہے تھے اور وہ اپنے بالوں کو نوچتی حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی۔

"میں ایسا کیوں چاہوں گی، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔" سوزن اور عیسیٰ دونوں گھبرا گئے تھے۔ عیسیٰ، مالا کے لیے پانی لینے کچن کی طرف بھاگا تھا جبکہ مالا مسلسل چیختے جا رہی تھی۔

"تم ایسا ہی چاہو گی..... میرے خلاف سازشیں کرتی ہو، تم انتہائی خبیث ہو، یہ میں ہی تھی جو تمہیں جان نہیں سکی۔ تمہارا کریہہ روپ دیکھ نہیں پائی۔" مالا ہانپتے ہوئے زہرخند ہو رہی تھی جبکہ سوزن

کا سرخ چہرہ آگ کے مانند تپنے لگا تھا۔ مالا کے الفاظ نے اسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔

''مالا...... اتم پاگل ہو چکی ہو۔'' سوزن نے تلخی سے کہا۔ ''بہت جذباتی ہو...... ایک دم احمق اور بدھو......'' عیسیٰ کو آتا دیکھ کر وہ خاموش ہو گئی تھی مگر اس کے چہرے کی تپش ختم نہیں ہوئی۔

''ہاں، تم تو چاہتی ہو، میں پاگل ہو جاؤں، پہلے مجھے تحفے بھیجتی ہو...... پھر مکر جاتی ہو تاکہ میرے شوہر کو بدگمان کر سکو۔'' مالا چنگھاڑی تھی۔ وہ مزاجاً ایسی نہیں تھی۔ اسے حالات نے مخبوط الحواس کر دیا تھا۔ عیسیٰ نے آگے بڑھ کر اسے زبردستی پانی پلایا تھا پھر سوزن کی طرف مڑ کر تلخی سے بولا۔

''پلیز سوزن! تم یہاں سے چلی جاؤ...... تمہاری وجہ سے مالا کی طبیعت بگڑ گئی ہے۔'' عیسیٰ کے انتہائی توہین آمیز الفاظ نے سوزن کو کپکپا کر رکھ دیا تھا۔ وہ اسے اپنے گھر سے نکل جانے کو کہہ رہا تھا۔ دوسرے معنوں میں وارننگ دے رہا تھا کہ اس کی وجہ سے مالا کی طبیعت بگڑی ہے اور سوزن دوبارہ یہاں نہ آئے۔ اس ذلت بھرے احساس نے اس کی آنکھوں کو نم کر دیا تھا مگر وہ پھر بھی یہ ماننے کو تیار نہیں تھی کہ اس نے مالا کو تحفہ بھیجا ہے۔ وہ جاتے جاتے بھی اپنی صفائی میں کچھ بول گئی تھی جسے عیسیٰ نے سنا ہی نہیں۔ وہ تو مالا کی طرف متوجہ تھا۔ وہ اسے پچکار رہا تھا۔ نرمی اور پیار سے سمجھا رہا تھا۔

''میں تم سے کبھی بدگمان نہیں ہو سکتا۔ تمہارا جو مقام میرے دل میں ہے اسے کوئی بھی بدگمانی ختم نہیں کر سکتی اور نہ مٹا سکتی ہے۔ سوزن مکرتی ہے تو سو دفعہ مکر جائے۔ مجھے یقین ہے مالا جھوٹ نہیں بولتی۔'' عیسیٰ کے نرم پھوار جیسے الفاظ جاتی ہوئی سوزن کی سماعتوں میں بھی اتر گئے تھے۔ اس کے دل میں نیزے کی انی جا چبھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ عیسیٰ کے الفاظ سوزن کے منہ پر طمانچہ تھے۔ کبھی وہ کہتا تھا کہ سوزن جھوٹ نہیں بولتی، آج وہ کہہ رہا تھا کہ مالا جھوٹ نہیں بولتی۔ وقت انسان کو کیسے دوراہے پر لا کھڑا کرتا ہے۔ حالانکہ عیسیٰ اپنے ایمان اور یقین سے کہہ سکتا تھا مالا اور سوزن دونوں جھوٹ نہیں بولتیں...... اگر وہ ایسا کہہ دیتا تو کیا حرج تھا؟ مگر وہ ایسا نہیں بولا تو گویا اس کا یقین مالا پہ بھاری تھا۔ سوزن کا پلڑا ہلکا ہو گیا...... مالا اس کی بیوی تھی جبکہ سوزن صرف ایک کزن...... رشتوں میں فرق بہت تھا، اعتبار اور اعتماد کی نوعیت بھی کچھ اور تھی۔ اس نے فرش پر گرے بریسلیٹ کو دیکھا...... پھر جھک کر اسے اٹھا لیا۔ اس بریسلیٹ کی وجہ سے کتنے دلوں کا نقصان ہوا تھا۔ یہ تو کوئی نہیں جانتا تھا۔ ہاں، سوزن کا اعتبار مالا سے اٹھ گیا تھا اور مالا کا اعتبار سوزن سے اٹھ گیا تھا۔ ایک قرآن کی قسم کھا رہی تھی...... ایک مقدس انجیل کی قسم کھا رہی تھی۔ ان دونوں سے بھی زیادہ عیسیٰ مشکل میں گرفتار تھا۔ بھلا وہ ان دونوں میں سے کس کا یقین کرتا......؟ وہ دونوں ہی اپنی، اپنی جگہ درست تھیں شاید...... جانے غلط کیا تھا؟ جانے غلط کیوں تھا؟ اور کیسے ہو رہا تھا؟

عیسیٰ نے مالا کے لبوں سے پانی کا گلاس ہٹایا تو اس کی سماعتوں میں سوزن کی آواز اتری۔ وہ سینے پر صلیب کا نشان بناتی بھرائی آنکھوں سے پلٹ کر ان دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے لیے یہ منظر... بے انتہا اذیت ناک تھا۔

''مقدس انجیل کی قسم! یہ لڑکی خسارہ اٹھانے والی ہے، اسے انسانوں کی پہچان ہی نہیں۔'' سوزن کی درد ناک آواز لاؤنج میں گونجتی رہ گئی تھی جبکہ وہ اپنی روک کو پیروں میں روندتی الٹے سیدھے قدم اٹھاتی کبھی اس گھر میں دوبارہ نہ آنے کے لیے چلی گئی تھی جبکہ لاؤنج اور سٹنگ روم کے سناٹوں کو محسوس کرتے یہ دو لوگ ایک دوسرے کو بے ساختہ پکار اٹھے تھے۔

☆☆☆

"مالا......!" اس نے مالا کا گال بے ساختہ تھپتھپایا۔

"عیسیٰ ......!" مالا نے گھبرا کر عیسیٰ کا اپنے گال پر رکھا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ وہ دونوں کچھ دیر کے لیے گم صم رہ گئے تھے۔ جیسے کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ چند لمحوں میں بھلا ہوا کیا تھا؟ عیسیٰ کو لگا جیسے یہ کوئی ڈرامے کا سین تھا جو فافٹ منظر بدلا گیا۔ دو پل میں کیا سے کیا ہو گیا؟ سوزن کے چلے جانے کے بعد عیسیٰ کو احساس ہوا تھا کہ اس نے سوزن کو گھر سے نکال کر اچھا نہیں کیا...... غصے، جذباتیت اور جلد بازی میں اس نے سوزن کی بہت توہین کر دی تھی۔ عیسیٰ نے گروسی کی محبت کا خیال رکھا اور نہ تانتے کے پیار کو نظر میں رکھا۔۔۔۔ پھر وہ اس کے گھر مہمان آئی تھی۔ مہمانوں کو یوں بے عزت کر کے گھر سے نکالنا عیسیٰ کے گھرانے کی روایت تو نہیں تھی۔ اسے سوزن کے ساتھ انتہائی معیوب سلوک کرنے پر اور اسے گھر سے نکال دینے کی وجہ سے خود پر غصہ آ رہا تھا۔ غصہ حرام ہوتا ہے۔ اسے ان لمحات میں غصے کے نقصانات کا ادراک ہوا تھا۔ مگر وہ بھی کیا کرتا؟ سچوئیشن ہی ایسی تھی۔ مالا کی اذیت نے عیسیٰ کی سدھ بدھ بھلا دی تھی۔ تبھی وہ سوزن پر الٹ پڑا تھا۔ اسے سوزن کے ساتھ اتنا تلخ رویہ نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ عیسیٰ نے سوچا تھا، معمولی سے گفٹ کا تو معاملہ تھا۔ بات رفع دفع ہو جاتی تو بہتر تھا۔ اسے بات بڑھانی نہیں چاہیے تھی۔ مگر بات پھر بھی بڑھ چکی تھی۔ ادھر مالا ابھی تک اس کیفیت سے باہر نہیں آ رہی تھی۔ اسے سوزن پر شدید غصہ تھا۔ وہ اب بھی سسکاریاں بھرتی گھٹی، گھٹی آواز میں کہہ رہی تھی۔

"یہ کون سی جادوگری ہے علی عیسیٰ! یہاں اتنی انہونیاں کیوں ہوتی ہیں؟ میری سادہ سی زندگی میں اتنی الجھنیں کہاں سے آ گئی ہیں۔" وہ آنسو پونچھتی کراہ رہی تھی۔ یہ علی عیسیٰ کی ذات کا مان، تحفظ، محبت اور اعتبار ہی تو تھا جو وہ پھر سے بولنے کے قابل ہو چکی تھی۔ ورنہ جو کچھ سوزن نے اس کے ساتھ کیا تھا وہ نہ بھلایا جانے والا تھا اور نہ نظر انداز کیے جانے والا تھا۔

وہ جو سمجھ رہی تھی سوزن کے انکار اور مکر جانے کے بعد عیسیٰ اس سے بدگمان ہو جائے گا ایسا کچھ بھی نہیں ہوا۔ اس نے گفٹ والے قصے پر مٹی ڈال دی اور مالا کو سختی سے تاکید کی کہ آئندہ اس گھٹیا قصے کا ذکر نہیں ہوگا۔ مالا کے دل میں عیسیٰ کی محبت پہلے سے چوگنی ہو گئی تھی۔ کبھی، کبھی اسے خود پر ناز ہونے لگتا تھا۔ وہ تو بہت حقیر سی لڑکی تھی اللہ نے اسے اتنا نوازا دیا تھا جس کی نہ کوئی حد تھی اور نہ کوئی شمار تھا۔ سوزن تو یہی سوچتی ہوگی وہ عیسیٰ کو مالا سے بدگمان کر دے گی۔ آخر اس کی بات کا مطلب تو یہی تھا۔ عیسیٰ، مالا سے متنفر ہو جائے گا مگر پانسہ جیسے الٹ ہی گیا تھا۔ عیسیٰ نے مالا سے بدگمان ہونا تھا نہ ہوا۔ حالانکہ اس کے بعد کئی مرتبہ بے نام پارسل موصول ہوئے۔ چونکہ عیسیٰ کی غیر موجودگی میں آتے تھے سو مالا انہیں بنا دیکھے کوڑے والے ڈرم میں الٹ آتی تھی پھر بہت سارے دن دبے قدموں گزر گئے۔ عیسیٰ اسے اور چاچو کو شہر سے باہر گھمانے لے گیا تھا۔ آفاق کو بھی ساتھ چلنے کے لیے کہا تھا مگر اس نے معذرت کر لی تھی۔

زندگی جیسے پھر سے معمول پر آ گئی۔ یوں لگا، وہ دو آنکھوں والا آسیب اس کا پیچھا چھوڑ گیا ہے۔ شاید اس نے مالا کی ذات سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ مالا کے لیے یہ احساس ہی فرحت بخش اور اطمینان دلانے والا تھا۔ مگر یوں تھا کہ مالا بے چاری کے سکون و چین اور اطمینان کے دن تھوڑے ہی تھے۔ پھر ایسا روح ہلا دینے والا واقعہ ہوا جس نے پہلی مرتبہ عیسیٰ اور چاچو کو چونکا ڈالا تھا۔ وہ دن بڑا است روی سے طلوع ہوا تھا۔ عیسیٰ اور آفاق دونوں دفتر چلے گئے تھے اور آج کے دن چاچو لازمی چاچی کی قبر پر فاتحہ پڑھنے اور پھول چڑھانے جاتے تھے۔ یہ ان کے معمول میں

شامل تھا۔ ہر پندرہ دن بعد وہ دل کے اطمینان کی خاطر چاچی سے ملنے جاتے۔ اس دن نمی اور مالا گھر میں اکیلی تھیں۔ مالا نے بڑا مزیدار لنچ تیار کر رکھا تھا مگر لنچ سے کچھ دیر پہلے عیسیٰ نے کہا وہ کسی ضروری میٹنگ کی وجہ سے نہیں آسکے گا۔ تب مالا پہلے وقت کے مطابق نماز ادا کرنے کمرے میں چلی گئی تھی۔ وہ سلام پھیر رہی تھی جب اس نے مڑ کر دیکھا...... ہاں اس نے مڑ کر غیر ارادتاً دیکھ لیا تھا اور یوں لمحوں میں اسے لگا جیسے اس کے وجود سے دھیرے دھیرے نہیں ایک ہی جھٹکے ساتھ جان نکل گئی ہے۔ اس کے پیچھے ایک عورت کھڑی تھی۔ سر سے لے کر پیروں تک سفید لباس پہنے ہوئے...... اس کا چہرہ انتہائی سفید اور چمکیلے غازے سے لتھڑا ہوا تھا۔ اس عورت کی آنکھیں جھکی تھیں...... وہ خوب صورت عورت تھی مگر اس کی اصل رنگت سفید غازے میں گم ہو چکی تھی۔

ایک تنہا کمرے میں اکیلا وجود کسی اور کا گمان نہ کرتے ہوئے اپنے دھیان میں مگن ہو اور اسے اچانک کوئی وجود نظر آجائے...... پھر کسی کی جانے کیا حالت ہوتی ہوگی تاہم مالا تو جیسے مرنے کے قریب پہنچ گئی تھی۔ اسے لگا، آنکھیں تو حلقے سے نکل کر باہر ابل پڑیں گی اور یہ ٹانگیں تو کبھی چلنے کے قابل نہیں ہو سکیں گی۔ اس نے اتنا بھیانک منظر زندگی میں کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔ معاً دروازہ دھیرے سے کھلا تھا اور مالا کی جیسے جان میں جان آگئی۔ اندر داخل ہونے والی نمی تھی جو کسی اور کے وجود سے قطعاً بے نیاز مالا سے مخاطب تھی۔ "برتن میز پر لگا دیے ہیں......" نمی نے بغیر چونکے یا ٹھٹکے آرام سے کہا تھا۔ کیا اسے مالا کے قریب کھڑی وہ عورت نظر نہیں آئی تھی؟ مالا کا ٹھہرتا دل پھر سے دھک دھک کرنے لگا تھا۔

"نمی! کمرے میں کوئی اور بھی ہے۔" مالا نے کمزور آواز میں زیر لب بڑ بڑا کر پوچھا تھا۔ تب نمی کی آنکھیں پھٹ پڑیں۔ اس نے ڈھیلے پھاڑ پھاڑ کر پورے کمرے پر نگاہ ڈالی تھی۔ اسے مالا کے قریب وہ جوان عورت کھڑی نظر نہیں آئی تھی۔ مالا کے پیروں تلے سے زمین دھیرے دھیرے سرکنے لگی تھی۔ پھر اس نے نمی کو کچھ بولتے سنا تھا۔ وہ مالا کے حواس معطل کر رہی تھی۔

"کہاں ہے......؟ کون ہے......؟ مادام! آپ تو بہک گئیں۔ یہاں تو کوئی بھی نہیں۔" نمی نے ہکلاتے ہکلاتے بہ مشکل اپنی بات مکمل کی تھی۔ اس کا پورا وجود تھر تھرا رہا تھا اور وہ چہرہ خوف کے مارے انڈے کی زردی جیسا ہو چکا تھا۔

"تمہیں یہ عورت نظر نہیں آئی......؟" مالا نے اپنے قریب کھڑی عورت کی طرف اشارہ کیا تھا تب نمی چیخ مار کر مالا کے قریب آگئی۔

"مجھے کوئی عورت نظر نہیں آرہی...... یہاں ہم دو ہیں۔" نمی نے اس کا بازو دبوچ کر پھنسی آواز میں کہا۔

"ہم دو نہیں تین ہیں۔" مالا کی گھگی بندھ گئی۔ خوف نے اسے لرزا لرزا کر بے حال کر دیا تھا۔ وہ بے ہوش ہونے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ وہ جیسے گرنے کے قریب پہنچ چکی تھی۔

"تم اِدھر دیکھو......" مالا نے نمی کا چہرہ اس عورت کی طرف موڑا تھا۔ وہ عورت جو سپاٹ چہرہ لیے ہاتھ باندھے سر جھکائے کھڑی تھی۔ اس کا انداز اتنا عجیب تھا۔ وہ کچھ بول نہیں رہی تھی کچھ کہہ بھی نہیں رہی تھی اور نہ وہ غائب ہو رہی تھی۔ جبکہ مالا کے علاوہ وہ کسی اور کو نظر بھی نہیں آرہی تھی۔ سب سے تکلیف دہ مقام بھی یہی تھا۔

"یہاں کچھ بھی نہیں۔" نمی منمنائی۔

"تم اندھی ہو......" مالا چیخی۔

"میں جھوٹ نہیں بول رہی......" نمی کی آواز کپکپا رہی تھی۔ حلق خشک ہو رہا تھا۔ وہ کمرے سے بھاگ جانا چاہتی تھی مگر کیسے مالا کو اکیلا چھوڑ دیتی۔

"تو میں جھوٹ بولتی ہوں۔" مالا نے تڑپ کر کہا۔ "الہیٰ یہ کیسی سزا ہے۔" وہ بلبل رونے لگی

تھی۔ مگر سامنے کھڑی چاندی کے مجسمے میں ڈھلی عورت ٹس سے مس نہیں ہوئی تھی۔ نہ چونکی، نہ ٹھٹکی۔ اسی طرح بت کی طرح کھڑی رہی تھی۔

''تم ...... تم کون ہو......؟'' مالا نے بڑی ہمت کے ساتھ اس عورت کو مخاطب کیا تھا جو صرف اسے نظر آرہی تھی نینی کو ہرگز نہیں...... مالا بھلا کیا کرتی......؟ خوف، صدمہ، دکھ اور جانے کون، کون سا احساس حواس معطل کررہا تھا۔

''بولتی کیوں نہیں...... مجھے کیوں تنگ کرتی ہو؟ میرا گناہ کیا ہے؟'' مالا تڑپ، تڑپ کر بولی تھی پھر جیسے پتھر کے بت میں جان پڑ گئی تھی۔ اس چاندی کے مجسمے نے کہا۔

''یہ ہماری جگہ ہے...... تم یہاں سے چلی جاؤ۔'' آواز کی گونج مالا کے کانوں میں اتر گئی تھی۔ مگر نینی گونگوں، بہروں کی طرح بس ٹکر ٹکر دیکھتی رہی۔ مالا نے نینی کو جھنجوڑ دیا تھا۔

''کیا تمہیں کوئی آواز سنائی دی؟'' مالا نے بڑی آس سے پوچھا تھا مگر نینی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''مجھے کوئی آواز سنائی نہیں دی......'' نینی خوف کے مارے لرزتی آواز میں بولی تھی۔ پھر جیسے، مالا نے تھک کر نینی کو بتایا تھا۔

''یہ عورت مجھ سے کہہ رہی ہے میں اس گھر سے چلی جاؤں۔'' مالا پھوٹ، پھوٹ کر رو دی تھی اور نینی کے ڈیلے پھر سے باہر آگرے تھے۔ شاید مجسمہ نما عورت کو مالا کا بولنا اور رونا پسند نہیں آیا تھا۔ وہ کسی روبوٹ کی طرح چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ جبکہ مالا کو ایک دم ہوش سا آگیا تھا۔ وہ بھی لپک کر باہر کی طرف بھاگی تھی۔ حالانکہ نینی اسے روکنا چاہتی تھی مگر مالا سر پر پیر رکھ کر بھاگ رہی تھی۔ جیسے ہی وہ لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر آئی۔ وہ عورت تالاب تک جاتی دکھائی دی پھر وہ جنگلی پھولوں کی اوٹ میں گم ہوگئی تھی۔ مالا آنکھیں پھاڑے اسے پکار رہی تھی۔ مگر جنگلی پھولوں کی باڑ تک جانے کا اس میں حوصلہ نہیں تھا۔ اندھیرا نما جھنڈ، اونچے، اونچے درخت نما پودے جن پر قسم، قسم کے پھول لگے ہوئے تھے۔ نینی بھی تب تک مالا کے پیچھے گرتی پڑتی آگئی تھی۔ اب اسے باڑ کو گھورتے دیکھ کر زبردستی اندر لے آئی۔

''سایوں کا پیچھا نہیں کرتے۔'' مالا نے نینی کو کہتے سنا تھا۔ پھر جیسے اس کی آنکھوں میں اندھیرا سا اتر آیا۔ وہ چکرا کر فرش پر گر رہی تھی۔ جب اسے نینی نے سہارا دے کر تھام لیا تھا تاہم اس کا ذہن ایک دم تاریکیوں میں گم ہوگیا۔

وہ پورے آٹھ گھنٹے بے ہوش رہی تھی۔ اس بے ہوشی نے اگر اسے شدید اور بھیانک خوف کی سوچا تیں دی تھیں تو اس بے ہوشی کے ساتھ کچھ حقائق بھی تھیں...... جب وہ بے ہوش ہوئی تب چاچو بھی گھر لوٹ آئے تھے۔ اس کی حالت دیکھ کر گھبرا اٹھے۔ ایمبولینس منگوائی اور مالا کو اس میں ڈال کر اسپتال لے گئے تھے۔ تب تک عیسیٰ بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ پھر فوراً طبی امداد ملنے کے باعث اسے ہوش تو آگیا تھا تاہم ڈاکٹر نے بتایا وہ کسی شدید قسم کے خوف اور ڈر کے زیرِ اثر ہے۔ اسی بے ہوشی میں ڈاکٹر نے بتایا کہ مالا ماں بھی بننے والی ہے۔

جہاں یہ خوش خبری چاچو اور عیسیٰ کے لیے انتہائی مسرت کی تھی وہیں مالا کی حالت نے انہیں تشویش کا شکار کر دیا تھا۔ نینی نے من وعن پورا واقعہ کہہ سنایا تھا۔ مالا نے ہوش میں آکر وہی باتیں دُہرا دی تھیں۔ مالا نے روتے، روتے بتایا۔

''وہ عورت چاہتی ہے، میں اس گھر میں نہ رہوں...... وہ مجھے نظر آتی ہے نینی کو نہیں۔ آخر میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟'' مالا کی ذہنی حالت قابلِ تشویش تھی۔ اس کی کنڈیشن ایسی نہیں تھی کہ... وہ کوئی صدمہ برداشت کر سکے۔ چاچو اور عیسیٰ سخت پریشان

تھے۔ پاکستان میں ہوتے تو ان باتوں پر آس پاس کے لوگوں سے مشورہ کرتے۔ مگر یہاں تو ایسا کچھ نہیں کرسکتے تھے۔ یہ آسیب وغیرہ پاکستان میں تو تھے ہی، کیا جرمنی جیسے ملک میں بھی تھے؟

عیسٰی نے آفاق کو پوری بات بتادی تھی۔ وہ اس سے مشورہ طلب کررہا تھا۔ آفاق خود ساری باتیں سن کرسنانے میں رہ گیا تھا۔ خصوصاً وہ عورت جو مالا کو نظر آئی تھی۔ اس کے بارے میں سن کر وہ بیچ مچ متفکر ہوچکا تھا اور سنجیدگی سے اس کا حل ڈھونڈنے کی کوشش میں عیسٰی کی ہر ممکن کوشش کرنے کا وعدہ کرچکا تھا۔ مالا کے گھر والوں سے سب کچھ چھپالیا گیا تھا۔ وہ ان لوگوں کو پریشان نہیں کرنا چاہتے تھے مگر ہاتھ پر ہاتھ رکھے بھی بیٹھ نہیں سکتے تھے۔

پھر بہت سارے دن سکون سے گزر گئے۔ بلکہ دو تین مہینے گزر گئے تھے۔ ان کی شادی کو کتنی کے پانچ ساڑھے پانچ ماہ ہوگئے تھے۔ اتنا خوب صورت وقت اتنی جلدی گزر گیا تھا۔ خلاف توقع کوئی انہونا واقعہ وقوع پذیر نہیں ہوا تھا۔ اب عیسٰی نے مالا کو اکیلا نہ چھوڑنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ رات کو اگر اسے پیاس بھی لگتی تو پانی پینے اسے اکیلے نہیں بھیجتا تھا۔ اگر آفس میں جانا اس کا بہت ضروری ہوتا تب جاتا تھا۔ ورنہ آفاق کو بھیج دیتا مگر یہ سلسلہ زیادہ دیر نہیں چل سکا تھا۔ ایک صبح آفاق اور عیسٰی دونوں کو ایک ساتھ آفس جانا پڑ گیا۔ ننی ابھی آئی نہیں تھی جبکہ چاچو سو رہے تھے۔ دن کا وقت تھا، مالا نے عیسٰی کو تسلی دے کر دفتر بھیج دیا تھا۔ حالانکہ جہاں عیسٰی کا جانا بہت ضروری ہوتا وہیں وہ جاتا تھا اور آفاق کو گھر چھوڑ دیتا۔ تاہم آج وہ دونوں چلے گئے تھے اور صرف آدھے گھنٹے کے لیے گئے تھے۔ مالا، چاچو کو سوتا دیکھ کر گارڈن میں آگئی تھی۔ یہاں تالاب کے پاس بیٹھنا اسے بہت پسند تھا۔ اسے لگتا تھا یہ تالاب سیف الملوک جھیل ہے۔ جس پر ہر رات پریاں اترتی تھیں۔

حالانکہ یہ تالاب ایسا تھا کہ دن کے وقت بھی یہاں پریاں چلتی پھرتی نظر آسکتی تھیں۔ دیکھا جائے تو تصوراتی خاکوں میں پریوں کا ذکر، ان سے ملاقات اور ان کے حسن کی مجسمہ سازی کی ایک ایک کہانی بھری ہوتی ہے۔ پریوں کو دیکھنے کا شوق اور ان کے حسن سے متاثر ہونا ایک الگ چیز اور بات ہوتی ہے۔ پریوں کو اپنے مقابل دیکھنا بہت ہمت والا کام ہے۔ قوم جن کی حسین عورتیں، جن میں سے ایک پری وادیِ کوہستان کا شہزادہ سیف الملوک بھی عاشق ہوگیا تھا۔ پھر وہ پری شہزادے سے ملنے جھیل پر آتی تھی۔ شہزادہ پری کے عشق میں فنا ہوگیا تھا۔ قصوں اور کہانیوں میں یہ سب کچھ بہت دلفریب لگتا ہے۔ اور اگر حقیقت میں کوئی پری حواس معطل کرنے سامنے آجائے تو بھلا کیا حال ہوتا ہے؟ شاید ویسا ہی جو مالا کا حال ہو رہا تھا۔

مالا کے ڈیڈی کی ذاتی لائبریری میں قوم جن کی حسین و جمیل پری بدیع الجمال کے حسن پر عاشق ہونے والے شہزادہ سیف الملوک کی سوانح عمری اپنی اصلی حالت میں محفوظ پڑی تھی جسے لکھنے والے حضرت میاں محمد صاحب نے کسی بھی مبالغے سے ہٹ کر اصل کہانی کی صورت میں لکھا تھا۔ کتاب سفر العشق معروف بہ سیف الملوک اصل کتاب جو 1898 میں حضرت مصنف نے اپنی زیرِ نگرانی طبع فرمائی تھی۔ مالا نے سیف الملوک پوری پڑھ رکھی تھی۔ اسے پنجابی کے شعر اتنے سمجھ نہ آتے تھے مگر شوق ایسا جنونی تھا کہ اس نے ڈیڈی سے پوچھ، پوچھ کر پوری کتاب پڑھ لی تھی۔ بھلا کیا ہی عشق کیا تھا سیف الملوک نے پری بدیع الجمال سے اور کیسے بدیع الجمال مرمٹی تھی شہزادہ سیف الملوک پہ......

اسے تو اپنی محبت اور عشق کے سامنے کسی اور کی محبت دریا میں سے چلو بھر پانی کے برابر لگتی تھی۔ جو عشق اسے علی عیسٰی کے وجود سے تھا ویسا عشق تو کسی نے نہ

کیا ہوگا۔ اس کی تو سانس بند ہونے لگتی۔ اگر وہ کبھی علی عیسیٰ سے دوری کا تصور کرتی۔

اور صبح کے اس نورانی وقت تالاب کے کنگرے پر بیٹھ کر کیا ضروری تھا کہ وہ پری بدیع الجمال یا سیف الملوک کو یاد کرتی؟ وہ سر جھٹک کر اپنی سوچوں کو ایک ننھے منے نرم و نازک سے وجود کی طرف مبذول کروانا چاہتی تھی۔ وہ بچہ جو اس کے سارے خدشات ختم کرنے، اس کا دل بہلانے دنیا میں آنے والا تھا۔ ایک خوشگوار ممتا کا احساس بخشنے والا تھا۔

وہ شاید خوابوں اور خیالوں میں بہت دور تک چلی جاتی جو اگر اسے "اوں...... ہوں......" کی آواز نہ چونکاتی...... کوئی پھر مالا کے آس پاس تھا...... کوئی پھر مالا کے قریب تھا۔ اس نے دائیں دیکھا۔ پھر پیچھے دیکھا..... وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ قریب پڑی کچی کلیوں کو بے پروائی سے پانی میں اچھال رہی تھی۔ پانی کی شفاف سطح پر ہلکے بھنور بنتے رہے تھے۔ مالا کی زندگی بھی انہی بھنوروں کے مانند تھی۔ کبھی الجھ جاتی تھی کبھی سلجھ جاتی تھی۔ بس ایک محبت کا احساس تھا جس نے اسے زندہ کر رکھا تھا۔ ورنہ وہ اتنی پریشانیوں میں ابھی تک کیسے حواس قائم رکھے ہوئے تھی؟!

یونہی تالاب کے شفاف پانیوں کو دیکھتے ہوئے اچانک اس کے ذہن میں میاں محمد صاحب کے شعر اترنے لگے تھے۔ کسی اور نے محبت کی ایسی شاندار تشریح کی ہوگی......؟ محبت کو جیسے انہوں نے بدیع الجمال اور سیف الملوک کے قصے میں گوندھ دیا تھا۔ کس طرح سیف الملوک باغ میں ٹہل رہا تھا۔ ایسا ہی کوئی حسین پھولوں سے لدا گارڈن ہوگا۔ مالا آس پاس نگاہ دوڑا رہی تھی۔ اسے لگا، وہ تصوراتی دنیا میں کھو گئی ہے۔ میاں محمد صاحب کی مٹھاس بھری کہانی میں پور پور ڈوب گئی ہے۔ انہوں نے کتنی محبت سے سیف الملوک کی سوانح عمری لکھی تھی۔ جب وہ پیدا ہوا، بے شمار منتوں مرادوں کے بعد۔ پھر پلا بڑھا...... ناز و نعم میں پرورش پائی۔ پھر ایک روز باغ میں ٹہلتے ہوئے بدیع الجمال نے اسے دیکھا اور سیف الملوک نے بدیع الجمال کو دیکھا عشق نے کیسی آگ لگائی تھی کہ اڑتی ہوئی جن زادی آدم کے عشق میں اسیر ہوگئی۔

مالا کو میاں صاحب کے وہ شعر یاد آرہے تھے جب شہزادہ، بدیع الجمال سے ملنے گیا تھا پھر کیسے التجائیہ انداز میں درخواست پیش کی تھی کہ اس کی محبت اور عشق کی روداد سن لے۔ شہزادے نے پری کو اس کی ماں کے دودھ کی قسم دی تا کہ پری اس کی بات سن لے۔ شہزادے نے پری سے کہا۔ میاں محمد صاحب نے پنجابی زبان میں اس پوری داستان کو نظم بند کیا ہے۔

ترجمہ) میری بات پوری سن لو اور سنا دل کے کانوں سے، میرے پاس اب صبر نہیں رہا، میری روداد عشق اب سن لو۔ پھر پری نے شہزادے کی آہ و زاری سے متاثر ہو کر بڑے ناز بھرے انداز میں جواب دیا تھا۔

ترجمہ) بدیع جمال پری نے کہا..... اے شہزادے! تو نے مجھے ماں کے دودھ کی بہت بھاری قسم دی ہے۔ میں تمہاری بات ایک بار تو ضرور سنوں گی۔ پھر شہزادے کی پوری بات سن کر پری نے اوا سے کہا تھا۔

ترجمہ) تیرا، میرا ملنا تو بہت مشکل ہے، یہ کس نے کہہ دیا تم سے کہ ہم دونوں کبھی مل سکیں گے؟

پھر پری بدیع الجمال نے سیف الملوک کو جیسے سمجھاتے ہوئے مزید کہا تھا۔ سیف الملوک کے عشق کی داستان کے جواب میں پری دلائل اور جواز دیتی ہے اور بڑے تفاخر اور ناز بھرے انداز میں کہتی ہے۔

ترجمہ) ہم تو ناری ہیں اور خود کو آدم زاد سے اونچا سمجھتے ہیں۔ تم ناری کی محبت چھوڑ دو، پریوں کی محبت تمہیں کیا دے گی۔

مالا نے بھی بدیع الجمال کا قصہ ایک کہانی سمجھ کر نہیں پڑھا تھا۔ اس نے ہمیشہ بڑی محبت، چاہت اور عقیدت کے ساتھ اسے پڑھا تھا۔

وہ اب بھی پری کے ساحرانہ کلام میں جیسے

کھوئی ہوئی تھی۔ اسے لگا، وہ سمندر پار کسی اجنبی ملک کی سرزمین پر نہیں بلکہ اپنے ڈیڈی کی لائبریری میں بیٹھی سفر العشق یعنی قصہ سیف الملوک و بدیع الجمال پڑھ رہی تھی۔ اسے پری کی ناز بھری آواز لاکھوں میل کی دوری کے باوجود سنائی دے رہی تھی۔ جیسے وہ سیف الملوک کو سمجھا رہی تھی۔ اور ابن آدم کو بے وفا کہہ رہی تھی۔

بے وفائی کم تے ڈا، پریاں لوک وفائی
بے قدراں دی الفت مندی، نیچاں دی آشنائی

ترجمہ) پری بتاتی ہے کہ بے وفائی تمہارا کام اور انسانوں کا وصف ہے، جبکہ پریاں فطرتاً وفادار ہوتی ہیں۔ وہ جس سے محبت کرتی ہیں عمر بھر اس کی وفادار رہتی ہیں اور پری کہتی ہے کہ بے قدروں یعنی انسانوں کی الفت بری ہے اور نیچ لوگوں کی آشنائی اور دل ربائی بھی بری ہے۔

نیچاں دی آشنائی کولوں فیض کسے نہیں پایا
ککر تے انگور چڑھایا، ہر گچھا زخمایا

ترجمہ) نیچ لوگوں کی محبت سے کس نے فیض اور ثمر پایا ہے؟ کیکر کے کانٹوں پہ انگور چڑھانے سے ہر دانے کو زخم ہی تو آتا ہے مالا کو لگا تھا جیسے بدیع جمال نے یہ الفاظ اسے ہی سمجھانے کو کہے تھے۔ جیسے ایک پردہ سا اس کی آنکھوں کے سامنے سے ہٹا تھا۔ اس کے کانوں میں میاں صاحب کا یہ شعر پھر سے امرت ٹپکانے لگا۔

"ککر تے انگور چڑھایا، ہر گچھا زخمایا۔" مالا کو لگا، پیاز کی پرتیں کھلنے لگی ہیں۔ ایک، ایک پردہ ہٹنے لگا تھا۔ خلوص اور محبت کو بے قدروں پر مت لٹاؤ، کیکر پہ انگور مت چڑھاؤ اور مالا نے بھلا کیا، کیا تھا؟ اور کیا کچھ کرتی آئی تھی؟ بے قدروں پر اعتبار کرتی رہی اور خلوص لٹاتی رہی۔ جیسے بنجر زمین پر خلوص و الفت کے بیج پھینکتی رہی۔ بھلا بنجر زمینیں فصلیں اگاتی ہیں؟ محبت پتھروں کے سینوں میں سے چشمے نہیں نکالتی پر پتھروں کے نیچے دبی مٹی سے ہی چشمے پھوٹتے ہیں۔ بس مالا ہی سمجھ نہیں پائی تھی۔ اسے لگا، بدیع جمال نے اسے ایک راہ دکھائی ہے۔ بدیع جمال جیسے روشنی کا مینار بنی کھڑی تھی۔ اسے رستہ بتا رہی تھی۔ اسے سمجھا رہی تھی۔

"نیچاں دی آشنائی وں فیض نہیں پھل پایا؟" لفظ ملفظ میں جیسے مالا کے لیے کوئی رہبر کھڑا پکار رہا تھا۔ بات مشکل نہیں تھی بس مالا سمجھ نہیں پائی۔ اس نے آفاق اور سوزن پر اعتبار کر کے دھوکا کھایا تھا۔ اس نے ان دونوں پر خلوص لٹا کر غلط کیا تھا۔ مالا نے بے قدروں پر خلوص نچھاور کیا اور انہیں اعتبار کے قابل سمجھا۔ وہ یہ کیوں نہیں سمجھ سکی کہ مون کی کزن، عیسیٰ کی نام نہاد منگیتر سوزن، مالا کے لیے کیوں مخلص ہوئی؟ وہ یہ بھی کیوں نہیں سمجھ سکی، مون کے انسٹی ٹیوٹ سے ٹیکنالوجی کورس کر کے آنے والا آفاق مون کی ہی حریف یعنی مالا سے مخلص ہوگا؟ تو گویا مالا نے تسلیم کر لیا تھا۔ وہ ایک بھیانک سازش کا شکار ہو رہی تھی۔ اور اسے نفسیاتی حربوں سے ٹیز اور ٹارچر کیا جا رہا تھا۔ اور سب سے بڑی بات اس سازشی منصوبے میں آفاق اور سوزن کا بھی پورا پورا ہاتھ تھا۔

وہ ابھی آفاق اور سوزن کی منافقت کے بارے میں کچھ اور بھی ٹھوس نکتے نکالتی جب "اوں ہوں" کی آواز نے مالا کو پھر سے چونکا دیا تھا۔ جیسے "اوں ہوں" میں کوئی تنبیہ تھی۔ مالا کو کسی بات سے منع کیا جا رہا تھا بھلا کس سے؟ اس نے تالاب کے کنگرے پہ رکھے گملے میں سے کئی کنکر تو نکالے ہی تھے بلکہ اس سے بھی پہلے پودے کی شاخوں پر لگی ساری کلیوں کو توڑ کر تالاب میں پھینک دیا تھا اس نے پھولوں سے لدے پودے کو قریب، قریب گنجا کر دیا تھا۔ اب کہ مالا کو کچھ افسوس سا ہوا تھا۔ بھلا ایسی بھی کیا ... بے خبری؟ وہ خود کو لعن طعن کرنے لگی تھی۔ جب "اوں ہوں" کی آواز پھر سے سنائی دی۔ اب کہ مالا نے بائیں جانب دیکھا تھا۔ پھولوں کا اونچا جھنڈ ایک

جگمگاتی حسین عورت سے لشک رہا تھا۔ وہی جوان عورت جو مالا کو کمرے میں ملی تھی۔ چمکتا ہوا سفید چہرہ...... سانچے میں ڈھلا بدن...... نہ نقوش مشرقی تھے نہ مغربی...... کمال کا نفیس نقوش سے ترشا چہرہ تھا۔ مالا کو پہلی مرتبہ ذرا بھی خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ وہاں خوف کہیں نہیں تھا۔ مالا کچھ متحیر رہ گئی تھی۔ مگر فی الحال حیران ہونے کا بھی اس کے پاس وقت نہیں تھا۔ وہ اپنے قدموں پر اٹھ کھڑی ہوئی۔ جھولی میں گری ساری چیاں تالاب میں گر پڑی تھیں۔ مالا نے جھک کر ایک کلی کو مٹھی میں دبا لیا تھا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''پری بدیع الجمال۔'' مالا نے زیر لب بڑبڑا کر کہا تھا۔ ''مجھے تم سے ملاقات کا بہت شوق تھا۔ میں ایک عرصے سے تمہارے سحر میں گرفتار تھی۔ مجھے یقین تھا تم میرے تصور سے بھی بڑھ کر حسین ہو گی۔'' مالا نے دو قدم غیر محسوس طریقے سے آگے بڑھائے تھے۔ سامنے کھڑی چاندی میں ڈھلی عورت شاکڈ رہ گئی۔ اس کے تاثرات بہت حیران کن تھے۔ مالا خود بھی متحیر رہ گئی۔ ''تو کیا پریاں بھی حیران ہوتی ہیں؟'' وہ گویا خود سے پوچھ رہی تھی۔ جبکہ دوسری طرف حیرت کا انداز اور شارہی کوئی نہیں تھا۔

مالا سہمی نہیں تھی، ڈری نہیں تھی...... اس کے دل میں کہیں خوف کا نشان تک باقی نہیں تھا۔ خوف اس کے دل سے بے وفائی کر گیا تھا مگر مالا اس بے وفائی پر بہت خوش اور مطمئن تھی۔

''آج تم خاموش کیوں ہو؟ بولتی کیوں نہیں؟ مجھے تمہارے بولنے کا شدت سے انتظار ہے۔'' مالا جیسے اس کی خاموشی سے بھی لطف اندوز ہو رہی تھی۔ آج مالا کی ترنگ ہی کچھ اور تھی۔ اس کے سامنے بدیع الجمال جو کھڑی تھی۔ اس کا تصوراتی پیکر، سیف الملوک کی محبوبہ......

''تم جانتی ہو، میں کون ہوں؟'' چاندی کے بت میں جان پڑ گئی تھی۔ مالا کو گویا بہت ہی لطف آیا۔

''ہاں، ہاں...... تم چاندی کا بت ہو...... ہمارے ہاں تمہارے جیسے بت کو خرید کر مزار پر چڑھاوا دیتے ہیں...... آں...... ہاں، میں یہ کیا بول گئی۔ تم تو بدیع الجمال ہو......'' مالا نے کمال عقلمندی سے اسے ایک مرتبہ پھر ہونق کر دیا تھا۔ بھلا پریاں ہونق بھی ہو جاتی ہیں؟ مالا کو پہلی مرتبہ تجربہ ہوا تھا سو کچھ حیرانی بھی تھی۔ مگر سامنے کھڑی عورت اس کے سارے طبق روشن کرنے کے موڈ میں تھی۔

''میں علی عیسٰی کے نکاح میں ہوں...... جس شب تمہارا محمد علی عیسٰی سے نکاح ہوا تھا اسی شب میں بھی خود بخود اس کے نکاح میں آ گئی تھی۔ اس گھر میں میرا قیام ہے۔ انسان تو بے وفا ہوتے ہیں جبکہ ہم نہیں...... مر کر بھی نہیں چھوڑتے۔'' وہ اپنے تئیں مالا کے حواسوں پر بم پھوڑ چکی تھی۔ کچھ پل کے لیے مالا بھی چکرا کر رہ گئی تھی۔ اسے سنبھلنے میں بہت وقت لگا تھا۔ یہ انکشاف لمحے بھر کے لیے ہلا کر رکھ گیا تھا اسے...... مگر وہ پھر بھی سنبھل ہی گئی تھی۔ اس نے سامنے کھڑی پری پیکر کو دیکھا تھا۔ انسانی ڈھانچے میں ڈھلا وجود...... چہرے پر ناقابل فہم تاثرات اور الفاظ ایسے تھے گویا مالا کی ہستی مل کر رہ گئی تھی۔

''اوہ...... تو یہ بات ہے، تم عیسٰی کے نکاح میں ہو...... اور مجھے پریشان کرتی ہو، پھر میری وجہ سے عیسٰی پریشان ہوتا ہے تم کیسی محبت کرتی ہو علی عیسٰی سے؟ اس گھر میں رہنے والوں کو زک پہنچاتی ہو، ٹھہرو، میں تمہیں پوچھتی ہوں۔'' مالا نے پورے جوش اور غصے کے عالم میں جارحانہ تیور کے ساتھ مٹھی میں دبائی کلی سامنے کھڑی عورت کو ماری تھی۔ یہ حملہ بہت اچانک تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا، مالا پتھر بھی مارتی تو وہ عورت ٹس سے مس نہ ہوتی بلکہ بندوق کی گولی بھی اس پر اثر نہ کرتی مگر وہ تو معمولی سی کلی کا زور بھی سہہ نہیں سکی تھی حالانکہ کلی اس تک پہنچ بھی نہیں پائی تھی۔

ہوا میں معلق رہ کر بالآخر زمین بوس ہوگئی تھی۔ جبکہ سامنے کھڑی چاندی کی عورت نے بے ساختہ چیخ ماری تھی۔ پھر وہ الٹے قدموں بھاگ گئی۔ مالا کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ جوتا اٹھا کر چاندی میں ڈھلی اس عورت کا پیچھا کرے مگر وہ گلاب کے جھنڈ میں غائب ہوگئی تھی۔ اور مالا ... ایک گہری سانس کھینچتی تالاب کے کنگرے پر بیٹھ گئی۔ اس کے سر پر سے خوف کا بھیانک بھوت اتر گیا تھا۔ قوم جن کی ایک عورت علی عیسیٰ سے نکاح کا اعتراف کرکے بھاگ گئی تھی۔ مالا نے اسے بھگا ڈالا تھا۔ ناری پہ خاکی جیسے سبقت لے گیا۔ اس نے ڈر کو ڈر کے ساتھ کاٹ ڈالا تھا۔ اس پل مالا کو بدیع الجمال پر ٹوٹ کے پیار آ گیا تھا۔

جیسے کوئی جمیل سیف الملوک پر سر جھکائے ٹھنڈی میٹھی چاندنی میں گنگنا رہا تھا۔ ''بھلا پریاں کس کے ہاتھ آتی ہیں؟ پریوں کو تو چھونا بھی ممکن نہیں۔'' پھر یہ کیسی پری تھی جو کلی کا وار سہہ نہ پائی اور انسانی لمس کی قربت سے بھاگ گئی۔ مالا تو ابھی اس کے قریب آ رہی تھی۔ وہ اسے کلی مار کر چھونا چاہتی تھی اور شاید وہ عورت اس کا ارادہ بھانپ چکی تھی جبھی بھاگ نکلی۔ اگر مالا اسے چھو لیتی تو بھرم ٹوٹ جاتا۔ شاید آج فیصلے کا... آگہی اور ادراک کا دن نہیں تھا۔ مالا پھر کسی ایسی ہی ملاقات کا انتظار کرنے لگی تھی۔

علی عیسیٰ نے وہ دن پہلے ہی مالا کو یہی تو سمجھایا تھا۔

''یہ ڈر اور خوف کچھ نہیں ہوتا۔ انسانی ذہن کے وسوسے ہیں سارے، کچھ بھی خود پر سوار کرلو، چاہے خوشی، چاہے غم یا خوف..... جو سوچو گے اسی کے زیر اثر رہو گے، دیکھو، کنویں میں جھانکے بغیر اس کی گہرائی کا پتا نہیں چلتا۔ آگ کو چھوئے بغیر اس کی تپش کا احساس ہو جاتا ہے مگر نزدیک جاؤ کچھ چیزیں سمجھانی پڑتی ہیں اور کچھ بغیر سمجھائے ادراک تک پہنچ جاتی ہیں۔ تم خوف کو آگ کی تپش مت سمجھو بلکہ کنویں کی طرح سمجھو...... جب تک خوف کی گہرائی میں نہیں اترو گی، جب تک خوف کو ہاتھ سے محسوس نہیں کرو گی، وہ کبھی تم سے دور نہیں جائے گا۔'' یہ عیسیٰ کے قول تھے پھر بھلا مالا ان پر ایمان کیسے نہ لاتی۔ اس نے خوف کو مجسم شکل میں دیکھ کر اسے چھونا چاہا تھا اور خوف، مالا کے خوف سے بھاگ گیا تھا۔

مالا کا دل چاہ رہا تھا جو آسمانوں پر مرغابیاں اڑ رہی ہیں اور جو کونجیں قطاروں میں تیر رہی ہیں کم از کم آج تو وہ ان کے ہمراہ رقص کرلے، آج مالا کی فتح کا.. پُرمسرت دن تھا۔ آج مالا کی ان دیکھے اور آنکھوں دیکھے خوف سے آزادی کا دن تھا۔

☆☆☆

اگلے بہت سارے دن جیسے امن اور شانتی کی پھوار لے کر آئے تھے۔ زندگی کی بگڑتی ترتیب میں سنوار اور نکھار آ گیا تھا۔ بگڑتی چیزیں جیسے اپنے اصل مقام تک آ رہی تھیں۔ مگر مالا اتنا ضرور جانتی تھی کہ یہ سکون بھی عارضی ہے۔ ابھی اس کی آزمائش ختم نہیں ہوئی تھی۔ ابھی کچھ اور امتحان باقی تھے۔

اس دن شام سے کچھ پہلے ہیرا کی کال آ گئی تھی۔ وہ اسے میکس کی برتھ ڈے پارٹی کا بتا رہی تھی بلکہ یاد دہانی کروا رہی تھی۔

''سات بجے تک پہنچ جانا..... میں بھی سات بجے تک آؤں گی۔'' ہیرا عموماً ہر قسم کے فنکشن انجوائے کرتی تھی۔ سو اس وقت بھی بہت ایکسائٹڈ تھی۔ مالا کا پہلے تو ارادہ ڈانواں ڈول ہوگیا تھا۔ پھر ہیرا کے اصرار پر اس نے حامی بھرلی تھی۔ پھر جب عیسیٰ سے مالا نے پوچھا تو اس نے بخوشی اجازت دے دی تھی۔ مگر ساتھ تاکید بھی کی تھی۔

''اگر آفاق فارغ ہے تو اسے ساتھ لے جاؤ۔''

جانے اس کے شوہر کو خبیث آفاق پر کیسا اندھا اعتماد تھا؟ مالا کو آفاق زہر لگتا تھا۔ دل تو چاہتا تھا اسے اٹھا کر باہر پھینک دے مگر عیسیٰ کی وجہ سے مجبور تھی۔

مالا نے آفاق سے مارے باندھے ہی پوچھا تھا

کہ وہ مصروف تو نہیں اور آفاق نے بتایا، اس کا گلا خراب ہے، ڈاکٹر کے پاس جا رہا ہے۔ مالا نے تشکر بھری سانس خارج کی تھی۔ وہ آفاق کے ساتھ کہیں بھی نہیں جانا چاہتی تھی۔ ادھر آفاق کے نکلتے ہی اس نے بھی تیاری کر لی تھی پھر چاچو کو بتا کر بس کے ذریعے میکس کے فلیٹ تک آگئی۔ رستے میں اس نے فلاور شاپ سے بوکے خریدا تھا اور کیک کے ساتھ چاکلیٹ کا ایک لارج سائز پیک بھی لیا۔ جب وہ میکس کے فلیٹ کی بلڈنگ تک پہنچی تو میکس اسے نیچے ہی مل گیا تھا۔ اس نے مسکرا کر مالا کا خیر مقدم کیا۔ اور پھر مالا کو بتایا، وہ فلیٹ نمبر [illegible] پر پہنچ جائے۔ دروازہ کھلا ہی ہوگا۔ میکس جلدی میں تھا اور قریبی بیکری میں گھس گیا تھا۔ مالا اسے پکارتی ہی رہ گئی۔ پھر جب وہ لفٹ کے ذریعے مطلوبہ فلیٹ ..... پر پہنچی تو توقع کے عین مطابق دروازہ کھلا ہی ملا تھا۔ اس نے دروازے سے اندر پاؤں رکھا تو کئی طرح کی وقفے، وقفے کے ساتھ آوازیں سنائی دی تھیں۔ پہلی آواز سوزن کی تھی، دوسری مون کی، تیسری آواز آفاق کی تھی۔ مالا کے سر پر دھڑام، دھڑام سماعت آسمان آگرے تھے۔ تو آفاق ڈاکٹر کے کلینک جانے کے بجائے مون کے بلاوے پر ادھر آگیا تھا۔ آفاق نے مالا سے جھوٹ بولا تھا؟ اتنا بڑا ایک اور دھوکا......؟ مالا کا سر گول، گول گھومنے لگا۔ تو گویا آفاق جانتا ہی نہیں تھا۔ مالا کو بھی میکس کی طرف آنا ہے۔ اگر جانتا تو یہاں نہ آتا۔

مالا کو اندر سے قہقہوں کی جھنجھناہٹ نما آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اس کا وجود گویا دھول مٹی ہو رہا تھا۔

"ٹارگٹ کامیابی کے آخری مراحل میں ہے...... بس ایک ہی جھٹکے میں کہانی کا اینڈ ہو جائے گا...... اس فلم کی پروڈیوسر مون حبیب ہے۔" اندر سے مون کی چہکتی آواز سنائی دی تھی پھر کچھ دیر بعد دوسری آواز آئی۔

"اس فلم کا ڈائریکٹر اطلق یعنی کہ میں ہوں..... علی عیسیٰ کی آستین میں آرام فرمانے والا ڈیش، ڈیش اور ڈیش......" آفاق نے قہقہہ لگایا تھا کچھ لمحوں کے بعد سوزن کی آواز آئی۔ وہی مکارانہ آواز..... مالا کو جیسے الیکٹرک شاکس لگ رہے تھے۔

"اور میں فلم کی کاسٹ کا اہم حصہ ہوں...... اس فلم کا نام ہے ترک وفا...... یہ فلم مالا اور علی عیسیٰ کی کہانی پر مبنی ہے۔ اس کا اسکرپٹ مون حبیب نے لکھا ہے اور اسے پروڈیوس بھی مون حبیب نے کیا ہے۔ جبکہ ہم محض کہانی کے اہم ترین کریکٹرز ہیں.....اور ایکٹنگ میں کمال کا فن رکھتے ہیں۔" وہ چالاک لومڑی قہقہہ لگا کر ہنس رہی تھی جبکہ مالا کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔

اندھیرا کیا ہوتا ہے؟ مالا نے اس لمحے جانا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے غبار چھا گیا تھا، سیاہ دھجی دھجی بکھرا گہرا ہوتا غبار..... نکتوں کی شکل میں ابھرتا اور پھر گہرا ہوتا، پھیل پھیل جاتا۔ اس نے دیوار کا سہارا لیا تو دیوار بالشت بھر پیچھے ہٹ گئی تھی۔ دماغ چکی کے پاٹ کی طرح بھاری تھا اور گول، گول گھوم رہا تھا۔ وہ زمین پر گرنے کے قریب تھی یا پھر وہ زمین پر گر گئی تھی یا خلا میں معلق تھی۔ وہ کہاں تھی؟ شاید کہیں بھی نہیں، زمین پر نہ آسمان پر خلا میں، نہ ہوا میں۔

"نیچاں دی آشنائی نوں فیض کسے نہ پایا" کوئی سیف الملوک جھیل پر سر جھکائے بھیگی آواز میں گا رہا تھا۔ مالا کو لگا، اس کا دل پھٹ جائے گا، اس کی سماعتیں، اس کی آنکھیں، اس کا دل، سوچیں کسی گڑھے میں گر رہی تھیں۔ وہ خود بھی تو کسی گڑھے میں گر رہی تھی۔ جہاں اندھیرا تھا، جہاں سانس لینا بھی مشکل تھا۔

وہ دیوار کے ساتھ چپکی گہری، گہری سانس لے رہی تھی، مالا نے اس پل جانا تھا کبھی، کبھی سانس لینا بھی کتنا دشوار ہوتا ہے۔

تالاب کے کنارے پھر کوئی .... پری پیوا اڑے بیٹھی تھی۔ وہ جو روشنی کا مینار تھی اور مالا کو صاف راہ دکھا رہی تھی، اسے سمجھا رہی تھی کہ نیچ لوگ محلوں میں بھی رہیں تب بھی نیچے ہی ہوتے ہیں۔ اور نیچوں کی یاری، دلداری سے اعتبار ہی ٹوٹتے ہیں، بے بیچتی، دکھ اور صدمات ملتے ہیں، اسے لگا، بدیع الجمال پھر اس کے قریب آگئی ہے۔ وہ جھیل سیف الملوک کے ٹھنڈے پانیوں میں اتر کر اسے بتا رہی تھی کہ دکھ اور اچانک صدمے سے سنبھلتے کیسے ہیں؟ وہ اسے مضبوط رہنے اور حوصلہ پکڑنے کی ہمت دلا رہی تھی۔ وہ بدیع الجمال ہی تو تھی جو ایک مرتبہ پھر روشنی کا مینار بنی کھڑی تھی۔ اسے بتا رہی تھی کہ انسان کا بھروسا تب ٹوٹتا ہے جب اللہ پر اس کا بھروسا ہلکا ہوتا ہے۔ زاہد اور متقی بن مشقت کے نہیں بن جاتے۔ درگاہوں اور صحراؤں میں رُلنا پڑتا ہے۔ کسی نے مالا کے کانوں میں امرت قطرہ قطرہ ٹپکا دیا تھا۔ اس کی نیم وا آنکھیں ایک جھٹکے سے کھل گئی تھیں۔ نکتوں کی شکل میں دھجی دھجی بکھرا غبار دھیرے دھیرے چھٹ رہا تھا جیسے اندھیرا کم پڑ رہا تھا۔ جیسے غبار کے پیچھے کوئی ننھا سا جگنو ٹمٹما رہا تھا۔ دور، بہت دور لاکھوں میل کی دوری پہ جھیل سیف الملوک کے بیچ کناروں پہ شیریں نغمے فضاؤں میں بکھرتے سنائی دے رہے تھے۔ کوئی بہت سوز و گداز سے اللہ کی "حمد" پڑھنے میں دنیا بھلائے مگن تھا۔ وہ بھلا کون تھا؟ سیف الملوک یا بدیع الجمال؟ اللہ کی بادشاہی ہمیشہ کی ہے، اسی کا راج ہے، اسی کی حکومت ہے، اسی کے ملک ہیں اور اسی یعنی اللہ کے در پہ سبھی سلامی دیتے ہیں۔ سبھی جھکتے ہیں، آدم، جن اور فرشتے ہردم، ہر جان اللہ کی بندگی میں مصروف اور اسی کے سامنے سربسجود ہیں۔ سیاہ دھجی جیسا اندھیرا کچھ اور چھٹ گیا تھا۔ غبار پہلے سے ہلکا تھا۔ وہ اندھیرے میں آنکھیں کھول سکتی تھی، اسے اندھیرے میں کچھ، کچھ روشنی نظر آرہی تھی، یہ روشنی جگنو کی تھی یا پھر....؟

وہی ہے جو غرور اور تکبر کرنے والوں کے غرور کو توڑ ڈالتا ہے۔ غریب، بے کس، مسکین اور مظلوم کا ساتھی مددگار ہے، کوہ قاف تک روزی پہنچانے والا چرند پرند تک رزق دینے والا وہی اللہ تو ہے۔ پردے جیسے ایک، ایک کر کے کھسک رہے تھے۔ اس نے دیوار پر ہاتھ رکھا تو اس کا چکراتا دماغ ٹھہر گیا۔ اسے گزرے ہوئے کچھ پل یاد آئے تھے، اسے کوئی بات یاد آئی تھی۔

"تم عنقریب، میرے بھائی کی زندگی سے جانے والی ہو، بہت جلد علی عیسیٰ تمہیں طلاق دے دے گا۔" غرور، تکبر سے بھری یہ آواز کس کی تھی؟ مالا عالم بالا میں پہنچ کر بھی اس آواز کو پہچان سکتی تھی۔ اس کا دل ایک مرتبہ پھر لہولہان ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں نم بھر گئے تھے مگر پھر جیسے کوئی سکون کا پھاہا مالا کے وجود پر پڑھ کر پھونکنے لگا تھا۔ جیسے کسی نے مالا کو اپنے محفوظ حصار میں مقید کر لیا تھا۔ اس کے اندر باہر ٹھنڈک اترنے لگی تھی۔

اس نے یقین کو اپنے اندر مضبوط کیا تو اللہ نے اس کے قدم زمین پر مضبوطی سے جما دیے تھے۔ وہ خلا سے باحفاظت زمین پر اتر آئی تھی۔ اس کے قدم زمین پر جم گئے تھے اور وہ نیچ لوگوں کی اوقات پہچان چکی تھی۔

"ٹارگٹ مشکل ضرور ہے پر ناممکن نہیں...... میں چاہتی تو لمحوں کو ایک ہی جھٹکے کے ساتھ ختم کر سکتی تھی۔ مگر ایسی گیم کا مزہ ہی کیا...... جس میں مقابل کو اس کی بے خبری میں مات دی جائے۔" کچھ عرصے بلکہ کچھ دن پہلے تو اس نے اپنے کمرے کی واحد گلاس ونڈو کے دوسری طرف ایک عورت کے زہریلے الفاظ سنے تھے۔ وہ عورت موون اور علی عیسیٰ کی فرسٹ کزن سوزن تھی۔ مالا نے سوزن کی اصلیت پہچان لی تھی اور مالا نے آفاق کی حیثیت بھی سمجھ لی تھی، اب کوئی راز "راز" نہیں رہا تھا جیسے حقیقت

روشن ہو گئی تھی۔ جیسے مالا کے حقیقی دشمن کھل کر اس کے سامنے آ گئے تھے۔ آگہی کا عذاب تکلیف دہ ضرور تھا پر مالا خود کو خوش بخت سمجھتی تھی جسے دوست، اور دشمن کی پہچان بروقت ہو چکی تھی۔ اب مسئلہ یہ تھا وہ علی عیسیٰ کو آفاق کے گھناؤنے روپ اور سوزن کی کریہہ شکل کیسے دکھائے۔ اسے کوئی ٹھوس ثبوت کی اشد ضرورت تھی۔ کوئی ایسی شہادت، کوئی ایسی گواہی جو دلیل بن کر سامنے آتی۔ جو علی عیسیٰ کو یقین کی پہلی سیڑھی سے آخری سیڑھی تک لے جاتی تب وہ سوزن اور آفاق کے اندر کی سیاہی کو کھوج نکالتا۔ وہ مالا کی بات کا اعتبار کر لیتا۔ یہ کام بہت مشکل تھا وہ سب سے برتر تدبیر کرنے والے اپنے رب پر بھروسا کرتی تھی وہی اسے اس مشکل سے نکالنے والا تھا۔

چکنی دیوار سے کمر چپکائے جیسے وہ اپنے حواسوں میں آ چکی تھی۔ چکر کھاتا دماغ اب پُرسکون ہو چکا تھا پھر کچھ دیر بعد اسے تیز قدموں کی آہٹیں سنائی دی تھیں۔ دوسرے ہی لمحے میکس کھلے دروازے سے لدا پھندا اندر آ گیا۔ وہ کاریڈور میں کھڑی تھی اور میکس اسے کسی بت کے مانند کھڑا دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔

"تم اندر کیوں نہیں گئیں؟ یہاں کیوں کھڑی ہو؟" میکس حیران ہوتا ترک کر کے شاپرز سامنے میز پر رکھتا ڈرائنگ روم کا دروازہ کھولنے کے لیے واپس آیا تھا۔ وہی دروازہ جس کے پیچھے بہت سے سیاہ دل والے چہرے موجود تھے۔ جو کچھ عرصے پہلے تک مالا کے لیے بہت محترم تھے۔ آج وہ اپنی غلاظت کے باعث پستیوں میں گر چکے تھے۔ اس نے سختی سے جبڑے بھینچ لیے تھے۔ وہ میکس کو ہینڈل گھماتا دیکھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد دروازہ کھل جاتا اور ان دو لوگوں کی غلیظ صورتیں مالا کے سامنے آ جاتیں۔ وہ قیامت تک ان دو لوگوں کی صورت کبھی نہ دیکھتی گر جو اتنی مجبور نہ ہوتی۔ اسے بالآخر

نظم

نصیب سے نصیب کو نصیب ہو
کہ پیار تیرا مجھے بھی نصیب ہو
جتنا قریب ہوں میں تیرے
اتنا تو بھی میرے قریب ہو
لگ جائے تجھے ایسا مرضِ پیار کہ
میرے سوا کوئی نہ طبیب ہو
ملے مجھے ایسے پیار تیرا کہ
زمانے میں کوئی نہ رقیب ہو

شاعر: بمیرا اختر
مرسلہ: مہوش آفتاب، اسلام آباد

سوزن اور آفاق کا سامنا تو کرنا تھا۔ سوزن جو اجنبی دیس میں مالا کی پہلی دوست تھی، جو اسے بہت مخلص لگی تھی۔ پھر آفاق تھا، عیسیٰ کا ہمراز اور اس کا عزیز دوست...... مالا کو حیرت ہوتی تھی، لوگ اتنے چالباز کیوں اور کیسے ہوتے تھے؟ مخلص رشتے بناتے اور پھر توڑ ڈالتے، مالا کو آفاق نے بہن بنایا تھا اور بہنوں کے ساتھ بھلا کوئی ایسے کرتا ہے؟

وہ ایک مرتبہ پھر نم آنکھوں سے سنہرے ہینڈل کو دیکھ رہی تھی۔ جو کلک کی آواز کے ساتھ کھل چکا تھا۔

"تم اندر کیوں نہیں گئیں.....؟ ڈرائنگ روم میں سوِن موجود تھی۔ تم اس گھر میں آنے والی پہلی مہمان نہیں ہو، سوِن تم سے پہلے کی آئی ہوئی ہے۔ اور باقی لوگ بھی آتے ہی ہوں گے۔" میکس نے مسکرا کر جیسے وضاحت کی تھی۔ وہ اس کا تذبذب سمجھ گیا تھا۔ شاید وہ فلیٹ میں اکیلے ہونے کے خیال سے ڈرائنگ روم میں نہیں گئی تھی۔ میکس اب دروازہ کھولے اسے اندر آنے کا کہہ رہا تھا۔ مالا کے ارادی قدم آگے کی طرف بڑھے تھے... اور دوسرے

ہی لیے جیسے اس کے قدم زمین نے پھر سے جکڑ لیے تھے۔ ڈرائنگ روم کا منظر واضح تھا۔ وہاں سون کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ نہ سوزن اور نہ ہی آفاق ---- پورا کمرا بھاں، بھاں کر رہا تھا۔ یاقوت اور ہیرے سے سجا کراؤن سر پر سجائے سرخ گھنے سلکی بالوں کی اونچی سی پونی بنائے بلاشبہ وہ سون ہی تھی۔ سرخ سلک کی پیروں تک چھوتی روک پہنے، ٹانگ پر ٹانگ رکھے وہ بڑے نخرے اور طمطراق کے ساتھ صوفے پر بیٹھی سامنے کسی ڈیکوریشن پیس کو دیکھ رہی تھی۔ مالا کی موجودگی محسوس کر کے اسے الیکٹرک شاک لگا تھا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ صوفے سے اٹھ گئی تھی۔

"تم نے اسے بھی انوائٹ کر رکھا ہے؟" سون نے غیظ کے عالم میں میکس سے پوچھا تھا۔ اس کے چہرے پر ناقابلِ فہم تاثرات چھائے تھے۔ گویا اسے مالا کی موجودگی نے بہت شاکڈ کیا تھا۔ وہ کم از کم ... مالا کی یہاں توقع نہیں کر رہی تھی۔ اگرچہ اس کے انداز سے یہی ظاہر تھا تاہم مالا کو لگ رہا تھا وہ ڈرامہ کر رہی ہے۔ اسے پہلے سے خبر تھی کہ مالا بھی یہاں آئے گی۔ جبکہ میکس، سون کے الفاظ پر ہکا بکا رہ گیا تھا۔ پھر اس کے چہرے پر خفت سی چھا گئی تھی۔

"مالا سے میری اچھی جان پہچان ہے۔ یہ ہیرا کی دوست ہے اور تمہاری بھابی...... اگر اسے انوائٹ کیا ہے تو تمہیں کیوں برا لگا؟" میکس اپنی شرمندگی مٹا رہا تھا۔ اور مالا کے سامنے سون کی اتنی تلخ بات کا اثر زائل کر رہا تھا۔ جبکہ مالا تو ششدر تھی۔ ڈرائنگ روم میں صرف سون کھڑی تھی تو پھر سوزن اور آفاق کہاں تھے؟ اس نے پاگلوں کی طرح آنکھیں پھاڑ، پھاڑ کر پورا کمرا چھان مارا۔ اسے سوزن اور آفاق کہیں بھی نظر نہیں آئے۔ جانے وہ اچانک کہاں چلے گئے تھے؟ مالا کو دیکھ کر کہاں چھپ گئے تھے؟ اس کی موجودگی محسوس کر کے کس جگہ اور کہاں غائب ہوئے تھے؟ مالا کی آنکھیں صوفے کے پار، پردوں کے پیچھے دروازے کے دائیں،

بائیں دیکھ دیکھ کر تھکنے لگی تھیں جبکہ سون اس کی کیفیات سے بے نیاز مائی فٹ بولتی پیر پٹختی اسی غرور کے ساتھ واپس گھر چلی گئی تھی۔ جبکہ میکس جانے کیا بڑبڑا رہا تھا۔ مالا چونک کر میکس کی طرف متوجہ ہوئی۔

"آفاق اور سوزن کہاں ہیں؟" اس نے کمرے میں میکس کے علاوہ کسی اور کو نہ پا کر متفکر لہجے میں پوچھا تھا۔ وہ سون کے چلے جانے پر قطعاً غور نہیں کر سکی تھی۔ وہ تو صرف آفاق اور سوزن کی آوازوں میں الجھی تھی۔

"وہ دونوں تو نہیں آئے۔ سوزن نے معذرت کر لی تھی جبکہ آفاق......" میکس بولتے، بولتے ایک دم رک گیا تھا۔ جیسے اچانک اسے کچھ یاد آیا تھا۔ جیسے اچانک اسے کچھ خیال آیا تھا۔ پھر وہ سر جھٹک کر کچھ بولنا چاہتا تھا جب کاریڈور سے ہیرا اور ابوبکر کے بولنے کی آواز سنائی دی تھی تب وہ مسکراتا ہوا انہیں ویلکم کرنے باہر نکل گیا...... جبکہ جاتے، جاتے اس نے مالا کی بڑبڑاہٹ سنی تھی۔

"سوزن اور آفاق کہاں چلے گئے؟ ابھی تو یہیں تھے اور میرے خلاف بول رہے تھے۔" مالا کی خود کلامی میکس کو ضرور ٹھٹکا دیتی جو اگر ہیرا کی چہکار اس کا دھیان نہ بٹا دیتی۔ کچھ دیر میں میکس کے گنے چنے مہمان جمع ہو گئے تھے۔ پھر محفل زعفران زار بن گئی تھی۔ میکس نے تالیوں کی گونج میں کیک کاٹا تھا، وہ بچوں کی طرح خوش نظر آ رہا تھا۔ پھر اس نے سب سے پہلے مالا کا شکریہ ادا کیا، سب سے گفٹ وصول کرتے ہوئے وہ خوش ہونے کے ساتھ، ساتھ کچھ افسردہ بھی تھا۔ ابوبکر کے پوچھنے پر اس نے افسردگی سے کہا۔

"کیا تھا جو سوزن بھی میرا دل رکھنے کو آ جاتی۔ مگر اسے دل رکھنا آتا ہی کہاں ہے؟" میکس کا لہجہ نم سا تھا۔ اداس اور غمزدہ سا عجیب سا آنچ دیتا ہوا...... جبکہ مالا تو اس کے الفاظ پر گویا دم بخود رہ گئی تھی۔

"سوزن بھی آ جاتی؟ سوزن آئی تو تھی...... یہ

میکس کیا بے وقوف ہے؟ یا مجھے احمق سمجھتا ہے؟" وہ انتہائی تلخی اور بدگمانی سے سوچ رہی تھی۔ اس نے سوزن اور آفاق کے ساتھ میکس کو بھی اسی کیٹیگری میں کھڑا کر دیا تھا۔ دھوکے بازوں اور فریبیوں کی کیٹیگری میں۔

☆☆☆

وہ ایک بھرپور شام گزار کر جب گھر واپس آئی تو آفاق کو لاؤنج میں کراہتے ہوئے پایا تھا۔ وہ صوفے پر گلا پکڑے لیٹا تھا۔ اور ہائے وائے کیے جا رہا تھا۔ مالا اسے دیکھ کر متحیر رہ گئی تھی۔ کیا آفاق چھلاوا تھا؟ پل میں ادھر اور پل میں اُدھر...... مالا اس پر تین حرف بھیج کر آگے بڑھ رہی تھی جب آفاق نے کراہتے ہوئے اسے پکارا تھا۔

"کیسی بہن ہو، تڑپتے بھائی کو نظر انداز کیے آگے بڑھ رہی ہو؟ رکتی کیوں نہیں؟ بندہ کسی کا احوال ہی پوچھ لیتا ہے۔" وہ کہنی کے بل سر اونچا کیے بڑی دکھی نظر سے مالا کو دیکھ رہا تھا۔ وہ آگے بڑھتے بڑھتے ایک دم رک گئی تھی۔ اسے آفاق کی ڈھٹائی پہ غش سا آ گیا تھا۔ کوئی اتنا ڈھیٹ بھی ہوتا ہے؟ کوئی اتنا بے شرم بھی ہوتا ہے؟ اس کا دل چاہ رہا تھا۔ وہ الٹے قدموں پیچھے ہٹے اور آفاق کے منہ پہ تین چار طمانچے دے مارے۔ اس کا دل چاہا، وہ آفاق کا منہ توڑ کر اس کا کریہہ روپ، اندر کی سیاہی اور منافقت کا سارا کچا چٹھا کھول دے۔ مگر اس کے منہ پہ آیا سارا تلخ کلام ایک ضبط اور صبر کے تیز ریلے میں بہہ گیا تھا۔ اس نے انتظار کی طنابوں کو سختی سے پکڑ لیا۔ وہ تدبیر کرنے والے کی سب سے بہترین تدبیر کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے انتظار کرنا تھا۔ حقیقت کے کھلنے کا، سچائی کے ظاہر ہونے کا اور سون، سوزن، آفاق کی غلیظ پلاننگ کے کھلنے کا تو پھر وہ اتنا سارا انتظار کیوں نہ کرتی۔ جب تک علی عیسیٰ سب کچھ خود بخود نہ جان لیتا...... سو وہ اپنے اندر اٹھتی غصے کی لہروں کو دباتے ہوئے واپس پلٹ آئی تھی۔

"کیا ہوا ہے تمہیں......؟" نفرت اور غصے کو دبا کر بالکل پہلے کی طرح نارمل انداز میں بولنا کس قدر مشکل ترین امر تھا۔ مگر مالا نے یہ مرحلہ بالآخر طے کر ہی لیا۔ وہ آفاق سے کلام کرنے پر خود کو تیار کر چکی تھی۔

"گلے میں بہت درد ہے، دوا بھی لے کر آیا ہوں مگر کچھ افاقہ نہیں۔" آفاق نے تکلیف دہ کراہتی آواز میں کہا تھا۔ یقیناً وہ ہمدردی لوٹنے کے چکر میں تھا اور مالا اتنی رحم دلی کا مظاہرہ کرنے سے کترا رہی تھی۔

"تو صبر کرو، آرام آ ہی جائے گا۔" اس نے تلخی چھپا کر کہا۔

"تب سے صبر ہی تو کر رہا ہوں۔" وہ پھر سے کراہا۔

"تو اب میں کیا کروں......؟" مالا نے منہ بنا لیا تھا۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ اسے خوب کھری کھری سنا کر ہاتھ سے پکڑ کر گھر سے نکال دے مگر اسے صبر کی طناب کو ہاتھ سے نہیں چھوڑنا تھا۔ یہ اس نے خود سے وعدہ کر رکھا تھا اور وہ عہد توڑنے والی بننا نہیں چاہتی تھی۔

"ایک کپ قہوہ بنا دو، مجھے لگتا ہے، قہوے سے افاقہ پاؤں گا۔" آفاق نے مسکین صورت بنا کر فوراً فرمائش جڑ دی تھی۔ اب ہونا تو یہ چاہیے تھا وہ کھٹ سے اسے جواب دے دیتی مگر اس ازلی مروت کا کیا کرتی؟ پھر وہ اپنی بدمزاجی سے آفاق کو چوکنا کرنا بھی نہیں چاہتی تھی، اس کا بدلہ رویہ دیکھ کر یقیناً وہ وجہ کھوج کر محتاط ہو سکتا تھا اور مالا اسے محتاط نہیں کرنا چاہتی تھی، وہ ایسی ہی کسی سازشی پلاننگ میں آفاق اور سوزن کو رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتی تھی۔ خصوصاً اس وقت جب عیسیٰ بھی قریب ہوتا۔ اور اسے پوری امید تھی اللہ اسے بہت جلد ایسا ہی کوئی موقع فراہم کرنے والا تھا۔ ابھی چند گھنٹے پہلے ہی آفاق، مالا کے لیے کتنے بے ہودہ الفاظ بول رہا تھا، وہ اس کا دشمن تھا اور آستین میں بیٹھ کر عیسیٰ پر وار کرنے والا

تھا۔اس کے باوجود یہ مالا کے حوصلے، صبر اور ہمت کی انتہا تھی جو وہ آفاق کے لیے قہوہ بنالائی تھی ورنہ اسے آفاق کے الفاظ بھولے تو نہیں تھے۔

"اس فلم کا ڈائریکٹر آفاق یعنی احلق یعنی کہ میں ہوں...... علی عیسیٰ کی آستین میں آرام فرمانے والا ڈیش، ڈیش اور ڈیش۔۔۔" قہوہ بناتی مالا نے سختی سے آنکھیں میچ لی تھیں۔ کچھ دیر میں وہ قہوہ ابل گیا۔ اس نے مگ میں قہوہ انڈیل کر باہر کی طرف دیکھا۔ آفاق گلا دباتے ہوئے ابھی تک کراہ رہا تھا۔ جانے وہ تکلیف میں تھا یا محض اداکاری کررہا تھا۔ کچھ گھنٹے پہلے کی اپنی بکواس کو کسی ڈرامائی سین کی طرح اسکرپٹ سے غائب کرنا چاہ رہا تھا۔ اس کی کراہیں مالا کو کچھ دیر پہلے کی تکلیف اور زہریلے الفاظ بھولنے پر مجبور نہیں کرسکتی تھیں جب ایک مرتبہ انسان نظر سے گر جاتا ہے تو کبھی دوبارہ اٹھ نہیں پاتا۔ سوزن اور آفاق، مالا کی نظر سے گر چکے تھے۔ اب وہ دوبارہ اپنا مقام زندگی کی آخری سانس تک بھی بحال نہیں کرسکتے تھے۔ کہتے ہیں نا کہ زمین پر گرا انسان اٹھ سکتا ہے، البتہ آنکھ سے گرا کبھی نہیں اٹھ سکتا۔ اسے انسانوں کی پہچان اس سے پہلے نہیں تھی۔ انسانوں کی پہچان اسے اب ہوئی تھی۔ آگہی کا عذاب بہت اذیت ناک ہوتا ہے اور مالا آگہی کے اس عذاب سے گزر رہی تھی۔

اس نے مگ اٹھا کر ٹرے میں رکھا۔ پھر کچھ سوچ کر ٹرے وہیں سلیب پر چھوڑ کر خود باہر آگئی تھی۔ اس نے مگ کو کنڈے سے پکڑ رکھا تھا اور پھر آفاق کو مگ پکڑاتے ہوئے اس نے دانستہ کنڈا نہیں چھوڑا، مجبوراً آفاق کو مگ نیچے سے پکڑنا پڑا تھا۔ گرم قہوے کی وجہ سے مگ بہت گرم تھا۔ آفاق کا ہاتھ بری طرح جل گیا۔

"ہائے، وائے، اوئی...... امی جی۔" آفاق اچھل کر سیدھا ہوا تھا۔ تب تک مالا نے مگ احتیاط سے دور ہٹا کر سینٹرل ٹیبل پر رکھ دیا تھا۔ "جلن بجلی ہو یا زیادہ، مگر ہوتی ضرور ہے۔" اس نے مڑ کر صوفے پر رکھے کشن سیدھے کیے تھے پھر ایک میگزین اٹھا کر دیکھنے لگی۔ جانے یہ میگ کون لایا تھا؟ مالا تو ایک دو صفحات سے زیادہ نہیں دیکھ سکی تھی۔ آج سے پہلے اس گھر میں مالا نے ایسا کوئی بھی میگزین نہیں دیکھا تھا۔

ایک فحش اور بے ہودہ...... اسے میگزین پکڑے دیکھ کر آفاق اپنے ہاتھ کی جلن بھلا کر میگ پر جھپٹ پڑا تھا۔ پھر ایک دم اپنی جگہ سے اٹھا اور تیز، تیز قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ مالا بھی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ گلاس ونڈو کی طرف بھاگی تھی۔ وہی نائیلون کے جالی دار پردے کو ہٹا کر اس نے باہر جھانکا تو آفاق کو میگ پھاڑ کر ڈرم میں پھینکتے ہوئے دیکھ کر کچھ متحیر رہ گئی تھی۔ کچھ دیر بعد آفاق ہاتھ جھاڑتا اندر آگیا۔

"یہ میگزین کون لایا تھا؟ عیسیٰ دیکھ لیتا تو قیامت آجاتی۔" آفاق تیز تیز بولتا گلے میں سے گرر گرر کرتی آواز کے ساتھ کہہ رہا تھا۔ تب مالا کی بھنویں ایک دم تن گئی تھیں۔

"تمہاری اس بات کا مطلب کیا ہے؟ ذرا وضاحت کرو گے؟ یہ میگزین کون لایا تھا؟" مالا نے جیسے اس کے لہجے اور الفاظ کی نقل اتاری تھی۔

"مجھے کیا پتا......؟" آفاق نے کندھے اچکائے تھے پھر مگ اٹھا کر قہوہ سڑ کنے لگا۔ اس کی...... بے نیازی نے مالا کا اشتعال کچھ اور بڑھا دیا تھا۔

"تو پھر کیا یہ بے ہودہ میگ میں لائی ہوں؟" اس کی آنکھوں سے شرارے نکلنے لگے تھے۔ انتہائی بے ہودہ تصویروں والا وہ رسالہ جس پر مالا نے دوسری نگاہ بھی نہیں ڈالی تھی اور اسے اپنے گھر کے نیوز پیپر ریک میں دیکھ کر اسے غصہ تو آنا ہی تھا۔

"میں نے یہ تو نہیں کہا......؟" آفاق اس کے غصے سے ایک دم سہم گیا تھا۔ (ایکٹر نہ ہو تو) وہ خوں رنگ آنکھوں سے مسلسل اسے گھور رہی تھی۔

"تو پھر......؟" وہ اسے بخشنے والی نہیں تھی۔

آفاق کچھ ہونق ہو گیا۔

"تم کیا سمجھ رہی ہو، یہ میگزین میں لایا ہوں؟" آفاق نے سنجیدگی کے ساتھ پوچھا تھا۔ قہوہ پینے سے گلے کو تقویت ملی تو وہ بھی فارم میں آ گیا۔

"پھر کون لایا ہے؟ عیسیٰ؟ میں یا چاچو......؟"

مالا کے تیور غضبناک تھے۔ آفاق پھر سے سہم گیا۔ ڈرامے باز صاف ایکٹنگ کرتا نظر آ رہا تھا۔

"آئی سوئیر مالا......! مجھے اتنے بے ہودہ رسالے خریدنے کا کوئی شوق نہیں۔" آفاق اب... بڑی عاجزی سے کہہ رہا تھا۔ کچھ دیر بعد یہ بے مقصد بحث عیسیٰ کی آمد کے ساتھ ہی ختم ہو گئی تھی۔ عیسیٰ کے آتے ہی مالا کو میکس کی پارٹی میں مون، سوزن اور آفاق کی بکواس پھر سے یاد آ گئی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ فوراً آفاق کا کچا چٹھا کھول کر رکھ دے مگر بعض قوی خواہشات جتنی بھی قوی ہوں ان کو پورا کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ وہ بھی بے بس ہو کر رہ گئی تھی۔ ایک انتظار کی زنجیر میں بندھ گئی تھی۔ وہ قبل از وقت، کچھ بھی بول کر عیسیٰ کو بدگمان کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اپنا اعتبار ہلکا کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی خواہش تھی کہ عیسیٰ خود سوزن، مون اور آفاق کی اصلیت کھوج نکالے، ان کی مکاری، عیاری اور سازش کو سمجھے اور ایسا ناممکن تو ہرگز نہیں تھا۔

عیسیٰ کے آتے ہی مالا کی مصروفیات بڑھ جاتی تھیں، اسے سوچنے کا بھی وقت نہیں ملتا تھا۔ ان دنوں عیسیٰ رات کو بھی گھر میں رہتا تھا سو وہ بے نام سا خوف اور عجیب سی آہٹیں سنائی نہیں دیتی تھیں۔ کبھی، کبھی مالا کو لگتا تھا یہ اس کے اپنے ہی ذہن کے وسوسے ہیں، سو وہ سر جھٹک کر نظر انداز کر دیتی تھی ویسے بھی بڑے دنوں سے وہ سفید لبادے میں لپٹی عورت دکھائی نہیں دی تھی۔ مالا کی ماری ہوئی گولی نے جیسے گولی کا کام کیا تھا۔ وہ دوبارہ دکھائی ہی نہیں دی۔ حالانکہ مالا کو اس سے دوبارہ ملاقات کا خاصا اشتیاق تھا۔

چونکہ بہت دنوں سے کوئی عجیب واقعہ رونما نہیں ہوا تھا سو چاچو سمیت سبھی دلی اطمینان محسوس کر رہے تھے۔ حالانکہ جانتے بھی تھے کہ یہ اطمینان بس عارضی ہے۔ تاہم کچھ دن تک سکون سے تو رہا جا سکتا تھا۔ اس دوران آفاق نہ جانے کہاں سے ایک بزرگ خاتون کو دریافت کر لایا تھا۔ جنہوں نے پورے گھر کے کونے، کونے پر زعفران اور گلاب کے عرق میں بھیگے تعویذ والے پانی سے چھڑکاؤ کیا تھا پھر بلند آواز میں قرآنی آیات کی تلاوت پورے تین دن تک کرتی رہی تھیں۔ جرمنی میں ایسی نگینہ بزرگ عورت کو دیکھنا بہت تعجب انگیز تھا۔ پھر مالا کو پتا چلا کہ یہ بزرگ عورت ڈاکٹر ابوبکر کی والدہ ہیں جو ایران سے آئی تھیں اور ان کے پاس روحانی علم تھا۔ ہیرا کی سانس سے مل کر مالا کے بہت سے وسوسے خود بخود ختم ہو گئے تھے۔ بالہ صاحبہ نے بتایا تھا ان کے گھر پر کوئی بھی آسیب نہیں ہے۔ مالا اپنے دل سے ہر وہم نکال دے۔ انہوں نے مالا کو کثرت سے ذکرِ الٰہی کے متعلق ہدایات دی تھیں اور جاتے، جاتے انہوں نے انکشاف کیا تھا کہ مالا کسی کی بدنظر کے حصار میں ہے اور ستاروں کی نحوست کا اس پر اثر ہے۔ بالہ صاحبہ ایک ہفتے کے لیے جرمنی آئی تھیں۔ انہیں جلد واپس چلے جانا تھا۔ اور مالا چاہتی تھی کہ جانے سے پہلے وہ ان کی دعوت کرے۔ اس ضمن میں اس کا پروگرام بھی طے ہو چکا تھا جو جلد ہی ترتیب پایا اس روز کھانے کے دوران بھی مالا یہی ڈسکس کرنا چاہتی تھی مگر آفاق اور عیسیٰ نے ایک الگ موضوع چھیڑ رکھا تھا۔ وہ نوٹ تو کب سے کر رہی تھی کہ آفاق، عیسیٰ کے کانوں میں گھسا ہوا ہے مگر اپنی سوچوں میں گم ہونے کی بیماری کے باعث وہ ان کی گفتگو سننے سے محروم رہ گئی تھی۔ اب جبکہ وہ ان دونوں کی طرف متوجہ ہو چکی تھی تو وہ دونوں ہی منہ بند کیے کھانا کھانے میں مگن ہو چکے تھے۔ عیسیٰ کے چہرے پر...

بے نیازی تھی جبکہ آفاق کا منہ پھولا ہوا تھا۔ جانے ان کے درمیان کیا بات ہوئی تھی؟ مالا کو فطری سا تجسس ہونے لگا تھا۔ کچھ دیر بعد آفاق نے خود ہی بات چھیڑ دی۔ وہ زیادہ دیر چپ نہیں رہ سکتا تھا۔

"تمہیں میرا کچھ احساس ہی نہیں......" وہ دکھی سا نظر آرہا تھا۔ لہجے میں ہزاروں شکوے تھے۔ مالا کو اس کی اداکاری پر سخت تاؤ آنے لگا تھا۔ خصوصاً جب وہ مسکین سی شکل بنا کر اپنی کوئی بھی بات عیسیٰ سے منوالیتا تھا۔ اور عیسیٰ ایسا نرم دل تھا کہ اس فوراً پسیج جاتا۔

"تمہارا احساس نہ ہوتا تو تم میرے سامنے بھی بیٹھے نہ ہوتے۔" عیسیٰ نے پانی کا گلاس اٹھا کر لبوں سے لگالیا تھا جو کچھ دیر پہلے مالا نے بھر کے رکھا تھا۔ وہ معمول کے مطابق عیسیٰ کی پلیٹ میں کچھ نہ کچھ رکھتی جارہی تھی۔ حالانکہ پہلے یہی معمول عیسیٰ کا تھا مگر اب مالا نے اس کی گدی سنبھال لی تھی۔ آفاق سے یہ منظر دیکھا نہیں گیا تھا، فوراً منہ بسور کر بولا۔

"تم چاہتے ہی نہیں، میرا بھی کوئی خیال رکھے مالا کی طرح......" آفاق کے دکھ کا پس منظر سمجھتے ہوئے مالا کے منہ میں کڑوے بادام آگئے تھے۔ یقیناً وہ انی سے شادی کی بات کررہا تھا۔ ایک منافق، فریبی اور مکار شخص معصوم سی انی کو اپنے جال میں پھانسنے والا تھا۔ کیا خبر، آفاق کی اس میں بھی پلاننگ شامل ہو...... وہ پیپرز بنوا کر انی کو چھوڑ دے یا کوئی اور بڑا اڑان لے جائے۔ بھلا منافق اور جھوٹے لوگوں پر بھروسا کیا جاسکتا ہے؟ مالا کے اندر یا ہر بے چینی بھر گئی تھی۔ وہ اپنی مخلص سہیلی کو کیسے اس فراڈیے سے بچا پائی؟

"میں کیوں نہیں چاہوں گا......؟" عیسیٰ نے کھانا ختم کرکے نیپکن سے ہاتھ پونچھے تھے۔ اب وہ فراغت کے ساتھ آفاق کو لاجواب کرسکتا تھا۔ "میں تو چاہتا ہوں، کل کے بجائے آج تمہارا نکاح پڑھادوں...... کم از کم تمہاری بدنظر کا تو کس تو بدلے گا۔ ضرور تم میری اور مالا کی محبت کو نظر لگانے والے ہو۔" وہ آنکھوں میں شرارت بھرے اسے چھیڑ رہا تھا۔ عیسیٰ کی توقع کے عین مطابق وہ فوراً برامان گیا۔

"میں کیوں نظر لگاؤں گا۔ بھلا بہنوں کے شوہروں کو نظر لگائی جاتی ہے؟" اس پل جو بھولپن آفاق نے اپنے چہرے پر چپٹ کررکھا تھا مالا کو ایک دم مذ ماسک لگا۔ اس کا دل چاہا، آفاق مکار لومڑے کا منہ ہی نوچ لے۔ مگر وہ یہ سب صرف سوچ سکتی تھی۔ عمل کرنا آسان نہیں تھا۔

"اب مسکہ مت لگانا...... میں اپنی .... بے غم (بیگم) کے ہاتھ کا لذیذ کھانا کھا کر فل ہوچکا ہوں۔" عیسیٰ نے مسکرا کر جتایا۔

"تو پھر تنگی سے کچھ آگے بھی بڑھو۔" آفاق بری طرح چڑ گیا۔

"ہوں...... تو یہ بات ہے۔" وہ گویا سمجھ کر مسکرایا تھا۔ آفاق نے فوراً باچھیں کھلالیں۔

"جی ہاں...... یہی بات تو تھی۔" آفاق ضرورت سے زیادہ ہی ایکسائٹڈ ہوگیا۔

"بھلا کون سی......؟" عیسیٰ نے اگلے ہی لمحے اس کی پوری ایکسائٹمنٹ کا بیڑا غرق کردیا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پھر منہ پھلا کر بیٹھ گیا۔

"بھاڑ میں جاؤ تم۔" آفاق کو غصہ آگیا۔ ادھر مالا برتن اٹھاتی ٹھٹک کررک گئی تھی۔

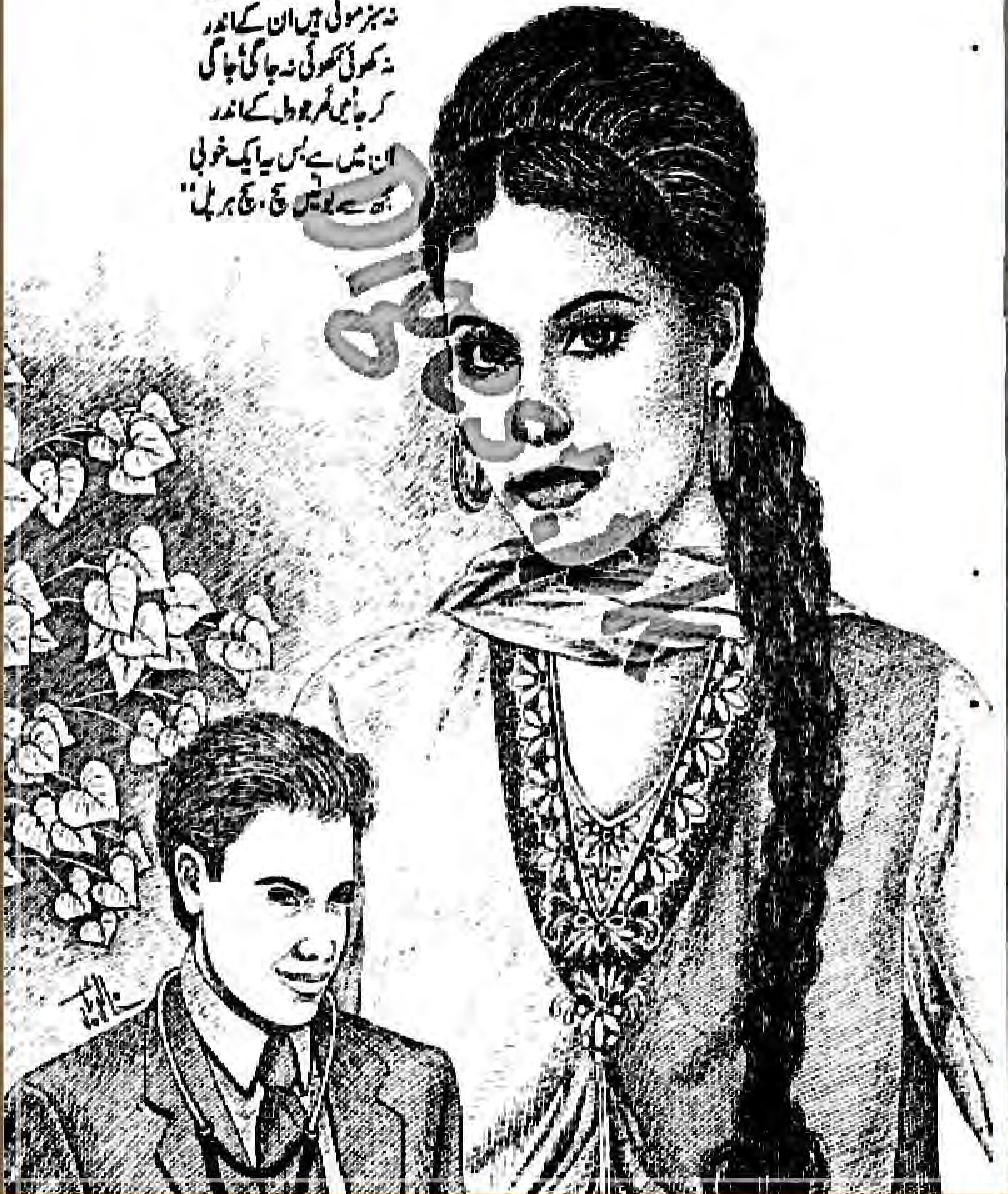
"بھاڑ میں جاؤ تم......" وہ زیرلب بڑبڑاتی پھر جیسے پھٹ پڑی۔ "اور تم بھی۔" مالا کا ردعمل اچانک سامنے آیا تھا۔ وہ دونوں بری طرح سے چونکے تھے۔ مالا ان کے تاثرات دیکھنے رکی نہیں تھی بلکہ فوراً ہی کچن میں چلی گئی۔ آفاق اس کی بات پر کچھ دیر تک کے لیے بھونچکا رہ گیا تھا پھر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

> مالا کی زندگی کس نہج پر جا رہی تھی وہ خود بھی سمجھنے سے قاصر تھی کیا علی عیسیٰ بھی مالا کے ساتھ "کھیل" کھیل رہا تھا؟ یہ سب جانیے اگلے ماہ کے شمارے میں

محبت مسکراتی ہے

حمیرا احسان

"اس کی آنکھیں کتنی سندر
نہ تو ان میں چھپے سمندر
نہ نیلی جھیلیں ہی کہہ سکتے ہیں
نہ سبز موتی ہیں ان کے اندر
نہ کھوئی کھوئی نہ جاگی جاگی
کر جائیں گھر جو دل کے اندر
ان میں ہے بس یہ ایک خوبی
مجھ سے بولیں سچ، سچ ہر پل"



لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لیے آنکھیں موندے وہ بہت خوب صورت لب و لہجے میں بار بار ایک ہی نظم دُہرائے جا رہا تھا۔

''اب بتا بھی دے کون ہے وہ؟'' شرجیل جو کافی دیر سے اسے سن رہا تھا آخر پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔ شرجیل کی آواز پر صارم نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔

''کیا بتاؤں؟''

''وہی جس کے لیے تم نے کئی دن سے یہ نظم پڑھ، پڑھ کر میرا دماغ خراب کر رکھا ہے۔'' شرجیل نے کہا۔

''مجھے یہ نظم پسند ہے اسی لیے پڑھتا ہوں۔'' صارم نے فوراً ہی اجنبی لہجہ اختیار کرلیا۔

''اچھا بچو..... اب ہم سے بھی پردہ، شرافت سے بتا دو ورنہ دیکھ لو میں دادی اماں کو کہہ دوں گا کہ تم فائزہ کے عشق میں دیوانے ہو رہے ہو بہتر ہے جلد از جلد اسے تمہاری زندگی کا حصہ یعنی شریکِ حیات بنا دیا جائے۔''

''اوئے، اوئے رک تو سہی۔'' شرجیل سنجیدگی سے کہہ کر کمرے سے جانے لگا تو صارم کی جان پر بن آئی۔ جانتا تھا کہ اگر ایک بار دادی اماں کے کان میں یہ بات پڑ گئی تو پھر وہ لاکھ سر پٹخے شادی اسے فائزہ سے ہی کرنا پڑتی کیونکہ دادی اماں خود دل و جان سے یہی چاہتی تھیں۔ وہ تو صارم نے جانے کون، کون سی قسمیں اور محبت کے واسطے دے کر انہیں ایسا کرنے سے روکا ہوا تھا ورنہ اب تک تو وہ دو چار بچوں کا ابا حضور بھی بن چکا ہوتا۔ ایسا نہیں تھا کہ فائزہ میں کوئی برائی تھی بات صرف اتنی تھی کہ ان دونوں کے مزاج میں زمین، آسمان کا فرق تھا اور اسی لیے صارم کو ہی نہیں فائزہ کو بھی اس رشتے پر شدید قسم کے اعتراضات تھے۔

''چل بتا پھر کون ہے وہ؟'' شرجیل اپنی بلیک میلنگ کے کامیاب ہونے پر مسکراتا ہوا پوچھنے لگا۔

''یار میں اسے نہیں جانتا، میرا مطلب ہے اس کا نام پتا نہیں معلوم۔''

''تو تجھے معلوم کیا ہے ڈفر.....؟''

''بس اتنا پتا ہے یار کہ اس کی آنکھیں بہت خوب صورت ہیں اس کے چہرے پر جو معصومیت ہے وہ میں نے پہلے نہیں دیکھی لیکن ایک بات مجھے بالکل پسند نہیں، اس کی خوب صورت آنکھوں کی اداسی مجھے بالکل پسند نہیں، جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تب سے ہی میرا دل چاہا اس کی آنکھوں سے وہ اداسی چرالوں اور وہاں مسکراہٹ رکھ دوں۔'' شرجیل خاموشی سے بیٹھا اسے سن رہا تھا آخر صارم کو ہی احساس ہوا۔

''تم خاموش کیوں بیٹھے ہو کچھ کہو ناں......''

''میاں مجنوں تمہاری رام کہانی ختم ہو تو میں کچھ بولوں ناں......'' شرجیل نے پہلی بار اسے کسی لڑکی کے بارے میں اس طرح بات کرتے سنا تھا۔

''تو کیا خیال ہے پھر پتا لگائیں؟''

''کیا......؟''

''بھئی ان خوب صورت آنکھوں کی اداسی کا راز، آخر میرے یار نے ان آنکھوں کو مسکراہٹ دینے کا عہد جو کرلیا ہے۔'' شرجیل کے کہنے پر صارم بے اختیار اس کے گلے لگ گیا۔

''یو آر مائی بیسٹ فرینڈ۔''

''آئی نو آئی نو مگر کاش میرا بھی کوئی بیسٹ فرینڈ ہوتا۔'' شرجیل کے مصنوعی دکھ سے کہنے پر صارم نے اس کی پشت پر مکا رسید کیا۔

''مار ڈالا ظالم۔'' شرجیل نے دہائی دی۔

''اور ماروں گا اگر ایسی بکواس پھر کی تو۔'' صارم کی دھمکی سن کر شرجیل ہنس پڑا۔

☆☆☆

''اللہ مجھے معاف کرے، رمضان کے مہینے میں ایسے، ایسے کام کرتا پھر رہا ہوں۔''

''کیسے، کیسے کام.....؟''

"کسی لڑکی کا پیچھا کرنا اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا کیا شریف لڑکوں کا کام ہے؟" ٹھنڈے پانی کی بوتل منہ سے لگاتے ہوئے شرجیل نے سوال کیا۔

"او مائی گاڈ یعنی تم نے اپنی بھابی کے بارے میں ساری معلومات بھی حاصل کر لیں، دل خوش کر دیتا یار۔"

"بھابی .....؟ کون بھابی اوہ اچھا تم عانیہ کی بات کر رہے ہو۔"

"اس کا نام عانیہ ہے؟ اور ابھی سب بتانا اس کے بارے میں۔" صارم فورشوق سے صوفے سے پھسل کر شرجیل کے قدموں میں آبیٹھا۔

"بتاتا ہوں یار ایک تو پیچھا کر کر کے میری ٹانگیں بری طرح درد کرنے لگی ہیں۔" سامنے میز پر ٹانگیں پھیلاتے ہوئے اس نے ایسے کہا جیسے گاڑی پر نہیں بلکہ پیدل جا کر ساری معلومات لایا ہو۔

"اچھا اب زیادہ بکواس نہ کر بتانا ہے تو بتا ورنہ رہنے دے۔" صارم بھی اسے اچھی طرح سمجھتا تھا بھی دانستہ بے پروائی دکھائی۔

"بڑا خبیث ہے تو یار سب .... کیا، کیا کرتا ہوں تیرے لیے لیکن تو ذرا جو احسان مند ہوا ہو کبھی؟ عانیہ نام ہے اس کا دو بہن بھائی ہیں، باپ کی ایک سال پہلے ڈیتھ ہو گئی تب سے یہ دونوں بہن بھائی اپنی ماں کے ساتھ رہتے ہیں، بھائی اسکول میں پڑھتا ہے، باپ مکینک ہوا کرتا تھا اس کے بعد گھر چلانے کے لیے عانیہ نے ایک اسکول میں جاب کر لی اور ہاں میں بتانا بھول گیا عانیہ نے میتھس میں ایم ایس سی کیا ہوا ہے۔"

"تو اس کی آنکھوں کی اداسی کی وجہ اس کے گھر کے حالات ہیں؟" سب سننے کے بعد صارم نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں وجہ یہ بھی ہے لیکن آئی تھنک اصل وجہ

ایک تحقیقی رپورٹ

تازہ ترین تحقیق کے مطابق مال دار مردوں کی بیویاں اپنی ازدواجی زندگی میں زیادہ خوش اور مطمئن نظر آتی ہیں اس کی اصل وجہ کیا ہو سکتی ہے؟

جواب یہ بھی کہ انہیں پیسے کی فراوانی کی وجہ سے دال آٹے کا بھاؤ نہیں معلوم ہو پاتا اور پیسے کی بہتات کی وجہ سے ان کا جھوٹ بولنا بھی گھوڑے کرکٹ کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ تو کوئی انہیں ان کی اوقات بھی یاد نہیں دلا سکتا۔

مرسلہ: زرین زبیر کوٹھاری، کراچی

ہے اس کا منگیتر ....." شرجیل نے جیسے ایٹم بم ہی تو پھاڑ دیا تھا۔

"منگیتر ......! اس کی منگنی بھی ہو گئی۔"

"ہاں ہو گئی تھی لیکن اب ٹوٹ گئی ہے کیونکہ منگیتر صاحب کو اس سے بہتر مطلب ہے امیر لڑکی مل گئی ہے۔"

"تو اس لیے اس کی آنکھیں اداس رہتی ہیں، اس لڑکے سے بچھڑنے کے غم میں ....." صارم کے دل میں ٹیس اٹھی تھی۔

"اتنی جلدی، جلدی سارے نتیجے مت نکالو میرے بھائی ذرا صبر سے کام لو پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر وہ اپنا رشتہ ختم ہونے پر بھی غمزدہ ہے تو یہ کوئی غلط بات نہیں ہے۔ اسے تو نہیں پتا ناں کہ کوئی اس کی آنکھوں کو دل میں بسائے دس فٹ دور بیٹھا آہیں بھرتا رہتا ہے، دوسری اور اصل بات یہ رشتہ اس نے مجبوری میں کیا تھا کیونکہ وہ لڑکا اسے ذرا بھی پسند نہیں تھا لیکن ماں باپ کے دباؤ کی وجہ سے اسے یہ منگنی کرنا پڑی تھی اس لیے منگنی ٹوٹنے پر وہ سکھ کا سانس تو لے سکتی ہے لیکن غمزدہ نہیں ہو سکتی، بات یہ ہے کہ اس کے منگیتر نے

منگنی توڑنے کے لیے عانیہ کا کاندھا استعمال کیا ہے اور یہ کہہ کر منگنی توڑ دی ہے کہ اسے عانیہ پر بھروسا نہیں ہے، اس کا کسی اور کے ساتھ چکر ہے اور تم سمجھ سکتے ہو کہ ایسے میں لڑکی کی لائف کتنی مشکل ہو جاتی ہے۔"

"الو کا......"

"شرم کرو یار روزے میں گالی دے رہا ہے۔"

"سوری میرے اللہ میاں......" صارم نے فٹ معافی مانگی۔

"ویسے بھی تجھے اس گدھے کا شکر گزار ہونا چاہیے اگر وہ منگنی نہ توڑتا تو، تو ہمیشہ کے لیے ٹھنڈی آہیں بھرتا رہ جاتا۔"

"ہاں یار یہ تو ہے۔" شرجیل کے کہنے پر صارم کو خیال آیا۔

☆☆☆

"کون آیا تھا امی......؟" وہ اکیڈمی سے تھکی ہاری لوٹی تو گلی میں ہی اس کی پڑوسن فرخندہ نے اس سے پوچھا تھا کہ آج ان کے گھر کون لوگ آئے تھے مگر ظاہر ہے وہ لاعلم تھی۔

"کچھ لوگ آئے تھے بیٹا، اپنے بیٹے کے لیے تمہارا رشتہ مانگنے...... بہت بڑے لوگ لگ رہے تھے۔" ان کی بات پر انہیں حیرت سے دیکھتے ہوئے......

اس نے ماں کی کہی ہوئی بات سن کر ایک نظر اپنے در و دیوار پر ڈالی اور مایوسی سے گردن ہلا دی۔

"غلطی سے آگئے ہوں گے امی۔" پچھلے کچھ عرصے سے وہ بہت زیادہ حقیقت پسند ہو چکی تھی۔

"ارے نہیں بیٹا، ان کے ساتھ بشریٰ بی بی بھی تھیں اور انہوں نے تمہارا نام لے کر رشتے کے بارے میں بات کی تھی وہ تمہارے بارے میں سب جانتے ہیں۔" انہوں نے علاقے کی ایک معزز خاتون کا حوالہ دیتے ہوئے اسے یقین دلانا چاہا۔

"میرے بارے میں سب جانتے ہوئے بھی وہ رشتہ لے کر آئے...... پاگل تھے کیا؟"

"ایسا کیوں سوچتی ہو عانی، خدا اسی طرح اپنے بندوں پر مہربان ہوا کرتا ہے۔" بیٹی کے لہجے کی تلخی اور مایوسی نے انہیں اداس کر دیا۔

"جو کچھ بھی ہو امی، آئندہ وہ لوگ آئیں تو انکار کر دیجیے گا، مجھے شادی نہیں کرنی، ایک ہی تجربہ کافی ہے میرے لیے۔" ان کے لہجے کی اداسی کو نظر انداز کرتی وہ تلخی سے کہتی اپنے کمرے میں جا گھسی۔

انہوں نے بڑی بے چارگی سے کمرے میں جاتی بیٹی کو دیکھا، جانتی تھیں کہ اس کی یہ نہ ہاں میں نہیں بدلے گی جبکہ وہ خود تو سوچوں ہی سوچوں میں عانیہ کو ایک بڑے پیارے سے گھر میں پیار کرنے والے لوگوں کے درمیان چلتے پھرتے بھی دیکھ چکی تھیں۔

☆☆☆

"لیکن انکار کی کوئی وجہ تو بتائی ہو گی انہوں نے؟" صارم کو ایسے صاف جواب کی امید نہیں تھی۔

"بتایا تو ہے ان کی بیٹی نے رشتے سے انکار کر دیا ہے وہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

"مگر کیوں......؟"

"مجھے کیا پتا شاید محترمہ پچھلے تجربے کی تلخی سے نہیں نکلیں ابھی تک، کسی اور پر اعتبار نہیں کرنا چاہتیں۔"

"ہوں......ں......"

"دیکھو صارم تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہ لوگ ہمارے لحاظ سے...... میرا مطلب ہے کہ کلاس ڈفرنس ہی بہت بڑی وجہ بن جایا کرتا ہے ایسے معاملات میں۔ مگر یہ ہم سب لوگوں کی تمہارے لیے محبت کی انتہا ہی ہے کہ تمہارے جذبات کے بارے میں جان کر اسے بنا دیکھے، بنا ملے ہی دل و جان سے قبول کر لیا، رشتہ بھی لے گئے اب اگر وہ نہیں مانتی تو اس میں کوئی کیا کر سکتا ہے، بھول جاؤ سب کچھ اور شکل ٹھیک کروا بچے، تمہیں اس حلیے اور موڈ میں دیکھ کے سارے پریشان ہو رہے ہیں۔" صارم نے کچھ بھی کہے بنا اثبات میں گردن ہلا دی، شرجیل اس کے

کندھے پر نرمی سے تھپکی دیتا وہاں سے اٹھ گیا جانتا تھا کہ صارم کو اس وقت تنہائی کی بہت ضرورت ہے، اس طرح اسے خود کو سمجھانے میں مدد ملے گی۔

"سب ٹھیک ہو جائے گا۔" شرجیل نے مڑ کر ایک نظر سر جھکا کر بیٹھے صارم پر ڈالتے ہوئے شاید خود کو تسلی دی۔ ادھر صارم کسی اور ہی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا وہ جنگ لڑے بنا ہار ماننے کو تیار نہیں تھا۔

☆☆☆

"جی فرمائیں کس سے ملنا ہے آپ کو.....؟"

"آپ سے.....!" ملازم کے کہنے پر کوئی اس سے ملنے آیا ہے وہ اکیڈمی کے آفس میں آئی تھی۔ اتفاق سے اس وقت کوئی ٹیچر وہاں نہیں تھا اس وقت سبھی مصروف ہوا کرتے تھے۔ صوفے پر ایک اجنبی شخص کو بیٹھا دیکھ کر اسے لگا ملازم کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے لیکن اجنبی کے جواب نے اسے حیران کیا تھا۔

"پلیز تشریف رکھیں۔" وہ جو اس کے آنے پر احتراماً کھڑا ہو گیا تھا اسے بیٹھنے کا اشارہ کرتا اس کے سامنے والے صوفے پر آ بیٹھا۔

"میرا نام صارم رحمان ہے، کچھ دن پہلے ہی میرا ہاؤس جاب کمپلیٹ ہوا ہے فی الحال فارغ ہوں مگر جلدی ایک اچھی جاب تلاش کر لوں گا ویسے تو کلینک بنانے کا آپشن بھی ہے میرے پاس لیکن ابھی میں نے کوئی فیصلہ نہیں کیا ہے، خیر یہ تھا میرا تعارف، اب آپ یقیناً میری یہاں موجودگی کی وجہ جاننا چاہیں گی..تو وجہ ہیں آپ، کچھ دن پہلے میرے گھر والے ایک ریکویسٹ لے کر آپ کے گھر آئے تھے لیکن آپ نے منع کر دیا تو مجھے ایسے میں آپ سے ملنے آنا پڑا، آئی ایم سوری مگر اس کے علاوہ مجھے کچھ نہیں سمجھ آیا۔" اب عانیہ کو سمجھ آ گئی تھی کہ وہ کون تھا لیکن اب بھی وہ حیران تھی کہ اس کے انکار کے بعد بھی وہ یہاں کیوں چلا آیا تھا اور یہی سوال اس کی آنکھوں میں دکھائی دیا تو اس کے پوچھنے سے پہلے صارم بول پڑا۔

"آپ کو شاید عجیب لگے مگر یہ سچ ہے کہ آپ کی آنکھیں بہت بولتی ہیں اور ان کی ہر بات مجھے سمجھ آتی ہے اور ان بولتی آنکھوں میں تیرتی اداسی میرے دل کو بے چین کیے ہوئے ہے، میرا آپ سے کوئی رشتہ نہیں مگر میرے دل نے آپ سے کوئی رشتہ بنا لیا ہے، میں آپ کے ہونٹوں پر سچی ہنسی اور آنکھوں میں مسکراہٹ دیکھنا چاہتا ہوں اور اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں، شاید اسے ہی محبت کہتے ہیں۔" وہ بولنے پر آیا تو بولتا چلا گیا اور اس کے لہجے کی سچائی عانیہ کے دل کو چھونے لگی۔

"میرا ماضی جاننے کے بعد بھی آپ ایسا سوچتے ہیں؟" وہ نم و افسردہ لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"ہاں..کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم اتنی ہی پاکیزہ ہو جتنی کہ کوئی بھی لڑکی ہو سکتی ہے۔" صارم کے یقین سے کہنے پر نہ جانے کیوں عانیہ کی آنکھیں بھر آ گئیں، آنسو اس کی آنکھوں سے موتی بن کر برس رہے تھے اور صارم خاموشی سے کھڑا اسے دیکھ رہا تھا۔ جانتا تھا بارش کے بعد آسمان نکھر جایا کرتا ہے اور وہ نظارہ بہت دلفریب ہوتا ہے۔

"تو میں اپنے گھر والوں کو دوبارہ کب بھیجوں؟" وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتا پوچھ رہا تھا۔ جہاں اس کے سوال پر دھنک اتر آئی تھی۔ صارم نے مسکراتے ہوئے اس حسین منظر کو اپنی یادوں کے ذخیرے میں محفوظ کر لیا۔ "میری عانیہ کا خیال رکھنا۔" جاتے جاتے وہ یاد دہانی کرانا نہیں بھولا تھا اور عانیہ مسکراتے ہوئے اپنے دل کی کایا پلٹ پر حیران ہو رہی تھی۔

"شاید سچے جذبوں میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ لمحوں میں تسخیر کر لینے کے فن سے واقف ہوتے ہیں۔" عانیہ کو کہیں پڑھا یہ جملہ یاد آیا اور وہ مسکراتے ہوئے اعتماد سے قدم اٹھاتی کلاس کی طرف بڑھ گئی۔

شامِ شہرِ یاراں

عنیزہ سید

آخری قسط

زندگی اور محبت کے رنگ کبھی کوئی گن نہیں سکا ہے۔۔۔ خیر و شر، نیکی اور بدی۔۔۔ زندگی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر ایمان کی طاقت۔۔۔ ہر برائی پر حاوی ہو جاتی ہے اور اسی طاقت کی بدولت صحرا بھی ستاروں کا آنگن بن جاتا ہے۔

ہماری مایہ ناز مصنفہ عنیزہ سیّد نے اس ناول میں صحرا کی ریت میں کس طرح پھول اگائے ہیں یہ آپ کو ناول پڑھ کر ہی پتا چلے گا۔

رنگ و خوشبو کے حُسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے





"اب کیا ہوا نادر؟" نادر ان لوگوں کو وہیں کھڑا چھوڑ کر زوئی کی طرف آیا تو اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔ "شہباز صاحب کا پتا چل گیا کیا انہیں؟"

"نہیں زوئی اس بار وہ صرف پتا چلانے نہیں آئے......" نادر سنجیدگی سے بولا۔ "اس بار وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جانے آئے ہیں۔"

زوئی کے قدموں کے نیچے سے زمین نکل گئی تھی۔

"نہ صرف تمہیں بلکہ شہباز صاحب کو بھی۔"

"شہباز صاحب بے چارے کو بھی؟" زوئی کو پہلے سے زیادہ یہ جملہ سن کر تکلیف ہوئی تھی۔

"ہاں...... تمہیں جلدی جانا ہوگا۔" زوئی کو نادر کے لہجے اور رویے پر حیرت ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کسی پریشانی کے آثار نہیں تھے، وہ مطمئن تھا اور پرسکون بھی جیسے کسی بلا کے ٹل جانے پر ہوا جاتا ہے۔

"اماں!" زوئی نے عقب سے آتی قدموں کی آواز سن کر گردن موڑ کر دیکھا۔

"اب لینے کے لیے سر پر آن کھڑے ہوئے ہیں تو جانا تو ہوگا ہی۔" اماں نے پہلی بار اس کی طرفداری کرنے کے بجائے نادر ہی کے سے لہجے میں کہا۔

"او میرے اللہ...... کوئی ساتھی بھی نہیں رہا......" زوئی نے آسمان کی طرف دیکھا۔ "میں نے تو نادر کو پا کر سب کچھ چھوڑ دیا تھا۔" اس نے ایک بار پھر باری، باری نادر اور اماں کی طرف دیکھا۔ ان دونوں کے چہروں پر ایک ہی تحریر لکھی تھی۔ "سوچ کیا رہی ہو، اب جاؤ...... ہماری جان چھوڑو۔" اس تحریر کو پڑھنے کے بعد زوئی نے سر ہلایا اور تیز قدموں سے چلتے ہوئے اندر چلی گئی۔ پھر صحن میں موجود واحد کمرے کی چارپائی سے بیمار اور کمزور شہباز صاحب کو بازو کا سہارا دے کر باہر لانے میں اسے دس منٹ لگے تھے۔ "چلیں......" اس نے ان تینوں اہلکاروں کے قریب جا کر کہا تھا اور پھر نادر کی طرف دیکھا۔

"میں تو ان سے پہلے ہی وعدہ کر چکا تھا زوئی ڈیئر۔ کچھ ثابت ہو گیا تو تمہیں لے جانے پر مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" وہ بے نیازی سے شانے اچکاتا ہوا بولا اور پھر باری، باری ان تینوں سے ہاتھ ملا کر انہیں رخصت کرنے لگا۔

ان کی جیپ میں شہباز صاحب کو سوار کرانے کے بعد خود سوار ہونے تک زوئی کے دل میں موجود نادر اور پاکستان سے محبت کے بت میں کئی دراڑیں آ چکی تھیں۔

☆☆☆

"وہ کہتا ہے کہ وہ جہانگیر سہگل کی لے پالک بیٹی ہے، مجھے اس بات پر شک ہے۔ جہانگیر سہگل کسی بچی کو کیوں اڈاپٹ کرے گا بھلا۔" ثمرین نے محمود درانی سے کہا جو اخبار کے پیچھے چہرہ چھپائے بیٹھے تھے۔

"کوئی کام، کوئی بھی شخص کیوں کرتا ہے، میں اس کے بارے میں کیا رائے دے سکتا ہوں۔" محمود درانی نے ہنوز چہرہ اخبار کے پیچھے چھپائے ہوئے کہا۔

"مجھے پہلے اس بات کی تحقیق کرنا ہوگی، چھان بین کرنی پڑے گی وہ بچی دراصل ہے کس کی؟" ثمرین نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"کیا آپ کے لیے اتنا کافی نہیں کہ جہانگیر سہگل اسے بیٹی کہتا ہے۔" اب کے محمود درانی کو اخبار چہرے کے آگے سے ہٹانا پڑا۔

"نہیں...... یہ کافی نہیں ہے۔" نیرین نے سر ہلا کر کہا اور اپنے فون پر کسی کا نمبر ملانے لگیں۔ محمود درانی اب پوری توجہ سے انہیں دیکھ اور سن رہے تھے۔

"ہاں رضا...... " انہوں نے اپنے ایک بھتیجے کا نام لیا۔ "کچھ اتا پتا لگا؟"

"اچھا...... کیا بتایا اس نے۔"

"کیا......؟"

"اغوا ہوگئی تھی، اسکینڈلز سامنے آئے تھے۔" ان کا لہجہ بدلنے لگا اور محمود درانی کا دل بیٹھنا شروع ہوا۔

"تو یہ سب ہوا کدھر، کہاں بات ہوتی رہی، ہمیں تو نہیں پتا، ہم نے تو یہ خبریں نہیں سنیں۔" ان کی آواز میں تیزی آنے لگی۔

"ہائے میرے اللہ، منسٹر کی داشتہ رہ چکی ہے۔" ان کی آنکھیں پھیلیں۔

"حمزہ کو وہ کہاں ٹکرا گئی۔ یہ تو ضد ہے شادی کرے گا تو اسی سے کرے گا۔" انہوں نے بین کرنے کے سے انداز میں کہا تھا۔

"ہائے نہیں...... میں بھلا یہ ہونے دیتی ہوں، ان بڑے لوگوں کے اندر تو نہ جانے کیسا گند بھرا ہوتا ہے۔ توبہ، تو بہ میرا حمزہ تو معصوم ہے، بے چارے کو زمانے کے سیاہ وسفید کی اتنی خبر کہاں، نہیں میں سمجھالوں گی اسے تم فکر مت کرو......" انہوں نے بات ختم کرتے ہوئے کہا اور فون بند کر کے فخریہ نظروں سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہی ہوں دیکھا میں نے پتا لگالیا۔

☆☆☆

"تم مجھ سے شادی کیوں کرنا چاہتے ہو فہد؟" اس ویک اینڈ پر جب فہد لاہور آیا اور میرال سے ملنے عافیہ کے گھر پہنچا تو اتنے وقت میں پہلی بار میرال کو ایک نارمل موڈ اور بہتر حلیے میں پایا۔ وہ آہستہ آہستہ اس ٹراما سے باہر نکل رہی تھی جس نے اسے اپنے آہنی پنجوں میں دبوچ رکھا تھا۔

"اس لیے کہ تم مجھے اچھی لگتی ہو اور میں تمہیں خوش رکھنا اور خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔" فہد نے مختصر جواب دیا۔

"اگر میں کہوں کہ تم مجھ سے اس لیے شادی کرنا چاہتے ہو کہ تم سمجھتے ہو اس نارمل معاشرے میں مجھ اسی ایب نارمل حالات کی شکار لڑکی سے، شاید ہی کوئی شادی پر رضامند ہو کیونکہ جو بھی سنے گا شکوک کا شکار ہو جائے گا اور ان حالات میں میرے بچپن کے دوست ہونے کے ناتے تمہیں ہی یہ قربانی دینی چاہیے تو یقیناً تم یہ بات نہیں مانو گے، ہے ناں......!"

فہد کے دل نے ایک دھڑکن چھوڑ دی، وہ جتنی خوب صورت تھی اتنی ہی ذہین بھی تھی...... اور یہ بات وہ بہت پہلے سے جانتا تھا۔

"تم ایک سلیبریٹی ہو فہد، تمہارا نام ہے معاشرے میں، لوگ تم سے ایک ایب نارمل فیصلے کی توقع نہیں کرتے، تمہارا امیج، تمہاری شخصیت سب اس ایک فیصلے کا شکار ہو سکتے ہیں۔"

"مجھے اس کی پروا نہیں میرال، تم جانتی ہو کہ میں ہمیشہ سے ہی تمہارے لیے اچھی فیلنگز رکھتا ہوں۔"

"اچھی فیلنگز رکھنا اور بات ہے...... ایک سلیبریٹی کسی سوشل کاز کے لیے چلائی جانے والی مہم کا حصہ بن کر اپنا امیج مزید بہتر تو کر سکتا ہے مگر اس مہم کے اندر موجود سیاہیوں کو اپنے چہرے پر سجا لینا اس کے لیے مشکل کھڑی کر دیتا ہے۔"

فہد نے سر اٹھا کر میرال کی طرف دیکھا، وہ مجسم حسن تھی، ایک ایسا حسن جس پر حزن اور ملال نے شاید مستقل ڈیرے جمالیے تھے۔

''تم سمجھتی ہو سلیبریٹی ہونا میرے لیے بہت اہم چیز ہے کیا؟'' اس نے سوال کیا۔ ''میں سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔''

''ایسا کہنا آسان ہے فہد...... اور کرنا......'' وہ رکی۔ ''بہت طویل سفر ہے کر کے دکھانا اور جیسے تمہیں مجھ سے انسیت محسوس ہوتی ہے ویسے ہی مجھے بھی تم سے محسوس ہوتی ہے، میں تمہیں اس لمبے کٹھن سفر کا مسافر نہیں بنا سکتی۔''

''گویا تم مجھے ریجیکٹ کر رہی ہو؟'' فہد نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا میری اوقات کسی کو ریجیکٹ یا قبول کرنے کی ہے؟'' جواب میں میرال نے سوال کیا۔

''تمہاری اوقات......'' فہد نے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا اب بھی تمہیں اس کے بارے میں کوئی شک ہے؟''

''نہیں کوئی شک نہیں ہے۔'' وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''لیکن میں انسانوں کے لیے آزمائش بن کر نہیں جینا چاہتی...... آزمائش کہنے کو صرف ایک لفظ ہے مگر اس میں سے گزرنا یوم قیامت ہے تمہیں اندازہ نہیں۔''

''پھر اگر میں نہیں تو کون ہے جو آزمائش میں پڑے بغیر تمہیں اپنائے گا؟'' فہد نے پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے علم نہیں۔ لیکن تمہیں ایک مشورہ دوں گی کہ اگر تمہارے اندر قربانی کا جذبہ ہے تو تم اس کو اپنا لو، جو تمہیں چاہتی ہے، جس کے لیے تمہارا ساتھ اہم ہے۔''

فہد اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے ایک گہری سانس لیتے ہوئے دوسری طرف دیکھنے لگا۔ اس کی دائیں ٹانگ کا ہلتا گھٹنا اس کے اندرونی اضطراب کو صاف ظاہر کر رہا تھا۔

''اپنا من چاہا پالینے کی خوشی اپنی جگہ...... لیکن کسی کا من چاہا اسے دے دینے کی خوشی بھی محسوس کرنی چاہیے بھی...... اس کا الگ ہی مزہ ہوتا ہے۔'' میرال نے کہا۔

''تم جانتی ہو وہ تم سے کتنی جیلس ہوتی ہے۔'' فہد نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

''یہ ہی تو اس کی تم سے محبت کی واضح ترین علامت ہے۔'' میرال نے فوری جواب دیا۔

''محبت......؟'' فہد کے لہجے میں استہزائیہ تھا۔ ''وہ احساسِ کمتری کا شکار ہے۔''

''اسے اس احساسِ کمتری سے تم ہی نکال سکتے ہو، دوسروں کے لیے جینے میں بہت مزہ ہے فہد، تم ایک بار آزما کر تو دیکھو۔''

''میں اس suggestion پر احتجاج اس لیے نہیں کروں گا کہ یہ تم دے رہی ہو اور تم میرے لیے کتنی اہم ہو، اس کا اندازہ شاید تمہیں کبھی نہیں ہو سکے۔''

''اگر تم میری تجویز مان لو تو یقیناً مجھے اندازہ ہو جائے گا۔''

فہد نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے اپنا آئی فون نکال کر اس پر ایک نمبر ملایا۔

''ہیلو علینہ...... کیسی ہو تم؟'' اس کی آواز کمرے میں گونجی تھی۔

''سنو آج شام تک میں ایبٹ آباد پہنچ رہا ہوں، نادیہ آنٹی سے ملاقات ہو سکتی ہے ناں......؟''

''نہیں، میڈیکل ایڈوائس نہیں لینی، مجھے تمہیں پرپوز کرنا ہے آنٹی نادیہ کے سامنے۔''

میرال غور سے فہد کی بات سن رہی تھی اور اس آخری بات کے ردعمل کو گفتگو میں شریک نہ ہوتے ہوئے بھی سمجھ سکتی تھی۔

"چپ کیوں ہو گئیں؟" فہد کہہ رہا تھا۔

"you there?" پھر اس نے سوال کیا تھا۔

"ہاں تو بس پھر میرا انتظار کرو آج میں پہنچوں گا کل ہم لوگ ٹھنڈیانی چلیں گے۔ اوکے....!" فہد کہہ رہا تھا۔

☆☆☆

"پہلے تو تمہاری ساس کہتی تھی کہ اس کی کوئی بیٹی نہیں ہے، اب اچانک یہ بیٹی کہاں سے نکل آئی؟" بینش کی اماں نے دانیال کے گھر سے واپسی پر اس سے کہا تھا۔ دانیال، بینش کو میرال کے بارے میں بتا چکا تھا اور اماں کو میرال کی کہانی سنانا طوفان کھڑا کر دینے کے مترادف تھا۔

"انہوں نے آپ کو بتایا ہی ہوگا اماں؟" بینش نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

"پتا نہیں کیا بتا رہی تھیں کہ بچھڑی ہوئی بھانجی دوبارہ ملی ہے۔" اماں نے کہا۔ "مگر میرا دل نہیں مانتا اس لڑکی کا تو ماتھا (چہرہ مہرہ) ہی ان لوگوں سے نہیں ملتا ہو تو دور سے کشمیرن لگتی ہے بکی۔"

"افوہ....اماں آپ بھی کیا بال کی کھال اتارنے لگ جاتی ہیں۔" سلیم جھنجلا کر بولا۔ "ہو سکتا ہے دانیال کا خالو کشمیری ہو پیچھے سے۔"

"لو....." اماں نے ایک اور نکتہ نکالتے ہوئے کہا۔ "اگر ایسا ہے تو پھر تو بھئی ان سمگلوں کا خاندان تو بھان متی کا کنبہ ہی ہے، کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا۔"

"جو بھی ہے، آج تک کسی نے ان کے خاندان کی طرف انگلی تو اٹھائی نہیں، ایک آپ ہیں کہ جب موقع ملتا ہے ان میں کیڑے نکالنے لگتی ہیں۔" سلیم بھی زچ ہو کر بولا۔

"جہاں کیڑے ہوں گے وہیں نظر بھی آئیں گے اور نکالے بھی جائیں گے۔" اماں ہٹ دھرمی سے بولیں۔ "تم لوگوں کو تو نہ جانے کاہے کا ہوکا لگا ہوا ہے، تمہارا بس چلے تو آج ہی بہن کی انگلی پکڑ کر اسے ان کے گھر چھوڑ آؤ۔"

"وہ لوگ ہیں ہی اتنے اچھے.....ہمیں تو اُن میں اور خود میں کوئی فرق نہیں نظر آتا۔" سلیم نے بے نیازی سے کہا۔

"سب جانتے ہیں اچھے کیوں ہیں۔" اماں کی زبان خاموش رہ ہی نہیں سکتی تھی۔ "لڑکا ان کا ٹٹ پونجیا (ٹوٹ پھوٹ) کر دوبارہ جڑا ہے، اللہ جانے کون کون سی مشینیں اس کے اندر ڈالی گئی ہوئی ہیں، ربڑ کی آنتیں اور پلاسٹک کا معدہ.....انہوں نے تو اچھا ہونا ہی ہے، انہیں بینش کے گنوں والی لڑکی اور کہاں ملنی تھی۔"

"افوہ اماں....." سلیم سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ "ان کا بیٹا ہیرا ہے ہیرا....." وہ جتانے کے سے انداز میں بولا۔ "وہ چاہتے تو اونچے سے اونچے گھرانے میں اس کا رشتہ کر لیتے مگر آپ نے دیکھا نہیں کتنی عاجزی، کتنی خدا خوفی ہے ان میں، دولت، پیسے اور اسٹیٹس کے فرق کو فرق سمجھتے ہی نہیں وہ لوگ جب ہی تو خود چل کر رشتہ لے کر آئے تھے۔"

"بڑا احسان کیا تھا ناں جو رشتہ لے کر آئے تھے، نہ آتے تو ہم نے ان کے گھر جا کر رشتہ دے نہیں آنا

تھا۔" اماں اب بھی پوری اکڑ دکھا رہی تھیں۔

"بس اماں بہت ہوگئی۔" بالآخر سلیم تختی سے بولا۔ "وہ لوگ جیسے بھی ہیں اب ہمارے کڑم (سمدھی) ہیں، کوئی بات نہیں ہوگی اب ان کے سلسلے میں۔ رہی آپ کی برادری تو جا کر دیکھیں کون ایسا ہے جو رشتے والی بات سن کر رشک نہیں کر رہا بینش کی قسمت پر۔" اب اماں کو بیٹے کے تیور ٹھیک نہیں لگے اسی لیے سر جھٹک کر خاموش ہوگئی تھیں۔

"کتنی عجیب سی بات ہے ناں......" اس رات بینش نے اپنے بستر پر بیٹھے کتاب میں رکھی دانیال کی تصویر دیکھتے ہوئے کہا۔ "مائیں اپنی بیٹیوں کے لیے شہزادوں کے خواب دیکھتی ہیں اور جب کوئی شہزادہ واقعی آن پہنچتا ہے تو اس میں کیڑے نکالنے لگتی ہیں۔"

"تمہاری اماں غلط نہیں ہیں۔" اگلی صبح کیفے میں بیٹھے دانیال نے اسے بتایا تھا۔ "وضعدار اور پرانے خیالات کے لوگوں کی طرح ان کا ری ایکشن فطری ہے۔ ہمارا معاشرہ ہیومنٹیشن کے فیز سے گزر رہا ہے، پرانے کو نئے میں تبدیل ہوتے ٹائم تو لگے گا، یہ کیا کم غنیمت ہے کہ انہوں نے ہمارا رشتہ ہو جانے دیا ہے۔"

"انہیں میرال والی بات پر بھی تشویش ہے۔" بینش نے اسے بتایا۔

"فکر مت کرو، ہم جلد از جلد میرال کی شادی کسی بہت اچھی فیملی میں کرنے کی فکر میں ہیں جب تک تم میرے گھر آؤ گی، میرال والا معاملہ ویسے ہی نمٹ چکا ہوگا۔" دانیال نے بے فکری سے کہا۔

"ویسے وہ حقیقت میں کتنی خوب صورت ہے ناں......" بینش نے یاد کیا۔ "ایسے لگتا ہے مجسم حسن نہیں خواب دیکھ رہے ہوں۔"

"ہوں......" دانیال نے کہا۔ "یہی حسن تو اس کا دشمن بن گیا...... اور دیکھ لو اسے کن کن راستوں سے گزارتا کہاں تک لے گیا۔"

"وہ جو منسٹر صاحب ہیں، کیا وہ نہیں کریں گے میرال سے شادی؟" بینش نے تجسس کے مارے پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ نہیں۔"

"ہاں...... وہ کیوں...... میرا خیال تھا کہ وہ اس کی محبت میں ہی یہ سب کرتا رہا۔" بینش کا ردعمل فطری تھا۔

"ہم سب کا بھی یہی خیال تھا...... مگر لگتا ہے اس کے سیاسی اور خاندانی حالات اسے اس شادی کی اجازت نہیں دیں گے۔" دانیال نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

"تو ان لوگوں کو کیا فرق پڑتا ہے، یہ تو خفیہ شادیاں کرنے کے ماہر ہوتے ہیں۔"

"میرال اس کے لیے شاید...... one and only والا معاملہ ہے۔" دانیال نے کہا۔ "میرا مطلب ہے یہ میرا تجزیہ ہے اس کے بارے میں۔" اس نے بینش کو وضاحت دیتے ہوئے کہا۔ "اور جب کوئی کسی کی زندگی میں ایسا امپورٹنٹ ہو تو پھر وہ اس تک پہنچنے اور اسے پانے کے لیے چور راستے نہیں ڈھونڈتا...... مہرزاد خان نے ممی سے خود کہا ہے کہ کوئی اچھا لڑکا دیکھ کر میرال کی شادی کروا دیں۔"

"ہائے......" بینش نے جھرجھری لیتے ہوئے کہا۔ "کتنا مشکل ہے ناں یہ کہنا۔"

"وہ بہت مختلف شخص ہے، اس کے مضبوط جسم کے اندر اس سے بھی زیادہ مضبوط دل و دماغ موجود ہے اور اس پر وہ پورا اختیار بھی رکھتا ہے۔" دانیال نے کہا۔ "میں نے اس سے ملاقات کے دوران اسے مکمل آبزرو

کیا ہے اور میرا خیال ہے کہ وہ مجھے بہت اچھا لگا۔ وہ بہت سوں سے بہت مختلف ہے۔"
"اور ہم پچھلے کئی مہینوں سے اسے گالیاں دیتے چلے آرہے تھے۔" بینش نے کہا۔
"اور اس نے وہ گالیاں بھی پھول سمجھ کر وصول کیں...... سوچ لو وہ میرال کے لیے کیا جذبہ رکھتا ہوگا۔"
"ایسا جذبہ کہ اپنے سیاسی کیریئر پر محبت قربان کر دی۔" بینش کے لہجے میں طنز تھا۔
"میں فی الحال کچھ کہہ نہیں سکتا۔ وہ بہت unpredictable انسان ہے، دیکھتے ہیں وہ آگے کیا کرتا ہے۔" دانیال نے اٹھتے ہوئے کہا۔
"ہیلو گائز....." سامنے سے آتی ثمرین نے دانیال کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔ "بلکہ مجھے کہنا چاہیے ہیلو لو برڈز۔"
"ہیلو ثمرین۔" دانیال نے چہرے پر اتر آتی ناگواری کو چھپاتے ہوئے کہا۔
"سو فائنلی تم نے اس لڑکی سے رشتہ جوڑ ہی لیا۔" ثمرین نے ایک حقارت بھری نظر بینش پر ڈالی۔ "تم جہاز سے کیا گرے تمہاری چوائسز اور سلیکشنز بھی آسمان سے زمین پر آگریں، مجھے تم سے ہمدردی ہے۔"
"کیوں ہمدردی ہے تمہیں؟" دانیال وہاں سے جانے کا ارادہ ترک کرتے ہوئے دوبارہ بینش کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔
"تمہاری چوائس دیکھ کر۔" ایک مزید حقارت بھری نظر بینش پر ڈال کر وہ بولی۔ "ایک ایسی لڑکی جسے ڈھنگ سے اردو بھی بولنی نہیں آتی، جو لگتا ہے ڈریس اپ بھی اپنی مادری زبان میں ہوتی ہے، جسے کلچر اور آرٹ اور لٹریچر سے زبردستی کا لگاؤ ہے اور جسے دنیا کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں، تم نے اس سے منگنی کر لی.....؟ تمہاری غریبانہ سوچ پر مجھے ہمدردی کیوں نہ ہو تم سے، آفٹر آل ہم پرانے دوست ہیں۔"
"ثمرین، بینش میری منگیتر ہے اور اس کے بارے میں ایسے الفاظ دوبارہ استعمال... کرنے کی اجازت میں تمہیں نہیں دوں گا۔" دانیال نے اپنے اشتعال کو قابو کرتے ہوئے کہا۔ "بہت اچھا ہوا میں جہاز سے گرا، گرنے کے بعد مجھے زمین پر موجود ہر چیز زیادہ واضح نظر آنے لگی، ورنہ اس سے پہلے میرا حال یہ تھا کہ بستا زمین پر تھا اور اڑتا آسمانوں پر تھا، نہ زمین کی مخلوق تھا نہ آسمانوں کی...... جب ہی تو کوؤں اور ہنسوں میں فرق نہیں کر سکا کبھی۔"
"ویری...... sarcastic اینڈ ویری فنی۔" ثمرین طنزاً بولی۔ "آئی وش تمہیں کبھی اپنے فیصلے پر پچھتانا نہ پڑے۔"
"انشاءاللہ کبھی ایسا نہیں ہوگا۔" دانیال نے مضبوط لہجے میں کہا۔
ثمرین ایک اور حقارت اور طنز بھری نظر بینش پر ڈال کر وہاں سے اٹھ گئی۔ دانیال نے اسے دور جاتے دیکھا اور پھر گردن موڑ کر اپنے پہلو میں بیٹھی بینش کو جس کی آنکھوں میں آنسو بھر رہے تھے۔
"ارے یہ کیا....." اس نے بینش کا سر نرمی سے اونچا کیا۔
"اتنی انسلٹ---اتنی humiliation" بینش نے بدقت کہا۔ "آپ کے ساتھ میں...... مجھے ہر دم اسی کا ڈر رہے گا۔"
"احمق ہو تم جو اس خوف میں مبتلا ہو۔" دانیال نے ٹشو پیپر اسے پکڑاتے ہوئے کہا۔
"ارے میری جان--- میں جو تمہارے ساتھ ہوں ہر دم..... ہر لمحہ اور میرے گھر والے بھی..... پھر تمہیں ایسے رویوں کا خوف کیوں ہے۔" وہ اسے دلاسا دے رہا تھا..... لیکن بینش کے دل سے تذلیل کا

احساس نہیں جا رہا تھا۔

''میں نے تم سے ایک بار کہا تھا انسان کو اپنے بارے میں کانفیڈنٹ ہونا چاہیے..... اگر وہ غلط نہیں ہے تو دنیا کے سارے لوگ جو مرضی کہتے رہیں وہ غلط نہیں ہو سکتا اور یہی کانفیڈنس دنیا کی زبانیں بند کرا کے چھوڑے گا..... ابھی میں نے تمہیں مہرزاد خان کے بارے میں بتایا..... ہم تو ہم، اللہ جانے اس نے کہاں، کہاں سے کیا کچھ نہ سنا ہوگا، کیا کچھ نہ فیس کیا ہوگا مگر تم نے اس کے اعتماد کا لیول نہیں چیک کیا شاید، چلتی گولیوں سے خود کو نکال کر ہمارے پاس پہنچا گیا اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی، رول ماڈلز صرف اچھی دنیا میں ہی نہیں تلاش کرنے چاہئیں، رول ماڈل ہم سب کی دھتکاری ہوئی دنیا میں بھی مل جاتے ہیں..... اور یہ ثمرین.....'' اس نے اُسی سمت دیکھا جدھر ثمرین گئی تھی۔

''pity on her..... وہ صرف تم سے جیلس ہو رہی ہے۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے وہ تم سے حسد کر رہی ہے، دل میں تم پر رشک کر رہی ہوگی، اس سے ثابت ہوا کہ تم ہر چیز سے ہر بات سے above ہو۔''

بینش نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے مسکرا رہا تھا۔

''بس کرو اور اب جو میں کرنے والا ہوں اس میں مجھے پوری طرح سپورٹ کرنے کی تیاری کرو۔'' پھر وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

''کیا کرنا ہے؟'' بینش نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ محبت کا ایسا اظہار تو مردے میں بھی جان ڈال سکتا تھا اور اس نے تو ابھی جینا شروع کیا ہی تھا۔

''ایک تو اپنی آرٹ گیلری بنانی ہے، بی اینڈ ڈی ایکسپریشنز کے نام سے اور جس میں تمہارے حتی ایچرز اور کیلی گرافی کے شاہکار خصوصیت کا درجہ رکھتے ہوں گے..... اور دوسرا یہ کہ میں دوبارہ سے فلائنگ کلب جوائن کرنے والا ہوں۔''

''نہیں..... یہ نہیں ہوگا۔'' بینش نے گھبرا کر کہا۔ ''آپ فلائنگ کلب..... ہرگز نہیں جاؤ گے۔''

''میں ضرور جاؤں گا لیکن ایک نئے عزم کے ساتھ، اسکائی از دی لمٹ کے نعرے کے ساتھ، اب میں beyond the skies جانے کا دعویٰ نہیں کروں گا اور تم دیکھو گی کہ اس بار میں کیسا پیا فلائر بنوں گا۔'' وہ مسکرا رہا تھا۔ بینش نے بھی مسکراتے ہوئے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔

☆☆☆

''مجھے معلوم نہیں محترمہ آپ نے میرے بیٹے کو کیسے ورغلالیا، ایک ایسی لڑکی سے شادی کرنے کی ضد کرنے لگا ہے وہ جس کا آگا پیچھا ہی ٹھیک نہیں، توبہ توبہ آپ کو خدا کا خوف نہیں آیا، ایسے نامور خاندان کے بیٹر تلے ایسا لغو اور چھوٹا کام کرتے ہوئے۔'' عافیہ کو یہ جملے سنتے ہوئے اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا یہ جملے حمزہ کی ممی بول رہی تھیں اور بولتے ہوئے کہیں سے بھی مہذب اور پڑھی لکھی خاتون نہیں لگ رہی تھیں۔

''کیا کمی دیکھی آپ نے میرال میں جو ایسے کہہ رہی ہیں؟'' عافیہ پوری کوشش کے ساتھ ایسے نرم الفاظ بولنے میں کامیاب ہوئی تھیں۔

''کمی.....؟'' وہ ہاتھ پھیلا کر بولیں۔ ''کوئی ایک کمی ہو تو بولوں..... اغوا شدہ، کوٹھے والیوں کے ہاں رہنے والی، منسٹر کی داشتہ، جسے اچھی طرح برت کے وہ آپ کے حوالے کر گیا اور اب آپ اس کے ذریعے شریف خاندانوں کے لڑکے پھنسا رہی ہیں، خدا کا خوف کریں..... سنا ہے بڑی اللہ والی بنتی ہیں آپ ویسے تو،

اللہ رسولؐ کے نام کے پردے تلے یہ حرکتیں، توبہ توبہ۔ بی بی خدا کو کیا منہ دکھاؤ گی کل کو۔" عافیہ کا واسطہ ایک بدزبان اور مغرور خاتون سے پڑ رہا تھا اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان خاتون کو کیسے ہینڈل کریں۔

"پھپھو آپ تو کوئی اور بات کرنے کا کہہ کر لائی تھیں مجھے۔" خاتون کے ساتھ آنے والی لڑکی شرمندہ، حیران اور پریشان تھی، یہ لڑکی نگین تھی جسے مہرین خاص طور سے اپنے ساتھ لے کر آئی تھیں۔

"میں بھی کہنے اور ان محترمہ سے یہی پوچھنے آئی تھی۔" انہوں نے نگین سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے کہا۔

"دیکھیے محترمہ، میں آپ کے بیٹے کی نیک دلی، شرافت اور نیک فطرتی کی وجہ سے آپ کی باتیں برداشت کر رہی ہوں۔" بالآخر عافیہ کے صبر کا دامن ان کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

"ہماری شریف، باعصمت، باکردار بچی پر یہ واہیات الزام لگانے کا آپ کو کوئی حق نہیں۔ خدا سے مجھے مت ڈرائیں، خود اس کا خوف کریں کہ آپ کسی بات کے سیاق و سباق کو جانے سمجھے بغیر ایک خاندانی، باعزت بچی پر شرمناک الزام لگا رہی ہیں، معافی مانگنی چاہیے آپ کو اللہ تعالیٰ سے، اس سے پہلے کہ آپ اس کے غضب کی پکڑ میں آ جائیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کے بیٹے کو نہ تو کسی نے یہ رشتہ جوڑنے پر مجبور کیا ہے نہ ہی اکسایا ہے، وہ اپنی مرضی سے یہ رشتہ مانگنے آیا تھا۔"

"ہمرے اتنی ہی شریف اور باعصمت و باکردار ہے یہ لڑکی تو آپ اپنے بیٹے سے کیوں نہیں جوڑ لیتیں اس کا رشتہ، آپ کا بھی تو ایک بیٹا کنوارا ہے ناں......" مہرین نے چمک کر کہا۔ "نیکی کرنے کا شوق چرایا ہے ناں تو بسم اللہ اپنے گھر سے کیوں نہیں کر لیتیں۔ بجائے دوسروں کے گلے منڈھنے کے لڑکی کو۔" عافیہ ایک دم خاموش ہو گئیں۔

"دیکھا کیسے سانپ سونگھ گیا انہیں، اب جب اپنے بیٹے کی بات آئی ہے۔" عافیہ کو خاموش دیکھ کر مہرین نے نگین کو کہنی مارتے ہوئے کہا، نگین عافیہ کی طرف بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔ "ذرا باندھ کر دکھائیں گندگی کے اس طوق کو اپنے بیٹے کے گلے میں پھر میں جانوں گی...... دوسروں کے بیٹے پھنسانے تو بہت آسان ہوتے ہیں۔" مہرین بولے چلی جا رہی تھیں۔

"پھپھو آپ کو بتایا تھا کہ وہ بی اماں کی سہیلی کی......" نگین نے کہنا چاہا۔

"ارے چھوڑو بی اماں اور ان کی سہیلی کو......" مہرین غصے سے غرائیں۔ "ساری عمر کے لیے بھوت بن کر چمٹ گئی بی اماں کی روح میرے حمزہ کو، ان کی مروت میں ایک ڈھکیل سے شادی کرنے چلا تھا۔"

"پلیز آپ خاموش ہو جائیں۔" عافیہ سے میرال کے لیے بولا جانے والا یہ لفظ برداشت نہیں ہوا۔ "آپ کو اپنے بیٹے کی خواہش سے اتفاق نہیں ہے تو مت کیجیے یہ رشتہ مگر اب میں مزید آپ کو اس بچی پر کیچڑ اچھالنے نہیں دوں گی۔"

"اسے اپنی بہو بنا لیں...... باعزت مقام دے دیں، کیچڑ اچھلنی خود ہی بند ہو جائے گی۔ آپ جیسوں کے پردے میں چھپ کر تو کوئلہ بھی ہیرا بن جاتا ہے، اچھی رہیں گی میری مان کر، ورنہ اِدھر اُدھر کے لڑکے پھانسنے کے چکر میں تو یوں ہی بے عزت ہوتی رہیں گی۔"

"آپ فکر نہ کریں، مجھے اس بچی کی خاطر ایسا کرنا پڑا تو میں یہ بھی کر گزروں گی۔" عافیہ نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "اللہ مجھے اس کی عزت کی چادر کی حفاظت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔"

عافیہ کے جواب نے نگین کے ساتھ ساتھ مہرین کو بھی ششدر کر دیا تھا۔

☆☆☆

سارا راستہ آنسو کسی گرم سیال کی طرح زوئی کی آنکھوں سے بہتے رہے تھے۔ خود پر پڑنے والی ناگہانی صورت حال کے غم سے زیادہ اسے نادر اور اس کی اماں کے رویے کی روکھائی اور بے اعتنائی نے صد درجہ دکھی کر دیا تھا۔ نادر کا رویہ اس کے لیے اتنا غیر متوقع تھا کہ وہ اس سے آگے کچھ سوچنے کے قابل ہی نہیں رہی تھی۔ دائیں ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھتے ہوئے اس نے شہباز صاحب کی طرف دیکھا۔ جن کا چہرہ خوف سے سفید پڑ گیا تھا۔ ان کے ہاتھ اور ہونٹ لرز رہے تھے، زوئی کو بے اختیار ان پر ترس آنے لگا۔

''یا خدا! صرف ایک چھوٹی سی نیکی' وہ بھی غلط فہمی کی نیکی کی اتنی بڑی سزا۔'' وہ کھڑکی سے باہر آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے شکوہ کناں ہوئی۔

''لیں جی دفتر آگیا، آپ آجائیں نیچے۔'' ایک بڑی سی عمارت کے گیٹ کے اندر جیپ داخل کرنے کے بعد روکتے ہوئے ڈرائیور نے کہا اور زوئی کے ساتھ والا دروازہ کھول دیا گیا۔ زوئی لرزتی ٹانگوں کے ساتھ پہلے خود جیپ سے اتری اور پھر شہباز صاحب کو سہارا دے کر اتارنے لگی۔

''بزرگ کے لیے وہیل چیئر لاؤ او ئے۔'' ایک اہلکار نے اپنے ماتحت کو آواز دے کر کہا۔ دومنٹ کے بعد شہباز صاحب کے لیے وہیل چیئر آگئی..... شہباز صاحب کی وہیل چیئر دھکیلتے اور اپنی ٹانگوں کو گھسیٹتے زوئی نے ایک مختصر فاصلہ طے کرنے میں کافی وقت لیا۔ ان کے آگے چلنے والا اہلکار ایک دفتر نما کمرے کے سامنے جا کر رک گیا اور دروازہ کھول کر اندر جھانکنے لگا۔

''صاحب اندر ہی بیٹھے ہیں، آپ آجائیں۔'' اس نے زوئی کو مخاطب کیا۔ زوئی اس کے پیچھے چلتی اندر داخل ہوئی۔ یہ ایک کشادہ اور خوب صورتی سے سجا دفتر تھا۔

''سر جانیئز لڑکی اور بینک منیجر۔'' اہلکار نے اعلان کیا، میز پر سر جھکائے شخص نے سر اٹھا کر سامنے دیکھا اور جیسے تعظیماً کھڑا ہو گیا۔ اس شخص کے بال سفید اور چہرے پر طویل تجربے کی کہانی لکھی تھی۔

''آئیں پلیز بیٹھیں۔'' وہ خوش دلی سے مسکراتے ہوئے اپنے سامنے رکھے صوفوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ''غلام محمد، بہت اچھی اور پُر تکلف چائے بھجواؤ۔'' پھر اس نے انٹرکام کا چونگا اٹھا کر کسی سے کہا۔

زوئی کے لیے یہ رویہ اور ماحول بھی غیر متوقع تھا۔ وہ شہباز صاحب کی چیئر دھکیلتی صوفے کی طرف بڑھ گئی۔ اس کی رہنمائی کرنے والا اہلکار کمرے سے باہر جا چکا تھا۔

''جی تو مس زوئی حسین۔'' وہ شخص جو اس دفتر کا صاحب تھا زوئی کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''اور ملک شہباز صاحب۔'' پھر اس نے شہباز صاحب کی طرف دیکھا۔

''کیسے ہیں آپ؟''

''جی ٹھیک......'' زوئی نے شہباز صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہم نے شہباز صاحب آپ کے گھر پر بندے بھجوائے، آپ سے ٹیلی فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن آپ کا کچھ اتا پتا نہیں تھا۔'' اس شخص نے شہباز صاحب سے کہا۔

''اور مس زوئی آپ کے تو خیر ہز جینڈ سے بات ہو گئی تھی۔'' اس نے زوئی کی سماعت پر بمباری کی۔

''اور پھر ہمارے خفیہ والوں ہی کا کمال ہے کہ آپ کو مس زوئی کے گھر میں لوکیٹ کر لیا انہوں نے۔'' پھر وہ شہباز صاحب کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

''ہمیں یہاں کیوں لائے آپ؟'' زوئی کی باریک آواز کمرے میں پھیلی۔

''آپ دونوں کو سلیوٹ کرنے کے لیے۔'' اس شخص نے ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ ابتدائی فارم فل کروانے کے لیے۔'' اس نے دو فارم ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''آپ لوگ اپنا، اپنا بائیو ڈیٹا خود درج کرلیں اس میں، مس زوئی۔'' اس نے زوئی کی طرف دیکھا۔ ''آپ کو بہت مبارک ہو، آپ کا نام اس سال سماجی بہبود کے لیے دی گئی خدمات کے سلسلے میں صدارتی تمغہ برائے حسنِ کارکردگی کے لیے فائنل ہو چکا ہے۔'' اس نے زوئی کی سماعت پر ایک مرتبہ پھر بمباری کرتے ہوئے کہا۔

''اور شہباز صاحب آپ کی دلیرانہ مدد جو آپ نے مس میرال صلاح الدین کو فراہم کی کے عوض آپ کو خصوصی انعام سے نوازا جا رہا ہے اور ان دونوں انعامات کی سفارش وزارتِ اطلاعات و نشریات کی طرف سے کی گئی ہے۔ میں خود بھی۔'' وہ شخص کھڑے ہوتے ہوئے بولا اور ماتھے پر ایک مرتبہ پھر ہاتھ لے جا کر سلیوٹ کے سے انداز میں ان کی طرف دیکھا۔ ''آپ دونوں کی اس خاموش خدمت پر آپ کو سلیوٹ کرتا ہوں۔''

اس دفتر کی مشرقی دیوار پر سجے پاکستان کے قومی پرچم اور بڑے منقش فریم میں جڑے پاکستان کے نقشے پر زوئی کی نظر پڑی۔ وہ جغرافیائی حدود کی حقیقت کو نہ مانتے ہوئے اس ملک کی شہری بننے پر بضد رہی تھی اور اس نے اس خواہش کے پورا ہونے کے بعد کتنی ہی بار سوچا تھا کہ اس نے ایسا کر کے اپنے سیدھے سادے راستے میں کیسے کانٹے بو لیے تھے جو اس کے پیر چلتے، چلتے آبلہ پا ہونے لگے تھے...... مگر یہ اس کی نیت، شوق، لگن، یونیورسل محبت کی سچائی تھی جو اس روز ایک ایسے صلے کی شکل میں اس کے سامنے آئی تھی جس کا اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ اس نے ڈبڈبائی نظروں سے شہباز صاحب کی طرف دیکھا...... جن کی اپنی آنکھوں سے اشک رواں تھے اور وہ اسی مشرقی دیوار کی طرف چہرہ موڑے ماتھے پر ہاتھ رکھے پرچم کو سلیوٹ کر رہے تھے۔

اس روز گھر واپسی پر زوئی کا ارادہ نادر سے ایک بہت بڑا جھگڑا کرنے کا تھا...... لیکن گھر واپسی پر اس کے سامنے ایک انوکھا ہی منظر موجود تھا۔ اس کی ساس، سب نندیں، نندوئی ان کے بچے اور شہباز صاحب کی بیگم ان کے راستے میں پھول بکھیرے، پھولوں کے ہار اور گجرے لیے اس کے اور شہباز صاحب کے منتظر تھے۔ گھر کا ہر کمرا سجا ہوا تھا اور میز پر مٹھائیوں اور کیک کے ان گنت ڈبے رکھے تھے، وہ اتنے بھرپور انداز میں اپنی سسرال اور اپنے پاکستان میں قبول کر لی گئی تھی کہ اس کی پچھلی تمام تکلیفیں اور آبلہ پائی اسے بھولنے لگی تھی۔

''تم بہت بے ایمان ہو نادر......'' مٹھائی کھاتے ہوئے اس نے باریک آواز میں چلاتے ہوئے کہا۔

''اور آپ بھی اماں۔'' پھر اس نے ساس کی طرف دیکھا۔

''ہمیں تو صبح سے ہی پتا تھا، ہم نے سوچا تمہیں وہ دیا جائے کیا بھلا نادر......؟'' اماں نے نادر کی طرف دیکھا۔

''سرپرائز...... ہاں سرپرائز......'' نادر کی خوشی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔

''بس میں کچھ نہیں جانتی زوئی، مجھے تو تم جاپانی سے اصلی جاپانیز ڈیکوریشن پیس لا کر دو گی جب اگلی بار وہاں جاؤ گی تو......'' یہ نادر کی آپا تھیں جنہیں سب سے زیادہ اس سے اختلاف تھا۔ جادو کی چھڑی سی چلی تھی اور منظر یکسر بدل گیا تھا۔ اسی ہفتے کے اختتام پر شہر کے ایک اچھے بینکویٹ ہال میں زوئی اور نادر کے ولیمے کا اہتمام کیا گیا تھا جس میں حمزہ محمود درانی نے بطورِ خاص شرکت کی تھی اور زوئی سے اس ساری تکلیف پر معذرت کرتے ہوئے جو اسے ایجنسیز کی تحقیقات کے دوران اٹھانی پڑیں، خود اس کے سامنے کھڑے ہو کر اسے سلیوٹ کیا تھا۔ یہ ایک ایسا سلیوٹ تھا جس کا حمزہ نے نادر سے وعدہ کر رکھا تھا۔

☆☆☆

''تم بھی تو جذبۂ خدمت سے سرشار ہوناں دانیال...... پھر قربانی کی تو کئی قسمیں ہوتی ہیں۔ پے در پے بھی، میراں کے رشتے کے سلسلے میں جس قسم کی گفتگو سن چکی ہیں انہیں یہ فیصلہ اسی وجہ سے کرنا پڑا۔'' شاندانہ نے اپنے بیڈ پر سیدھے لیٹے دانیال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

''قربانی کی کوئی جھلک بھی تو نہیں ہوناں بھابی۔'' دانیال بے بسی سے بولا۔ ''آپ خود جانتی ہیں کہ یہ کیسی بے تکی بات ہے۔''

''دیکھاناں...... جب بات خود پر آئے تو کیسا لگتا ہے۔'' شاندانہ نے اکسایا۔ ''ہم اِدھر اُدھر جہاں بھی میراں کی شادی کرنے کی کوشش کریں گے ہمیں کم و بیش ایسی ہی باتوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔ ایک تم ہو جو سب جانتے ہو، سب سمجھتے ہو، یقین کرتے ہو اور مانتے بھی ہو۔''

''پلیز بھابی مجھ سے اتنی بڑی بات کی توقع نہیں کی جائے، آپ جانتی ہیں کہ میں نے کبھی میراں کو اس اینگل سے نہیں دیکھا اور پھر بینش کے ہوتے ہوئے میں ایسا سوچ بھی کیسے سکتا ہوں۔'' دانیال نے کہا۔

''دیکھو دانیال...... بینش اتنی اچھی لڑکی ہے، اس کے پیچھے ایک اعلیٰ فیملی بیک گراؤنڈ ہے، اسے تو کوئی بھی اپنانے میں فخر محسوس کرے گا مگر میراں......'' شاندانہ نے اپنی بات ادھوری چھوڑتے ہوئے دانیال کی طرف دیکھا جو اٹھ کر بیٹھ گیا تھا، اس کی نظریں خلا میں جمی تھیں اور وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔

☆☆☆

''پھپھو نے بہت بڑی زیادتی کی ہے حمزہ، انہیں سوچ سمجھ کر یہ بات منہ سے نکالنی چاہیے تھی...... مجھے تو بہت پہلے سے اس ہنگامے کی توقع تھی۔'' نگین نے عالیہ کے گھر سے واپسی پر سب قصہ حمزہ کے گوش گزار کرتے ہوئے کہا تھا۔

''ممی نے بہت بڑی حماقت کی جو یہ سب وہاں جا کہا......'' جواب میں حمزہ کا ردِعمل نگین کی توقع سے زیادہ شدید تھا۔ ''ممی نے بی اماں کے حوالے کر کے بھی مجھے نہیں کھویا تھا لیکن آج شاید انہوں نے ہمیشہ کے لیے مجھے کھو دیا۔'' وہ جذباتی ہو رہا تھا۔

''میں بی اماں کے ہاتھوں پلا بڑھا ہوں نگین۔'' پھر اس نے نگین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ''بی اماں جو رشتوں، روایتوں، وضع داریوں اور اپنی بات کا پاس کرنے والی نسل کی امین تھیں۔ بی اماں نے یہ سب خصوصیات گھٹی کے ساتھ میرے اندر بھی ڈال دیں جب ہی تو میں تم لوگوں کی اور ممی کی اس دنیا میں مس فِٹ ہوں، خدا کی قسم نگین میں اگر بی اماں کی بوا جی سے کمٹ منٹ کے بارے میں نہ بھی جانتا ہوتا تو میراں کے لیے اپنا پروپوزل ضرور بھجواتا کیونکہ ابھی تو اسے کسی مسیحا کی ضرورت ہے اور میں نہیں سمجھتا کہ اس کے لیے مجھ سے بہتر کوئی اور مسیحا ہو سکتا ہے۔ میں تو خود اپنی ذات کی تنہائی کا شکار ہوں اور اپنے ہی جیسی کسی شریکِ حیات کے ساتھ بی اماں کا گھر بسانا چاہتا ہوں مجھے ان خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ جو مجھ میں ہیں کون قبول کرے گا بھلا؟''

نگین کے پاس حمزہ کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا...... وہ تو اس کے پروپوزل کے ردِعمل میں ہر ایک کی رائے سن کر حیران ہو رہی تھی اور تو اور روشن خیال اور تعلیم یافتہ اشعر میاں بھی حمزہ کی تجویز پر اعتراض کر رہے تھے۔

''حقیقت چاہے جو بھی ہو، ہم شریف خاندان کے لوگ ہیں نگین، حمزہ کو ہمیں ہماری ہی نظروں

میں شرمندہ کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔" اشعر کے کمنٹ نے تکین کو حیران کر کے رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

"کیچڑ میں کھلے پھول کو کیچڑ میں ہی پڑے رہنے دینا چاہیے کیونکہ وہ کیچڑ سے باہر نکل کر بھی اپنی اصلیت کے ساتھ ہی پہچانا جاتا ہے، شاید وہ کیچڑ میں ہی بھلا اچھا لگتا ہے کیونکہ اس کی وجہ سے کیچڑ کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔" بہت دن پیچھے مہرزاد خان نے میرال سے رابطہ کیا تھا اور اس کی کہی بات سنی تھی۔

"آپ عزت داروں کا معاشرہ مجھے قبول کرنے سے انکاری ہے کسی اور کی کیا کہیں خود آپ بھرے ہجوم میں میری گواہی دینے کا دعویٰ کرنے کے باوجود مجھے قبول کرنے سے انکار کر چکے ہیں باقی کے لوگ تو عام دنیا ہیں اور دنیا کو کیا پڑی اس گواہی پر آمنا و صدقنا کہے۔" وہ کہہ رہی تھی۔

"تم جتنا زیادہ مجھ سے بدگمان ہوتی ہو مجھے اتنا ہی زیادہ اطمینانِ قلب محسوس ہوتا ہے۔" مہرزاد خان نے دل میں سوچا تھا۔ "بہت بہتر ہے تم مجھے بہت برا جانو اور بروں کی زندگی میں اچھی چیزیں جچتی نہیں، میں جس دنیا میں رہتا ہوں وہاں خوب صورتی کے اندر بدصورتی بستی ہے اور وہاں تم جیسے لوگ جچتے ہیں نہ ایسی بدصورتی کے درمیان جی پاتے ہیں، ہم ایسوں کے ڈھول دور سے ہی سہانے لگتے ہیں میرال صلاح الدین اور تمہیں اس بدصورتی میں بسا کر جیتے جی تمہارا گلا گھونٹ دینے کا گناہ میں کیسے کر سکتا ہوں...... جبکہ میں نے تو خود تمہیں.... زندگی کی بدصورتی سے نکال کر میرال صلاح الدین بنا دینے کے لیے اپنے نفس کا گلا خود اپنے ہاتھوں سے گھونٹے رکھا..... میں واپس تمہیں نفس کی خود غرضی کی، سیاہ کاری، جھوٹ، فریب، ذاتی انا، جھوٹی انا پرستی اور جاہلانہ رسم و رواج کی دنیا میں لے جانے کا جرم نہیں کر سکتا۔ مجھے معاف کر دینا، میرال میرے قدم میری حدود پر کھڑے ہیں، ان سے پار جانے کی کوشش کروں گا تو خود تو تباہ ہو ہی جاؤں گا، تمہاری بربادی کا بھی باعث بن جاؤں گا۔" وہ کہہ رہا تھا اور اس کے الفاظ میرال کے دل پر آنسو بن کر گر رہے تھے۔

"مجھے قسم ہے اس عظیم جذبے کی جو تم پر پہلی نظر پڑتے ہی میرے دل میں جاگا تھا، جس کے اثر میں، میں آگے چلا، کہانیاں کہنے اور کہانیاں سننے کے سلسلے سے آگے ایک ہزار راتوں کی قیمت ادا کرنے تک اور پھر اس سے بھی آگے اس کیچڑ میں جہاں تم جیسا کنول ڈولتا تھا، اس بدصورتی جس نے تم جیسی خوب صورتی کو اپنے شکنجے میں جکڑ رکھا تھا تک رسائی کے دوران کوئی لمحہ ایسا نہیں آیا جب میرے دل نے تمہاری تمنا نہ کی ہو، میرے حواسوں سے اتر کر تم کہیں اور چلی گئی ہو۔ دنیا مجھے سیاست کرتے، انتخاب لڑتے، تقریریں کرتے، جیتتے، جشن مناتے، وزارت کا حلف اٹھاتے، پیشہ ورانہ ذمے داریاں پوری کرتے ہر روز دیکھتی رہی مگر قسم ہے مجھے اپنے رب کی اس سب کے دوران بھی کوئی لمحہ ایسا نہیں تھا جب تم میری سوچ پر حاوی نہ تھیں......" وہ کہہ رہا تھا۔

"میرا جذبہ کتنا عظیم تھا اس کی سب سے بڑی گواہ تم خود ہو میرال...... وہ راتیں یاد کرو، جن میں تمہارے، میرے، تنہائی اور میرے اختیار کے سوا صرف خدا تھا۔" میرال کا دل لرزنے لگا۔

"وہ دن یاد کرو جب اس مرنے والے اور اس کے بیٹے کی قید سے نکال کر میں تمہیں اپنے ریسٹ ہاؤس میں لے گیا، کتنے دن، ہفتے، مہینے تمہارے وہاں گزرے، کیا مجھ ایسے شیر کے دانت تیز نہ تھے یا شکار مُردار تھا؟"

میرال کا دل اپنے کہے لفظوں کے ایک ایک حرف پر ہزار ہا بار ندامت کی گہرائیوں میں ڈوبنے لگا۔
"کیا تھا جو میں مسز جہانگیر اور ان کے دوستوں کی احمق آواز کو شروع میں ہی دبا دیتا، میرے پاس اختیار نہ تھا یا مجھے خود پر اچھالی کیچڑ اچھی لگتی تھی؟" حقیقتیں مزید عریاں ہو کر میرال کو اپنا آپ دکھانے لگیں۔
"اور پھر مجید خان تو مر ہی گیا تھا، دو چار گولیوں کی زد میں تم بھی آ جاتیں، قصہ ہی ختم ہو جاتا، مسز جہانگیر اور ان کے دوستوں کے اٹھتے ہوئے قلم مجھے عظیم ترین شخصیت گردانے لگتے، برستی گولیوں میں خود کو جھونک کر، پروٹوکول اور پوزیشن کی پروا کیے بغیر جان پر کھیلتے ہوئے اپنا وعدہ ایفا کرنے کی مجھے کیا ضرورت تھی میرال اگر تمہارا میری نظر میں وہ مقام نہ ہوتا جو ہے۔" میرال کو پہلی بار اس کی آواز بھرائی ہوئی محسوس ہوئی۔
"خدا گواہ یہ سب سچ ہے۔" میرال نے بہ مشکل حلق میں گھٹے الفاظ ادا کیے۔ "لیکن اب جبکہ آگ کا دریا عبور ہو چکا، پھر مجھے کیوں زندگی کی بستی میں تنہا چھوڑے جاتے ہیں۔"
"کیونکہ میں تمہیں اپنے ساتھ کی پل، پل کی موت مرتے نہیں دیکھ سکتا۔ خود اپنے ہاتھوں سے تمہیں زندگی کی بسی بسائی بستی میں چھوڑ کر آیا ہوں۔ واپس آگ کے دریا میں کیسے لے آؤں۔ میں بہت بہادر، بہت ذہین، کسی سے نہ ڈرنے والا، گھوڑ دوڑ کی پشت پر بیٹھ کر سینہ سپر جنگجوؤں کا مداح، پشت سے آئے وار کا شکار ہو چکا ہوں...... اور یہ وار میرے اس اپنے نے کیا ہے جسے بے گناہ قرار دینے کی مجھ میں ہمت ہی نہیں ہے۔ میں اس وار کے آگے نہتا ہوں میرال۔ میرے ہاتھ اوپر کو اٹھے ہوئے ہیں اور ہونٹ سل چکے ہیں، میرے ہتھیار میرے قدموں میں پڑے ہیں۔"
میرال نے اس کی بات سنی اور ضبطِ گریہ کرتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اپنی ساری بات کہہ چکا تھا۔ اب اس کے پاس اور نہ خود میرال کے پاس کچھ کہنے کو باقی تھا۔
"تم مجسم دعا ہو میرال صلاح الدین، میرے لیے دعا کرنا میں اپنوں کی بوئی جو فصل کاٹ رہا ہوں، وہ کٹ جائے اور میرے ہاتھ شل نہ ہوں۔" اس نے آخری بات کی تھی اور فون بند کر دیا تھا۔ میرال سب کچھ پا کر بھی اسے ہار چکی تھی۔

☆☆☆

"میرا نام محمود درانی ہے، میں حمزہ کا والد ہوں اور آپ سے اپنی بیوی کے انتہائی غلط رویے کی معافی مانگنے آیا ہوں۔" محمود درانی نے باری، باری عافیہ اور جہانگیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"انہوں نے غلط رویہ ہی نہیں اپنایا، بہت بڑی زیادتی کی۔" عافیہ نے کہا۔
"وہ ناسمجھ اور بدبولی ہے، میں بتا نہیں سکتا میں کتنا شرمندہ ہوں۔" محمود درانی سر جھکائے ہوئے بولے۔
"کہے ہوئے الفاظ اور دیے ہوئے زخم واپس نہیں ہو سکتے...... لیکن پھر بھی آپ خود چل کر آئے ہیں اس لیے ہم اپنے دل سے بات نکال دیں گے۔" جہانگیر نے سنجیدگی سے کہا۔
"میں حمزہ کے والد کی حیثیت میں خود آپ سے میرال کے لیے حمزہ کا نام تجویز کرنا چاہتا ہوں۔" محمود صاحب نے کہا۔
"اب شاید اس کی ضرورت نہیں رہی۔" عافیہ نے کہا۔ "آپ کی وائف کی توجہ دلانے پر ہی ہمیں خیال آیا کہ دوسروں کی طرف دیکھنے کے بجائے ہم میرال کو اپنی ہی بہو کیوں نہیں بنا لیں کیونکہ ہم تو اس کی عصمت

اور کردار کے گواہ ہیں، اس کے لیے ہمیں اپنے بیٹے کا طے شدہ رشتہ ہی کیوں نہیں توڑنا پڑے ہم اس نیک کام کو اپنے گھر ہی سے کیوں نہ شروع کریں۔"

"نہیں میری بہن......" محمود درانی نے عافیہ کی بات سن کر حمزہ کے چہرے پر امڈتی بے چینی پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "میں اگرچہ ابھی تک اس بچی سے ملا نہیں ہوں مگر بغیر دیکھے، ملے اور جانے ہی اس کی پاکبازی اور عصمت و کردار کی گواہی دیتا ہوں اور یہ کوئی جذباتی گواہی نہیں ہوگی، یہ حالات و واقعات کے منطقی تجزیے کا نتیجہ ہوگا۔" عافیہ نے کن انکھیوں سے جہانگیر سہگل کی طرف دیکھا۔

"ویسے عجیب سی بات یہ ہے کہ ہم سب اپنی، اپنی جگہ پر کوشش کر رہے ہیں، ہم نے میراں سے اس کی رائے نہیں لی، وہ اقبال، حمزہ، فہد ان تینوں میں سے اسے اپنے لیے کون مناسب ساتھی محسوس ہوتا ہے۔" جہانگیر سہگل نے یک دم کہا۔ ان کی بات سن کر وہ اقبال نے بے چینی سے اپنی نشست پر بیٹھے، بیٹھے پہلو بدلا تھا اور حمزہ اٹھ کر اندر چلا گیا تھا۔ اس کا رخ میراں کے کمرے کی طرف تھا۔ دروازے پر دستک دینے اور اندر داخل ہونے کی اجازت پانے کے بعد وہ میراں کے سامنے تھا۔

"مجھے زیادہ لمبی چوڑی باتیں کرنی نہیں آتیں میراں، یہ بات تم بہت پہلے سے جانتی ہو۔" اس نے اس کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے بغیر کوئی تمہید باندھے کہا۔

"ایک عرصے سے بی اماں اور خصوصاً بوا جی مجھے خواب میں تمہاری کھوج میں نکلنے کی تلقین کر رہی ہیں، ساتھ کے ساتھ وہ مجھے یہ اشارہ بھی دیتی رہی ہیں کہ تمہارے سر پر چادر ڈالنا میرا فرض اور میری ذمے داری ہے۔" اس نے رک کر میراں کی طرف دیکھا جو پوری توجہ سے اس کی بات سن رہی تھی۔

"میں تمہارے بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتا...... بچپن، ایک ہیولے کی طرح میری یادوں میں زندہ ہے..... مگر جب میں ایک عرصے بعد ایبٹ آباد گیا تو اس شہر کو دیکھ کر مجھے تمہارا اور بوا جی کا خیال آیا اور غالباً اسی روز سے میری ڈیوٹی لگ گئی کہ تمہیں تلاش کروں، تمہاری کھوج میں جہاں اتنے لوگ نکلے وہاں ایک دیا تمہاری تلاش کا میں نے بھی جلایا اور اپنی بساط بھر کوشش کرتا رہا ہے۔"

میراں کے چہرے پر ممنونیت کے آثار نظر آنے لگے۔

"اور اب جب تم اس زنداں سے باہر نکل چکی ہو میرے سامنے موجود ہو، میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر تمہاری عصمت اور پاکبازی کی گواہی دیتا ہوں اور خود کو تمہارے ساتھ کے لیے سوالی کے طور پر پیش کرتا ہوں، بی اماں اور بوا جی تو شاید ہم دونوں کا تعلق بہت پہلے..... طے کر چکی تھیں، میں اس کمٹ منٹ کو حقیقت بنانے کے لیے تم سے ریکوئسٹ کرنا چاہتا ہوں، اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دو۔ ہم دونوں مل کر بی اماں اور بوا جی کی ریتوں، روایتوں اور اس دم توڑتی اقدار کو دوبارہ زندہ کر سکتے ہیں جن کو ہم نے بھلا رکھا ہے کیونکہ اس نسل کی وضع داری کے امین شاید صرف ہم دونوں ہی ہیں۔"

"کیا تم اس پر ہنگام زندگی سے دور مجھے پھر سے سادگی اور بے تکلفی کے اس دور میں واپس لے جاسکتے ہو جو بی اماں اور بوا جی کا دور تھا؟" میراں نے اس کی لمبی بات سننے کے بعد صرف ایک سوال پوچھا۔ "کسی ایسی جگہ جہاں میں اپنی نئی شناخت بنا سکوں جہاں میں بوا جی کی بیٹی اور بی اماں کی بہو کی حیثیت سے جانی جاؤں؟"

"بالکل!" حمزہ نے فوری جواب دیا۔ "میرا تم سے وعدہ رہا...... میں تمہیں ایسی ہی جگہ لے جا کر بساؤں گا۔"

"کیا تمہارے والدین مجھے قبول کر لیں گے؟" میراں نے دوسرا سوال کیا۔

"میرے والد باہر تمہارے سوالی بنے بیٹھے ہیں عافیہ آنٹی کے پاس۔"

"ٹھیک ہے، میں تمہارے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیتی ہوں۔" میرال نے ہاتھ بڑھایا، اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے حمزہ نے دیکھا وہ اسی کی طرف دیکھ رہی تھی اور اس کی بھاری غلافی آنکھوں میں حزن تھا، ملال تھا، سوگواری تھی۔

"لو آج میں بھی تم سے دست بردار ہوئی مہرزاد خان۔" اور میرال سوچ رہی تھی۔ "ایک صرف تمہارے خیال سے نجات پانے کے لیے اس شخص کی نیک فطرتی اور پُرخلوص محبت کے آگے سرنڈر کردینے میں مجھے کوئی ملال نہیں ہونا چاہیے...... مگر نہ جانے ایسا کیوں ہے کہ میرے اندر کچھ کٹتا محسوس ہو رہا ہے اور میرے جسم میں کانٹے سے چبھنے لگے ہیں۔"

☆☆☆

"میرا بیٹا، شہید کا بیٹا، ظالموں کے قبضے میں، حکومت مدد کرے، ہم کارواں بنائیں گے، احتجاجی ریلی وغیرہ۔ واہ بھئی اتنے کم دنوں میں تم نے بہت کچھ کر ڈالا۔ مجھے توقع نہیں تھی سائیں کہ تم اتنی باہمت ثابت ہوگی، بک اپ سائیں بک اپ۔"

"میں کانٹوں کے بستر پر سوتی ہوں صاحب، میری آنکھوں کی نیندیں اُڑ چکی ہیں، میرا بیٹا نہ جانے کس حال میں جیتا ہوگا۔"

"تو ایسا کرو ناں بابا ایک چیز ہوتی ہے ٹرینکولائزرز، کیا سمجھیں ٹرینکولائزرز وہ لینا شروع کرو رات کو سونے سے پہلے، دماغ کو آپوں آپ (اپنے آپ) سکون آنا شروع ہو جائے گا۔"

"صاحب آپ باتوں میں ٹرخا رہے ہیں مجھ کو۔"

"تو اور کیا کروں بابا...... ادھر جہاں تمہارا بیٹا ہے ناں ادھر بات کرنے کے لیے پہلے ڈالروں کی بوریوں کے منہ کھولنے پڑتے ہیں۔ ڈالر بات شروع کرواتے ہیں۔ ڈالر ہی بات آگے بڑھاتے ہیں...... لے آؤ اتنے ڈالر اور کروالو ان سے بات، نہیں تو پڑا رہنے دو آسے اُدھر اس اسکار چنگ ہیٹ میں ٹھنڈی ٹھار چٹانوں میں پڑا آرام کرتا ہے، canned فوڈ کھاتا ہے اور اصلی شراب پیتا ہے، اسے وہاں دکھ کیا ہے جو روتی ہو، بس وقت کو ٹالتی جاؤ، احتجاج کرتی رہو گا ہے بگاہے یہ ہی تمہارے لیے لائن آف ایکشن ہے، اگر ڈیڈ ایشوز جوڑے ختم ہوگئے ہیں تو وہ اور بنوالو البتہ، ہیبیوں نے وہیں میں ایک نیا ڈیڈ ایشو ڈھونڈا ہے، فرانس سے آیا ہے، دنوں میں جھنڈے گاڑ دیے اس نے، کہو تو اس کا کانٹیکٹ دے دوں؟"

"رہنے دیجیے...... بہت تمسخر اڑا چکے آپ ہماری بے بسی کا، وقت بدلنے کا وقت اب آیا ہی چاہتا ہے، اب آپ بھی تیل دیکھیں گے اور تیل کی دھار بھی۔"

"ہاہاہا...... ہمیں ڈراتی ہو نہ ہاہا نہ...... یاد رکھنا رادھا کے ناچنے کے لیے بھی نومن تیل چاہیے ہوتا ہے، کوئی نومن تیل لائے گا تو رادھا کو نچوائے گا ناں...... اس لیے ہمیں تیل کی دھار کی کیا فکر بھلا!"

"اللہ آپ سے پوچھے صاحب، میرا تو خاندان برباد ہوگیا آپ کی دوستی میں۔"

"میں تو پہلے ہی عرض کرتا تھا تم لوگ ٹھہرے اہلِ علم و دانش کی اولادیں، قدوسی اللہ والوں کی سرزمین کا خادم، دوستی کیسے ہوگئی کچھ سمجھ نہیں آیا۔"

''تھینک یو صاحب اینڈ گڈ بائے فار گڈ۔''

''گڈ بائے بی بی جان..... گڈ بائے۔ ساتجل کی دھار دکھانے والی مکانی تم نہ جانے کدھر سے آگئی تھیں اہلِ علم و دانش کے خاندان میں۔''

☆☆☆

اس کے سامنے تین شادیوں کے کارڈز رکھے تھے، سادہ مگر بے حد خوب صورت کارڈ۔ تین باراتیں ایک ہی گھر سے نکلنے والی تھیں اور تینوں کو ایک ہی جگہ جا کر تین دلہنیں بیاہ کر لانی تھیں۔ ان تینوں باراتوں میں وہ بصد احترام مدعو تھا بلکہ شاید وی آئی پی گیسٹ ہوتا اگر وہ ان میں شرکت کرتا..... مگر وی آئی پیز کو مدعو کرنے کے جھگڑے اور قصے لمبے ہوتے ہیں، پروٹوکول، خصوصی انتظامات، حفاظتی دستے اور نہ جانے کیا، کیا..... اپنے میزبانوں کو اسی زحمت سے بچانے کے لیے اس نے شرکت سے معذرت کرلی تھی۔ اس کی طرف سے تینوں جوڑوں کے لیے تہنیتی پیغامات کے ساتھ قیمتی تحائف بھجوائے جا چکے تھے۔ اس شام جب یہ تقریب منعقد ہو رہی تھی تو وہ اسکائپ پر عانیہ جہانگیر کے ساتھ رابطے میں تھا۔ تینوں نکاح مسجد میں ہوئے تھے اور تینوں باراتیں سادگی کے ساتھ کنٹری کلب میں اتری تھیں۔ تینوں دولہا خوب صورت تھے اور روایتی لباس میں شاندار لگ رہے تھے۔ وہ بہت دلچسپی کے ساتھ عرصے کے بعد کسی شادی کی تقریب دیکھ رہا تھا۔ تینوں دلہنوں نے روایتی گھونگٹ کاڑھ رکھے تھے۔ تینوں کو وہ ساتھ بیٹھے دولہاؤں کے ذریعے پہچان پا رہا تھا۔ فہد صدیقی کی دلہن، دانیال جہانگیر کی دلہن اور حمزہ محمود کی دلہن اس تیسری جوڑی پر آ کے اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے آنکھیں بند کرلی تھیں۔ تینوں دولہاؤں کے چہرے ہنس اور مسکرا رہے تھے مگر لمبے گھونگٹ کاڑھے تینوں دلہنوں میں سے کون کتنی خوش تھی کون جانے..... اسے نگاہ وہ مزید نہیں دیکھ پائے گا..... اس نے اپنے ٹیب کی اسکرین آف کردی اور گلاس وال کے پار اندھیرے میں چمکتی مصنوعی روشنیوں کو دیکھنے لگا۔

''میں کہتا تھا ناں کہ تمہاری قسمت کا ستارہ بہت بلند ہو رہا ہے جو بات منہ سے نکالتی ہو پوری ہو جاتی ہے، کیسے طنطنے کے ساتھ تم نے کہا تھا۔ دیکھتے ہیں کون یہاں سے جا کر واپس آتا ہے اور لو تمہاری کہی بات پوری ہوگئی۔ مبارک ہو اس بار بھی حسبِ عادت تم نے بولا اور اس کی فصل مجھے کاٹنی پڑی..... مگر تمہاری عطا کردہ یہ سوغات میرے سر آنکھوں پر۔ بس ایک خواہش دل میں جاگتی رہے گی کہ تم ہمیشہ خوش رہو اور میرے دل کے نہاں خانوں میں بستی رہو۔'' اس نے حمزہ محمود کے پہلو میں بیٹھی دلہن کو تصور میں مخاطب کرتے ہوئے سوچا اور کمرے میں جلتی تمام روشنیاں بجھا دیں۔

☆☆☆

''اُف اگر حمزہ نہ ڈٹ جاتا تو میں تو گیا تھا کام سے۔'' دانیال نے ہنس کر کہا تھا۔

''میں تو مر ہی جاتی۔'' بینش کی آواز ابھری۔

''میں تمہاری لائف ہوں جانِ من، تم کیسے مرسکتی تھیں.....'' دانیال کے لہجے میں شوخی ابھری تھی۔ وہ دونوں ہنس رہے تھے۔

☆☆☆

''مجھے ابھی تک یقین نہیں آیا کہ تم نے میرال کو چھوڑ کر میرا انتخاب کرلیا۔'' علینہ نے کہا۔

''میرال کو میں نے پکڑا کب تھا محترمہ..... اسے صرف تلاش کر رہا تھا میں، وہ بھی انسانیت کے نام

پہ۔۔۔" فہد کی آواز آئی۔

" جاؤ، جاؤ جیسے میں جانتی نہیں۔" علینہ نے مصنوعی خفگی دکھائی۔

" تم واقعی نہیں جانتیں کیونکہ تم sadist ہو، اب دیکھنا، میں تمہیں کیسے ایک optimist میں convert کرتا ہوں۔"

" ایک بات بتا دوں، میں گھر میں کوکنگ نہیں کیا کروں گی کیونکہ یہ تمہارا شعبہ ہے۔" علینہ کی ہنسی کی آواز پھولوں سے سجے کمرے میں پھیلی۔

" چلو کوکنگ مت کرنا، بچن ٹریش ٹھکانے لگانا تمہارا کام ہوگا۔" فہد بھی ہنسا تھا۔

" نہیں، میں صرف زندگی انجوائے کروں گی...... ہاں زندگی کی ہر خوب صورتی کو رک کر کچھ دیر دیکھتے رہنے کی لگژری انجوائے کروں گی۔"

" leisure نامی نظم کاری ایکشن۔" فہد ہنسا۔

" بالکل......" اک ادائے ناز سے کہا۔

" چلو ٹھیک ہے، زندگی کی سب خوب صورتیاں اور یہ لگژری تمہارے نام۔" اب وہ دونوں اکٹھے ہنس رہے تھے۔

☆☆☆

" اللہ کا شکر ہے آج میں بی اماں اور بوا جی کے سامنے سرخرو ہوا۔" حمزہ کی پُرسکون آواز کمرے میں گونجی۔

" میں تمہاری ممنون ہوں کہ تم مجھے بیاہ کر بی اماں کے گھر لے آئے، اپنی ممی کے گھر لے جانے کے بجائے۔" میرال نے کہا تھا۔

" کیا تمہیں یہاں آکر اپنائیت محسوس نہیں ہو رہی؟"

" لگتا ہے سب وہی ہے، اپنا سا، مانوس سا۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

" یہ میرے اس عزم کی نشانی ہے جو بی اماں اور بوا جی کو خوابوں میں دیکھنے اور سننے کے بعد میں نے باندھا تھا۔ تمہاری تلاش اور تم سے شادی......"

" مجھے تمہارے عزم پر فخر ہے...... مجھے اپنا آپ بہت honoured محسوس ہو رہا ہے۔۔۔ آسمانوں پر اُڑتا ہوا...... تم ایک عظیم انسان ہو۔"

" تم شاید اندازہ نہیں کر سکتیں کہ تم ایسے "معجزے" کو پا کر میں کتنا honoured محسوس کر رہا ہوں، مجھے یقین ہے تمہارے ساتھ چلتی صوفی صاحب کی دعائیں ہماری زندگی میں رحمت و برکت بھر دیں گی۔"

" اللہ کرے......" دل کے ساتھ زبان نے بھی پُرزور تائید کی۔

" انشاءاللہ......" وہ دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

☆☆☆

گورنر ہاؤس میں جاری سرکاری تقریب کے دوران چینی نژاد پاکستانی مسز زوئی نادر حسین کو سماجی بھلائی کے کاموں میں اعلیٰ خدمات کے عوض صدارتی تمغہ برائے حسنِ کارکردگی سے نوازا گیا تھا۔ زوئی حسین کی ہسٹری بتانے والے کمپیئر کی بات سننے کے بعد اکثر لوگوں نے اسے سفارشی انعام قرار دیا تھا۔ یہی تبصرہ ملک شہباز کو ملنے والی خصوصی انعامی رقم کے نتیجے میں بھی کیا گیا تھا...... مگر زوئی حسین اور نادر کو بخوبی اندازہ تھا کہ

ملک کی ایک بیٹی کی عصمت کو بچانے کے لیے چھوٹی سی سعی ان پر کیسی بھاری بن کر گزرتی رہی تھی۔ تمام نامساعد حالات کا سامنا کر لینے کے بعد بھی زوئی حسین کی پاکستان سے محبت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ پُروقار سرکاری تقریب کے اختتام پر سبز ہلالی پرچم کے ہم رنگ سبز لباس اور سفید دوپٹے میں ملبوس زوئی حسین ٹی وی کیمرے کے سامنے اپنا میڈل پہنے کھڑی اپنی باریک آواز اور چھنتی لب و لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''مجھے پاکستانی قوم کی فرد ہونے پر فخر ہے۔ پاک سرزمین شاد باد......'' اس کے اردگرد کھڑے لوگ بھی ہاتھوں میں پکڑی چھوٹی، چھوٹی جھنڈیاں اٹھائے قومی ترانہ سنا رہے تھے۔

☆☆☆

قیوم نے ''steady green'' سگنل دینے کے بعد پیچھے ہٹتے ہوئے اپنے سامنے موجود سیسنا جہاز کو ٹیکسی فارورڈ کا اشارہ دیا اور مزید پیچھے ہٹ گیا۔ جہاز نے اپنے پہیوں پر آگے آتے ہوئے انجن سے دھواں چھوڑا اور دھیرے، دھیرے اوپر اٹھنے لگا۔ والٹن فلائنگ کلب لاہور کے فلائنگ انسٹرکٹر قیوم شہزاد کے لیے یہ فلائٹ، اس کی زندگی کا سب سے بڑا معجزہ تھی۔ چار سال قبل جو فلائر اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے جہاز سمیت بلندیوں سے نیچے آگرا تھا۔ ایک ایسی فال جس نے جہاز کو آگ کے شعلوں میں لپٹے ہوئے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیا تھا، جہاز اڑانے والے کا جسم زخموں سے چور تھا اور دماغ کوما میں جا چکا تھا اور جس کی جواں مرگی کا سوچ کر اس کی روح فنا ہوتی تھی اور جسے اس حادثے کے بعد ایک لمبے عرصے تک وہ موت اور زندگی کے دوراہوں پر کھڑے اور بھٹکتے دیکھتا رہا تھا۔ آج وہی ہوا باز...... اس کی نظروں کے سامنے اپنے کامل اعضا اور مکمل حواسوں کے ساتھ اس کے ''steady green'' سگنل پر ہاتھ کے انگوٹھے کے اشارے سے اسے چیئرز کا اشارہ دیتے ہوئے آسمان کی بلندیوں پر پرواز کر رہا تھا۔ قیوم نے اپنی زندگی کے اس سب سے بڑے معجزے کا نظارہ کرتے ہوئے اپنی بھیگی آنکھوں کو ہاتھ کی انگلیوں سے خشک کرتے ہوئے اپنے بائیں طرف کھڑے دانیال جہانگیر کی والدہ، والد اور بیوی کو دیکھا...... ان سب کی آنکھیں بھی برس رہی تھیں اور چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے۔

''وہ ایک مکمل فائٹر ہے......'' قیوم نے عافیہ جہانگیر کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''اور مکمل فائٹر ہی عظیم ترین فلائرز ہوتے ہیں۔''

''تم خوش قسمت ہو بیٹی جو تمہیں اس شخص کا ساتھ ملا جو اللہ کی قدرت کا چلتا پھرتا اور اس کی رحمتوں کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔'' پھر اس نے بینش دانیال کو مخاطب کیا تھا جس کا معصوم چہرہ ہلکے گلابی دوپٹے کے ہالے میں اور بھی معصوم نظر آ رہا تھا۔

''ہم سب خوش قسمت ہیں مسٹر قیوم...... جو ایک حادثے نے ہماری زندگیوں کے محور بدل ڈالے، ہمیں راہِ ہدایت اور صراطِ مستقیم حاصل ہو گئی، اب یقیناً دانیال کی پرواز میں اور بھی مہارت اور خوب صورتی نظر آئے گی کیونکہ یہ ایک سچے اور پختہ ایمان والے کی فلائنگ ہے۔'' عافیہ نے مسکرا کر کہا۔ آسمان کی بلندیوں پر دانیال کا جہاز یکساں اور متوازن پرواز کر رہا تھا...... ایک دعائے خیر نے ناممکن کو ممکن میں بدل ڈالا تھا۔

☆☆☆

''میں نے تمہاری ماں کو جو حقیقت تھی سچ، سچ بتا دی تھی مہرزاد خاناں......'' بلغمی آواز والے بزرگ اس روز بھی اس کے گھر میں اس کے سامنے بیٹھے تھے، کمرے میں موجود باقی نشستوں پر بھی وہی جانے پہچانے

لوگ براجمان تھے جو برادری کی پنچایت میں شامل ہوتے تھے۔

''میں نے آپ کی اور اماں جان کی ساری بات سن لی تھی نانا جان۔۔۔۔ ''اس نے تحمل سے جواب دیا۔ ''اور آج صبح میں آپ کو فون پر اپنے فیصلے سے مطلع کر چکا ہوں پھر میری سمجھ میں نہیں آرہا کہ یہ نئی عدالت کس سلسلے میں لگی ہے؟''

''او ئے جھنڈ، مہرزاد خاناں......!'' وہ شخص جو اس کا سسر بننے کی سعادت سے محروم رہ گیا تھا اٹھ کر اس کے قریب آتے ہوئے بولا۔ ''تو زیادہ ہی غصہ نہیں کھا گیا۔ ان رشتوں، ناتوں کا کیا ہے، مقدر میں ہوں تو جڑ جاتے ہیں، نہ ہوں تو نہیں جڑتے، ان کے پیچھے تعلق داریاں تو نہیں ناں خراب کر لیتی ہم نے۔''

''ایسا بڑا یوٹرن......؟'' وہ محفل میں بیٹھے ہونے کے سبب کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ بھی نہیں کر سکا تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے اویس خان کی طرف دیکھا جو اس کے انکار کے نتیجے میں گدی کو گھر بٹھانے والا تھا، وہ اسی کی طرف خوشامدی سی مسکراہٹ چہرے پر سجائے دیکھ رہا تھا۔ نظریں چار ہونے پر وہ اسی مسکراہٹ کے ساتھ بول اٹھا۔

''یار مہرزاد خان...... ابھی ہی تو میلا بھرنے لگا ہے، مت ماری ہے ہماری جو بھری ہانڈی کو لات مار جائیں گے، چل شاباش!'' اس نے پچکارا۔ ''غصہ تھوک دے۔ قبیلہ اور برادری پہلے بھی تیرے پیچھے کھڑی تھی، اب بھی اسی طرح اسٹینڈ اسٹل ہے۔''

''اب اس کا کوئی فائدہ نہیں اویس خان۔'' مہرزاد خان کو ان سارے لہجوں اور رویوں سے کراہیت محسوس ہونے لگی تھی۔ اس کا لہجہ اکھڑ ہو رہا تھا۔ ''میں اپنے فیصلے کی کاپی فارورڈ کر چکا ہوں اور اسے واپس لینے کا میرا قطعی کوئی ارادہ نہیں، میرے باپ کے مرنے پر جو وقتی خلا آپ لوگوں کی صفوں میں پیدا ہوا تھا، وہ پُر ہو چکا، اقتدار کے ایوانوں، بیورو کریسی، عدلیہ، مقننہ...... اس ملک کا کوئی ستون ایسا نہیں جس پر آپ لوگوں کے پنجوں کی گرفت مضبوط نہ ہو چکی ہو...... میرا کام اتنا اور اِدھر تک ہی تھا...... اب آپ بے فکر ہو کر راج کر سکتے ہیں...... اور ہاں مرد تو بھرا میلا ہی چھوڑ کر جانے میں ہے ناں......'' وہ ذرا سا مسکرایا۔

''مگر وزارت......؟'' ایک دبی ہوئی آواز سنائی دی۔

''وزارت کی مدت رہ ہی کتنی گئی ہے۔'' وہ طنزیہ ہنسی ہنسا۔ ''اور اب تک تو یہ وزارت ایک ایسا لافنگ اسٹاک بن چکی ہے کہ جو بھی اسے اپنے سر پر سجائے گا لطیفوں کا بادشاہ اور ہنسی کا گول گپا ہی بن کر رہ جائے گا۔''

''نہ کر خاناں۔۔۔ نہ کر ایسا...... آنے والے کئی الیکشنز تک ہمیں تیری ضرورت ہے۔'' بلغمی آواز بولی۔

''آپ لوگ میری شہادت کیش کرانا چاہتے تھے، مجھے شہادت درکار نہیں تھی۔ نانا جان! میں اس شہادت سے دست بردار ہوا، اب آپ میرے اس فیصلے کو خاندانی اصول پرستی اور راست گوئی قرار دے کر برسوں کیش کراتے رہیے گا...... مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''اپنی ماں کو بھی اپنا ہم نوا بنا کر تو نے تو پورا یوٹا ہی اکھیڑ ڈالا خاناں...... اس خاندان کو تیرے ایسا کہاں ملنا ہے برسوں...... ہر توقع کا رخ موڑ ڈالنے والا، ہر فیصلے پر سب کے منہ کھول دینے والا، ہر قدم پر سرپرائز، ہر موڑ پر اندھی گلیوں کو مات دے دینے والا...... نہ کر یہ ظلم خاناں نہ کر۔''

''آپ کو یاد ہے ناں آپ سب نے مجھے گولی سے وارن کیا تھا، وارن بھی کیا بلکہ تھریٹ کیا گیا تھا میں۔'' وہ کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ ''مجھے اس گولی سے بچنا ہے، میری زندگی اتنی کم قیمت نہیں، اتنی غیر اہم نہیں کہ جسے

میں شہادت کے نعرے مارنے والوں کے لیے قربان کر جاؤں، مجھے اپنی زندگی کو جتنی کہ وہ ہے بہت سے اور کاموں کے لیے استعمال کرنا ہے۔ ایسے کام جو میرے ہی کرنے کے ہیں۔ آج میں آپ کو آپ کے قبیلے کی، آپ کی برادری کی اور آپ سب حضرات کی اپنی، اپنی دستار، عزت، غیرت اور سرداری واپس کرتا ہوں، جتنی دیر یہ میرے پاس رہی، میرا خدا گواہ ہے میں نے اس سے غداری نہیں کی لیکن مزید وفاداری اب میرے لیے ممکن نہیں رہی لہٰذا اب یہ آپ کو مبارک ہو۔" اس نے حتمی لہجے میں آخری بات کی اور ان سب چہروں پر نظر ڈالی جن پر مایوسی تھی، شرمندگی تھی، پریشانی تھی، پشیمانی تھی، فکر تھی...... مگر چیلنج نہیں تھا، وارننگ بھی نہیں تھی اور دھمکی بھی نہیں تھی، مہر زاد خان نے بغیر اپنے مہرے، ادھر اُدھر کیے انہیں سیدھی شاہ مات سے دوچار کر دیا تھا۔

☆☆☆

تمام ٹی وی نیوز چینلز پر ایک بریکنگ نیوز چل رہی تھی۔ وفاقی وزیر اطلاعات و نشریات سردارزادہ مہر زاد خان نے اپنی وزارت سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ انہوں نے نہ صرف وزارت بلکہ قومی اسمبلی کی رکنیت اور پارٹی کی بنیادی رکنیت سے بھی استعفیٰ دے دیا تھا۔ استعفیٰ کی وجہ ذاتی مسائل بتائی گئی تھی۔ چند منٹوں کے اندر سیٹلائٹ، ٹی وی کے نیوز چینلز پر تمام مخصوص چہرے اپنے، اپنے مائیک سنبھالے اس بریکنگ نیوز پر تبصرے اور بحث کرنے کے لیے تیار بیٹھے تھے۔

☆☆☆

"His was an entry of a leading soldier and his is an exit of a high-headed conqueror".

اگلے روز ایک لیڈنگ نیوز پیپر میں نامور صحافی نبیل رئیس کا تبصرہ اس عنوان کے تحت شائع ہوا تھا۔ نبیل رئیس جس نے چند ہفتے قبل ہی مہر زاد خان کی ترجمان کی حیثیت سے ذاتی اختلافات کی بنا پر استعفیٰ دیا تھا کا یہ تبصرہ جاندار اور انتہائی منطقی تھا۔

☆☆☆

"میں جانتا تھا بابا...... تم اگلا دایاں قدم ایسا اٹھاؤ گے جس کی خبر تمہارے بائیں قدم کو بھی نہیں ہوگی مگر تم نے یہ قدم کچھ اچھا نہیں اٹھایا۔"

"آپ سب جانتے ہیں سر!"

"ہاں بابا میں جانتا ہوں...... مگر یہ کوئی مردوں والی بات تو نہ ہوئی ناں......"

"میں نے پہلے روز کہا تھا سر، میں اپنی سی کوشش کروں گا لیکن اگر نظام کو نہ بدل سکا تو نظام کا حصہ بننے کے بجائے نظام کو چھوڑ جاؤں گا۔"

"پہلے روز کی کہی باتیں کوئی صحیفے تو نہیں ہوتی ناں سائیں، کیوں اپنا نقصان کرتے ہو...... آگے لمبا سیاسی کیریئر پڑا ہے، جانتے ہو تم کتنی بار گولی سے بچے ہو، اتنی بار گولی سے بچ جانے والے کو تو ستے خیراں ہوتی ہیں سائیں۔"

"آپ میرے قبیلے، میری برادری اور خاندان کو جانتے ہیں سر، میں ان کے سروائیول کے لیے انہیں ایک اور شہید کا تحفہ نہیں پیش کرنے والا۔ اب انہیں اپنے ہتھیار خود اٹھا کر فرنٹ پر آنا ہوگا...... یا تو ختم ہو جائیں گے یا ہمیشہ کے لیے مین اسٹریم میں آ جائیں گے۔"

"تو بابا میرا کیا قصور ہے اس میں، تمہارے راستے صاف کرنے کو میں نے کون، کون سا کانٹا کیسے نکالا جانتے ہو ناں......"

"جانتا ہوں سر.....اور اسی لیے آپ کو سیلوٹ کرنے آیا ہوں۔ آپ بہت بڑی سپورٹ رہے۔"

"یہ اچھی بات نہیں ہے سائیں، سپورٹروں کو یوں دغا دے جانا۔"

"میں یہ بھی جانتا ہوں اور معذرت خواہ بھی ہوں لیکن کبھی اگر مجھے محسوس ہوا کہ تبدیلی کا محض نعرہ نہیں لگ رہا تبدیلی واقعی نظر آنے لگی ہے تو لوٹ آؤں گا۔"

"یار تم تو بڑے گٹوں والے بندے ہو، حوصلہ مند چنگیز خان کے مداح، تم retreat کیوں کر رہے ہو سائیں۔"

"یہ retreat نہیں ہے سر، تمام چالیں ایک individual کو بچانے کے لیے تھیں۔ individual، سروائیو کر گیا تو واپسی کا سفر آسان ہو جائے گا۔"

"صرف ایک لڑکی کی وجہ سے بساط الٹ کر جا رہے ہو سائیں، کم آن سائیں۔"

"صرف ایک لڑکی.....؟" وہ ہنسا۔ "وہ صرف ایک لڑکی نہیں سر، وہ پورا جہان ہے۔ جب ہی تو اللہ مجھے اِدھر لایا، الیکشن لڑایا، وزارت عطا فرمائی، وہ صرف ایک لڑکی ہوتی تو یہ اتفاقات کہاں ہاتھ لگتے۔"

"ایسی ہی ہوتی آئی ہے سائیں، اپنی محبوبائیں تمام ہیروز کو پورا جہان ہی نظر آتی رہی ہیں، جب ہی ہمیں، دیکھو کہیں ایک جگہ دل نہیں لگایا۔ جو آئی اسے جانا ہی ہے کہ مصداق کیا، کیا سمجھے گئے ہم۔"

"آپ کی تو بات ہی کیا ہے سر، آپ تو گریٹ ہیں، میں نے آپ سے بہت سیکھا ہے سر...... خصوصاً بساط پر بیٹھے بغیر چالیں چلتے دیکھنے کا فن۔ مگر میں اس انجیں ہاتھ کے قاتل کہاں جو پردے کے پیچھے سے آئے اور سب مہرے میرے حق میں چل جائیں۔ اس انتہا تک پہنچنے کے لیے مجھے آپ کا سا سفر طے کرنا ہوگا..... وہی سفر طے کرنے جا رہا ہوں۔"

"bon voyage، سائیں bon voyage، تم بہت کامیاب رہو گے، موقع پر آئے اور موقع پر نکل لیے..... آنے والا وقت تمہارا ہی ہوگا۔"

"مجھے میرے وقت کی بشارت مت سنائیں سر، میرے لیے اب سارے وقت ایک سے ہی ہوتے ہیں۔"

"ہاہا......"

"anyway تھینک یو فار دی سپورٹ یو آل ویز ایکسٹینڈ ڈ ٹو می۔"

"تم ذہین تھے، سپورٹ تمہاری بنتی تھی، ورنہ کون محافظ اپنے ہی صاحب کو گولی مار دیتا ہے اور کون سا...... قاتل خود کو hire کرنے والے کو اغوا کر کے لے جاتا ہے۔ سب co-incidence کا نتیجہ ہے سائیں...... اللہ تمہاری حفاظت کرے۔"

"تھینک یو سر...... گاڈ بلیس یو۔"

"یاد رہے یہ ایک فارمل الوداعی ملاقات ہے، اندر کھاتے ہم ملتے رہیں گے۔"

"شیور سر شیور.....!"

☆☆☆

تین سال بعد

لندن میں مقیم ساؤتھ ایشین اسٹڈیز کی استاد اور معروف پاکستانی صحافی کی کتاب "Meharzad

"khan a dynasty in himself" لندن کے ایک معروف اور مہنگے پبلشنگ ہاؤس سے شائع ہوئی اور ایک ساتھ پورے یورپ اور امریکا کے بک اسٹالز کے شیلفوں کی زینت بنی...... ڈشنگ مہرزاد خان کی بلیک اینڈ وائٹ پروفائل والے سرورق سے سجی اس کتاب میں ایک پاکستانی سیاست داں کی زندگی کو موضوع بنا کر پاکستان بالخصوص اور جنوبی ایشیا بالعموم کی سیاست کے حالات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی تھی اور مہرزاد خان کو ایک تاریخ ساز، دیومالائی شخصیت کے طور پر سامنے لایا گیا تھا۔ اس کتاب نے اپنی اشاعت اور مارکیٹ میں آمد کے ساتھ ہی کتب بین حلقے میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ پورے یورپ اور امریکا کے تمام بڑے اخبارات میں اس کتاب پر ریویو لکھے گئے اور چھ ماہ کے اندر، اندر ہی یہ کتاب booker's award کی ایک مضبوط امیدوار قرار دی جا چکی تھی۔

پاکستان میں البتہ اس کتاب کی خرید و فروخت پر مکمل پابندی لگ چکی تھی کیونکہ پاکستان میں مہرزاد خان کی پارٹی کی مخالف جماعت اقتدار میں آ چکی تھی۔ انٹرنیٹ پر دستیاب یہ کتاب آئندہ آنے والے سالوں میں انتخابات اور نئی قیادت کے سلسلے میں پاکستانیوں خصوصاً نوجوان پاکستانیوں کے ذہن میں کس انقلاب کا پیش خیمہ بننے والی تھی۔ یہ آنے والا وقت ہی بتانے والا تھا۔

☆☆☆

"ایک اجتماعی المیے سے مردانہ وار لڑنے والی پاکستانی قوم شاید ہی کبھی اندازہ کر پائے کہ اس اجتماعی المیے کے اندر کتنے ہی انفرادی المیوں نے جنم لیا۔ سن دو ہزار پانچ میں جس خوف ناک زلزلے نے پاکستان کے شمالی علاقوں کو اپنے آہنی پنجوں میں آن دبوچا تھا۔ وہ ایک قدرتی آفت قرار دی جا سکتی ہے بلکہ وہ تھی ہی ایک قدرتی آفت..... لیکن اس زلزلے کے اندر جنم لینے والے چھوٹے، چھوٹے انفرادی المیوں کو برپا کرنے کا ذمّے دار کون ہے، کون ذمّے دار ہے اس بچے کی موت کا جسے بھوک اور آفت کی دہشت کی ماری ماں نے خود اپنے ہاتھوں سے بلندی سے نیچے پھینک دیا، کون ذمّے دار ہے ان لوگوں کی موت کا جو کسی امداد کا انتظار کرتے، کرتے بے قرار ہو کر خود ہی پتھروں میں بھرے زندہ دفن اپنے پیاروں کو نکالنے چل پڑے اور خود بھی موت کا شکار ہو گئے۔ کون ذمّے دار ہے ان سیکڑوں باعصمت دوشیزاؤں کی عصمت دری کا جو امدادی کیمپوں سے زخمی حالت میں اٹھائی گئیں اور آج تک جن کی کسی کو خبر تک نہیں ملی۔ میں جانتی ہوں، میرا یہ بلاگ، صرف چند سو لوگوں کی نظروں سے گزرے گا یا شاید اس سے بھی کہیں کم...... لیکن کیا ان چند سو میں سے کوئی ایک ہے جو مجھے بتائے کہ ان باعصمت و باکردار زخمی بچیوں کو امدادی کیمپوں سے امداد اور طبی سہولتوں کے نام پر اٹھا کر کسی امراؤ بیگم، کسی زمرد خانم، کسی سلطانہ جان کے کوٹھے یا پھر کسی وزیر، مشیر، بڑے افسر، اعلیٰ عہدیدار کی سیجیں سجانے کو چھوڑ دینے والے ہاتھ کس کے ہیں، امدادی کاموں میں بے قاعدگیوں اور لوٹ مار کی تحقیقات کرنے والے کیا کبھی اس امر کی تحقیق بھی کر پائیں گے کہ ان بے کس، مجبور، لاوارث بچیوں کی عصمتوں کا قاتل کون ہے، حکومت، معاشرہ، ناقص قانون سازی یا پھر یہ سب مل کر ان کے مجرم ہیں؟

میں ایسی ہی گم کردہ راہ بچیوں میں سے ایک ہوں جس نے اس عظیم انسانی المیے میں دنیا میں باقی بچنے والا اپنا واحد رشتہ بھی کھو دیا اور قیامت کے منظر اپنی آنکھوں سے دیکھے..... امداد کے نام پر کیمپ سے اٹھائی گئی اور انسانی تماشوں کا حصہ بنتی رہی...... میرے مہربان رب نے نہ جانے کس، کس کی دعا کے صدقے ہر گام پر مجھے تباہی و ذلت سے بچاتے ہوئے ایک عظیم انسان کی آستین پکڑا کر آگ کا دریا عبور کرایا اور اس سے آگے

بھی اپنی رحمتوں کے صدقے ایک اور عظیم انسان کے گھر کی عزت بنا دیا۔ آج میں اپنے جان لٹا دینے کی حد تک محبت کرنے والے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ اپنی من چاہی زندگی گزار رہی ہوں...... لیکن زندگی کے ان خوب صورت و حسین رنگوں میں کھیلتے ہوئے جو آج مجھے میسر ہیں، کیا میں قدرت کی وہ قیامت خیزیاں اور انسان کی وہ شیطانیت بھلا پاؤں گی جنہیں میں نے اپنی آنکھ سے دیکھا اور بار ہا دیکھا...... کیا میں اپنی زندگی کی کتاب سے بھی وہ باب نکال پاؤں گی جو تاریک ہے مگر سب سے طویل بھی ہے۔''

پاکستان کی بہادر بیٹیوں میں سے ایک بیٹی کے نام سے... انٹرنیٹ فورم پر آنے والا یہ بلاگ مہرزاد خان نے بھی پڑھا اور اسے کسی طرح بھی یہ پہچاننے میں غلطی نہیں ہوسکتی تھی کہ وہ بلاگ کس کا لکھا ہوا تھا۔

''بہت اچھا ہوا یہ بلاگ میری نظر سے گزر گیا۔'' اس رات اس نے اپنے دل کے نہاں خانوں میں پوشیدہ اس شخصیت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے کسی بھی قسم کا رابطہ کرتے ہوئے ڈرتا ہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ حمزہ محمود بہت عظیم انسان سہی مگر وہ فرشتہ ہرگز نہیں اور اسے میرے اور تمہارے ماضی کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے۔ میں تمہاری سینت لگا کر اس کی نظروں میں آنا اور تمہاری ہنستی، مسکراتی زندگی کو طوفانوں کی نذر کردینے کا جرم کیسے کرسکتا ہوں لیکن تمہارا یہ بلاگ پڑھنے والوں کو تو کیا پیغام دے گا، میں نہیں جانتا مگر مجھے یہ پیغام دے گیا ہے کہ تم خوش ہو، مطمئن ہو، اللہ نے تمہیں شوہر کی محبت اور اولاد جیسی نعمت سے نواز رکھا ہے، بھلا بتاؤ میرے جیسے انسان کے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کا اہتمام اور کیا ہوگا۔''

☆☆☆

وہ اپنے پسندیدہ ترین لیبارڈر ریٹریور کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ اعلیٰ نسل کا یہ لیب (lab dog) پچھلے پانچ سالوں سے اس کے ساتھ تھا، جن دنوں وہ بہت مصروف رہا کرتا تھا اس وقت بھی وہ اس کے لیے وقت نکال لیا کرتا تھا اور اب تو ہر ویک اینڈ پر اس کے دن کا ایک حصہ ضرور اس کے ساتھ کھیلتے گزرتا تھا۔ دنیا کے بہترین کتوں کی نسل میں سے ایک یہ کتا...... اپنی ذاتی وفاداری، دوستانہ فطرت، دوسروں کی راہنمائی کرنے کی صلاحیت اور محبت کے فطری جذبے رکھنے کی وجہ سے دنیا کے بہترین کتوں کی کسی بھی دوسری نسل سے اُسے کہیں زیادہ پسند تھا۔ اس وسیع سرسبز لان کی لش گرین گھاس پر لیٹا وہ لیب کے خصوصی کرتبوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا جب اس کے قریب کسی کے قدم آکر رکے تھے۔ اس نے یونہی لیٹے، لیٹے ایک نظر ذرا اپنے دائیں طرف ان ڈارک براؤن چمکیلے کورٹ شوز پر ڈالی اور مسکرا کر سر اٹھاتے ہوئے اوپر دیکھنے لگا...... اس کی یہ خصوصی مہمان اس کے اس وقت کی میٹنگ اپائنٹمنٹ لے چکی تھی...... اور اس نے دیکھا اس کی مہمان کے عقب میں سورج کی تیز کرنیں چمک رہی تھیں۔

''کیا یہ ایک پرفیکٹ ویک اینڈ ہے؟'' اس کی مہمان نے چاکلیٹ براؤن لپ اسٹک سے سجے اپنے ہونٹ پھیلاتے ہوئے کہا۔ وہ آف وائٹ بلاؤز اور چاکلیٹی رنگ کے پھولوں سے سجی...... اسکرٹ میں ملبوس تھی۔ اس کے گلے میں قیمتی موتیوں کی مالا نظر آرہی تھی اور کانوں میں انہی موتیوں کے اسٹڈز سجے تھے۔ اس نے بالوں کو ایک ڈھیلے جوڑے کی شکل میں باندھ رکھا تھا اور وہ ہمیشہ سے زیادہ میچور اور دل کش نظر آرہی تھی۔

''ہاں، یہ ایک بہت پُرسکون ویک اینڈ ہے۔'' وہ گھاس پر سے اٹھتے ہوئے بولا اور اپنی کیشرول پولو شرٹ کی پشت پر چپکے گھاس کے تنکے جھاڑنے لگا۔

''کیا یہ ایک اچھی ریٹائرڈ لائف ہے؟'' اس کی مہمان نے اس کے ہمراہ چلتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے بتایا یہ ایک بہت پرسکون زندگی ہے، ریٹائرڈ اگرچہ نہیں۔ میں محنت کرتا ہوں اور اس محنت کی کمائی پر زندگی گزار رہا ہوں، یہ ایک اچھی زندگی ہے۔''

''دنیا بھر کی لیڈنگ یونیورسٹیز میں جنوبی ایشیا کی سیاست پر ویزیٹنگ لیکچر دینا محنت ہے کیا؟'' وہ مسکرائی اور اس کے ساتھ چلتی وسیع بیک یارڈ میں چھت کی طرح تنی سرسبز و شاداب بیلوں کے سائے تلے رکھی کرسیوں میں سے ایک پر جا کر بیٹھ گئی۔

یشل رئیس اس روز خصوصی طور پر نارتھ کیرولینا کے علاقے ڈریم میں واقع سردار مہرزاد خان کے اس جاپانی طرزِ تعمیر کے شاہکار فارم ہاؤس میں اس سے ملنے آئی تھی۔ اس وسیع فارم ہاؤس میں مہرزاد خان تنہا رہتا تھا۔ چند ماہ قبل ہی یہاں اس کی والدہ کا انتقال ہوا تھا۔ وہ ساڑھے تین سال پہلے اس کے ساتھ یہاں آ گئی تھیں۔

''ہاں یہ محنت کی کمائی ہے۔'' وہ گارڈن چیئر پر آرام سے بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''اس میں کوئی دھوکا، ڈراما اور سیاست انوالو نہیں ہے۔''

''آپ پاکستان سے کیوں فرار ہوئے...... دھوکے، ڈرامے اور سیاست کی وجہ سے؟'' یشل نے ترچھی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں وہاں سے فرار ہوا نہ ہی میں نے خود ساختہ جلاوطنی اختیار کر رکھی ہے۔'' مہرزاد نے اس کی تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ''میں کوئی عزم لے کر وہاں گیا تھا نہ ہی گرتی دیواروں کو دھکا دینے کا خیال میرے ساتھ تھا۔ مجھے حالات کی ستم ظریفی خود بخود بہا کر وہاں لے گئی تھی۔'' اس نے اپنے ذاتی ملازم کی پہنچائی جانے والی چائے کے لوازمات پر نظر ڈالتے ہوئے کہا...... جو ایک عمدہ ویک اینڈ برنچ کے لیے کافی تھے۔

''زندگی کی اکثر چوائسز ہماری اپنی نہیں ہوتیں...... پاکستان جانا اور اپنے باپ کی چھوڑی سرداری کو سنبھالنا میری چوائس نہیں تھی مگر اس وقت کے حالات کا تقاضا تھی۔ میرے علاقے کے لوگ خود کو بے آسرا اور یتیم سمجھ رہے تھے، ان کے سروں پر ہاتھ رکھنا میرا فرض تھا۔''

''کیا اب وہ ایسا نہیں سمجھ رہے ہوں گے؟'' یشل نے بٹر بلڈ مفن اٹھا کر اپنی پلیٹ میں رکھتے ہوئے پوچھا۔

''اب......!'' وہ مسکرایا۔ ''میں نے اس مختصر عرصے میں وہاں چھوٹے بڑے سرداروں کی مشروم گروتھ ہوتے دیکھی ہے، اب ہر پندرہ گز کے فاصلے کے علاقے کا اپنا ایک سردار ہے، ہر سردار کے اپنے مفادات ہیں اور ان مفادات کے لیے وہ سب اپنی اپنی جنگ لڑ رہے ہیں۔ اس علاقے کو شاید ایسے ہی زمینی حقائق سوٹ کرتے ہیں۔''

''آپ کی پاکستان میں انٹری اور ایگزٹ...'' یشل نے اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا دونوں ہی غیر متوقع نہیں رہے؟''

''زندگی کے اس اسٹیج پر جہاں ہم سب انسان اپنا، اپنا حصہ پرفارم کر رہے ہیں، ہم سب میں سے ہر ایک کے لیے دو ہی چیزیں تو سب سے اہم ہیں، کون کیسے انٹر ہوا اور کون کیسے ایگزٹ کر گیا۔'' وہ مسکرا کر بولا۔

''میں اقرار کرتی ہوں کہ زندگی کے اس اسٹیج پر آپ سے بہتر پرفارمر ابھی تک میں نے کوئی دوسرا نہیں دیکھا۔'' یشل نے متاثر ہوتے ہوئے کہا۔ ''اور آج میری یہاں آمد کا ایک مقصد اپنی ان تمام تلخ اور تیکھی باتوں پر معذرت کرنا بھی ہے جو اپنے استعفیٰ پیش کرنے کے دن میں نے آپ سے کیں۔''

"اس کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔" وہ ایک بار پھر مسکرایا۔ "اس حادثے کے روز تمہارا پیغام، میرے استعفیٰ پر تمہارا کالم اور گزشتہ سال شائع ہونے والی تمہاری کتاب، تمہاری سوچ کی عکاس ہے اور یہ سب چیزیں مجھ تک پہنچ چکی ہیں...... تمہیں یاد ہوگا میں نے کہا تھا کہ میں کوشش ضرور کروں گا، کامیاب نہ ہو سکا تو چھوڑ جاؤں گا۔"

"کیا اسی کو فرار نہیں کہتے؟" ایشل کے لہجے میں طنز کی چبھن اتری۔

"نہیں، یہ بقا ہے......" وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "اس نظام سے جڑے رہتے ہوئے اور اس کو بدل ڈالنے کا ایک کھوکھلا اور انفرادی نعرہ لگاتے ہوئے چاروں میں سے کسی ایک بھی سمت سے آتی ہوئی گولی کا شکار ہو جانا مردانہ واری کہلاتی کیا......؟"

"ضروری تو نہیں کہ ایسا ہی ہوتا۔" ایشل نے کہنا چاہا۔

"ضروری ہی تھا کہ ایسا ہوتا...... سو فی صد امکان یہی تھا۔" اس نے دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھتے ہوئے اپنی کرسی کو پیچھے کی طرف جھلایا۔ "تم بتاؤ میں کس کے نعروں کے لیے شہید ہو جاتا، شہادت کا درجہ تو کیا ملتا کس، کس کے مفاد اس خود ساختہ شہادت سے نہ جڑ جاتے...... میں کیوں اپنے تابوت کو کتوں کے دانت تیز کرنے کے لیے چھوڑ دیتا...... میں کیوں بقا کا راستہ نہ اپناتا...... بقا جس میں نئی امید کی کونپلیں کھل سکتی ہیں...... میں نے اپنے ہتھیار پھینکے نہیں، اپنے قدموں میں رکھے ہیں، بقا کی شکل میں کسی بھی وقت جنہیں دوبارہ اٹھایا جا سکتا ہے۔"

"میں جانتی ہوں آپ ہارے نہیں، آپ نے پشت پر وار نہیں کھایا، مختصری سہی اس عرصے میں آپ نے دلوں میں گھر بنائے ہیں، جس کا ثبوت آپ کے حامیوں اور مخالفین کے وہ بیان ہیں جو آپ کے استعفیٰ پر سامنے آئے۔"

"میری وہی ایک انفرادی کوشش ایک روز اجتماع کی آواز بنے گی تم دیکھنا...... اور اس روز کے انتظار میں، میں یہاں رہتے ہوئے اپنی توانائیاں جمع کر رہا ہوں۔" اس نے اپنے اردگرد دیکھا۔

"یہاں سکون ہے، میرے پرندے ہیں، جانور ہیں، درخت ہیں، پھل پھول ہیں، کتابیں ہیں، میں ہوں......اور......" وہ کہتے کہتے رک گیا۔

"اور......" ایشل نے اس کی طرف دیکھا۔

"اور میری سوچ کا لگایا ہوا باغ ہے۔" وہ مسکرایا۔ "کسی کے بارے میں میری ہر سوچ میرے دل میں ایک پھول کھلا دیتی ہے اور اب تک یہ پھول ایک وسیع باغ میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ میں ان پھولوں کی چھاؤں میں خوش باش، مسرور و مگن دن، رات گزارتا ہوں۔"

"وہ......" ایشل کے لہجے میں ایک بار پھر طنز ابھرا۔ "وہ جو صرف ایک نہیں تھی...... وہ جو پورا جہان تھی...... آپ نے اسے بھی ہار دیا؟"

"تمہیں معلوم نہیں اسے جیت کر بھی تو میں نے ہارنا ہی تھا۔" وہ سامنے دیکھتے ہوئے بولا۔ "بدصورتی میں چھپی حسن خوب صورتی کو...... کیچڑ میں کھلے جس کنول کو میں وہاں سے نکال لانا چاہتا تھا...... وہی بدصورتی اور کیچڑ میرا اپنا جہان تھی۔ وہ مجھے جہاں تک جانتی تھی اس سے آگے میں بہت مکروہ تھا، گندا اور بدصورت، وہاں تک اسے لے کر آتا تو وہ سانس لینا بھول کر مر جاتی۔ اسی لیے میں نے اسے جیت کر بھی ہار دینا بہتر جانا۔"

"اور اس کے بعد آپ موت سے ڈرنے لگے؟"

"نہیں، اسی کے بعد تو مجھے زندگی سے پیار ہونے لگا..... اس سے پہلے تو موت مجھے ایک کھیل لگا کرتی تھی..... اس کی یاد نے تو مجھے زندگی جینا سکھا دیا۔ میں خود کو کیوں اُن، ان گنت روحوں میں شامل کر دیتا جن کی یاد میں تو اب کوئی ایک شمع تک بھی نہیں جلاتا..... میں اپنی جان کو کسی تعمیری کام میں کیوں نہ مصروف کر دیتا..... ایک مقصد ادھورا رہ گیا تو کیا ہوا..... کئی اور مقصد تو پورے ہو سکتے ہیں۔"

"یونہی رہ جائیں گے، اکیلے اور مست.....؟"

"ہاں کیونکہ یہ ہی میرا مقسوم ہے۔" وہ ایک بار پھر مسکرایا۔

"میں نے واقعی آپ کو غلط سمجھا..... میرا خیال تھا آپ نظام کا حصہ بن چکے ہیں۔"

"نظام.....!" وہ ہنسا..... "نظام تو بس ایک نام ہے، ہم ہی تو ہیں جو نظام بناتے ہیں، ہم ہی تو ہیں جو نظام کو فرسودہ اور مکروہ شکلیں عطا کرتے ہیں۔ ہم خود ہی تو نظام ہیں..... ہم نہ بدلے تو نظام کیا بدلے گا..... میں نے اس بھاری پتھر کو بدقت اٹھایا، چوما اور پھر واپس رکھ دیا۔ میرے لیے زندگی میں کرنے کو شاید اور بہت سے کام تھے۔"

"کوئی پچھتاوا، کوئی دکھ.....؟"

"نہیں، میں بہت مسرور ہوں، خوش ہوں، میں نے دعا کی تھی، اس کی قبول کی اور اسے پورا کر پایا۔ اس دعا کے ماحصل سے جب مجھے خوشی اور مسرت کی لہریں وصول ہوتی ہیں تو میرا جہان اور بھی خوب صورت ہو جاتا ہے۔ میں خوش ہوں کہ میرے شہر یاراں کی گلیاں تر و تازہ، اور شاداں و پُرسکون ہیں، کیا میرے جینے کے لیے خوشی اور اطمینان کا اتنا احساس ہی کافی نہیں....." اس نے یشل کی طرف دیکھا اور لمحے کے اس ہزارویں حصے میں یشل کو سمندروں دور زندگی گزارتی میر ال صلاح الدین پہ ٹوٹ کر رشک آیا۔

"آپ واقعی بہت unpredictable ہیں۔" یشل نے بے ساختہ کہا۔

"انسان کو ہونا بھی چاہیے..... قلم کار کو اپنے قاری سے کم از کم دو قدم آگے چلنا چاہیے..... جس کہانی کی ابتدا پڑھ کر قاری انتہا کا پتا نہ لگا لے وہ کامیاب کہانی تسلیم ہوتی۔"

یہ وہ زریں الفاظ تھے جن پر آ کر مہرزاد خان سے گفتگو کا اختتام ہوا۔

"an afternoon with brown beard and olive green eyed sardar from pakistan" یشل نے اپنے نوٹ پیڈ پر اس گفتگو کا عنوان ٹائپ کیا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ مہرزاد کے سر پر چھت کی طرح تنی مارننگ گلوری کی بیل کے نیچے جھولتی ایک شاخ کو ھمنگ برڈ نے اپنی چونچ میں دبوچ رکھا تھا۔ اس شاخ کو چھوڑ کر کسی اور شاخ کو دبوچنے کی چاہ میں ھمنگ برڈ نے اپنی چونچ کھولی اور جھولتی شاخ سے کتنے ہی شنگرفی رنگ کے پھول گر کر نیچے بیٹھے مہرزاد خان پر بکھر گئے۔

"کچھ لوگوں کو نیچر خود tribute پیش کرتی ہے شاید اسی طرح جیسے ان پھولوں نے گر کر مہرزاد خان کو پیش کیا۔ کیا کوئی بھی دوسرا tribute اس tribute کا مقابلہ کر سکتا ہے۔" یشل نے سوچا اور مسکرا دی۔

"یہ ایک بہت اچھا انٹرویو تھا۔" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

"ہاں.....! ہمیشہ کی طرح۔" وہ بھی مسکرا دیا اور اپنی جگہ پر بیٹھے، بیٹھے یشل ریکس کو خود سے دور جاتے دیکھنے لگا۔ حسین شام کے شنگرفی سائے سارے میں پھیل رہے تھے۔

(ختم شد)



ڈکرتار سنگھ

اُم ثمامہ

"السلام علیکم.....نانا جان.....!" دین محمد صحن میں انار کے درخت کے نیچے بیٹھے چڑیوں کو دانہ ڈال رہے تھے کہ عبداللہ اُن کے پاس رکھی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ یہ اس کا روز کا معمول تھا وہ آفس جانے سے پہلے اور نماز پڑھنے کے بعد کا وقت اپنے نانا کے پاس گزارتا تھا۔

"جیتے رہو بیٹا....." انہوں نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔

دین محمد پچاسی سال کے ہو چکے تھے مگر اچھے وقتوں کی خالص اور سادہ خوراک، نماز، روزے کی پابندی اور اخلاقی اقدار کی بلندی کی وجہ سے ان کی صحت قابلِ رشک تھی، عبداللہ ان کی اکلوتی بیٹی بانو کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس سے پہلے کہ عبداللہ ان سے باتیں شروع کرتا اس کے موبائل کی گھنٹی بجنے لگی۔

"ارے چھوڑ یار...... کیا دوستی کا راگ الاپ رہے ہیں لوگ، یہ دوستی، یہ یگانگت اس وقت کہاں تھی جب جبراً کشمیر پر قبضہ کیا گیا اور آج اتنے سال گزر جانے کے بعد بھی وہاں ظلم و ستم کا بازار گرم ہے۔ یہ جذبے اس وقت کہاں ہوتے ہیں جب رزق کی تلاش میں پانی کی بے رحم موجوں پر سفر کرنے والے غریب ماہی گیروں کو پکڑ لیا جاتا ہے اور ساری عمر یا تو وہ قید کی صعوبتیں برداشت کرتے ہیں یا پھر مار دیے جاتے ہیں اور پھر ان کے بے جان جسموں کو اپنے وطن کی مٹی میں دو گز جگہ بھی نصیب نہیں ہوتی۔ دوستی کا راگ الاپنے والے انصاف پسند اور تعلیم یافتہ لوگ اس وقت کہاں تھے جب انیس سو سینتالیس میں صرف ایک الگ ریاست کے مطالبے پر بے گناہ مسلمانوں کی زندگی کی رنگینیوں کو ان ہی دھار کرپانوں' بھالوں اور تیروں سے موت کے اندھیروں میں دھکیل دیا گیا، جب کتنی مائیں، بہنیں فقط اپنی عزتوں کو بچانے کے لیے چھتوں سے کودیں اور ندیوں اور کنوؤں میں چھلانگیں لگا کر ڈوب مریں۔ میں ایسے کسی وفد سے ملاقات نہیں کروں گا"

ہماری این جی او کے لیے اس سے زیادہ ضروری ایشو موجود ہیں۔ یہ سکھ، ہندو بہت مطلب پرست قومیں ہیں، خود غرض، احسان فراموش اور کینہ توز......"

عبداللہ غصے میں کسی سے فون پر باتیں کرنے میں لگا ہوا تھا اور دین محمد پوری توجہ سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ عبداللہ نے حال ہی اپنی تعلیم مکمل کر کے ایک ملٹی نیشنل این جی او جوائن کی تھی۔ اس کا تعلق اس محب وطن گھرانے سے تھا جن کے رگ و پے میں وطن عزیز کی سلامتی کی دعائیں اور محبتیں دوڑ رہی تھیں۔ اس لیے پاکستان کے مفاد کے خلاف تھوڑی سی بات بھی قابلِ برداشت نہیں تھی۔ عبداللہ فون بند کر کے اٹھ کر جانے لگا تو دین محمد نے اسے آواز دے ڈالی۔

"بیٹا ایک بات کہوں...... کسی انسان کو صرف اس کے مذہب اور قومیت کی بنیاد پر برا نہیں کہا جا سکتا، مانا تحریکِ آزادی کے وقت اور بعد میں بھی ہندوؤں اور سکھوں نے بہت ظلم ڈھائے، ساری عمر کی واقفیت کو ان سب نے ایک لمحے میں بھلا ڈالا مگر جس طرح پانچوں انگلیاں ایک برابر نہیں ہوتیں بالکل اسی طرح سب برے نہیں ہوتے، سب ہی برے نہیں ہوتے بیٹا......" وہ بات کرتے، کرتے جانے کہاں جا پہنچے تھے کہ ایک ہی بات کی گردان کر رہے تھے، عبداللہ کو دیر ہو رہی تھی۔ اس لیے وہ کچھ سنتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے انہیں خدا حافظ کر کے گیٹ سے باہر نکل گیا۔

اندر برآمدے میں کھڑی بانو جانتی تھی کہ اب اباجی نے بہت دنوں تک بے کل رہنا تھا، یادوں کے ریلے انہیں اپنے ساتھ بہائے لیے جائیں گے اور ان کے پور، پور سے تشکر اور دعاؤں کے سوتے پھوٹتے رہیں گے۔

رات دین محمد سونے کے لیے لیٹے تو نیند اُن کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ اکتوبر کا اوائل تھا، ہوا میں ہلکی، ہلکی ٹھنڈک اب محسوس کی جا سکتی تھی۔ رات نے تاروں بھرا گھونگھٹ آسمان کے شانوں پر ڈال دیا تھا...... دین محمد کچھ دیر تک نواڑ کی چارپائی پر کروٹیں بدلتے رہے اور پھر بے چین ہو کر اٹھ بیٹھے۔

چپ چاپ سرہانے کھڑا انار کا درخت، پنجرے میں لوٹتی ننھی چڑیاں اور بہت سی یادوں نے ان کے گرد میلا سا لگا لیا تھا اور وہ ان کے درمیان سر جھکائے بیٹھے تھے۔ یادیں انہیں اپنے

سنگ، سنگ دور بہت دور لیے جا رہی تھیں اور وہ ان کا ہاتھ تھامے پٹیالہ کے گلی کوچوں کی جانب چل نکلے۔

بہت سارے منظر ایک، ایک کر کے ان کی آنکھوں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ جن میں سب سے واضح منظر تانگا اسٹینڈ کا تھا۔

☆☆☆

دینو کوچوان کب سے سواری کے انتظار میں کھڑا تھا مگر آج کوئی سواری اس کے تانگے کی طرف نہیں آ رہی تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ اپنے استاد کی سکھائی ہوئی بات "حرکت میں برکت ہے......" پر عمل کرتے ہوئے جگہ تبدیل کرتا سامنے کی طرف سے دو گورے آتے دکھائی دیے۔ انہوں نے مان سنگھ چوک تک جانا تھا۔ اس نے کرایہ طے کیا اور گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اسے چلنے کا اشارہ کی۔ بے زبان جانور مالک کے اشارے پر خراماں، خراماں دلکی چال چلنے لگا۔

کچہری روڈ سے ہوتے ہوئے مان سنگھ چوک پہنچ کر دینو نے سواری کو اتارا تو وہاں سے اسے پٹیالہ مارکیٹ تک کی سواری مل گئی تو اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اسے بھوک لگ رہی تھی۔

صبح سویرے وہ بغیر کچھ کھائے پیے تانگا لے کر اسٹینڈ پر آ جاتا تھا کہ اسے اپنے استاد کی بات آج تک یاد تھی۔ وہ کہتے تھے۔ "پتر رزق کے پیچھے تڑکے تڑکے جانے سے وہ زیادہ ملتا ہے۔"

دینو نے سواری اتار کر تانگا درخت سے باندھا اور گھوڑے کے آگے گھاس رکھ کر خود کرتار سنگھ حلوائی کی دکان کی طرف چل دیا کہ وہ روز یہاں سے ہی ناشتا کرتا تھا۔

"ست سری کال بھاجی......" دینو کو دکان میں داخل ہوتے دیکھ کر کرتار نے نعرہ لگایا۔

"گگے جلدی سے اپنے یار کے لیے ملائی والے دودھ میں جلیبیاں بھگو کر دے۔" زوردار

آواز میں ایک اور بڑک ماری گئی۔

وہ ایسا ہی تھا یاروں کا یار...... زندہ دل...... اور نبھانے والا، دینو کوچوان اور کرتار سنگھ حلوائی کا بچپن کا ساتھ تھا۔ دونوں کی ماؤں کا میکا ایک ہی پنڈ کا تھا اس لیے جب، جب وہاں جانا ہوتا تو وہ دونوں مل کر مزے کرتے۔ پنڈ کے تھوڑے میں نہاتے، ملائی والی برف کھاتے، درختوں سے لٹک، لٹک کر آم توڑتے۔

عملی زندگی میں آنے کے بعد بال بچوں والے ہونے کے بعد۔۔ آج اتنے برسوں بعد بھی دونوں کی گوڑی یاری ابھی تک قائم ودائم تھی۔

ابھی دینو دودھ جلیبی کھا ہی رہا تھا کہ کرتار اپنی پگڑی اور کرپان سنبھالتا اس کے پاس آ بیٹھا۔ گلا... فی الحال اس نے تنگے کے حوالے کر دیا تھا۔

"دینے یار تیرے سے اِک گل پوچھنی تھی کل کوئی بابو سی پیتے ہوئے باتیں کر رہا تھا، میں اپنے یار سے علوم کروں گا وہ سارا دن اِدھر سے اُدھر پھرتا ہے۔" کرتار سنگھ نے کرپان سائڈ میں رکھتے ہوئے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے بات شروع کی۔

"ہاں، ہاں پوچھ خیر تو ہے تیرے یار کی بڑی گوڑی نظر ہے، باہر ہر چیز کی خبر رکھتا ہے۔" دودھ جلیبی کا آخری گھونٹ پیتے ہوئے دینو نے سوالیہ نظروں سے کرتار سنگھ کو دیکھ کر کہا۔

"یار میں نے سنا ہے کہ الگ وطن بننے والا ہے، سارے ہندو اور سکھ یہاں رہیں گے اور سارے مسلمان نئے وطن چلے جائیں گے۔"

"ہاں کرتارے، میں آج تجھ سے یہی بات کرنے والا تھا۔ اِدھر اُدھر سے بڑی، بڑی خبریں آرہی ہیں، سب اِک دوجے کی جان کے دشمن بن گئے ہیں، میرا تو دل ہولتا ہے۔ کہیں وچھوڑے ناں پڑ جائے۔" پریشانی دینو کے چہرے پر واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی۔

"او تو کیوں فکر کرتا ہے۔ وا گرو دی سوں مرتے دم تک اپنی یاری نئی ٹوٹے گی اور پھر تیرے یار کرتار سنگھ کی کرپان کس ویلے کم آئے گی۔"

کرتار سنگھ نے چمکیلی کرپان پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا وہ اسے ہر وقت اپنے ہی پاس رکھتا تھا۔ کہیں کسی کے ساتھ ناانصافی ہوتے دیکھتا بیچ میں کود پڑتا۔ اسی چکر میں وہ کئی بار کچہری کا چکر بھی لگا آیا تھا۔ مگر وہ تھا ہی ایسا بے جگر، بے خوف اور دل والا۔

☆☆☆

دھوپ آنگن میں دروازے کے پاس رکھی ناندی تک آگئی تھی۔ شام ہونے والی تھی۔ بانو نے سارے صحن میں پانی کا چھڑکاؤ کر دیا تھا تو بے چین اڑتی گرد کو ایک دم سے قرار آگیا۔ گرد پانی کی گیلی اور ٹھنڈی چادر اوڑھ کر خاموشی سے بیٹھ گئی تھی ان کا گھر تو اڈے کے کارخانے کے اوپر تھا۔

بوسیدہ سی اِک کھڑکی بانو کی تنہائی کی واحد ساتھی تھی۔ وہ یہاں سے متحرک اور ساکت ہر منظر کو اپنی زندگی کا حصہ سمجھتی تھی۔ سامنے سے گزرتی چھک، چھک کرتی ریل اور پھر اس طرح اکیلی رہ جانے والی پٹڑیاں، آتے جاتے لوگوں کے عکس سڑک پر سے گزرتی گھوڑا گاڑیاں، ٹرام، موٹریں، بیل گاڑیاں اور سائیکل یہ سب اس کی سنگی سہیلیاں تھیں۔

سورج دھیرے، دھیرے مغرب کی اور ڈوب رہا تھا شام کا اجالا رات کی سیاہی میں ملنے والا تھا کہ اس نے اٹھ کر دیا جلا دیا۔ اس کے کانوں میں گھوڑے کے ہنہنانے کی مخصوص آواز سنائی دی تو اس نے سکون کی سانس لی اور کھانا گرم کرنے چل دی۔ کیونکہ وہ جانتی تھی ابا گھوڑے کو پاس اصطبل میں جوت کر سیدھا اوپر ہی آئے گا۔

"بانو پتر ذرا پانی تو پلا دے آج تو بہت سواری مل گئی تھی۔ حالات روز بروز بدلتے جا رہے ہیں۔ لوگ جلدی، جلدی اِدھر سے اُدھر جاتے ہیں

جانے کیا باتیں ہوتی ہیں۔ لیکن مجھ ان پڑھ کو اتنا پتا ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔" دینو نے کندھے پر لٹکے رومال سے منہ پونچھتے ہوئے کھانا گرم کرتی بانو کو آواز دے کر کہا اور وہیں اس کے پاس پیڑھی پر بیٹھ کر پانی پینے لگا۔

"کل تانگے میں انبالہ چھاؤنی سے کوئی بابو آ کر بیٹھا تھا بڑا بھلا مانس تھا۔ مجھے کہہ رہا تھا کہ ابھی اچھے وقتوں میں پاکستان ہجرت کر جاؤ۔ ورنہ مشکل میں پڑ جاؤ گے۔"

"ابا ہم پاکستان ضرور جائیں گے۔" باپ کے آگے روٹی رکھتے ہوئے بانو نے خوش ہو کر کہا۔

"سچ ابا بڑا مزہ آئے گا، اپنا وطن، اپنے لوگ..... نہ کسی بنیے کی چک، چک نہ کسی گورے کا رعب۔"

"ہاں پتر، دل تو میرا بھی کرتا ہے کہ اپنے وطن چل کر بے فکر ہو کر زندگی گزاریں۔ کتنے وریوں سے جو غلامی کا ان دیکھا طوق گلے میں ڈالا ہوا ہے اسے اتار پھینکیں ... پھر سوچتا ہوں کہ ساری زندگی یہیں بیتی، میرے ماں، پیو اور تیری ماں سب کی مٹی یہیں پر ہے، یہاں کام دھندا جما ہوا ہے اور پھر سب سے بڑھ کر اپنا یار کرتارا یہاں ہے۔ سب کچھ ایک دم کیسے چھوڑا جائے گا۔" وہ کچھ سوچ کر پھر بولا۔

"خیر رب سوہنا خیر کرے گا، چل روٹی کھاتے ہیں، سویرے کی سویرے دیکھی جائے گی۔ ابھی تو بہت تھک گیا ہوں، تھوڑا آرام کر لوں پھر تڑکے اٹھنا ہے۔"

کھانا کھانے کے بعد بانو نے برتن سمیٹے۔ دیے کی لو بجھائی اور کھڑکی کھول دی۔ چاند پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ صحن میں بچھی چارپائیوں پر پورے چاند کی میٹھی اور مدھم روشنی پڑ رہی تھی۔ ہوا بھی دھیمی، دھیمی چل رہی تھی۔ فضا میں ایک عجیب سی پُراسرار خاموشی کا راج تھا۔ ویسی خاموشی جو کسی بڑے طوفان کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ دونوں باپ بیٹی سوچوں میں ڈوبے جانے کتنی دیر تک چارپائی پر کروٹیں بدلتے رہے۔ تب کہیں جا کر نیند کی دیوی مہربان ہوئی اور انہیں اپنی آغوش میں لے لیا۔

☆☆☆

صبح سویرے دینو نے تانگے میں گھوڑا جوتا اور رزق کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ ریڈیو گھر کے سامنے سے ایک بوڑھے نے ہاتھ دے کر تانگے کو روکا، دینو نے گھوڑے کی باگیں کھینچ کر گھوڑے کو رکنے کا اشارہ کیا۔

"بھیا ذرا اسٹیشن چلو گے؟" آواز میں آنسوؤں کی نمی اور چہرے پر حد درجہ پریشانی رقم تھی۔

"جی، جی بھائی بیٹھو لے چلتا ہوں مگر آپ بہت پریشان لگ رہے ہو، خیر تو ہے؟" دینو سے رہا نہ گیا۔ سوار ہونے والا اس قدر پریشان لگ رہا تھا کہ وہ پوچھ بیٹھا۔

"بس بھائی کیا بتاؤں جب سے جناح صاحب کی قیادت میں آزادی کی تحریک چلی ہے تب سے ہی یہ بات ہندوؤں کی نظر میں کھٹک رہی تھی اور اب جب منزل قریب آ گئی ہے تو ان لوگوں نے ہر لحاظ بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنی اصل شکل دکھانی شروع کر دی ہے۔ جودھ پور میں میری بہن رہتی تھی، اطلاع آئی ہے کل خالصوں نے مسلم اکثریت والے علاقوں میں آگ لگا دی۔ کافی قتل و غارت گری کی، بہن بہنوئی کے تو شہید ہونے کی اطلاع ملی ہے مگر ایک بھانجی بھی تھی اس کی کوئی خیر خبر نہیں مل رہی اس کی تلاش میں جودھ پور جا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ رونے لگا۔

"میری اکلوتی بہن کی ایک ہی ننھی بچی ہے، اسے صحیح سلامت لے آؤں تو اپنے گھرانے کے ساتھ اپنے وطن چلا جاؤں گا ---- اللہ جانے بچی کس حال میں ہو گی۔" رومال سے آنسو صاف کرتے ہوئے اس شخص نے بات ختم کی تو اسٹیشن آ گیا۔

ڈینو نے اسے دعا اور تسلی دی اور اس سے کرایہ بھی نہیں لیا کہ اس کارِ خیر میں وہ بھی شریک ہو جائے گا۔

ڈینو نے گھوڑے کا رخ گھر کی طرف موڑ لیا۔ اب اس کا کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے آگے بار، بار بانو کا چہرہ گھوم رہا تھا۔

☆☆☆

اماں نے چھوٹی سی عمر میں ڈینو کی شادی کر دی تھی۔ اس کا اور آمنہ کا ساتھ بھی چھوٹا سا ہی ثابت ہوا اور جب بانو صرف چھ سال کی تھی وہ انہیں چھوڑ کر اپنے ابدی گھر روانہ ہو گئی۔ اس دن کے بعد سے ڈینو نے بن ماں کی بچی بانو کا بہت خیال رکھا۔ اسے بہت لاڈ پیار سے پالا، پوسا ابھی وہ جوان ہی تھا مگر اس نے دوسری شادی نہیں کی کہ آنے والی جانے اس کی بیٹی کے ساتھ کیسا سلوک کرے ابھی بچی کی عمر صرف پندرہ سال تھی مگر اچھی اٹھان اور صحت کی وجہ سے وہ سترہ، اٹھارہ برس کی لگتی تھی۔

بانو نے اماں کے اس صندوق میں سامان رکھنا شروع کیا جس میں انہوں نے اس کی شادی کی چیزیں رکھی تھیں۔ دادی کو وہ اماں ہی کہتی تھی جب وہ نو سال کی تھی تو دادی بھی اللہ کو پیاری ہو گئیں مگر اسے یاد تھا کہ وہ اس صندوق کو بانو کا صندوق کہتی تھیں اس میں اس کی مرحومہ ماں کی چیزیں اور جو چند چیزیں دادی نے اس کے لیے لے کر رکھی تھیں، پڑی ہوئی تھیں۔ ابا سویرے اسے تیاری کا کہہ گیا تھا۔ بانو نے صندوق کا ڈھکن کھولا...... لیڈی ہملٹن کی لال قمیص شلوار، سفید شفون کا اک دوپٹا جس پر چاروں طرف اس کی اماں کے ہاتھ سے کروشیا ہوئی تھی۔ چاندی کی پانچ کنگنیاں اور سونے کی دو چھوٹی، چھوٹی بالیاں اس نے اس سارے سامان کو ایک ململ کے دوپٹے میں باندھا اور احتیاط سے سامان کے ساتھ رکھ کر صندوق کو تالا لگا دیا۔ سیڑھیوں سے نیچے اتر کر اس نے کارخانے کے لالہ کو گھر کا خیال رکھنے کو کہا اور خود محلے کے ایک گھر میں داخل ہو گئی۔ ابا زیادہ اسے باہر نہیں جانے دیتا تھا مگر مولے موچی کی بیٹی سے اس کی گوڑی یاری تھی وہ اس سے مل کر جانا چاہتی تھی۔ ابا ایسے کہہ گیا تھا کہ وہ ساری معلومات کر کے آتا ہے وہ رات کے کسی پہر بھی نکل کھڑے ہوں گے۔

ڈینو کوچوان کا تانگا دھیمی اور اداس رفتار سے پٹیالہ کی گلیوں میں سیر گشت کر رہا تھا آج اس نے کوئی سواری نہیں اٹھائی تھی وہ کبھی پٹیالہ مارکیٹ، کبھی نہال سنگھ چوک، کبھی گرداس روڈ کبھی صاحب جی تمبل کبھی نواب پٹیالہ کی حویلی ہر ایک جگہ سے گزر رہا تھا۔

ہر اس جگہ پر جہاں اس نے اپنی جوانی اور بچپن گزارا تھا۔

پھر ڈینو نے تانگے کا رخ قبرستان کی طرف پھیر دیا۔ وہ جانے سے پہلے اماں اور آمنہ کی قبروں پر آخری سلام کرنا چاہتا تھا۔

فاتحہ پڑھنے کے بعد اس نے گھوڑے کی پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور اس کا رخ کرتار سنگھ کی دکان کی طرف پھیر دیا۔

"اوئے چھوٹے اپنا یار آیا ہے فٹافٹ گرما گرم روٹی پانی کا بندوبست کر دے۔" وہ گلے والی جگہ چھوڑ کر بڑھک مارتا جلدی سے ڈینو کی طرف لپکا۔ آج اتنے سالوں میں پہلی بار ہوا تھا کہ ڈینو اس کی دکان میں جب داخل ہوا تھا جب سورج سر پر چڑھ چکا تھا۔

"خیر ہوئی بادشاہو...... آج سویرے ناشتا کرنے نہیں آئے، میں دکان بند کر کے تیری طرف آنے ہی والا تھا۔" کرتار سنگھ نے اداس، اداس ڈینو کو دیکھ کر فکرمندی سے پوچھا۔

"کرتارے میں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

"اے کی گل کیتی یار تُو، تو کہتا تھا کہ وچھوڑا نہیں آئے گا اور پھر تجھے یہاں کیا کمی ہے۔ میں ہوں

ناں تو کیوں فکر کرتا ہے۔" کرتار سنگھ نے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

"بس یار لگتا ہے یہاں سے دانہ پانی اٹھ گیا ہے۔"

"تو تو سارا دن یہیں دکان پر رہتا ہے، میں ہر طرح کی سواری اٹھاتا اور بٹھاتا ہوں۔ حالات چنگے نہیں ہیں۔ دلی، جودھ پور، الہ آباد، پونا سے بہت بری خبریں آرہی ہیں اور تو جانتا ہے مجھے بانو کتنی عزیز ہے، میری کل دولت وہی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ جس بیٹی کو میں نے پھولوں کی طرح پالا اس کے ساتھ کچھ غلط ہو۔" وہ نہایت اداسی سے کہہ رہا تھا۔

"ابھی اپنے یہاں کچھ نہیں ہے، میں ٹھنڈے ٹھنڈے یہاں سے نکل جاؤں تو بہتر ہے۔ اور پھر کرتارے اپنا دیس تو اپنا دیس ہوتا ہے ناں......"

دینو نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے ساری بات بتائی تکھانا جوں کا توں پڑا ٹھنڈا ہو رہا تھا۔

"پر یار وہاں جا کر تو کرے گا کیا۔ تانگا تو ساتھ لے جا نہیں سکتا۔" کرتار سنگھ نے اداس ہو کر رک جانے کی اک آس دکھائی۔

"رب سوہنا مالک ہے، پر تو فکر نہ کر جیسے ہی حالات ٹھیک ہوں گے میں تجھ سے ملنے آؤں گا۔ اپنی یاری میں دوری کی وجہ سے کوئی فرق نہیں آئے گا۔" دینو نے وعدہ لینے کے انداز میں ہاتھ آگے کیا جسے کرتار سنگھ نے نم آنکھوں سے جم کر تھام لیا۔ دونوں آخری بار بغل گیر ہوئے تو لاکھ روکنے کے باوجود آنکھوں میں ٹھہرے آنسو بہہ نکلے۔

☆☆☆

دینو کے تانگے میں ایک وکیل بابو روزانہ کچہری آتے جاتے تھے۔ اس نے ان سے بات کرلی تھی۔ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ پاکستان جارہے تھے۔ انہوں نے دینو کو سمجھا دیا تھا کہ جیسے ہی شام کے سائے اندھیرے میں گم ہونے لگیں وہ بانو کو لے کر اسٹیشن پہنچ جائے۔ رات کو وہاں سے اسپیشل ٹرین چلتی تھی جو انہیں مالیر کوٹلہ، پٹیالہ، امرتسر سے لے کر لاہور اتار دے گی۔

رات ہوتے ہی بانو اور دینو ایک صندوق لے کر باہر نکلے انہوں نے آخری نگاہ اپنے مکان اور گلی پر ڈالی۔ دینو نے پاس کھڑے گھوڑے پر پیار سے ہاتھ پھیرا آخری بار اسے دیکھا اور آنکھوں میں آئے آنسو پیچھے دھکیلے اور نکڑ پار کر گئے۔

دونوں باپ بیٹی ابھی تھوڑا ہی آگے گئے تھے کہ سامنے والی گلی سے مشعلوں کی روشنی نمودار ہونے لگی، ایسا معلوم ہوتا کہ لوگوں کا ایک جم غفیر ہے جو نعرے لگاتا آگے بڑھ رہا ہے۔ دونوں باپ، بیٹی جلدی سے کونے کی دکان کی دیوار کی اوٹ میں ہوگئے۔ سامنے گلی کا منظر اب واضح ہو رہا تھا۔

بہت سارے لوگ ہاتھوں میں کرپانیں اور ترشول لیے محلے میں واقع مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا رہے تھے اندر آگ اور باہر قتل و غارت گری کا بازار گرم تھا۔ بچوں اور عورتوں کی چیخوں سے سارا آسمان گونج رہا تھا۔ دینو کو چاہ ان کو کچھ سمجھ نہیں آیا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا مگر اتنی جلدی اور اچانک اس کی اسے امید نہیں تھی اس نے مضبوطی سے بانو کا ہاتھ پکڑا اور پچھلی گلی کی طرف دوڑ لگادی۔ جہاں سے سڑک پار کرتار سنگھ کا گھر تھا۔

کرتار سنگھ روٹی کھا کر لسی پی کر چارپائی پر بیٹھا تھا، کرپان اس کے سرہانے ہی رکھی ہوئی تھی۔ ویہڑے میں کھڑی بھینس بے چینی سے ڈکار رہی تھی جیسے اسے کسی انہونی کی خبر ہوگئی ہو۔

کرتار سنگھ کی بیوی من جیت کور ویہڑے میں رکھی چارپائیوں پر بستر ڈال رہی تھی۔ پاس رکھے موڑوں پر کرتار سنگھ کی دونوں بیٹیاں بیٹھی باتیں کررہی تھیں، سڑک پار ہونے والی قیامت سے باخبر کرتار سنگھ اپنے یار دینو کے بارے میں سوچ رہا

تھا۔ اس کے بتائے ہوئے وقت کے حساب سے وہ ابھی ٹرین میں سوار ہو چکا ہوگا۔ اچانک دروازے پر زوردار دستک ہوئی، کرتار سنگھ ایک دم چونکا دروازہ بجانے والے کا انداز پریشان کن اور بدحواسی لیے ہوئے تھا۔

کرتار سنگھ نے چمک دار پھل والی کرپان اٹھائی اور دروازے کے پاس جا کر گرج دار آواز میں بولا۔

''کون ہے؟''

''کرتارے دروازہ کھول......'' دینو کی گھبرائی ہوئی آواز دروازے کے پار سے بلند ہوئی، کرتار سنگھ نے بیوی اور بیٹیوں کو اندر جانے کا اشارہ کیا اور جلدی سے دروازہ کھول دیا۔

دینو جلدی سے اندر چلا آیا بانو بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور اس کے چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ کرتار سنگھ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اسے پاس رکھی تادی سے پانی پلایا اور اسے اندر بیوی اور بیٹیوں کے پاس بٹھا آیا۔

دینو نے ساری بات کرتار سنگھ کو بتائی۔ ''میں رات کے اندھیرے میں جا کر پتا کرتا ہوں کہ وکیل صاحب روانہ ہوئے یا نہیں یا دوسری ٹرین کب جائے گی۔ جب تک ایک رات میری دھی تیرے پاس امانت ہے...... کرتارے تو جانتا ہے میرا اس کے سوا دنیا میں کوئی نہیں ہے، میں بہت بھروسے اور مان کے ساتھ اسے یہاں لایا ہوں، صبح تک ہم کچھ نہ کچھ بندوبست کر کے یہاں سے روانہ ہو جائیں گے جو کچھ آج میں نے آنکھوں سے دیکھا ہے اس کے بعد تو یہاں ایک پل بھی نہیں رہا جا سکتا۔'' وہ اس سے التجا کر رہا تھا۔

''اوئی گل کیتی اے بادشاہو جب تک میری جند باقی ہے بانو نوں کوئی میلی اکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتا۔ جیسے میری دل جیت کور اور من جیت کور ہیں ویسے ہی بانو دھی ہے، ایک رات کی کیا گل تم دونوں جب تک چاہو میرے کول رہ سکتے ہو۔ تیری دھی میرے کول بالکل محفوظ رہے گی یہ اک سکھ کا وچن ہے اور وہ اتھرو دی سوں میں ہر حال میں اسے نبھاؤں گا۔''

دینو کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے تھے۔ مگر دل میں کہیں اب بھی اک وسوسہ کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔ جنہیں وہ باہر اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ کر آیا تھا۔ ان سے بھی ساری عمر کا ساتھ تھا۔

''اور ہاں یارے جب تک باہر آگ لگی ہے، میں تجھے باہر نہیں جانے دوں گا۔ تو بھی رات یہاں رک۔ سویرے کو دونوں یار مل کر حالات کا جائزہ لیں گے اور کچھ بندوبست کریں گے۔ گرو کی کرپا سے کچھ چنگا ہو جائے گا۔'' کرتار سنگھ نے دینو کے دونوں ہاتھ پکڑتے ہوئے جوش اور پیار سے کہا۔

''کرتارے اپنی یاری تو بہت گوڑی ہے مگر گھر میں بھی آنا جانا کوئی ہوا۔ میری وجہ سے بھابی اور بچیوں کو پریشانی نہ ہو۔''

''تو فکر کیوں کرتا ہے، یہ پچھواڑے میں بھینس کی توڑی رکھنے کا چھوٹا سا کمرا ہے تو بے فکر ہو کر وہاں آرام کر میں یہاں ویہڑے میں منجھی ڈال کر پہرہ دیتا ہوں، دیکھتا ہوں کون ساماں دا جمیا یہاں قدم رکھتا ہے۔ وڈ کے رکھ دوں گا سب کو تو توڑی والے کمرے میں چل، میں تیری بھرجائی سے کہہ کر روٹی، پانی کا بندوبست کرتا ہوں۔ پتر دل جیت چاچے کے لیے چنگی سی منجھی بستر پرلے کمرے میں لگا دے۔''

کرتارے نے بیٹی کو آواز دی اور دینو کرتارے کے ساتھ توڑی والی کوٹھڑی کی جانب چل دیا۔

تھوڑا سا کھانا زہر مار کرنے کے بعد دینو چارپائی پر لیٹ گیا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ گزرنے والے حالات اور آنے والے وقت کے بارے میں سوچ سوچ کر اس کا دل ہول رہا تھا۔ سامنے ویہڑے میں کرتار سنگھ اپنی کرپان لے کر چوکس بیٹھا سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ برآمدے

میں پیچھے کرتار سنگھ کی بیوی کی چارپائی تھی اور آگے لائن سے تین چارپائیاں ڈلی ہوئی تھیں جن پر کرتار سنگھ کی بیٹیاں اور بانو سو رہی تھیں۔

بانو کو اس ماحول میں اپنائیت اور تحفظ ملا تھا اور پھر کچھ کچی عمر کی بے فکری تھی، وہ کھانا کھا کر آرام سے سوگئی تھی۔

ہجرت، پاکستان اور آنے والی زندگی کے بارے میں سوچتے سوچتے کب دینو کی آنکھ لگی اسے پتا ہی نہیں چلا۔ بند ہوتی آنکھوں میں آخری منظر ویہڑے کا ہی تھا جہاں کرتار سنگھ کرپان سنبھالے ابھی تک جوں کا توں بیٹھا ہوا تھا۔

رات کا آخری پہر تھا کرتار سنگھ کو تھوڑی سی اونگھ آئی تو اسے لگا ویہڑے میں کوئی دھم کرکے کودا ہے۔ اس نے جلدی سے آنکھیں کھول کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی مگر ناکافی سی روشنی میں اسے کچھ نظر نہیں آیا، چاند کی آخری تاریخیں تھیں۔ اس لیے تاروں کی مدھم روشنی میں منظر کچھ دھندلا دھندلا سا تھا۔

آنکھیں جب اندھیرے سے آشنا ہوئیں تو اس کی چارپائی کے گرد کرپال اور کمہار کھڑے تھے ان کے ہاتھوں میں چمکتی ہوئی کرپانیں تھیں اور آنکھوں سے شعلے لپک رہے تھے۔

"تاؤ ہم نے ساتھ والی چھت سے دیکھا ہے تو نے کسی مسلے کی کڑی کو پناہ دی ہے بس تو وہ لڑکی ہمارے حوالے کردے تو ہمارا تیرا کوئی حساب نہیں۔ ہم چپ چاپ واپس چلے جائیں گے۔" لڑکوں نے دھیمی آواز میں کرتار سنگھ سے کہا۔ اس کی جی داری اور کڑک عادت کی وجہ سے سب اس سے دبتے تھے۔

"او کھوتے دے پتروں تواڈی اتنی ہمت......" وہ غصے سے کرپان لے کر اٹھا۔ "تواڈی اتنی جرأت کے رات کے اس ویلے میرے گھر میں کودو، میں تمہیں چھوڑوں گا نہیں۔" وہ بھی دھیمی آواز میں گرجا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی کی آنکھ کھلے اور وہ انہیں دیکھ کر خوفزدہ ہو جائے۔

"تاؤ بات کو سمجھ، ان مسلوں نے پاکستان میں ہماری ماؤں، بہنوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے، تم نہیں جانتے اور اب ہم انہیں زندہ سلامت اور محفوظ پاکستان نہیں جانے دیں گے۔" دوسرا ذرا اور زور سے غرایا۔

ابھی یہ بات ہو ہی رہی تھی کہ کرتار سنگھ نے عقبی دیوار کی طرف دیکھا۔ سات، آٹھ اور مسلح افراد گھر کے اندر کودے۔ گھر کے باہر بھی دبا دبا شور سنائی دے رہا تھا۔ مشعلوں کی روشنی واضح طور پر نظر آرہی تھی۔ کرتار سنگھ کو حالات کی سنگینی کا اندازہ ہوا مگر وہ کرپان لیے آنے والوں کے آگے ڈٹا رہا۔

"کرتار سنگھ بات مان جا...... مسلوں کی چھوری ہمارے حوالے کردے۔ ورنہ ہم بغاوت اور غداری کے جرم میں تجھے اور تیرے گھر والوں کو بھی نہیں بخشیں گے...... ہم نے ٹھان لی ہے کہ رام کی کرپا سے مسلوں کا ناپاک وجود اس دھرتی سے مٹا دیں گے۔" ایک ہندو آگے بڑھ کر تھوڑی اونچی آواز میں بولا۔

تھوڑی دیر بحث کے بعد کرتار سنگھ کو اندازہ ہو گیا کہ معاملہ صرف اس اکیلے کی جی داری سے اوپر کا ہے وہ سب کے سب مسلح تھے، نشے میں تھے اور انتقام کی اندھی آگ میں جل رہے تھے۔

توڑی والی کوٹھڑی سے جیسے ہی کسی آہٹ کی آواز آئی کرتار سنگھ نے جلدی سے اسے باہر سے کنڈی لگادی...... کرتار سنگھ نے دو منٹ تک سوچا اور پھر مشتعل ہجوم میں سے ایک لڑکے کی طرف دیکھ کر برآمدے میں بچھی چارپائیوں میں سے درمیان والی کی طرف اشارہ کردیا۔

ایک اونچا لمبا سکھ جلدی سے آگے بڑھا اور چادر میں لپٹے وجود کو کندھے پر اٹھا کر جلدی سے کنڈی کھول کر باہر نکل گیا۔

اس سے پہلے کہ دینو کچھ کرسکتا، کھڑکی سے نظر

آنے والے منظر نے اسے یہ ضرور سمجھا دیا کہ اس کی دنیا لٹ چکی ہے۔

کرتار سنگھ نے اپنا گھر اور گھر والے بچانے کے لیے وہی کیا جو دنیا کا دستور ہے جیسے ہی دینو کے حواس میں اس بات نے اپنے پنجے گاڑے اس نے دیوانہ وار دروازے کو پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ ان ظالموں کے پیچھے جانا چاہتا تھا جو اس کی بانو کو اٹھا کر لے گئے تھے۔

کرتار سنگھ ڈھیلے قدموں کے ساتھ توڑی والے کمرے کی طرف آیا اور اس نے کانپتے ہاتھوں کے ساتھ دھیرے سے کنڈی کھول دی اور خود دیوار کے ساتھ سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ سر پر کس کر بندھی ہوئی پگ ڈھیلی ہو رہی تھی، ہاتھ میں کرپان اب بھی موجود تھی مگر اس کی گرفت میں وہ مضبوطی نہیں تھی جو کرتارے کا خاصہ تھی۔ دینو نے پتھرائی آنکھوں سے کرتار سنگھ کی طرف دیکھا اس سے پہلے کہ وہ اس کا گریبان پکڑ کر اس کو اس کا وعدہ یاد کرواتا بانو تڑپ کر اس کے گلے سے آلگی وہ زار و قطار رو رہی تھی۔

دینو نے تڑپ کر برآمدے کی طرف دیکھا۔

کرتار سنگھ کی بیوی بدحواس سی چادر اوڑھے چارپائی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی بیٹی حیران و پریشان اس کے ساتھ ہی کھڑی تھی مگر اس کی چھوٹی بیٹی کی چارپائی خالی تھی۔

دینو نے کرتار سنگھ کی طرف دیکھا وہ دھیرے دھیرے دیوار کے ساتھ ڈھے گیا۔ وہ جلدی سے لپک کر اس کی طرف گیا۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ برآمدے میں اس کی بیوی اور بیٹی ایک دوسرے سے لپٹ کر زار و قطار رو رہی تھیں۔ ویہڑے میں کھڑی بانو بھی بلک بلک کر رو رہی تھی۔ اپنے بچ جانے کی خوشی میں یا دل جیت کور کے کھو جانے کے دکھ میں وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

''کرتارے یہ تو نے کیا، کیا......؟'' دینو آنسوؤں اور حیرت بھرے صدمے کے عالم میں بس اتنا ہی کہہ سکا۔

''ہور کیا کرتا یار...... تیرے ساتھ وچن بھی تو نبھانا تھا۔ اس لیے میں نے ایک دھی بچانے کے لیے دوسری دھی قربان کر دی۔''

کرپان اب بھی اس کے ہاتھ میں تھی پگڑی میں بندھے کیس بکھر چکے تھے، چہرے پر آنسوؤں کی لکیریں تھیں، یہ وہ کرتار سنگھ نہیں تھا جسے دینو کوچوان جانتا تھا۔

☆☆☆

''نانا جان اٹھ جائیں باہر بہت سردی ہو رہی ہے آپ کے گھٹنوں میں درد بڑھ جائے گا۔'' عبداللہ نے آکر دین محمد عرف دینو کوچوان کو آواز دی۔

''نانا جان......'' عبداللہ نے دینو کے کندھے کو ہلا دیا۔

''ہوں......'' ''چلو تم چلو، میں اندر آتا ہوں مگر ایک بات یاد رکھنا انسان کو اس کی انسانیت اور اچھے بول سے پرکھنا چاہیے کیونکہ سب انسان ایک سے نہیں ہوتے۔'' عبداللہ اندر جا چکا تھا اور انار کے پیڑ پر پھدکتی چڑیا اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے یادوں کا اک میلا سا لگا لیا تھا...... پھر ہجرت، بانو کی شادی اور عبداللہ کی پیدائش...... وقت گزرتا گیا۔ اتنے برسوں بعد دینو کوچوان کے نام اک تار آیا۔ دین محمد نے تیاری پکڑی اور ٹرین کے ذریعے اس سرزمین پر جا پہنچا جہاں سے وہ لٹا ہوا تھکا ہوا یادیں اور محبتیں اور نفرتیں جانے کیا کچھ ساتھ لے کر پلٹا تھا، کرتار سنگھ کی بڑی بیٹی نے اسے چٹھی لکھی تھی اور آج وہ اپنے یار کو آخری سفر کی طرف رخصت کرنے آیا تھا۔ آج اس کی اتنے برسوں بعد کرتارے سے آخری ملاقات تھی۔

کرتار سنگھ کے کریا کرم کے بعد وہ پھر ڈھیر ساری یادوں کو پوٹلی میں باندھے لوٹ آیا تھا کہ یہ یادیں ہی اب اس کی بقایا زندگی کا سرمایہ تھیں۔



بوجھ بیٹیوں کے

شیریں حیدر

"ہاہ...... سکون آ گیا!" میں نے اپنے پیر اونچی ایڑی کی سینڈل کی گرفت سے آزاد کیے اور سکون سے ایک گہری اور فرحت بخش سانس لی۔ "ویسے ہمارے یہ غیر آرام دہ جوتے نہ ہوں، پارلر سے بنے ہوئے بال نہ ہوں، سونے کے بھاری زیورات نہ ہوں اور ہمارے وزن سے کہیں بھاری ملبوسات نہ ہوں تو کیا کسی بیاہ میں شرکت نہیں کی جا سکتی؟"

"کی جا سکتی ہے...... ضرور کی جا سکتی ہے...... مگر کسی اور کے، اپنے بھتیجے کے بیاہ میں نہیں۔" ندا نے میری بات پر فوراً کہا۔

"اچھا...... یہ کیا بات ہوئی؟" حنا نے حیرت سے پوچھا۔

"کیونکہ......" اسما نے مداخلت کی۔ "لوگ یہ نہ سمجھیں کہ طیب کی پھوپیوں کے پاس شاید اچھے

ملبوسات، قیمتی زیورات، نئے جوتے اور پارلر میں خرچ کرنے کے لیے رقم نہیں ہے۔"

"ویسے مجھے اس بات پر شک ہے ثنا کہ کوئی لباس تم سے بڑھ کر بھاری ہوسکتا ہے۔۔۔" میمونہ نے بھاری بھرکم........ ثنا کے وزن پر چوٹ کی۔

"تم خود تو گویا بڑی دبلی ہو......" ثنا کی طرف سے فوراً تپا ہوا جواب آیا۔

"تم سے دبلی تو ہوں......" میمونہ نے اترا کر کہا۔

"کیا بچوں کی طرح لڑ رہی ہو تم؟" میں نے مداخلت کی۔

"آپ خود دیکھ لیں آپی۔۔۔۔ اس نے مجھ پر جان بوجھ کر چوٹ کی ہے، میرا وزن بڑھ گیا ہے تو کیا میرے اختیار میں ہے اسے کم کرنا؟" ثنا کا لہجہ بھرا گیا تھا۔

"اچھا...... چھوڑو اس بات کو، وزن بڑھنا آسان ہوتا ہے مگر اسے کم کرنا مشکل مگر تھوڑی بہت کوشش سے ہو جاتا ہے......" میں نے مصالحت کے انداز میں ثنا سے کہا۔ "تم کوشش کرو تو ضرور کم ہو جائے گا، کم از کم میمونہ جتنا تو ہو ہی سکتا ہے۔" میں نے طریقے سے اس سے کہا۔

"کتنا تھکا دیتی ہیں آج کل کی شادیاں......" ندا نے اپنے بالوں سے جوڑے کی پنیں نکالتے ہوئے کہا۔ "مہندی سے پہلے کئی، کئی ڈھولکیاں...... کیسے نئے، نئے رواج چل نکلے ہیں، شکر ہے کہ کل ولیمہ ہوگا۔"

"درست کہتی ہو میری جان......" میں نے سب سے چھوٹی ندا کو دیکھا۔ "شادیوں کی رسومات طول پکڑتی جا رہی ہیں، جتنی زندگی مصروف ہو گئی ہے اتنا ہی ہم لوگ زیادہ فضولیات میں پڑ گئے ہیں......"

"مجھے تو شادیوں میں شرکت کرنا اچھا لگتا ہے......" حنا نے کہا۔ "ویسے ہم کہاں اس طرح مل پاتی ہیں، پانچ دن سے ہم چھ کی چھ بہنیں دن رات اکٹھے گزار رہی ہیں، ایسا موقع پہلے کب ملا ہے ہمیں؟" حنا، ثنا اور میمونہ تو آئی بھی دوسرے شہروں سے تھیں۔

"ہاں یوں لگتا ہے کہ ہم سب چھوٹی، چھوٹی بچیاں ہیں...... ماضی میں لوٹ جاتی ہوں میں تو بار، بار......" میں نے کہا۔ "خصوصاً جب تم لوگ آپس میں بلیوں کی طرح لڑتی ہو۔۔۔" میں ہنسی۔

"ابا جی کی وفات کے بعد پہلا موقع ہے کہ ہم سب بہن بھائی اکٹھے ہوئے ہیں......" اسما نے دل گرفتہ انداز میں کہا۔

"پندرہ سال......" میں نے کہا۔ "کتنا عرصہ ہوتا ہے ناں۔"

"اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں......" حنا نے گا کر کہا تو ماحول پر پھیلنے والی اداسی سمٹ گئی اور مسکراہٹ بکھر گئی۔

"جب تک اماں حیات ہیں تب تک تو ہم اس گھر میں آتے ہی رہیں گے......" ثنا نے کہا۔ "ابھی تو کسی ماتھے کے بل نظر بھی نہیں آتے...... اماں کی خاطر ہر بات کو ہنس کر ٹال دیتے ہیں۔"

"ہر ایسی بات کو ہنس کر ٹال دینے میں ہی کامیابی کا راز مضمر ہے......" میں نے انہیں سمجھایا۔ "اپنے گھروں میں بھی تو ہم یہی اصول رکھتے ہیں ناں، بچوں کے ساتھ۔ شوہر کے رویے، ساس، سسر کی ڈانٹ، نند، دیوروں کے مزاج اور باقی لوگ......"

"ساری زندگی ہمیں ہی پستا ہوتا ہے ناں......" ثنا نے منہ بسورا۔ "بیٹیاں ہونا کیا اتنی بڑی غلطی ہے...... کیا ہمارے اختیار میں ہوتا ہے کہ ہم اپنے لیے انتخاب کریں کہ ہم بیٹیاں ہوں یا بیٹے...؟ کاش ہوتا۔"

"ہاں...... کتنا اچھا ہوتا جو ایسا ہوتا۔" حنا نے کہا۔ "میں تو آپ سب کا بھائی ہوتی پھر......"

"مجھے تو انتخاب کا اختیار ملتا تو بھی میں بیٹی ہونے کو ترجیح دیتی......" میں نے پورے یقین سے کہا۔

"جانتی ہیں آپی آپ کہ بیٹیوں کے کتنے بوجھ

ہوتے ہیں......؟" ندا نے ہولے سے کہا۔ اس کی تین بیٹیاں تھیں اور بیٹا کوئی نہیں۔

"جانتی ہوں......" میں نے کہا۔ "تمہاری تو فقط تین بیٹیاں ہیں ناں......ابا جی کی تو ہم چھ بیٹیاں تھیں مگر کبھی کسی نے ان کے ماتھے پر بل نہیں دیکھا، بھائی تو تب اس قابل نہ تھا کہ ابا جی کا ہاتھ بٹاتا اور قابل ہو بھی جائیں بھائی تو ان کے اپنے بال بچوں کے اخراجات ہوتے ہیں، ہم سب کے بھی اسی طرح ہیں۔"

"نہ پوچھیں آپی یہ سب ایک ساتھ جوان ہو رہی ہیں تو کس طرح میری نیندیں یہ سوچ، سوچ کر اڑ جاتی ہیں کہ کس طرح انہیں بیاہوں گی۔" ندا کا لہجہ واقعی پریشان کن تھا۔ "شادیوں کے اخراجات کیسے، کیسے بڑھ گئے ہیں۔"

"ان کے نصیب کے لیے دعا کیا کرو......ماں کی دعا میں بڑی طاقت ہوتی ہے پیاری۔" میں نے اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔ "بیٹیاں تو ہم سب کے گھروں میں دو، دو تین، تین ہیں ناں؟"

"مگر آپ لوگوں کے ہاں بیٹے بھی تو ہیں......" اس نے جیسے شکوہ کیا۔

"سب اللہ کی دین ہے میری بہن۔" اسما نے مداخلت کی۔ "بیٹی کا رشتہ بہت پیارا ہوتا ہے، بیٹیوں کی پرورش کر کے اس کے فرض سے فارغ ہونے والے کو جنت کی بشارت دی گئی ہے......بیٹوں کی تو نہیں ناں۔" اسما نے ندا کو تسلی دینے کی کوشش کی۔

"واقعی......اس پر تو کبھی غور ہی نہیں کیا......" ندا نے کہا۔

"ویسے کہنے کی حد تک ہی ہے آپی مگر بیٹیوں والوں پر بڑے بوجھ ہوتے ہیں، بیٹیاں تو بوجھ نہیں ہوتیں مگر بنا دی جاتی ہیں۔" ثنا بھی مایوسی سے بولی۔ "آج کا ہی دیکھ لیں......بھیا بہو بیاہ کر لائے ہیں، کباڑا نکل گیا ہے لڑکی والوں کا، مہندی پر ہم سو لوگوں کو لے کر گئے، آج دو سو لوگوں کی بارات تھی، پھر دینا دلانا اور نہ جانے کتنی رسومات اور لغویات......"

"جانتی ہوں......" میں نے رسمان سے کہا۔ "اسی لیے تو میں نے تم سب لوگوں سے پوچھے بنا ہی ان کو اماں کے ذریعے کہلوا دیا تھا کہ ہم بہنوں میں سے کسی کا جوڑا نہ بنائیں......نہ ہی ہمارے شوہروں کے۔"

"اچھا کیا آپی آپ نے......" ثنا نے تائید کی۔

"اس سے کیا فرق پڑا آپی......" اسما نے کہا۔ "انہیں بھائی کے گھر والوں کے، طیب کے ماموں اور ممانیوں، خالاؤں اور خالوؤں، نانا، نانی اور دادی کے تو بیسیوں جوڑے بنانے پڑے ناں۔"

"انہوں نے تو شکر کیا ہوگا کہ طیب کے چچا اور پھپھیاں نہیں ہیں......" حنا نے ہنس کر کہا۔

"اور ان میں سے کوئی بھی جوڑا سات آٹھ ہزار سے کم کا کیا ہوگا؟" ندا نے کہا۔

"فرق کیوں نہیں پڑا......" حنا فوراً بولی۔ "اگر چھ ہمارے اور چھ ہمارے شوہروں کے جوڑے نہ بنے تو لاکھ روپے تک کی بچت تو ہوئی ہوگی ناں ان کی......"

"کاش آپ انہیں سب کے ہی جوڑے بنانے سے منع کر دیتیں......" ثنا نے کہا۔

"میں اپنے اختیار کی حد سے تجاوز نہیں کرتی۔ حتیٰ کہ تم لوگوں کے لیے بھی منع کیا تو بھابی کو اس بات پر اعتراض تھا کہ میں کون ہوتی ہوں منع کرنے والی......حالانکہ تم میں سے کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔"

"ایک جوڑے سے کسی کا کیا بن جاتا ہے آپی اور ہم کون سا انہی جوڑوں کے انتظار میں بیٹھے ہوئے ہیں مگر آپ کے اس اقدام سے ان کی کتنی بچت ہو گئی......" ندا نے کہا۔ "یوں بھی ان کے دیئے ہوئے جوڑوں میں سے ہم دس نقائص نکال دیتے۔"

"کل کو جب بھابی کو یہ ساری رسومات اپنی بیٹیوں کے لیے کرنا پڑیں گی تو بھاؤ معلوم ہوگا......" حنا نے جل کر کہا۔

"اللہ کرے کہ ان کی بیٹیوں کو ایسی سسرالیں

ملیں جو ہماری طرح انہیں فضول رسومات سے منع کر دیں۔" میں نے صدقِ دل سے دعا کی۔ "چلو سو جاؤ اب تم لوگ سب...." ہم نے چائے پینے کے دوران ہی ڈھیروں ڈھیر باتیں کر لی تھیں اور اپنے بالوں کے اسٹائل بھی پنیں نکال، نکال کر کھولے تھے، زیورات اور جوتے اتارے تھے، ہم سب کی سب ایک ہی کمرے میں مقیم تھیں اور ہمارے شوہر اور بچے مختلف جگہوں پر، جہاں جہاں پر انتظامات کیے گئے تھے۔

"آپ کو لگتا ہے آپی کہ آپ کے اس چھوٹے سے اچھے عمل کی کسی کو خبر بھی ہوئی ہو گی؟" ثنا نے حیرت سے پوچھا۔

"ہیں...." میں ہنسی۔ "تم سمجھ رہی ہو کہ میں نے یہ عمل اس لیے کیا ہے کہ اس کی داد کسی سے پاؤں، واہ واہ ہو میری اور میرے سر پر تاج سجے؟"

"معلوم تو سب کو ہوا ہو گا پیاری...." اسما نے کہا۔ "بہت سی عورتیں وہاں کہہ رہی تھیں کہ لڑکے کی پھوپیوں اور پھوپاؤں کے جوڑے نظر نہیں آ رہے تو کسی نے کہا کہ انہوں نے منع کر دیا تھا...."

"ہاں میں بھی وہیں تھی...." میمونہ نے اس کی تصدیق کی۔ "اور یاد ہے اسما.... ایک خاتون کہہ رہی تھیں کہ انہیں تو بہت اچھا لگا یہ سن کر.... اور یہ کہ وہ بھی اپنے بیٹوں کی شادی پر لڑکی والوں کو منع کر دیں گی کہ اپنی بیٹی کے سوا کسی کے لیے بھی کوئی کپڑا یا زیور بنانے کی ضرورت نہیں ہے...." اسما کا چہرہ اس بات کو یاد کر کے خوشی سے تمتما رہا تھا۔ "اچھا ہے ناں.... کسی نہ کسی کے اچھے عمل سے لوگوں کی سوچ تو بدلتی ہے، ہم باتوں کے ماہر ہوتے ہیں مگر عمل میں صفر۔"

"مجھے یہ سن کر اتنی خوشی ہوئی ہے کہ میں بتا نہیں سکتی۔" میرا چہرہ مسرت سے چمکنے لگا۔ "ہمارے کسی اچھے عمل سے کسی ایک شخص کی بھی سوچ مثبت رخ اختیار کر لے تو کیا ہی اچھا ہو...."

☆☆☆

"بھابی.... سنا ہے کہ طیب کی سسرال والوں نے آپ پھوپیوں اور پھوپاؤں کو شادی پر تحائف میں کپڑے وغیرہ نہیں دیے؟" میری دیورانی فرحت نے جانے کہاں سے اتنی "اہم خبر" سن لی تھی۔

"ہاں...." میں نے مختصراً کہا۔ "ہم نے خود منع کر دیا تھا۔"

"ہائیں؟" میری نند کرن کا منہ کھل گیا۔ "آپ نے خود کیوں منع کر دیا؟"

"تاکہ اس معاشرے میں انفرادی اقدامات سے ہم کچھ مثبت تبدیلیاں لا سکیں...."

"ایک آپ کے عمل سے.... بھلا پورا معاشرہ سدھر جائے گا، کیا آپ کو یہ لگتا ہے؟" فرحت نے ہنس کر کہا۔

"بارش.... پانی کے قطروں کے مجموعے کا ہی نام ہے فرحت اور ایک قطرے کی پہل سے ہی بارش کا آغاز ہوتا ہے...." میں نے رسان سے جواب دیا۔

"آپ کو ایک جوڑا دے دینے سے ان کا کوئی زیادہ نقصان ہو جاتا؟" کرن نے حیرت سے کہا۔

"بات میرے ایک جوڑے کی ہے نہ ہم چھ بہنوں کے چھ جوڑوں کی۔" میں نے کرن کا ہاتھ تھام لیا۔ "اصل مقصد یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں مروج ان بے ہودہ رسومات کا خاتمہ ہو جو ہمارے ہاں خواہ مخواہ در آئی ہیں، ان کا سبب ہمارا طویل عرصے تک ہندوؤں کے ساتھ برصغیر میں رہنا ہے...... ہمارے مذہب کی اتنی اچھی باتیں ہیں جو ہماری زندگیوں کو آسان کرتی ہیں اور کسی پر بوجھ کا باعث نہیں ہوتیں مگر ہم نے ان کو اپنے مذہب کے اچھے پہلوؤں سے آگاہ کرنے اور ان کی طرف راغب کرنے کے بجائے ان کی ایسی رسومات کو اپنا لیا جو امیروں کے لیے تو غالباً مشکل نہ ہوں گی مگر غریب کا تو کباڑا ہو جاتا ہے ایک بیٹی کو بیاہنے میں ہی۔"

"اگر آپ نے اپنے بھتیجے کی سسرال میں منع کر

دیا تھا تو کیا ہمیں اس بات کا اندازہ ہو جانا چاہیے کہ ہمیں سعد کی شادی پر اس کی سسرال سے کوئی توقع نہیں رکھنی چاہیے۔۔۔ کیا آپ ان کو بھی منع کر دیں گی کہ وہ سعد کی پھوپھیوں کے لیے تحائف نہ دیں؟" کرن نے مایوسی سے پوچھا۔

"نہ صرف سعد کی پھوپھیوں بلکہ کسی کو بھی نہیں۔۔۔ان سے تو میں کسی کے لیے بھی تحائف نہیں لوں گی۔" میرے لہجے میں عزم تھا۔

"وہ کیوں بھابی؟" کرن نے فوراً سوال کیا۔

"بیٹیوں والے بیٹی دے دیتے ہیں تو اس کے بعد کیا رہ جاتا ہے......" میں نے پیار سے کرن کی طرف دیکھا۔ "بیٹی کی شادی کی خوشی اپنی جگہ مگر ان پر بیٹی کی جدائی کا صدمہ بھی ہوتا ہے، ایک فرض سے فارغ ہو کر جہاں خوشی ہوتی ہے وہاں ان پر ان فرسودہ رسومات کا بوجھ بھی ہوتا ہے......"

"آپ نے تو ہمیں مایوس ہی کر دیا بھابی۔" فرحت نے منہ لٹکا کر کہا۔ "ہمیں تو بڑی امیدیں تھیں کہ اچھے اچھے جوڑے ملیں گے......"

"تمہیں جس طرح کا بھی اچھا جوڑا چاہیے...... وہ میں خود تمہیں دلواؤں گی۔ بلکہ تم نہ کہو تب بھی میں سعد کی شادی پر اس کی ساری پھوپھیوں، خالاؤں، چچیوں اور ممانیوں کے علاوہ اس کی ساری کزنز کو بھی تحائف میں جوڑے دینے کا ارادہ رکھتی ہوں۔" میں نے کرن سے کہا۔

"اگر آپ نے اپنے بھتیجے کی سسرال میں اس لیے منع کیا کہ ان پر بوجھ ہوگا تو پھر آپ ایسا کیوں کریں گی؟" کرن نے پوچھا۔ "آپ پر بوجھ نہیں ہوگا کیا؟"

"مجھ پر بوجھ نہیں ہوگا......" میں مسکرائی۔

"میں یہ سب اپنی خوشی سے کروں گی، اگر کر سکی تو......اور یہ کوئی رسم بھی تو نہیں...... کسی اور کے لیے کروں نہ کروں، تم دونوں سے تو وعدہ ہے کہ تم دونوں کے جوڑے پکے۔"

تیرے بن عید

ایک اور عید
آج میں گزاروں گی تنہا
آج پھر میں چاند رات کو
ہجر یار کے تارے کے ساتھ
تیری یاد میں
محبت کا دیا اک جلاؤں گی
آج بھی بن تیرے
عیدیوں مناؤں گی
میں بھی اس دیے کے مانند
دھیرے دھیرے جلتی جاؤں گی
چپ چاپ سلگتی جاؤں گی۔

مرسلہ: یاسمین اقبال، لاہور

"بھابی ہمارے علاقے میں تو لوگ بڑے دیالو ہیں...... قسم سے میرے بھائی کی شادی ہوئی تو لڑکی والوں نے تین ٹرکوں میں بھر کر سامان دیا...... سارے خاندان کے لیے بے شمار تحائف...... آدھے خاندان کی عورتوں کے لیے تو سونے کے تحائف تھے، کیسے کیسے تحائف بھابی، کیا بتاؤں!" فرحت نے بتایا۔

"تمہیں لگتا ہے کہ یہ سب ٹھیک ہوا؟" میرے لہجے میں تاسف تھا۔

"حقیقت میں پوچھیں بھابی تو اس وقت مجھے بھی یہ سوچ کر بہت افسوس ہوا تھا۔ حالانکہ مجھے بھی تحفے میں اتنا قیمتی جوڑا اور سونے کے جھمکے ملے تھے مگر میں سوچ کر رہ گئی تھی کہ کل کلاں کو ہم اپنی بیٹیوں کو کیسے بیاہیں گے......"

"اسی وجہ سے سوچ کو بدلنے کی ضرورت ہے فرحت...... بات کسی کے دیالو یا کنجوس ہونے کی نہیں، جب ایک دیتا ہے تو وہ دوسروں کے لیے ایک مثال قائم کر دیتا ہے، یہ مثال مجبوری بن جاتی ہے،

ہم جان سے چلے جاتے ہیں مگر ان بےہودہ رسوم و رواج سے نہیں بچتے....." میں نے کہا۔ "ہمارے گاؤں کے ساتھ ایک گاؤں ہے جہاں کی رسم ہمارے سارے ملک سے نرالی ہے اور انتہائی قابلِ عمل اور قابلِ تقلید بھی۔ مگر اسے سراہتے سبھی ہیں، اپنانے کا حوصلہ کوئی نہیں کر پاتا......"

"اچھا.... وہ کیا رسم ہے بھائی؟" کرن نے دلچسپی سے پوچھا۔

"وہاں پر مہندی کی تقریب سانجھی ہوتی ہے، لڑکے والے لڑکی والوں کے ساتھ پورا خرچہ مل کر کرتے ہیں، اگلے دن ناشتے کے بعد بارات لڑکی والوں کے گھر جاتی ہے، وہاں پر گرمیوں میں ٹھنڈے مشروب اور مٹھائی اور سردیوں میں چائے اور مٹھائی پر نکاح ہوتا ہے..... اس کے بعد رخصتی ہوتی ہے۔ شام کو لڑکی کا سارا خاندان بھی لڑکے والوں کے گھر آجاتا ہے اور ولیمے کی دعوت... ہوتی ہے، اتنی مختصر سی شادی کی تقریب ہوتی ہے اور لڑکی والوں پر ایسا کوئی بوجھ بھی نہیں پڑتا......"

"ارے واقعی..... یہ تو بہت اچھی رسوم ہیں بھائی!" فرحت نے کہا۔ "واقعی ایسی مثالوں کی تقلید کرنے کی ضرورت ہے، اچھائی کے پیغام کو جتنا پھیلایا جاسکتا ہے پھیلانا چاہیے......"

"اچھا لگا مجھے یہ سن کر..... ہم میں سے کوئی یہ نہ سوچے کہ ہم اکیلے کچھ نہیں کر سکتے، ایک نیکی بھی کریں تو وہ ضرب در ضرب کے عمل سے پھیلتی ہے اگر دوسرے ہماری نیت اور اس نیکی کے مفہوم کو سمجھیں تو کیا اچھا ہو۔ معاشرے میں پھیلی ہوئی بہت سی ناپسندیدہ اور قبیح رسوم ایسی ہیں جن کے ہونے کی پوری ذمے داری خود ہم پر ہی عائد ہوتی ہے، تم دونوں اگر میری طرح سوچو گی اور کم از کم اپنے بیٹوں کی شادیوں میں ان رسوم کو تبدیل کرنے کی کوشش کرو گی تو ضرور معاشرہ تبدیل ہوگا، انشاء اللہ۔"

میرے لہجے میں یقین اور عزم تھا۔

"صرف بیٹوں کی شادیوں پر ہی کیوں.....؟" کرن نے حیرت سے کہا۔ "بیٹیوں کی شادیوں میں بھی تو ہم ایسی شرائط رکھ سکتے ہیں کہ ہم تحائف دیں گے نہ جہیز......"

"بدقسمتی سے یہ معاشرہ اس بات کو لڑکی والوں کی طرف سے تسلیم نہیں کرے گا، چنا بھٹ کو نہیں پھوڑ سکتا (کمزور، زبردست کا کچھ نہیں کر سکتا) کیونکہ ہمارے ہاں لڑکے والے زبردست اور لڑکی والے زیردست ہوتے ہیں، ہمارا مذہب نہیں بلکہ معاشرہ لڑکی والوں کو مجبور بنا دیتا ہے..... وقت آئے گا کہ ایک دن ہم سب کی سوچ بدلے گی، انشاءاللہ!"

"انشاءاللہ....." دونوں نے بیک آواز کہا۔

"میرے ابا جی بیٹیوں کو کبھی بوجھ نہیں سمجھتے تھے اور ان کی قسمت ایسی کہ انہیں کوئی ایسا سمدھیانہ نہیں ملا جہاں کوئی ان بےہودہ رسومات کے خلاف ہوتا۔ میں سب سے بڑی تھی، اپنی شادی سے لے کر ہر بہن کی شادی پر اپنے ابا جی کے کندھوں کو پہلے سے زیادہ جھکے ہوئے دیکھتی اور خود کو مجرم محسوس کرتی کہ ہم بہنوں کے بوجھ اپنے کندھوں پر سے اتارتے ہوئے وہ اپنی عمر بتا گئے..... صرف شادیوں کے ہی نہیں بلکہ بیٹیوں کے بوجھ تو ماں باپ عمر بھر اٹھائے پھرتے ہیں۔" میں ملول ہوگئی۔

☆☆☆

"مبارک ہو آپی....." اسما کی آواز میں جوش تھا۔

"خیر مبارک..... " میں نے جواب دیا۔ "کس بات کی مبارک ہے بھئی؟"

"طیب کی سسرال سے ندا کی دو بڑی بیٹیوں کے لیے رشتے آئے ہیں....." اس نے اطلاع دی۔

"ماشاءاللہ....." میں نے کہا۔ "کون لوگ ہیں؟" ندا کو اپنی بیٹیوں کی طرف سے بہت پریشانی رہتی ہے تو یہ میرے لیے بہت اچھی اطلاع تھی، اس

کی تیسرے نمبر کی بیٹی کا رشتہ تو میں لے لوں گی، میرے دل میں خواہش تھی کیونکہ بڑی دونوں تو میرے سعد سے بڑی تھیں۔

"یاد ہے آپ کو، جو میں نے اور میمونہ نے آپ کو بتایا تھا...... جو خاتون آپ کے اس اقدام کی بہت تعریف کر رہی تھیں کہ آپ نے لڑکی والوں سے تحائف لینے کو منع کر دیا تھا......"

"ہاں، ہاں...... کچھ یاد تو ہے۔" میں نے ذہن پر زور دیا۔

"وہ طیب کی تائی ساس تھیں، انہوں نے اپنے پورے خاندان میں آپ کے اس اقدام کی نہ صرف تعریف کی بلکہ چاہا کہ اس اچھی سوچ والی خاتون کی بیٹی کو بیاہ کر لائیں مگر جب انہوں نے چیک کیا تو علم ہوا کہ اس اچھی سوچ والی خاتون کی فقط ایک ہی بیٹی ہے اور وہ بھی بیاہی جا چکی ہے...... تب انہوں نے مزید چھان بین کی اور ان کی نظر انتخاب ندا کی بڑی دونوں پر ٹھہری...... انہوں نے کہا ہے کہ انہیں صرف بچیاں چاہئیں اور کچھ بھی نہیں چاہیے۔ آج کل میں ہی ندا آپ کی طرف آئے گی، خوش تھی، کہہ رہی تھی کہ آپ سے مشورہ کرے گی کہ کیا کرنا چاہیے۔"

"بہت اچھی خبر سنائی ہے تم نے اسما......" میں نے دل میں شکر ادا کیا کہ ندا کی پریشانیاں کچھ تو کم ہوں گی۔ اسما نے مجھے تفصیلات بھی بتائیں جو بہت حوصلہ افزا تھیں، اللہ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جاتا، کم تھا۔

اگلے ہی روز اسما اور ندا آ گئیں، مجھ سے مشورہ کرنے کے لیے۔

"اس سے اچھا اور کیا ہو سکتا ہے۔" میں نے اس رشتے کی حمایت میں ووٹ دیا۔ چائے پیتے ہوئے مجھے ندا نے وہ تفصیلات بھی بتائیں جن کا کہ اسما کو بھی علم نہ تھا۔ سال بھر کے اندر ان کا دونوں شادیاں اکٹھے اور سادگی سے کرنے کا ارادہ تھا، دونوں بیٹے بہترین ملازمتوں پر تھے اور انتہائی شریف لوگ تھے۔

"یاد ہے ناں ندا...... اس دن ثنا نے پوچھا تھا کہ میرے اس نیکی کے عمل کی کسی کو خبر بھی ہوئی ہو گی کہ نہیں، تبھی تم لوگوں نے انہی خاتون کے بارے میں بتایا تھا......"

"ہاں، ہاں...... یاد ہے مجھے آپی!" ندا نے کہا۔

"نیکی ایک خوشبو ہوتی ہے پیاری...... خوشبو جو وجود رکھتی ہے مگر نظر نہیں آتی، ہوا کے ننھے سے جھونکے کے ساتھ پھیلتی ہے، ہر اچھا عمل نیکی کی خوشبو کی طرح ہوتا ہے، پھیلتا ہے تو محظوظ کرتا ہے۔ دیکھو لو...... اللہ کے ہاں نیکیوں کے کیسے، کیسے اجر ہیں، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میرے اس ننھے سے عمل کا اللہ تعالیٰ کے ہاں ایسا صلہ ہو گا جو اسی دنیا میں ہمیں مل گیا۔ میں اس روز تمہاری باتیں سن کر بہت پریشان ہوئی تھی کہ تم بیٹیوں کے مستقبل کی طرف سے کافی فکر مند ہو، میں نے دل سے تمہارے لیے دعا کی اور دیکھو اللہ تعالیٰ نے میرے اس چھوٹے سے عمل کا اجر ہمیں کتنا اچھا دیا کہ اس نے تمہارے حق میں کی گئی میری دعا سن لی۔" میں نے ندا کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔

"واقعی آپی!" ندا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے...... "اگر دنیا میں چند اچھے لوگ بھی آپ جیسے ہو جائیں جن کا عمل دوسروں کی سوچ بدل دیتا ہے تو یہ دنیا مثالی ہو جائے......"

"اور بیٹیوں کے بوجھ تو پھولوں کی طرح ہلکے ہو جائیں، بیٹیوں کی پیدائش پر کسی کا چہرہ نہ اترے......" اسما نے کہا۔

وقت رخصت، ندا اٹھی اور واپس آ کر میرے گلے سے لگ گئی...... "اس روشنی کو پھیلاتی رہیے گا آپی! اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر دونوں جہانوں میں دے گا......"

"آمین!" اسما نے کہا اور میں مسکرا دی۔

"انشاء اللہ!"

ناولٹ



ٹریم آرٹسٹ

عمیرہ احمد

وہ قدِ آدم کھڑکی کے پاس کھڑی باہر سوگ کی طرح پھیلے اندھیرے کو کھوج رہی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ اندھیرا اس کے اندر سے نکل کر چار سو پھیل گیا ہو۔

اس نے کھڑکی کے شیشے پر اپنے گال ٹکا دیے...... رات کا دوسرا پہر تھا ---- شانزے سو چکی تھی ۔ لیکن وہ اسے جگا گئی۔ اس کی بیٹی جو اس کی زندگی کو اس موڑ پر لے آئی ہے۔ اب سو چکی تھی اور وہ خود اب جاگ رہی ہے...... وہ جو بین الاقوامی



شہرت کی حامل ایک کامیاب اداکارہ تھی اب صرف ایک عورت بنی ہوئی تھی۔ کھڑکی کے شیشے کے پار بہت کچھ تلاش کرتے اسے اب احمد یاد آرہا تھا۔

"کیا وہ بھی احمد سے محبت کرتی تھی؟"

اسے یاد کرنے سے بھی کوئی یادداشت نہ ملی جس میں وہ بھی بنی رنگین تتلی کے مانند اس کے گرد رقصاں ہوئی ہو...... اسے یاد کیوں نہیں آرہا...... اسے احمد ہی کیوں یاد آرہا ہے۔ اسے اس کی محبت اب کیوں یاد آرہی ہے...... وہ جاچکا تھا اور اس نے خود ہی اسے جانے دیا تھا...... پھر......؟

کچھ لوگوں کو تاعمر یہ اندازہ نہیں ہوپاتا کہ وہ کس خزانے کے مالک ہیں...... بن گئے ہیں اور بنے رہنے والے ہیں...... "محبت کے خزانے"... جس کی چاکری کرنی پڑتی ہے نہ تشویش...... یہ اُن ہی کا تو ہے اور وہ خود اس خزانے کی حقیقت سے انجان...... اسے وقت کے ہاتھوں کوڑیوں کے بھاؤ بیچ دیتے ہیں...... اور پھر بھی انجان بنے پھرتے ہیں...... بدقسمت لوگ...... وہ اس سے محبت کرتا تھا اور وہ اس سے شادی کرچکی تھی۔

☆☆☆

اسے وہ وقت یاد آرہا ہے جب وہ محبت کا سوال لے کر اس کے پاس آیا تھا اس کے پیچھے بھاگا تھا۔

"کیا آپ میرے ساتھ ایک کپ چائے پئیں گی؟" وہ بڑا مؤدب بنا اس کے سامنے کھڑا تھا۔

"سوری...... میں......" وہ بہ مشکل مسکرا کر کہنے لگی...... وہ پروڈکشن ہاؤس کسی کام سے آئی تھی، دس، پندرہ منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگا تھا اسے...... اور وہ اس کی کار کے پاس کھڑا تھا۔

"پلیز...... انکار مت کیجیے گا۔"

"مجھے انکار کرنا ہی ہے کیونکہ میں بہت جلدی میں ہوں۔"

"میں نے پورے دو سال اس ایک کپ چائے کا انتظار کیا ہے۔"

"دو سال......؟" وہ حیران ہوئی۔

"میرا یقین کریں۔"

"میں یقین کرتی ہوں...... لیکن میں......"

"صرف دس منٹ لگیں گے یا پندرہ اس سے زیادہ نہیں...... اسی سڑک کے کنارے پر کافی شاپ ہے۔"

"میرے پاس بہ مشکل پانچ منٹ ہیں۔"

"چائے یا کافی آنے کے بعد کے صرف پانچ منٹ...... پلیز......" اس نے گھڑی دیکھی پھر اسے دیکھا۔

"چلیں...... میں اپنی کار میں آپ کو فالو کرتی ہوں۔"

"میرے پاس موٹر سائیکل ہے...... کیا ہم واک کرکے جاسکتے ہیں؟"

"دیکھیں میرے پاس وقت......"

"دیکھیے بلکی، ہلکی ہوا چل رہی ہے، فٹ پاتھ پر درختوں کے سائے کتنے بھلے لگ رہے ہیں۔ واک کرنا تو ایک خواب جیسا ہوگا۔" وہ مسکرا اٹھی اور آگے چلنے لگی۔

چائے آگئی اور اس نے جلدی سے سپ لیا۔

"میرے پانچ منٹ شروع ہوتے ہیں، کیا میں آپ سے بات کرسکتا ہوں۔"

"آپ بات ہی کررہے ہیں۔"

"نہیں، وہ بات جس کے لیے میں نے اتنا انتظار کیا ہے۔" وہ خاموشی سے چائے پیتی رہی، مطلب تھا "تم بولتے رہو۔"

"میں آپ سے سوال کروں......؟ یا جواب لوں مجھے تو کچھ نہیں آرہی۔ اظہار کروں یا اپنا حالِ دل بیان کروں۔"

اس کے چہرے پر ناگواری نظر آنے لگی۔ ظاہر ہے اس نے بہت بار ایسے ڈرامے دیکھے تھے

تھے۔ احمد اس پر نظر پڑتے ہی جان گیا کہ وہ بہ مشکل ہی اب یہاں تک کر بیٹھی رہے گی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو گود میں رکھ لیا جیسے ننھا سا بچہ سہم گیا ہو۔

''مجھ سے شادی کریں گی؟'' ننھا بچہ رو دینے کو ہوا۔

''نہیں......'' اس نے ایسے کہا جیسے ٹافی نہیں ملے گی باہر جا کر کھیلو...... اس نے آرام سے چائے کی ایک آخری چسکی لی۔

''میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے سوال بدل دیا۔

''میں جا رہی ہوں، چائے کے لیے شکریہ......!'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں آپ سے محبت کرتا ہوں...... آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں کیونکہ اب آپ کے بغیر نہیں رہ سکتا۔''

دو قدم آگے ہو چکی ماہ زیب نے ٹیک دم رک کر اس کی طرف دیکھا پھر اس کی شکل ''ھونہہ'' سی ہو گئی۔

''اچھا'' اس نے طنز سے بھی رنگ گھول کر محلول اس کی طرف اچھالا۔

''آپ میری سچائی کو آزما سکتی ہیں۔'' اس کا رنگ فق سا ہو گیا۔

اس بار ماہ زیب نے اچھا کہنا بھی گوارا نہیں کیا اور تیزی سے آگے چلنے لگی۔

''ایک بار میری پوری بات تو سن لیں۔'' وہ اس کے پیچھے آیا اور بہت تیزی سے کہا۔

''تمہاری بات بھی سن لی ہے اور تمہارے پانچ منٹ بھی ہو چکے ہیں...... اب جاؤ......'' وہ ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئی...... وہ ایسے اس کے پیچھے لپکا جیسے سامنے ہی دو قدم دور ملک الموت اس کی روح نکالے لیے جا رہا ہو...... وہ اپنی جان بچانے کو اس کے پیچھے لپکا۔

''میں آپ سے محبت کرتا ہوں...... یہ مذاق نہیں ہے۔ یہ صرف الفاظ نہیں ہیں......'' لمبے درختوں کے سائے سے ڈھکے فٹ پاتھ پر وہ اس کے ساتھ چلنے کی کوشش کرنے لگا...... وہ ''ہونہہ'' کی شکل بنائے تیز، تیز قدم اٹھاتی رہی...... وہ خوب صورت تھی۔ ملک کی مشہور اداکارہ تھی، ہزاروں بار اسے کہا جاتا تھا کہ ''میں آپ کا بڑا فین ہوں۔ آپ سے محبت کرتا ہوں، آپ مجھے اچھی لگتی ہیں۔'' شادی کے بارے میں بھی لوگ ڈھکے چھپے انداز سے کہہ ہی دیتے تھے...... لیکن ایسے اس طرح پیچھے پڑ کر...... ایسے ساتھ ساتھ بھاگ کر......

''مجھے پتا نہیں چلا، مجھے آپ سے محبت کب اور کیسے ہو گئی لیکن ہو گئی...... میں نے اداکارہ سے محبت نہیں کی...... میں آپ کا فین نہیں ہوں میں۔ ماہ زیب کا مداح ہوں...... مجھ پر آپ نے اِک جادو کر دیا ہے۔ اور میں اس میں خوش ہوں...... آپ مجھ میں حلول کر گئی ہیں۔ پہلے مجھے ڈر تھا کہ آپ کے بغیر مر جاؤں گا مگر اب یقین ہو چکا ہے۔ کاش مجھے معلوم ہوتا کہ یہ محبت ایسے کیسے ہونے لگتی ہے...... کیسے چھپ کر وار کرتی ہے تو میں اپنا بچاؤ کر لیتا...... لیکن اب تو......'' ماہ زیب کی خوب صورت سینڈل کی ہیل ٹک، ٹک فٹ پاتھ کے فرش سے اٹھ کر سارے میں پھیل رہی تھی...... احمد کی پی پی...... پیا پیا کی صدا صدیوں پیاسے صحرا کی پکار کے مانند تھی۔

ماہ زیب کی رفتار اور تیز ہو گئی اس نے اپنے ہاتھ کو اسے چانٹا مارنے سے روکا...... ''میرے لیے آپ اداکارہ نہیں ہیں...... مجھے آپ کی شہرت سے بھی غرض نہیں ہے۔ صرف ایک بار میرے بارے میں سوچ لیں...... مجھے خود پر ہنسی آتی تھی جب میں یہ سوچتا تھا کہ کبھی آپ سے یہ سب کہہ سکوں گا...... پھر میں رونے لگا...... اور روتا ہی رہتا اگر نہ کہتا......''

ماہ زیب اپنی کار تک پہنچ چکی تھی۔
"پلیز ماہ زیب! میری بات سن لیں...... پوری بات......"
"اگر اس پروڈکشن ہاؤس میں اپنی نوکری بحال رکھنا چاہتے ہو تو چلے جاؤ۔"
"صرف ایک بار میری بات سن لیں۔"
"تم صرف ایک بار میرے انکار پر یقین کرلو۔" احمد نے ڈرائیونگ سیٹ کے ڈور کو لجاجت سے پکڑ لیا۔
"میں جانتا ہوں، میرا رتبہ آپ کے مقابلے میں کیا ہے...... میں رتبے میں بہت چھوٹا ہوں...... لیکن اگر میری محبت کا مقابلہ کیا جائے تو وہ ہر میدان کی فاتح ہو گی...... آپ کے لیے اس محبت کا بہت بڑا رتبہ ہے۔"
ماہ زیب خاموش اسے دیکھے گئی...... اگر وہ جھوٹا تھا تو وہ کمال کا سچا لگ رہا تھا اگر وہ اداکار تھا تو آسکر ایوارڈ اس کا تھا۔
"زندگی میں آپ کو وہ تو ضرور ملے گا جو آپ کے ساتھ رہے گا لیکن وہ نہیں ملے گا، جو آپ کے بغیر نہ رہ سکے اور وہ...... وہ میں ہوں۔"
"پاگل ہو تم......" ماہ زیب نے اس کے ہاتھ کی گرفت سے دروازہ آزاد کروانا چاہا۔
"اگر یہ پاگل پن ہے تو میں اس پاگل پن سے خوش ہوں...... میرے علاوہ کوئی اور کہاں آپ کا خیال رکھ سکے گا...... کبھی تو وہ آپ سے ناراض ہو گا...... غصہ کرے گا...... لڑے گا...... آپ کو برا ثابت کرے گا...... کبھی تو وہ خود کو آپ سے برتر ثابت کرے گا...... کبھی تو وہ آپ کو کمتر کرے گا...... وہ آپ کو دیکھے گا اور خوش ہو گا...... نہ دیکھنے پر نا خوش نہ ہو گا...... کبھی نہ کبھی تو وہ آپ کو یاد کرنا بھول ہی جائے گا...... مگر ماہ زیب میں نہیں...... میں بھولوں گا تو یاد کروں گا ناں...... ماہ زیب کوئی آپ کو اپنی دنیا میں شامل کرے گا...... اس کے پاس بڑا سا گھر ہو گا...... بہت ساری کاریں ہوں گی۔ مگر میں آپ سے صرف آپ سے اپنی دنیا سجاؤں گا...... میری ساری دنیا آپ ہی رہیں گی، کسی اور کے ساتھ آپ میں اور تم ہوں گی...... لیکن ماہ زیب میں آپ ہی آپ ہوں...... میں ختم ہو چکا ہوں۔ میں آپ ہو چکا ہوں۔" اس کی آواز دھیمی ہو گئی۔
"میں آپ ہو چکا ہوں...... میں آپ ہو چکا ہوں۔" یہ صدا دور آسمان تک گئی...... اور بہت قدیم...... قبروں میں مدفن سچے عاشقوں تک بھی...... اور جیسے سب نے سر ہلایا اور کہا۔
"ہاں یہ ٹھیک کہتا ہے...... ایسا ہی ہوتا ہے۔"
اس نے دروازے پر اپنی مضبوط گرفت کو چھوڑ دیا...... ماہ زیب کا جی چاہا اس کی شاندار پرفارمنس پر تالیاں بجائے...... لیکن اس نے تالیاں نہ بجائیں...... احمد کھڑا اسے دیکھتا رہا تھا وہ اس کے خوب صورت چہرے کو نہیں دیکھ رہا تھا وہ اس خوب صورت چہرے کے دور اندر دیکھ رہا تھا۔ ماہ زیب نے سست روی سے دروازہ بند کیا...... دور اندر کہیں ایک جذبہ ابھرا کہ وہ ایسی ہی چند اور شاندار باتیں کرے...... ایک عورت نے چاہا کہ اسے اور بتایا جائے کہ اسے کیسے، کیسے چاہا جا سکتا ہے۔ اسے بتایا جائے کہ اسے کیسے پوجا جانا چاہیے...... اس کی اپنی مداح سرائی پر الفاظ کس بلندی تک پہنچ کر فضا میں بکھر سکتے ہیں...... اسے بتایا جائے کہ وہ کس قدر محبت کے لائق ہے...... اتنی ہی ناں کہ اس کے آگے ہاتھ باندھ کر کھڑا رہا جائے اور اپنا سب کچھ نچھاور کیا جاتا رہے...... یہ بھی کم ہے۔
کار آگے جا رہی تھی...... احمد پیچھے رہ گیا تھا...... وہ وہاں ایسے کھڑا تھا جیسے آسمان سے ایک آگ کے گولے نے اسے آلیا اور زمین اسے پیچھے بہت پیچھے کھینچتی ہو اور اب وہ نہ زندوں میں رہا، نہ

مُردوں میں..... ماہ زیب نے اسے بیک ویو مرر میں دیکھا..... وہ پریم سنگیت کے آخری دم توڑتے بولوں کی طرح ایستادہ لیکن بکھرا بکھرا تھا۔

اس طرح کے ہونے والے واقعات کو وہ اکثر اپنی فرینڈز کو مزے لے، لے کر سنا دیا کرتی تھی لیکن اس واقعے کو نہ سنا سکی..... چند راتیں سونے سے پہلے یہ منظر اس کی آنکھوں میں ضرور در آتا..... کانوں میں ترنم جاگ اٹھتا.....وہ اپنی پوجا کروانے لگتی.....شانت سی ہو جاتی..... اگر وہ رتبے میں اتنی اونچائی پر نہ ہوتی تو شاید..... اس پریم داس کے قدموں میں جا بیٹھتی..... پر دیوی سنگھاسن نہیں چھوڑا کرتی.....دیویاں داسی نہیں بنا کرتیں.....

"دیوی، ماہ زیب اپنے سنگھاسن پر ہی بیٹھی رہی۔"

"وہ پریم داسی نہ بنی۔"

☆☆☆

وہ ماسٹرز کر رہی تھی جب دھواں دھار محبت کے بعد اس نے حارب سے شادی کر لی..... اپنی تعلیم ادھوری چھوڑ کر وہ امریکا چلی گئی۔ کالج کے زمانے سے وہ ماڈلنگ اور اداکاری کرتی رہی تھی بہت مشہور نہیں لیکن اس کا ایک نام ضرور تھا..... اس نے اپنے کیریئر کو حارب کے لیے خیر باد کہہ دیا..... چند ایک پراجیکٹس امریکا سے کیے لیکن باقاعدہ کام نہیں کیا..... حارب کے ساتھ اس نے ایک مکمل گھریلو ... زندگی گزاری..... وہ گھر کے کام کرتی، کھانا پکاتی.....شانزے کو سنبھالتی اور حارب کا ہر طرح سے خیال رکھتی..... اس کی یہی زندگی تھی اور اسے یہی زندگی بہت پیاری تھی.....اور اس پیاری زندگی پر ماتمی سیاہی پھر گئی۔ جب نیویارک جاتے ہوئے حارب کار ایکسیڈنٹ میں جاں بحق ہو گیا۔ شادی کے پانچ سال کے بعد وہ بیوہ ہو گئی..... اس کے والدین اسے پاکستان واپس لے آئے۔ حارب کا

سوگ اس نے جی جان لگا کر منایا خود کو ختم ہی کر ڈالا..... چند سال لگے اسے نارمل ہونے میں..... اور پھر وہ خود کو معروف رکھنے کے لیے اداکاری کرنے لگی..... اور دیکھتے ہی دیکھتے ملک کی مشہور اداکارہ بن گئی۔

بہت سے لوگ اسے شادی کے لیے اپروچ کرتے تھے لیکن ابھی وہ چند اور سال شادی نہیں کرنا چاہتی تھی.....شادی اسے کرنی تھی .....لیکن کب اس کا اسے خود بھی اندازہ نہیں تھا.....اس کے گھر والے اس کے لیے آئے دن کوئی نہ کوئی پروپوزل فائنل کرتے اور وہ کسی نہ کسی بہانے ٹالتی رہتی.....شانزے بارہ سال کی ہو گئی تو اسے سنجیدگی سے شادی کے لیے کہا گیا اور اس نے زمان کو اوکے کر دیا..... وہ خوب صورت تھا..... بزنس مین تھا..... کینیڈا میں رہتا تھا.....اس کے پاپا کے دوست کا بیٹا تھا.....اس نے خود ماہ زیب سے شادی کی خواہش ظاہر کی تھی بلکہ ایک سال سے زیادہ اس کا انتظار بھی کیا تھا، وہ کسی بھی لڑکی سے شادی کر سکتا تھا لیکن وہ ایک بیوہ اور بارہ سالہ بچی کی ماں سے کر رہا تھا۔ اس کی بہنوں نے کہا وہ بہت خوش قسمت ہے، اس کے گھر والے بہت خوش تھے، وہ بھی خوش تھی اور شانزے بھی..... اس کے نانا، نانی نے اسے ایسے منایا تھا کہ وہ زمان کو اپنی ماں سے زیادہ پسند کرنے لگی تھی۔

دونوں کی منگنی ہو گئی.....شادی کینیڈا میں ہوتی تھی اس لیے تھوڑا وقت درکار تھا..... کچھ ماہ زیب کے اپنے پراجیکٹس تھے۔

زمان مہینے میں دو بار آنے لگا..... پھر تین بار..... پھر لگتا کہ وہ جاتا بھی نہیں ہے کہ آ جاتا ہے.....اس سے زیادہ وقت وہ کینیڈا سے ماہ زیب کو فون کرنے میں لگاتا..... جب وہ آتا تو ماہ زیب شوٹنگ کینسل کروا دیتی۔ وہ زیادہ آنے لگا تو وہ بار

بار یہ بھی نہ کر سکی...... اس کے لیے مشکل ہو گیا کہ وہ اس کی فون کالز سنے...... وہ آئے تو اسے وقت دے۔ شروع میں سب ٹھیک رہا پھر وہ چڑنے لگا...... وہ سیٹ پر ہے۔ مشکل اس سے آدھے گھنٹے بات کر پاتی...... خدا حافظ کہتی تو وہ خفا ہو جاتا۔

"مجھے کام کرنا ہے زمان...... سیٹ پر میرے لیے اتنا انتظار نہیں کیا جا سکتا......"

"میں بھی کام کرتا ہوں...... میرا بزنس بھی ڈسٹرب ہو رہا ہے۔"

"پھر تمہیں اپنے بزنس پر توجہ دینی چاہیے۔"

"تمہیں میرا فون کرنا پسند نہیں......؟"

"میں نے یہ نہیں کہا۔"

"میں سمجھ گیا......" فون کھٹک سے بند۔

وہ بات، بات پر خفا ہونے لگا۔ وہ فارغ ہوتی تو اسے فون کر کے مناتی۔ اسے یہ شکوہ بھی ہوتا کہ اتنی دیر سے فون کر کے کیوں منایا پھر وہ اس کے کام کا مذاق اڑانے لگا۔

"کیا دو پیسوں کے لیے خوار ہوتی ہو۔"

"پیسوں کی مجھے کبھی کمی نہیں رہی۔ کام میرا شوق ہے۔"

"فضول شوق ہے، اداکاری بھی بھلا کوئی کام ہے۔"

"دنیا میں لاکھوں لوگ اداکاری کرتے ہیں۔"

"ان لاکھوں لوگوں میں سے چند ایک کے نام ہی دنیا جانتی ہے۔ تمہارا نام کہاں ہے؟"

"میرا نام میرے ملک میں ہے۔"

تمہارا ملک...... تیسری دنیا کا تیسرے درجے کا ملک......"

"کیا تمہیں معلوم ہے۔ تیسرے درجے کے اس ملک میں پہلے درجے کے لوگ رہتے ہیں۔"

"ہاہاہا......" وہ دیر تک ہنستا رہا۔

وہ دیر تک اس سے خفا رہی۔

ایک بار وہ اچانک آیا تو وہ سرے سے اسے مل ہی نہیں سکی وہ کسی شوٹ کے لیے دور دراز گاؤں گئی ہوئی تھی، ماہ زیب نے کہا بھی کہ وہ اسے وہاں آ کر مل جائے لیکن وہ اتنا خفا ہو کر گیا کہ پورا ایک ہفتہ اس سے کوئی رابطہ نہیں رکھا۔

ماہ زیب اپنی بہنوں سے کہتی کہ اسے لگتا ہے کہ اس نے کسی بچے سے منگنی کر لی ہے۔ اس کی بہنیں ہنستیں اور پھر کہتیں۔

"تم بہت خوش قسمت ہو...... وہ بہت امیر ہے۔"

"پر امیر ہونے کے علاوہ اس میں جو بھی خوبیاں ہیں وہ کم و بیش کسی بھی دوسرے مرد میں ہو سکتی ہیں...... بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ......"

"نہیں...... صرف خوبیاں معاشرے میں آپ کا گراف اوپر نہیں کرتیں۔" یہ جویریہ تھی...... اس کی بڑی بہن...... جس نے قریب قریب ایک بڈھے سے شادی کر لی تھی صرف اس لیے کہ وہ شہر کے چند مہنگے امرا میں سے ایک تھا۔

☆☆☆

ایک رات وہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور ہنسنے لگی۔ اس کی منگنی کی خبر اخبارات میں آئی تھی یقیناً احمد نے بھی پڑھی ہو گی...... پھر ایک رات وہ بے قراری سے اٹھ کر ٹہلنے لگی...... اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس کے اندر کیا جل اٹھا ہے جو بجھ نہیں رہا۔

کس تنے کی جڑ اندر ہی اندر پھیلتی جا رہی ہے...... اور پھر اس نے سوچا کہ اگر اس معمولی سے شخص کی جگہ کوئی با اثر امیر، کبیر ہیرو ٹائپ کوئی انسان ہوتا تو وہ کیسا ردِعمل ظاہر کرتی۔

"اُف تم کس قدر خوش قسمت ہو۔" جویریہ کہتی۔

"اُف فلمی سچویشن...... یہ سب تمہاری ہی محبت

میں کیوں گرفتار ہوتے ہیں ماہ زیب...... کیا چھپا رکھا ہے تم نے اپنے اندر کہ سب دوڑے آتے ہیں تمہاری طرف۔" دوسری بہن سویرا کہتی۔ اس نے ایمانداری سے نتیجہ نکالا کہ اس مداح کا معمول ہوتا اسے بے وقعت کر گیا ورنہ..... ورنہ...... وہ رگوں میں حلول کرتا...... روح تک پہنچ جانے والوں میں تھا۔ دس منٹ کی ملاقات میں اس نے غضب کر دیا۔ ساری زندگی کے ساتھ میں تو وہ حیران کر دے گا۔

☆☆☆

ماہ زیب اور زمان کی شادی کی تیاریاں کی جانے لگیں۔ ماہ زیب جلدی، جلدی اپنا کام مکمل کروانے لگی.... زمان آیا اس دوران دونوں کو ڈنر کرنا تھا اور وہ پوری کوشش کے باوجود ہوٹل دیر سے آئی تھی اور زمان غصہ ضبط کیے بیٹھا تھا.... ڈنر کے دوران ہی اس نے اسے نرمی سے آگاہ کیا کہ وہ مستقبل.... کمرشل کی شوٹنگ کے لیے جا رہی ہے۔

"کب جانا ہے؟" اس نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے پوچھا۔

"کل......"

"لیکن کل ہی تو میں آیا ہوں..... اور کل تم جا رہی ہو۔"

"مجھے بھی رات ہی بتایا گیا ہے.... صرف دو دن کا کام ہے۔"

"دو دن کا ہو یا دو گھنٹے کا چھوڑ دو۔"

"صائم نے مجھے اس ایڈ کے لیے چھ ماہ پہلے سائن کیا تھا...... میں عین وقت پر انکار نہیں کر سکتی...... صائم سے میرے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ کمپنی نے مجھے بتا دیا تھا کہ کچھ تھری ڈی افیکٹس کی وجہ سے کمرشل لیٹ ہو جائے گا۔ انہوں نے مجھے منہ مانگا معاوضہ دیا ہے۔"

"وہ معاوضہ تم مجھ سے لے لو۔"

"بات پیسے کی ہے ہی نہیں صرف...... میری ساکھ۔"

"تو بات کس کی ہے..... صائم کی؟"

"صائم صرف کولیگ ہے۔"

"اور میں......؟"

"تمہاری بات کہاں سے آ گئی؟"

"میری ہی تو بات آئی ہے...... میں جب بھی آتا ہوں تم سو نخرے کرتی ہو۔"

"نخرے..... کون سے نخرے......؟"

"تم مجھے بار، بار یہ جتاتی ہو کہ میرے لیے تم اپنا کام چھوڑ کر آتی ہیں، شوٹنگ کینسل کروائی۔"

"کیا تم مجھے نہیں کہتے کہ تم اپنا بزنس، اپنی اہم بزنس میٹنگز چھوڑ کر آئے ہو؟"

"اوہ کم آن ماہ زیب..... مذاق مت کرو...... میرا کروڑوں کا بزنس ہے۔ یورپ کے دس ملکوں میں لیڈ کرتا ہے میرا بزنس..... اسے اپنی گھٹیا شوٹنگ سے مت ملاؤ۔" اس کی آواز کرخت ہو گئی۔

"دنیا کے بیس ملکوں میں میرے ڈرامے......"

"ہونہہ تمہارے ڈرامے...... پاپا ٹھیک کہہ رہے تھے کہ شوبز کے لوگوں سے دور رہو...... یہ زیرو ہو کر بھی خود کو ہیرو سمجھتے ہیں۔"

"کون ہے زیرو......؟"

"تم خود سمجھدار ہو...... میں تمہارے لیے کینیڈا سے آتا ہوں...... اور تم ان فضولیات کے لیے مجھ سے بہانے بناتی ہو...... تمہیں کیا لگتا ہے ماہ زیب، بھلا تم ہو کون......؟"

"میں ماہ زیب ہوں......" اس نے اطمینان سے ٹیبل پر دونوں ہاتھ رکھ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا...... آس پاس کے چند لوگ اس کی تیز آواز کی وجہ سے ان دونوں کی طرف متوجہ تھے۔

"تو مس ماہ زیب یہ جو آپ چند لاکھ کے ڈراموں میں کام کر کے سمجھتی ہیں کہ دنیا کی شوبز

انڈسٹری آپ کے ہی دم قدم سے قائم ہے تو وقت نکال کر اپنی غلط فہمی دور کرلیں......تم مجھے اس سب سے متاثر نہیں کرسکتیں۔"

"میں نے یہ غلط فہمی پالی ہی نہیں تھی۔ ہاں یہ خوش فہمی ضرور رہی ہے کہ تم آگے بڑھنے میں میرا ساتھ دوگے...... تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں تھا میرے کام کرنے پر......"

"اعتراض نہیں تھا جب تک یہ معلوم نہیں تھا کہ آف کیمرا بھی تم ایک "ہیروئن" ہی ہو۔"

"میں اپنے فیصلے کرنے میں آزاد ہوں...... مجھے ایڈ کے لیے جانا ہے یا نہیں...... اس کا فیصلہ صرف مجھے کرنا ہے...... مجھے یاد ہے اچھی طرح سے کہ میں نے تمہارے ساتھ منگنی کی ہے، ڈیل نہیں کہ جو تم کہو گے میں وہی کروں گی...... ویسے تم نے مجھ سے منگنی کی کیوں......تم نے کہا تھا کہ تم مجھے بہت پسند کرتے ہو؟"

"اور میری پسند کی کوئی ویلیو نہیں ہے تمہارے نزدیک؟"

"ویلیو نہ ہوتی تو منگنی نہ کرتی۔"

"تمہیں تو احسان مند ہونا چاہیے میرا...... تم بیوہ ہو...... تمہاری بارہ سال کی ایک بیٹی ہے...... اور میں سنگل کامیاب بزنس مین...... پاکستان میں تو تمہیں طلاق یافتہ ملتے یا رنڈوے......" اس کا انداز بدترین ہوگیا۔

"یہ عورت ابھی بیوہ نہیں ہوئی ہے۔ جس وقت تم مجھے رنگ پہنا رہے تھے اور خاص کر اس وقت جس وقت تم مجھے کہہ رہے تھے کہ میں تمہاری زندگی کو مکمل کردوں گی...... یہ عورت تب بھی بیوہ ہی تھی۔ اداکارہ تھی، بارہ سالہ بیٹی کی ماں تھی، تم نے کہا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو، اب کیا ہوا؟"

"محبت کرتا ہوں، پاگل نہیں ہوں میں کہ یہ سب برداشت کرتا رہوں۔"

"کیا محبت پاگل پن کا نام نہیں؟"

"جس طرح کی حرکتیں تم کررہی ہو انہیں برداشت کرنا پاگل پن ہے۔"

اس کا وجود ...... ڈیزائنل کی کرسی پر بیٹھا شائیں، شائیں کرنے لگا۔ ماہ زیب نے آنکھ اٹھا کر دیکھا......اور غضب ہوگیا...... وہ فائیو اسٹار ہوٹل کے ہال میں ہر طرف استادہ تھا...... ماہ زیب کو... جھرجھری نے آلیا۔

"تم مجھے ابھی سے طعنے دینے لگے ہو......ابھی سے تمہاری برداشت کی حد ختم ہوگئی ہے۔ میری تذلیل کرنے لگے ہو، ایک انگوٹھی پہنا کر تم مجھ پر حکمرانی کرنے لگے ہو۔"

"حقیقت یہی ہے، تم سوچ لینا، تمہیں میں چاہیے یا دنیا......؟"

"تم کون ہو......؟" ماہ زیب نے بہت نرمی سے پوچھا۔ زمان گنگ رہ گیا۔

"بولو تم ہو کون...... پیسے کے علاوہ تمہارے پاس کیا ہے؟"

"شٹ اپ......!" اس شٹ اپ نے جیسے کوئی مہر لگادی۔ ماہ زیب کئی لمحے اسے دیکھے گئی۔

"میں ایک عورت ہوں زمان، میرے پاس دنیا کی ہر چیز ہے۔ اب مجھے مزید چیزیں تو نہیں چاہیے ہوں گی ناں...... اور تمہارے پاس صرف چیزیں ہیں......تم میرے کسی کام کے نہیں ہو...... مجھے ابھی، ابھی اسی وقت یہ ادراک ہوا ہے کہ مجھے وہ انسان چاہیے جو ماہ زیب کو جانے، ماہ زیب کو سمجھے، جو کم از کم میرے لیے ایک وقت کا کھانا چھوڑ سکے، نہ کہ میری توہین کرے اور مجھے غلط اور جھوٹا ثابت کرتا رہے۔" اس نے انگلی سے انگوٹھی اتار کر میز پر رکھی۔

"ابھی تم مجھے اتنے پیارے نہیں ہوئے کہ

تمہارے لیے میں اتنا سب کچھ برداشت کروں...ہاں ابھی اتنے پیارے نہیں ہوئے۔"

"اچھا تو کون پیارا ہے تمہیں......صائم؟"

"کون، کون، کون..." اس کون کی گونج فضا میں بکھری ماہ زیب جیسے ایک دم سے تیز روشنی کا شکار ہوئی۔ پھپھو نے پی پی کی لمبی تان کھینچی...... کسی کی باتیں یاد آ گئیں۔

"کبھی تو وہ آپ سے ناراض ہوگا...... آپ کو برا ثابت کرے گا، کبھی تو وہ آپ کو یاد کرنا بھول ہی جائے گا۔"

زمان غصے سے اٹھ کر جا رہا تھا۔ انگوٹھی اٹھا کر اس نے غصے سے دور پھینک دی تھی، محبت کی نشانی خاک نشین ہو چکی تھی۔ وہ زمان کی پشت کو گھور رہی تھی۔

"کسی اور کے ساتھ آپ "میں اور تم" ہوں گی لیکن ماہ زیب میں آپ ہی آپ ہوں...... میں ختم ہو چکا ہوں...... میں آپ ہو چکا ہوں۔" وہ لرزی پڑی جا مد بیٹھی تھی۔ اٹھ کر جا ہی نہیں سکی تھی۔

"میں آپ ہو چکا ہوں......" اب وہ پروڈکشن ہاؤس فون کر کے اس کے متعلق جان رہی تھی۔

☆☆☆

وہ اس گھر کی لوکل آبادی سے ذرا دور سڑک پر کار کو پارک کیے کھڑی تھی۔ فون کر کے اس نے اسے وہاں آنے کے لیے کہا تھا۔ وہ کار کی پشت سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ وہ اس کے پاس آیا تو بری طرح ہانپ رہا تھا۔ ماہ زیب نے اسے دیکھا تو دنگ سی رہ گئی وہ کسی موذی بیماری کا مریض نظر آ رہا تھا۔

"تم بیمار ہو......؟" ماہ زیب کی آواز تیز ہو گئی۔

وہ خاموش رہا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟"

اس نے نظریں اٹھا کر ماہ زیب کو دیکھا......

اور ماہ زیب بجھ گئی۔ وہ ماہ زیب کو ایسے دیکھ رہا تھا جیسے اب اس کی سانس بحال ہوئی ہو.....اب اس کی بینائی نے کام کرنا شروع کیا ہو...... زندگی اس کی شریانوں میں اب دوڑی ہو۔

''تم جانتے ہو میں یہاں کیوں آئی ہوں؟''

''نہیں......''

''اس پوری دنیا میں، جس پہلے اور آخری مرد کو میں آزمانا چاہتی ہوں وہ تم ہو.....اب وہ تم ہو۔''

''وہ میں ہوں؟'' وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا۔

''میں تم سے محبت نہیں کرتی، چلے گا.....''

''چلے گا.....'' وہ مسکرانے لگا۔

''ہوسکتا ہے میں صرف تمہیں پسند کروں...... صرف پسند...... چلے گا؟''

''یہ بھی چلے گا.....'' اس کی آنکھوں میں خوشی سے نمی آگئی۔

''ہوسکتا ہے میں تمہیں برداشت نہیں کرسکوں اور اپنی زندگی سے کبھی نکال باہر کروں...... یہ چلے گا؟''

''ضرور چلے گا اگر میں زندہ رہا تو.....'' اس کے سارے وجود پر سیاہی پھیل گئی.....اس کی پلکیں لرزنے لگیں۔

ماہ زیب شدید گھبراہٹ کا شکار ہوئی جیسے اسے لگا اس نے بہت بڑی غلطی کی اس سے یہ بات کہہ کر۔

اسے خدا حافظ کہہ کر وہ جا رہی تھی اور سڑک پر کھڑا وہ اسے دور ہوتے دیکھ رہا تھا...... وہ پشت دکھانے والوں میں سے نہیں تھا۔

ماہ زیب نے اپنے گھر والوں سے پہلے بات کی...... اس کی توقع کے عین مطابق اسے کافی کچھ سننے کو ملا...... پہلے سب نے اس کا مذاق اڑایا پھر اسے پاگل کہنے لگے.....ایک عرصے سے وہ اپنا الگ گھر لے کر رہ رہی تھی۔ وہ احمد کو اپنے ساتھ لے جا کر ماما، پاپا سے ملوالائی...... وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا اس کی کافی بے عزتی کی گئی...... اس نے احمد کے ساتھ اپنی منگنی کا اعلان کردیا تو اس کے خاندان والے چپ سے ہوگئے اگر وہ شادی بھی ایسے ہی کرے گی تو ان کے لیے ایک نئی مصیبت آجائی...... وہ کس، کس کے سوالوں کے جواب دیتے۔

''تم اتنی پاگل ہوجاؤ گی مجھے اندازہ نہیں تھا۔'' پاپا ایک بار پھر اسے سمجھانے گھر آئے تھے۔

''میں جانتی ہوں، میں اس کے ساتھ مطمئن رہوں گی۔''

''زمان کتنی منت کررہا ہے تمہاری...... اپنی ضد چھوڑ دو۔''

''زمان! چانٹا مار کر گال سہلانے والا.....اب ایک اور چانٹا مارنا ہے مجھے؟''

''ہیرے پر کنکر کو ترجیح دے رہی ہو؟''

''میں نے وہ چہرا اتار پھینکا ہے جو زمان نے مجھے دیا تھا۔''

''زمان نہ سہی کسی اور سے......''

''میں نے فیصلہ کرلیا ہے پاپا..... مجھے میرا فیصلہ آزما لینے دیں۔''

''گھاٹے میں رہو گی۔''

''ہمیشہ فائدے میں رہی ہوں، گھاٹے میں رہ کر بھی دیکھ لیتی ہوں۔''

''وہ تمہاری دولت کے لیے.....''

''گھر میرے نام ہے.....بینک اکاؤنٹ بھی.....''

''اس نے کیسے تمہیں اپنے دام میں پھنسالیا.....حیثیت کیا ہے اس کی.....اس کا گھر دیکھا ہے؟ ایک بار جا کر دیکھ تو آؤ۔''

''وہ مجھے لے گیا تھا اپنے گھر والوں سے ملوانے...... سادہ سے لوگ ہیں سبھی۔''

"اتنے ہی سادہ ہیں کہ تمہیں اپنے قابو میں کرلیا۔"

"میں نکاح کرنا چاہتی ہوں..... آپ مان جائیں...... ورنہ دو ہفتے بعد یہ کام ویسے بھی ہو ہی جائے گا۔"

وہ لب بھینچ کر رہ گئے۔

ایک ہفتے بعد ماہ زیب کے آبائی گھر اس کی بہنوں اور ان کے خاندان والوں کی موجودگی میں اس کا نکاح ہو گیا..... وہ لوگ میڈیا پر کوئی تنازع نہیں چاہتے تھے اس لیے اس کا نکاح اپنی موجودگی میں کروایا..... دل جلے صحافیوں نے اس نکاح پر کڑوے کسیلے ریویو لکھے۔ چند ہفتے انڈسٹری میں اسے خوب ڈسکس کیا جاتا رہا..... پھر ماہ زیب کے ساتھ احمد کو دیکھنے کے سب عادی ہو گئے۔

ماہ زیب کے خاندان والے اس سے ناراض تھے اور سب نے ماہ زیب سے ملنا جلنا ترک کر دیا تھا۔ شانزے بھی اپنے نانا، نانی کے گھر تھی اسے اتنا معلوم تھا کہ اس کی ماما نے کسی گندے سے انسان کو اس کا باپ بنا دیا ہے۔ اس کی دوستوں نے بھی اس سے ایسی باتیں کہیں کہ اس نے کئی دن ٹھیک ٹھاک ہنگامہ برپا رکھا..... ماہ زیب نے اسے ہر طرح سے منانا چاہا لیکن وہ نہیں مانی..... پھر اسے اس نے نانا، نانی کے پاس ہی چند ہفتے رہنے دیا...... یہ اور برا ہوا..... اس کے ماموں اور خالاؤں نے اسے مکمل طور پر احمد سے باغی کر دیا۔

احمد نے اسے شادی پر چند لاکھ دیے تھے کہ وہ اپنی مرضی کا زیور بنوا لے...... اس نے اپنے اکاؤنٹ کو اس کے ساتھ جوائنٹ کر لیا تھا۔ وہ لاکھوں نہیں کماتا تھا لیکن جتنے ہزار بھی کماتا تھا وہ لا کر ماہ زیب کو دیتا تھا۔ وہ ماہ زیب کے ساتھ اسی کے گھر میں رہ رہا تھا کیونکہ ماہ زیب اس کے ساتھ اس کے آبائی گھر میں نہیں رہ سکتی تھی۔

وہ اس کے ساتھ اس کی شوبز کی پارٹیز میں نہیں جاتا تھا کیونکہ ماہ زیب کو اب بھی لوگوں کے طنز سننے پڑتے کہ اس نے اپنی عمر سے چند سال چھوٹے اور ایک معمولی سے شخص کے ساتھ شادی کر لی تھی۔

ماہ زیب کو اس معمولی سے انسان نے فی الحال بڑے سکھ میں رکھا ہوا تھا۔ اس سے کوئی پوچھ پڑتال نہیں تھی، وہ کب آتی ہے کب جاتی ہے، وقت پر ڈنر کے لیے کیوں نہیں آتی۔ کوئی اس پر حکم چلا نہیں سکتا تھا۔ احمد صبح جلدی اٹھتا۔ اپنی نگرانی میں گھر کی صفائی کرواتا..... ماہ زیب کے لیے صحت بخش ناشتے کی تیاری مکمل کروا کر آفس چلا جاتا، شام کو گھر آ کر وہ رات کے کھانے کی تیاری دیکھتا..... اور پھر اپنی موٹر سائیکل پر ماہ زیب کے سیٹ پر پہنچ جاتا...... وہ رات کو ایک بجے فارغ ہوتی یا دو بجے وہ سیٹ پر ہی موجود ہوتا...... وہ اسے اسکرپٹ یاد کرواتا...... گھر سے اس کے لیے جو اسنیکس وغیرہ بنوا کر لے گیا ہوتا اسے کھانے کے لیے دیتا رہتا...... سیٹ پر موجود لوگ پہلے اس کا مذاق اڑاتے تھے پھر وہ اس کی عزت کرنے لگے..... ماہ زیب کے ساتھی پہلے اسے طنزیہ اور تمسخرانہ نظروں سے دیکھتے تھے..... پھر وہ جیسے اس کے جذبۂ محبت کے معترف ہونے لگے...... ایک ساتھی اداکارہ جو احمد سے اس کی شادی کے حوالے سے کئی طنز کر چکی تھی ایک دن رشک سے اسے دیکھنے لگی۔

"پہلے مجھے لگا... کرتا تھا کہ تم صرف شہرت کے اعتبار سے خوش قسمت ہو...... تم جس سیریل میں کام کرتی ہو وہ سپر ہٹ ہوتا ہے...... اب مجھے یقین ہونے لگا ہے کہ تم زندگی کے ہر معاملے میں خوش قسمت ترین ہو...... میرا شوہر میری اداکاری کو اپنی جوتی کی نوک پر رکھتا ہے اور رات کے اس وقت وہ مزے سے اپنے بیڈ پر سو رہا ہوگا یہ جانے بغیر کہ اس کی بیوی اس وقت شہر کے کس حصے میں کیا کر رہی

ہے...... اور یہ احمد...... یہ کیسے تمہارے ساتھ رہتا ہے، کیا یہ نہیں تھکتا......؟ کیا اسے نیند نہیں آتی...... کیا اسے آرام پیارا نہیں؟"

ماہ زیب نے کیمرے کے پیچھے کرسی پر بیٹھے احمد کو دیکھا اور اسے احساس ہوا کہ اس کا فیصلہ غلط نہیں تھا۔

اگر وہ تھکی ہوتی تو وہ اس کے پیر بھی دبا دیتا...... نیم گرم پانی کا ٹب لاتا اور اسے پیر ڈبونے کے لیے کہتا...... اپنی نگرانی میں وہ ماہ زیب کے سارے کام خود کرتا بھی اور کرواتا بھی...... اس کی وارڈ روب ٹھیک کرتا...... اس کے جوتے اٹھا کر رکھتا...... جو جیولری وہ آتے ہی اتار کر پھینک دیتی اسے سلیقے سے سمیٹتا...... اس کا تکیہ دیکھتا کہ کیا وہ ہمیشہ کی طرح نرم ہے...... یا اسے تبدیل کیا جانا چاہیے...... اپنی نگرانی میں اس کے لیے کھانے بنواتا۔

ماہ زیب مکمل طور پر گھر سے انجان ہوگئی...... گھر مکمل طور پر احمد نے سنبھال لیا تھا...... ملازموں کے مسائل...... بلز...... گروسری...... سب کچھ۔

ماہ زیب کو کام کرنے کے لیے ایک مکمل فیز مل گیا...... گھر آتے ہی وہ سو جاتی اور جب وہ سوئی ہوتی احمد کسی ملازم کو اس کے کمرے کے باہر سے گزرنے تک نہ دیتا کہ مبادا وہ قدموں کی آہٹ سے اٹھ جائے۔

شانزے گھر آچکی تھی اور وہ اکثر کوئی نہ کوئی ہنگامہ کرتی تھی وہ احمد کو برا بھلا کہتی اس پر چیزیں اٹھا، اٹھا کر پھینکتی...... اس نے کئی بار اس پر گرم دودھ بھی پھینکا اور یہ سب باتیں ماہ زیب کو ملازموں سے معلوم ہوتی تھیں۔

"شانزے بچی ہے احمد وہ سمجھ جائے گی، میں اس کی طرف سے سوری کرتی ہوں تم سے۔"

"وہ میری بھی بیٹی ہے...... تم سوری کر کے یہ ثابت مت کرو کہ وہ صرف تمہاری ہی بیٹی ہے۔"

احمد نے لاکھ طریقے آزمائے لیکن شانزے اسے برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ وہ اسے گندا آدمی کہا کرتی۔ برا بھلا کہتی، وہ سمجھتی تھی کہ وہ ٹھیک کر رہی ہے، ماہ زیب نے اسے کئی بار سمجھایا پھر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

لیکن شانزے نے احمد کی زندگی اجیرن کیے رکھی...... ماہ زیب گھر ہوتی تو وہ کم ہنگامہ کرتی ورنہ بہانے، بہانے سے احمد کو زچ کیے رکھتی۔ اس کے لاکھ شور مچانے پر بھی وہی اسے اسکول ڈراپ کرتا اور لے کر آتا، مرد ملازموں کو سختی سے منع تھا کہ وہ گھر کے اندر نہیں جائیں گے۔ ایک کل وقتی ملازمہ شانزے کے آس پاس ہی رہتی...... شانزے اسے باپ نہیں سمجھتی لیکن وہ اسے بیٹی ہی مانتا تھا۔

ایک سال کے اندر، اندر ماہ زیب کے بہن، بھائی اور والدین کسی نہ کسی طرح احمد سے متاثر ہونے لگے تھے، ان تک احمد کے متعلق اچھی خبریں پہنچی تھیں۔ احمد کے آبائی گھر کے دو بھائیوں اور ایک بہن میں حصے ہوئے تو اس نے اپنے حصے کے چند لاکھ بھی ماہ زیب کو دے دیے۔ شادی کی سالگرہ کے تحفے کے لیے اس نے اوور ٹائم کیا تھا...... اور اس نے ایک بیش قیمت ساڑی اور پرفیوم ماہ زیب کو گفٹ کیا تھا۔

ڈائریکٹرز اور پروڈیوسرز کو اب ماہ زیب کے بجائے احمد سے رابطہ کرنا ہوتا تھا کہ وہ اسے اسکرپٹ بھیج دیتے تھے، گھر آ کر اس سے مل لیتے تھے وہ پوری توجہ سے ان کے پراجیکٹ کے بارے میں سنتا ایک، ایک تفصیل پوچھتا...... اور اگر اسے پراجیکٹ کسی قابل لگتا تو وہ ماہ زیب کو بتا دیتا...... اس کا اس معاملے میں تجربہ اتنا وسیع تھا کہ وہ ماہ زیب کو بتا دیتا کہ وہ کون سا ڈراما کمرشلی بنیاد پر کتنا کامیاب ہوگا اور کون سا صرف ناقدین میں...... آنے والے وقت

میں ماہ زیب صرف اس سے اتنا پوچھتی۔ "کروں یا نہیں.....؟"

وہ کہہ دیتا..... کرلو..... یار سک ہے..... زیادہ پاپولر نہیں ہوگا؟ اور ماہ زیب اس کی رائے کے ساتھ ہی چلتی۔ پروڈیوسرز کو صرف احمد کو قائل کرنا ہوتا۔

احمد کو اس کے ہر پراجیکٹ کی ہر تفصیل ازبر ہوتی، تاریخیں یاد رہتیں، وہ اخبارات، میگزینز میں اس پر آنے والی خبریں اور تبصرے کاٹ، کاٹ کران کا البم بناتا رہتا اور فارغ وقت میں انہیں لے کر بیٹھ جاتا..... وہ ماہ زیب سے ملنے آنے والے صحافیوں، انڈسٹری کے دوسرے لوگوں کی باکمال میزبانی کرتا..... اس نے ماہ زیب کی زندگی اتنی سہل بنادی کہ ماہ زیب کو لگتا وہ صرف دنیا میں راج کرنے آئی ہے بنا کسی دقت کے۔

اس کے ماں، باپ، بہن، بھائی گھر آتے تھے، وہ احمد کو پسند کرنے لگے تھے۔ ماہ زیب کے پاپا نے چاہا کہ احمد کو کوئی کاروبار کروادیں یا کسی اچھی پوسٹ پر کسی کمپنی میں رکھوادیں لیکن اس نے انکار کردیا۔

جویریہ کے شوہر نے اس بڑھاپے میں بھی دوسری شادی کرلی تھی اور وہ ماہ زیب کو بتائی تھی کہ زندگی میں ایک وفادار انسان کی ضرورت کس قدر شدید ہے۔

ماہ زیب کو ہنسی آتی تھی جب وہ ساتھی اداکاروں کے شوہروں کے افیئرز کی خبریں پڑھتی۔۔۔ اسے ایسا کوئی ڈر تھا نہ تشویش..... احمد نہ اس کی دولت کے پیچھے تھا نہ اس کی شہرت کے..... اس کی دولت کا وہ رکھوالا تھا اور شہرت پر خوش..... اپنے اخراجات وہ خود پورے کرتا تھا..... اپنے آفس بھی وہ اپنی موٹر سائیکل پر ہی جاتا تھا۔ ماہ زیب نے اسے اس کی سالگرہ پر کار گفٹ کی تھی پر وہ گھر کے پورچ میں ہی کھڑی تھی اور مہینے میں ایک، دوبار جب وہ ڈنر کے لیے جاتے وہ اسے تب ڈرائیو کرتا۔

اس کے بارے میں سوچے گئے سب خیالات غلط نکلے..... کیے گئے سب دعوے جھوٹے نکلے..... اسے صرف ماہ زیب چاہیے تھی..... اور اس کے ساتھ گزاری جانے والی وہ زندگی چاہیے تھی جو اسے مل گئی۔ اب بھی اگر وہ چیزوں سے جیب بھرتا تو خالی دل رہ جاتا۔

☆☆☆

اے لیول کے بعد شانزے امریکا چلی گئی مزید تعلیم حاصل کرنے..... اس دوران میں ان کی زندگی ذرا زیادہ پرسکون ہوگئی۔ احمد کی پروموشن ہوگئی تھی اور اس کی پے بڑھ گئی۔

ماہ زیب نے تین آرٹ موویز بھی کرلیں جس پر اس کی شہرت ملک سے باہر جا پہنچی..... وہ پہلے سے زیادہ مصروف ہوگئی۔ اس کے غیر ملکی دورے بڑھ گئے..... جب وہ بیرونِ ملک جاتی احمد کی جیسے مٹھی میں جان رہتی۔ اسے یہی فکر ستائے رکھتی کہ وہاں اس کا خیال کون رکھے گا۔ وہ اس کا سامان پیک کرتا اور اس کا وہ تکیہ ضرور سامان میں رکھتا جس کے بغیر اس کا سر دُکھنے لگتا تھا۔

ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ ملک سے باہر ہو اور اس نے اسے فون کرکے کہا ہو کہ اس کی فلاں چیز تو سامان میں آئی ہی نہیں۔

وہ اکثر اسے ساتھ چلنے کے لیے کہتی تھی پر وہ صرف اپنے خرچ پر جانا چاہتا تھا اور اپنے خرچ پر وہ صرف دوبار اس کے ساتھ دبئی جاسکا تھا۔

وہ ایک باکمال شخص تھا۔

وہ ایک شاندار ساتھی تھا۔

مہینے میں ایک دن ماہ زیب کے سب گھر والے ان کے ساتھ ڈنر کرتے اور احمد کے گھر والے بھی آجاتے..... وہ ایک اچھا میزبان تھا اور سب کو

خوش رکھنا جانتا تھا۔

اتنے سارے خوش باش افراد میں صرف شانزے ہی تھی جو اب بھی ویسی ہی تھی...... وہ جب، جب پاکستان آتی احمد کی زندگی جہنم بنا دیتی۔

شانزے نے اپنے کلاس فیلو افراسیاب سے منگنی کر لی تھی۔ اور عین منگنی کے فنکشن کے دوران اس نے ہزاروں افراد کی موجودگی میں احمد کو وہاں سے چلے جانے کے لیے کہا...... وہ خاموشی سے چلا گیا اور جب اگلے دن آیا تو جیسے بھول ہی چکا تھا کہ کل رات کچھ ہوا تھا۔ پھر شانزے تعلیم سے فارغ ہو کر آ گئی اور اس کی شادی کی تیاریاں کی جانے لگیں...... اور اس کے ساتھ ہی آئے دن نئے سے نئے واقعات ہوتے۔

"آپ کے شوہر نے مجھ پر چائے گرا دی ہے......" ایک دن وہ اس کے پاس اپنا جلا ہوا ہاتھ لے کر آئی۔

"تم ایسی بچگانہ حرکتوں پر بھی اتر آئی ہو۔"

"یہی کہا تھا... مسٹر احمد نے...... کہ کوئی میری بات کا یقین نہیں کرے گا...اور دیکھیں ایسا ہی ہوا ہے...... انہوں نے مجھے جلا دیا۔" وہ رونے لگی۔

اگلی بار وہ پھر آئی اس نے کہا کہ "احمد نے اس کا گلا دبانے کی کوشش کی تھی۔" شانزے... پھر بری طرح سے رو رہی تھی اور یہی کہہ رہی تھی کہ وہ جانتی ہے اس کی بات کا یقین نہیں کیا جائے گا اسی لیے وہ یہ سب کر رہا ہے۔

اگلی بار اس نے کہا کہ احمد نے اسے سیڑھیوں سے دھکا دیا ہے...... گھر کے ملازموں نے اسے سیڑھیوں کے پاس بے ہوش گرے پڑے دیکھا تھا اور اس کی پیشانی سے خون نکل رہا تھا جبکہ احمد گھر کی مرمت کا تھوڑا بہت کام کروا رہا تھا۔

افراسیاب کو خبر ہوئی تو اس نے احمد کا آ کر گریبان پکڑ لیا...... شانزے بار، بار ہوش میں آتی اور بے ہوش ہو جاتی...... اس کی حالت تشویش ناک تھی...... وہ کومے میں تھی، سر پر گہری چوٹ آئی تھی۔

"سچ بتاؤ احمد یہ سب تم نے کیا ہے؟"

احمد دنگ اسے دیکھے گیا۔

"ماہ زیب تم ایسا سوچ بھی کیسے سکتی ہو؟"

"انسان کا کیا اعتبار ہے احمد، وہ کبھی بھی بدل سکتا ہے۔"

"میں عام انسان نہیں، احمد ہوں...... تمہارا شوہر، شانزے کا باپ......"

"نہ وہ تمہیں اپنا باپ سمجھتی ہے، نہ تم اس کے باپ ہو۔"

"اور تم...... تم کیا سمجھتی ہو؟" اسے ایک شاک لگا۔

"میں صرف اتنا جانتی ہوں احمد کہ اگر تم اس سے غصہ یا اس کی حرکتوں سے نالاں ہو تو ایسے...... دیکھو وہ کیسے مر مر کر بچی ہے۔"

وہ ایسے سُن سا ہو گیا جیسے اس میں کبھی زندگی دوڑی ہی نہیں تھی۔

"کیا میں ایسا کر سکتا ہوں؟"

"دیکھو میں جانتی ہوں کہ شانزے نے ہمیشہ تمہیں پریشان کیا اور تم نے اسے برداشت کیا...... بلکہ اگنور کیا......"

"ماہ زیب تم یہ سب چھوڑ دو...... تم یہ بتاؤ کیا میں یہ سب کر سکتا ہوں؟"

"غصے میں انسان شاید......"

"غصے میں، میں اسے نقصان پہنچا سکتا ہوں...... میں......؟"

"اس کے سر پر چوٹ آئی ہے، اس کا خون نکلا ہے...... وہ خود سے تو اپنے آپ کو نہیں گرا سکتی ناں...... اس میں میری جان ہے احمد...... وہ نشانی ہے میرے پاس حارب کی...... تم ایسا کیسے کر سکتے ہو

اس کے ساتھ......" ماہ زیب بولتی رہی اور وہ کھڑا سنتا رہا۔

"ہاں میں نے ہی اسے گرایا تھا ماہ زیب۔" یہ آخری بات اس نے کی اور وہ چلا گیا...... بارہ سالوں میں پہلی بار اس نے گھر سے باہر رات گزاری..... ماہ زیب پھر سے شانزے کے پاس گئی اس سے پوچھا..... اس کا بھی کہنا تھا کہ احمد نے ہی اسے دھکا دیا تھا۔ وہ رو، رو کر یہی کہتی رہی کہ احمد اسے مار ڈالے گا۔

ایک ہفتے کے اندر، اندر احمد نے اسے اپنے باہر جانے کا عندیہ دے دیا۔ اس کا پروڈکشن ہاؤس اسے کافی عرصے سے چند کورسز کے لیے لندن بھیجنا چاہ رہا تھا لیکن وہ نہیں گیا تھا اور اب وہ جا رہا تھا۔ وہ جا رہا تھا۔

ایک سرد سی لہر ماہ زیب کے اندر دوڑ گئی۔

"تو یہ بھی جا رہا ہے..... اتنا کچھ کر کے..... خود ہی جا رہا ہے......"

وہ اچھا ل گیا..... اس نے شانزے سے معافی مانگی تھی۔ شانزے نے چیخنا، چلانا شروع کر دیا تھا۔ وہ خاموشی سے واپس پلٹ گیا اور ایک ہفتے بعد وہ چلا گیا۔

شانزے گھر آئی اپنی شادی کی تیاریاں کرنے لگی۔

احمد روز ماہ زیب کو فون کرتا...... لیکن ماہ زیب اتنی سرد مہر ہوتی ہو گئی کہ احمد کو اپنی فون کالز کے دورانیے کم کرنے پڑتے۔

ماہ زیب جو اب تک اپنی پوجا کرواتی رہی تھی کی انا کو ٹھیس لگی تھی۔ کوئی اسے پشت دکھا کر کیسے جا سکتا ہے۔

وہ جو کہتا ہے کہ وہ تمہارے بغیر مر جائے گا...... پھر بھی وہ زندہ ہے، پھر وہ مرتا کیوں نہیں......؟ مر کر دکھائے ناں......

عید پر گرنا

روپیہ چاہے کتنا ہی گر جائے مگر اتنا نہیں گر سکتا جتنا کہ ایک انسان اندھا دھند حاصل کرنے کے لیے گر جاتا ہے اور عید کے موقع پر زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے کے لیے کتنے لوگ کہاں تک گر جاتے ہیں اس کا انہیں شاید اندازہ تک نہیں ہوتا۔

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

کٹھا میٹھا

بیوی۔ "آج کوئی ایسی بات کہو کہ میں خوش بھی ہو جاؤں اور جل بھی جاؤں۔"

شوہر۔ "تم میری زندگی ہو اور......"

بیوی۔ "اور...... اور کیا؟"

شوہر۔ "اور لعنت ہے ایسی زندگی پر۔"

التجا

اے خوش رہنے والے لوگو!
خوشیوں کی سوغات سے ہم کو
تھوڑا سا کچھ دان کرو گے

مرسلہ: ارم کمال، فیصل آباد

عید آئی ہے

ہاتھوں میں مہندی
ماتھے پہ بندیا لگائی ہے
سنو سکھی عید آئی ہے
بڑھی ہے آنکھوں کی نمی میری
اور یاد بھی کسی کی آئی ہے
سنو سکھی عید آئی ہے

شاعرہ: ثنا اجالا، بھلوال

عورت کے لبادے میں چھپے سنگدل دیوتا نے سوچا کہ اگر بھینٹ جان کی تھی تو یہ بھینٹ دی کیوں نہیں جاتی..... دی کیوں نہیں گئی اب تک۔ وہ عورت جس سے محبت ہی کی گئی تھی اور بے تحاشا کی گئی تھی، جس کے پیچھے بھاگا گیا تھا..... جس کی منت کی گئی تھی۔ اس عورت کو اب یہ گوارا نہیں تھا کہ اسے چھوڑ دیا جائے۔

کوئی منت..... کوئی سماجت نہیں..... وہ ہاتھ جوڑے بنا..... پیچھے بھاگے بنا کیسے چلا گیا۔

محبت کے حاصل جمع پر وہ لکیر کیوں پھیر گیا؟

بہت کیوں اور کیسے تھے ماہ زیب کے اندر..... اس نے اس شخص کو جو اس کے بغیر رہتا نہیں جانتا تھا کو اپنے بغیر رہنے کی سزا دی..... اس نے اس کے فون سننے بند کر دیے۔

وہ پھر بھی فون کرتا رہا..... وہ اس کے ماں، باپ سے اس کا حال احوال پوچھتا رہا..... گھر کے ملازموں کو ہدایات دیتا رہا..... باہر بیٹھ کر بھی اس نے گھر سنبھالا ہوا تھا..... ماہ زیب اسے ناپسند کرنے لگی..... اسے سمجھ نہیں آتی تھی کہ اب وہ اسے پسند کیونکر کرے۔

اتنے سال وہ اس سے محبت کرتا رہا تھا۔ ماہ زیب نہیں..... ایک رائٹ پرسن کو زندگی میں لا کر اس نے اپنی زندگی رائٹ بنالی تھی..... اسے عادت ہو گئی تھی ''خالص محبت.....'' وصول کرنے کی..... صرف وصول کرنے کی..... وہ اس دیس کی باسی تھی جہاں دونوں ہاتھ لینے کے لیے پھیلائے جاتے ہیں..... وہ بھی دان دینے کے لیے نہیں اٹھتے۔

احمد ایک سال اس سے دور رہا..... اس کے کورسز ختم ہونے میں نہیں آرہے تھے..... ماہ زیب نے پلٹ کر اسے ایک فون کال نہ کی کہ آجاؤ۔

''مجھے اب بھی یقین ہے کہ شانزے جھوٹ بول رہی تھی۔'' اس کے پاپا اس سے کہتے۔

''دو مہینے اسپتال رہی ہے وہ..... تین بار کومہ میں گئی ہے..... کیسے جھوٹ بول سکتی ہے۔''

''ہوسکتا ہے وہ خودکشی ہو..... الزام احمد پر لگا دیا ہو۔''

''احمد کو اس پر غصہ بھی ہوسکتا ہے، آپ یہ کیوں نہیں سوچتے.....؟''

''احمد کے بارے میں، میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''اسی لیے اس نے ایسا کیا کہ کوئی بھی اس کے بارے میں ایسا نہیں سوچ سکے گا..... اور اس نے اپنے منہ سے اعتراف بھی کرلیا تھا۔''

''میں اندازہ کرسکتا ہوں اس نے کیوں اعتراف کیا..... ہمیشہ تمہیں ٹھیک کہنے والے نے تمہیں غلط کہنا مناسب نہیں سمجھا..... قتل کا الزام بھی تم لگاتیں تو وہ اعتراف کرلیتا۔''

اس کی امریکا میں شوٹنگ تھی اور وہ شانزے کے پاس ٹھہری ہوئی تھی۔ شوٹنگ نیویارک میں تھی اور شانزے کیلی فورنیا..... وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر ہی اس کی طرف رہنے آگئی۔

وہ آئی تو اسے معلوم ہوا کہ افراسیاب ملک سے باہر ہے۔ شانزے کو اس حالت میں چھوڑ کر وہ کیسے جاسکتا ہے۔

''وہ جانا نہیں چاہ رہا تھا لیکن میں نے ہی کہا تھا کہ چلے جاؤ۔'' وہ شرمندہ سی بولی۔

''یہ تم نے غلط کیا..... اور تم نے کہہ بھی دیا تھا تو اسے جانا نہیں چاہیے تھا۔ اسے احساس ہونا چاہیے کہ تم اس حالت میں اکیلی نہیں رہ سکتیں۔ اور تم نے مجھے بھی نہیں بتایا کہ افراسیاب ایسا مصروف ہے میں اپنا کنٹریکٹ نہ سائن کرتی اور تمہارے پاس آجاتی۔''

شانزے خاموش رہی..... اگلے دو دن وہ

ایسے ہی خاموش، خاموش سی رہی..... پہلے سی شانزے کہیں کھوگئی۔

"افراسیاب کا فون کب آتا ہے؟"

"وہ رات میں کرتا ہے مجھے......"

"رات میں کس وقت.....؟"

"کل رات بھی آیا تھا آپ سو رہی تھیں۔"

"تم جھوٹ بول رہی ہو..... مجھے بتاؤ کیا ہوا ہے.....تم دونوں میں لڑائی ہوئی ہے کیا.....؟"

"نہیں.....ہم میں کبھی لڑائی نہیں ہوئی۔"

"اس نے مجھے کبھی فون نہیں کیا، نہ ہی میرا فون اٹھا رہا ہے۔"

"ماما وہ بزی ہوتا ہے۔"

"اس کے گھر والے بھی تو اسی شہر میں ہوتے ہیں، وہ ان میں سے کسی ایک کو تمہارے پاس کیوں نہیں چھوڑ گیا..... میں تو مطمئن تھی کہ تمہاری ساری سسرال یہاں ہے.....اور تم یوں اکیلی..... اگر کوئی اختلاف ہے تمہارے درمیان تو بتاؤ..... میں بات کرتی ہوں افراسیاب سے۔"

"کوئی اختلاف نہیں ہے ہمارے درمیان وہ مجھے بہت پیار کرتا ہے، میرا بہت خیال رکھتا ہے بالکل مسٹر احمد کی طرح....."

ماہ زیب شاکڈ سی ہوئی، اپنی بیٹی کا منہ دیکھنے لگی.....اس نے احمد کا نام لیا تھا..... وہ احمد کی خوبی بیان کر رہی تھی۔ اور پھر وہ ہاتھوں میں منہ رکھ کر رونے لگی.....روتی ہی رہی.....

"ماما! میری قسمت آپ جیسی کیوں نہیں...... میرا مسٹر آپ کے مسٹر جیسا کیوں نہیں......" وہ ایک دم چیخی۔

ماہ زیب کے وجود پر جیسے گرم، گرم سیال گرا۔

"میں نے افراسیاب کا انتخاب کیا تھا...... صرف اس لیے کہ وہ آپ کے شوہر کی طرح لگتا تھا مجھے...... خیال رکھنے والا...... محبت کرنے والا..... اختلاف رکھتے ہوئے بھی تکرار نہ کرنے والا...... ٹھیک ہو کر بھی خود کو غلط مان لینے والا...... میرا مسٹر آپ کے مسٹر جیسا کیوں نہیں۔ وہ شادی سے پہلے تو مسٹر احمد جیسا تھا، شادی کے بعد وہ مسٹر احمد جیسا کیوں نہیں رہا۔" وہ رو رہی تھی اس کا زیاں ہوا تھا، کیوں نہ روتی.....گرم سیال نے دیوی کا بت توڑ ڈالا..... اندر ایک دل دھڑکنے لگا...... وہ ششدر اپنی بیٹی کو دیکھے گئی۔ اس کی بیٹی کا آئیڈیل احمد تھا.....اسے احمد جیسے مرد چاہیے تھا۔

"ٹھیک ہو کر بھی خود کو غلط مان لینے والا۔"

"میں پورے ایک مہینے سے یہاں اکیلی ہوں ماما.....سارے کام کرتی ہوں..... مارکیٹ جاتی ہوں..... مجھے اس حالت میں چھوڑ کر افراسیاب آسٹریلیا چلا گیا، اس کے گھر والے بھی ناراض ہیں، کہتے ہیں میں افراسیاب کا خیال نہیں رکھتی..... ماما یہ دیکھیے میرے پیر..... یہ بہت درد کرتے ہیں..... یاد ہے مسٹر احمد آپ کے پیروں کا مساج کیا کرتے تھے.....اور وہ آپ کا تکیہ جو وہ ہمیشہ باہر کے ٹورز میں آپ کے سامان میں پیک کیا کرتے تھے۔ ماما میں نے ایک رات افراسیاب کو اٹھا کر کہا کہ وہ دوسرے بیڈروم سے مجھے دو تکیے لا دیں۔ میری کمر میں درد ہے۔ میں انہیں کمر کے پیچھے رکھنا چاہتی ہوں تو جانتی ہیں اس نے کیا کہا..... اس نے کہا میں اپنی ہائے ہائے سے اسے ڈسٹرب کر رہی ہوں اور میں دوسرے بیڈ روم میں جا کر سوؤں......" وہ بلک رہی تھی۔

"ماما! میں ساری، ساری رات جاگتی رہتی تھی، مجھے متلی ہوتی تھی اور افراسیاب مزے سے سوتا رہتا تھا۔ وہ اٹھ کر مجھے ایک گلاس پانی تک نہیں پلاتا تھا..... الٹا وہ مجھ پر آ کر چلاتا تھا کہ میں نے کھانا کیوں نہیں پکایا..... بیڈ روم ٹھیک سے صاف کیوں نہیں کیا۔ ماما اس نے مجھے دھوکا دیا...... وہ جھوٹا

ہے۔ اس کے سارے وعدے جھوٹے نکلے...... وہ مسٹر احمد جیسا بالکل نہیں ہے۔ میں نے اس کی منت کی کہ وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر نہ جائے تو وہ بھڑک اٹھا...... وہ بلاوجہ بات، بات پر بھڑک اٹھتا ہے۔ ہفتوں ناراض رہتا ہے...... ہر بار میں ہی اسے مناتی ہوں...... میں اسے آسٹریلیا فون کرتی ہوں اور وہ فون ہی نہیں اٹھاتا...... ماما، میری قسمت آپ جیسی کیوں نہیں...... آپ میں ایسا کیا ہے کہ آپ کو مسٹر احمد ملے...... مجھ میں کیا کمی ہے کہ مجھے افراسیاب ملا......؟"

ماہ زیب کو سمجھ آ گئی تھی کہ شانزے اتنی کمزور کیوں ہو گئی تھی۔ اس کی آنکھیں اندر ہی اندر کیوں گڑتی جا رہی تھیں...... شانزے احمد کو سوتیلے باپ کی حیثیت سے سخت ناپسند کرتی تھی لیکن اپنی ماں کے شوہر کی حیثیت سے وہ اسے ہی آئیڈیالائز کرتی تھی...... وہ احمد جیسے شوہر کو ڈھونڈتی رہی اور...... ماہ زیب نے خود اسے اپنے ہاتھوں کھو دیا۔

"مجھے آپ کے مسٹر کی بددعا لگ گئی ہے۔ ہاں انہی کی لگی ہے۔"

"وہ تم سے بہت پیار کرتے ہیں شانزے۔"

"لیکن میں نے ان کے ساتھ کیا، کیا...... میں نے بہت ہمت کی کہ آپ کو فون کر کے بتا دوں لیکن ماما...... میرے جیسی لڑکیاں اگر جلد شرمندہ ہو بھی جائیں تو اعتراف نہیں کرتیں...... میرے جیسی ہائی، فائی لڑکیاں دنیا کو اپنی ٹھوکروں پر رکھنے والی غلطی کا اعتراف اسٹیٹس دیکھ کر کرتی ہیں...... سیڑھیوں سے میرا پیر پھسل گیا تھا اور ہوش میں آتے ہی میں نے آپ کے مسٹر کا نام لے دیا تھا۔ انہوں نے مجھے کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا...... میں اندر ہی اندر ان سے بہت حسد کرتی تھی اور آپ سے بھی...... میں چاہتی تھی کہ آپ الگ ہو جائیں......"

اب ماہ زیب، شانزے کی شکل دیکھنے لگی۔ اس کی بیٹی احمد جیسا نہ ملنے پر ٹوٹ گئی تھی، رو رہی تھی اور وہ احمد کو کھو کر سسک رہی تھی۔

ماہ زیب کے دل میں ٹیس کی ایک تیز لہر اٹھی...... اتنے سالوں میں اس نے احمد کو صرف پسند کیا تھا جیسے کسی اچھے وفادار ملازم کو کیا جاتا ہے، وہی ملازم کہیں دور چلا جائے تو اسے یاد بھی کیا جاتا ہے تو صرف کام کے لیے وفاداری کے لیے اور بس......

بیٹھے، بیٹھے ماہ زیب چُور چُور ہو کر زمیں بوس ہو گئی۔

"یہ پریم ریت ہے...... خالی پلٹ آنے پر یہ صدائیں امر ہوتے لگتی ہیں...... پیا من کا دیا پریم روگ...... کی لو دینے لگتا ہے۔

پی پیا...... پیا پیا......

ماہ زیب کھڑکی کے پاس رات کے آخری پہر کھڑی تھی اب وہ داسی بنی ہے...... اب اس نے اپنا بت توڑا ہے۔ اب اس کا وجود وہ بانسری بنا ہے جو پیا، پیا کے سُر بکھیرتا ہے۔ صبح ہوتے ہی اس نے شانزے کو آگاہ کیا۔

"میں لندن جا رہی ہوں...... احمد کو ساتھ لے کر آؤں گی۔" اور جب رات اس نے احمد کے فلیٹ کے دروازے پر دستک دی اور احمد باہر آیا تو اس نے دیکھا کہ وہ تو برسوں کا مریض ہے جسے وہ دیکھ رہی ہے وہ اس کا احمد تو نہیں......

اس پر نظر پڑتے ہی احمد کے وجود میں دم توڑتے پیچھی پیا نام کے دیے جل اٹھے۔

"تم آ گئیں......؟" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"ہاں...... اب بھی نہ آتی تو مر جاتی......" وہ رونے لگی تھی۔

تجدیدِ محبت

شائستہ عزیز



ذکا نے چندھیائی آنکھوں سے موبائل میں وقت دیکھا.....رات کے دو بجنے والے تھے۔ اسے بہت زوروں کی نیند آرہی تھی۔ جمائیاں لے، لے کر اس کا برا حال تھا مگر اس کی نظریں موبائل پر جمی ہوئی تھیں۔ اسے دو بجنے کا انتظار تھا۔

جونہی دو بجے، موبائل کی لائٹ آن ہوئی، اس کی آنکھوں سے نیند ہوا ہوگئی۔ وہ پوری طرح اس طرف متوجہ ہوگیا۔

"سو تو نہیں گئے تھے؟" دوسری طرف سے وہ پوچھ رہی تھی، روزانہ کا سوال...... اس نے بھی روز والا ہی جواب دیا۔

"نہیں...... تو...... تمہارے میسج کا انتظار کر رہا تھا۔"

"تمہاری بیوی بے خبر سو رہی ہوگی تم پر اندھا اعتماد کر کے...... کیوں......؟" وہ تھوڑا شوخ ہوئی۔

"ہاں، بیوی جو ہے۔" اس نے بھی نپا تلا جواب دیا۔

"آج کا دن کیسا گزرا......؟ اچھا...... برا یا بہت برا......؟" وہ یہ سوال بھی روز ضرور پوچھتی تھی۔

"آہ...... کیسا گزرنا ہے غریب مزدور کا دن...... وہ ہی روکھا پھیکا، بے مزہ...... بیوی کی طرح......" اس کے جواب پر وہ دل کھول کر ہنسی۔

"ہا...... ہا...... ہا کبھی کبھی تم پورے شوہر لگتے ہو، مسکین، معصوم اور بے زبان۔ اچھا یہ بتاؤ صبح آفس کیا پہن کر جاؤ گے؟" آج کا سوال نیا تھا۔

ذکا کی انگلیاں تیزی سے چلنے لگیں۔

"مزدور شوہر کے پاس وہی تین چار جوڑے ہیں، ان میں سے ہی کوئی پہن جاؤں گا۔ میں نے کون سا محبوبہ سے ملنے جانا ہے جو بن سنور کر جاؤں گا۔"

"تمہارے پاس کوئی ریڈ (سرخ) ٹی شرٹ ہے؟ کل وہ پہن کر جاؤ، ہو سکے تو جاگرز بھی پہن لینا اور ہاں پرفیوم لگانا نہیں بھولنا۔ زندگی میں کچھ تو بدلاؤ آئے۔" ذکا نے جلدی سے جواب لکھا۔

"دیکھوں گا رضا کی اگر کوئی ٹی شرٹ ہوئی تو...... اب تو ہم دونوں کے برابر کپڑے آتے ہیں۔ مگر میرے بننے سنورنے سے تمہارا کیا فائدہ ہوگا؟ کون سا تم مجھے دیکھ سکتی ہو؟"

"میں دیکھ نہیں سکتی مگر جب تمہارے اندر تبدیلی آئے گی تو تمہاری تحریر میں بھی یہ رنگ نمایاں ہوگا اور میں تمہیں خوش باش، مطمئن، زندگی سے بھرپور مرد دیکھنا چاہتی ہوں۔ اچھا شب بخیر...... میرا شوہر کروٹیں بدل رہا ہے۔" اس نے جلدی سے لکھ کر موبائل آف کر دیا۔

ذکا دیکھتا ہی رہ گیا۔ یہ اس کی روز کی کہانی ہو چکی تھی۔ اس نے مڑ کر اپنے برابر میں سوئی زہرا کو دیکھا وہ نیند میں کسمسا رہی تھی۔ اسے بھی زوروں کی نیند آ رہی تھی، اس نے چادر منہ تک تان لی۔

اس کے ذہن میں ایک ہی بات چل رہی تھی۔ "صبح ریڈ شرٹ پہن کر جانا ہے۔"

☆☆☆

صبح وہ الماری کے آگے کھڑا سارے کپڑے الٹ پلٹ کر کے دیکھ رہا تھا مگر مجال ہے جو کوئی شوخ رنگوں کی یا سرخ شرٹ برآمد ہو جاتی۔

زہرا چائے لے کر کمرے میں داخل ہوئی اور اسے یوں سارے الماری کے کپڑے گرائے کھڑا دیکھ کر حیران سی ہوئی۔

"یہ کیا صبح، صبح دھوبی بنے کھڑے ہو، اب دفتر سے دیر نہیں ہو رہی؟" کمر پہ ہاتھ رکھ کر تنقیدی انداز سے میاں کو گھورتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"تین دن سے ایک ہی جوڑا پہن رہا ہوں، کیا مجال ہے جو کوئی ڈھنگ کے کپڑے میرے پاس ہوں۔ سارے ہی بد رنگ، بد وضع سالوں پرانے کپڑے، لال رنگ کی کوئی شرٹ نہیں ہے کیا؟"

"لال رنگ؟ کیا شہ بالا بننے جا رہے ہو؟" زہرا کی آنکھیں حیرت سے پھٹیں۔

"افوہ...... تم سے تو بات کرنا بھی فضول ہے، دیکھو اگر رضا کی کوئی ٹی شرٹ ہو تو لے کر آؤ، آج میرا موڈ ہے ذرا چینج کرنے کا...... ریڈ نہ ہو تو پنک لے آؤ اور ہاں اس کے جوگرز بھی لیتی آنا، میرے

صبح آئی ہیں اس کی چتریں......'' زہرا حیرت وا ...... سے اسے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ جھنجلا کر بولا۔

''اتنا گھور کر مت دیکھو پگھل جاؤ گی، جاؤ جو کہہ رہا ہوں کرو جا کر، دیر ہو رہی ہے۔'' زہرا مرے، مرے قدموں سے باہر نکل آئی، اب اسے رضا کی الماری کھنگالنی تھی۔

☆☆☆

ذکا نک سک سے تیار ہو کر آخر میں پرفیوم اسپرے کر کے اپنی تصویر موبائل سے اتار رہا تھا تو زہرا کے تن بدن میں گویا آگ سی لگنے لگی۔

''کسے دکھانے کو یہ سب بناؤ سنگار ہو رہا ہے؟'' اس کی آواز میں شعلوں کی سی لپک تھی۔ ذکا نے موبائل بند کر کے دل جلانے والی مسکراہٹ سجا کر جواب دیا۔

''اپنے دل کی تسلی کے لیے، اپنے روٹھے دل کو منانے کے لیے سب کر رہا ہوں۔ تمہیں کیا اعتراض ہے؟''

''اس ریڈ ٹی شرٹ میں بالکل بندر لگ رہے ہو، ہونہہ۔ بڑھی گھوڑی لال لگام۔ بیٹا جوان ہو گیا ہے اور باپ کو اس عمر میں دل کو منانے کی سوجھ رہی ہے۔ ارے کچھ تو شرم کرو، باہر اس حلیے سے نکلو گے تو لوگ کیا کہیں گے، سب ہنسیں گے تم پر......'' زہرا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ نوچ، نوچ کر اس کا حلیہ بگاڑ دیتی۔

''ہا......ہا......'' اس نے جاندار قہقہہ لگایا۔ زہرا کے قریب آ کر اس کی ٹھوڑی چھو کر اس نے کہا۔ ''ہم چلے، دشمن جلے۔'' اور گنگناتا ہوا باہر نکل گیا۔

زہرا ابھی تک اپنی جگہ بت بنی کھڑی تھی۔

☆☆☆

آفس میں اسے دیکھ کر سب حیران تھے۔ سب نے اس کی اس تبدیلی کو سراہا۔

''بہت ہینڈسم اور بہت ڈیشنگ لگ رہے ہیں ذکا صاحب آج تو آپ۔ کسی پری کا دل آ گیا تو کیا ہوگا؟'' اس کی کولیگ ثروت نے اسے چھیڑا تو گویا اس کا سیروں خون بڑھ گیا۔

''کیا بات ہے ذکا اتنی زبردست تبدیلی؟ بھابی سے زیادہ بن رہی ہے کیا آج کل......؟'' جس کے جو دل میں آ رہا تھا کہہ رہا تھا۔ وہ بھی دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا۔ زہرا تو جلتی ہے مجھ سے، بھلا میں بندر لگ سکتا ہوں؟

''تھینک یو نسرین، آج کا یہ خوب صورت دن تمہارے نام......'' اس نے دل ہی دل میں نسرین کا ڈھیروں شکریہ ادا کر دیا۔

☆☆☆

گرمی سے بدحال زہرا بار بار پسینہ پونچھ کر گرمی اور لوڈشیڈنگ کو دہائی دے رہی تھی۔ صبح سے وہ تین مرتبہ نہا چکی تھی مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔

دس مرتبہ کے پہنے گھسے گھسائے کپڑوں میں تھوڑا سا سکون مل رہا تھا۔ پورے جسم پر پرکلی ہیٹ پاؤڈر مل کر وہ دودھ پانی میں سیون اپ ملا کر پی رہی تھی کہ ذکا گھر میں داخل ہوا۔ زہرا منہ سے لے کر ہاتھ پیروں تک سفید ہو رہی تھی۔

''خدا کی قسم بالکل پانڈا لگ رہی ہو۔'' اس نے زہرا کو چھیڑا۔ وہ ابھی تک خاصے خوشگوار موڈ میں تھا۔

''کچھ بھی لگوں...... بندر تو نہیں لگ رہی؟ صبح سے رات تک چولہے کے آگے کام کرو تو پتا چلے کہ کون پانڈا ہے اور کون لنگور......؟ اور یہ تم اتنے چہک کیوں رہے ہو؟ ساری دنیا تو گرمی سے بولائی پھر رہی ہے اور تم لال انار بنے پھر رہے ہو؟'' وہ تپے، تپے لہجے میں بولی۔

''یہ سب اس لال قمیص کا کمال ہے۔'' وہ اپنی

قمیص چھو کر اٹھ کر بولا، پھر اس کے قریب آ کر اداۓ بے نیازی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگا۔

''تم بھی اپنی بارات کا لال شرارہ پہن کر دیکھو، اگر تمہارے جذبات و احساسات میں خوشگوار ہلچل نہ پیدا ہو تو میرا نام بدل کر رکھ دینا۔'' اس کی آنکھیں حیرت سے پہلے پھیلیں پھر سکڑیں، برا سا منہ بنا کر اس نے .... اس کے آگے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

''بخشو مجھے.....تمہاری طرح مجھے جگ ہنسائی کا شوق نہیں..... بیٹا جوان ہو رہا ہے اور باپ کو نئے، نئے شغل میلے سوجھ رہے ہیں۔''

''اُفوہ یہ تم ہر بات میں بیٹا جوان ہو رہا ہے کی رٹ کیوں لگا دیتی ہو؟ اس کا تو کام ہی جوان ہونا ہے، اس کی جوانی سے میری جوانی کو کیوں غارت کرنے پر تلی رہتی ہو۔ میرا موڈ خراب نہ کرو، آج میں بہت خوش ہوں۔ جاؤ جا کر اچھی سی دودھ پتی بنا کر لاؤ اور خدا کے لیے یہ منہ ہاتھ دھولو۔ قسم سے چلتے ہوئے بالکل سائبیریا کی پینگوئن لگ رہی ہو، وہ ٹانگوں والی.....'' یہ سن کر زہرا کے سر سے لگی تلووں پر بجھی اس نے زہر خند انداز میں میاں کو گھورا۔

☆☆☆

آج بھی دو بج کر نہیں دے رہے تھے، جمائیاں لے، لے کر وہ نیند کو بھگا رہا تھا۔

''کم بخت کو یہی ٹائم رکھنا تھا سیٹنگ کے لیے۔'' اس کے دل و دماغ نے دہائی دی۔ ٹھیک دو بجے اس کا میسج آیا۔

''سو تو نہیں گئے تھے؟'' ہمیشہ والا سوال پوچھا گیا۔

''نہیں تو..... جاگ رہا ہوں، تمہارے میسج کا انتظار کر رہا تھا۔'' ایک ہاتھ سے جمائی روک کر دوسرے سے میسج لکھ کر اس نے روزانہ والا جواب دیا۔

''کیسا رہا آج کا دن.....؟ ریڈ شرٹ اور جاگرز پہن کر گئے تھے؟''

''بہت اچھا رہا آج کا دن..... بہت عرصے اتنا اچھا دن گزرا اور اس کے لیے تمہارا بہت شکریہ، تم نے میرے اندر کے چھپے مرد کو دریافت کر کے اسے گہری نیند سے جگایا ہے، تھینکس اگین.....'' ذکا کا رواں، رواں ممنونیت میں ڈوبا ہوا تھا۔

''رنگ ہماری زندگی پر بہت گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں، شوخ رنگ ہماری حس جمالیات اور حس مزاح کو اجاگر کرتے ہیں جبکہ پھیکے اور بدمزہ رنگ، ہمیں زندگی اور اس کی رعنائیوں سے دور لے جاتے ہیں۔'' اس کا فلسفیانہ جواب پڑھ کر وہ حیران ہوا۔ آج اس کا نیا روپ سامنے آیا تھا بلکہ پچھلے چھ ماہ کی ان کی دوستی میں روزانہ ہی اس کا ایک نیا روپ نیا رنگ سامنے آتا تھا۔ وہ بے ساختہ ہی پوچھ بیٹھا۔

''کیا تم رائٹر ہو، شاعر ہو یا پروفیسر.....؟''

''میں بس ایک عورت ہوں۔'' اس کا مختصر جواب آیا۔

''تمہارے اتنے روپ کیونکر ہیں پھر.....؟''

وہ جاننے پر بضد تھا۔

''میں نے کہا ناں کہ میں ایک عورت ہوں اس لیے میرے اتنے روپ ہیں۔''

''عورت تو میری بیوی بھی ہے..... مگر اس کا تو ایک ہی روپ ہے ماں اور بس ماں.....''

''عورت کا یہی روپ سب سے عظیم تر ہے۔'' برملا جواب آیا۔

''کیا تم ماں نہیں ہو.....؟'' ذکا کی طرف سے پھر سوال آیا۔

''اوہو..... شاید میرے میاں کو پیاس لگی ہے، وہ اٹھ رہے ہیں، کل باتیں ہوں گی۔''

''اچھا شب بخیر.....'' ہمیشہ کی طرح درمیان

میں اس کے شوہر کے اٹھنے نے بات بگاڑ دی تھی بلکہ ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"اس سالے کو بھی......" ذکا نے موٹی سی گالی دے کر موبائل بند کیا اور زہرا کی طرف دیکھا، وہ ادھ کھلی آنکھوں کے ساتھ خراٹے بھر رہی تھی۔

☆☆☆

وہ صبح سے بیزار، بیزار سی پھر رہی تھی، گرمی نے اسے بوکھلا دیا تھا اوپر سے گھر کے سیکڑوں کام ......کوئی ماسی نہیں رکھی تھی اس نے......اسے خود گھر کے سارے کام کرنا پسند تھے اور اسی چکر میں وہ اپنا آپ فراموش کر بیٹھی تھی۔

سب سے پرانا اور گھسا پٹا لان کا سوٹ نہا کر پہن کر اس نے واشنگ مشین لگائی، جھاڑو پونچھا کرنے کے بعد وہ پھر سے پسینے میں نہا گئی تھی، ابھی کھانا بھی بنانا تھا۔ رضا دو بجے اسکول سے آتا تھا وہ میٹرک کا طالب علم تھا، کھانے پینے میں اس کے بڑے نخرے تھے، اب وہ کریلے لیے بیٹھی اس سوچ میں تھی کہ اس کے لیے کیا بنائے......؟ خود اسے کریلے بہت پسند تھے اور دونوں باپ بیٹے کو کریلوں سے ازلی بیر......

رضا کے لیے تو چلو وہ انڈے بنا دے گی، شام کی شام کو دیکھی جائے گی۔ یہ سوچ کر تیزی سے کریلے چھیلنے لگی۔ اتنے میں پاس پڑے موبائل پر اوپر تلے تین چار بیلز ہوئیں، اس نے کوفت زدہ انداز میں موبائل کو دیکھا۔ میسج دیکھنا بھی ضروری تھا کوئی کام کی بات نہ ہو...... ہاتھ صاف کر کے اس نے جھنجلاتے ہوئے موبائل کا بٹن دبایا۔

"آپ ایک خوب صورت خاتون ہیں، بس اپنے آپ کو دریافت کرنے کی دیر ہے چلیں پھر آج سے ہی خود کو دریافت کرنا شروع کر دیں۔" میسج پر کوئی نام پتا نہیں تھا سوائے اس نمبر کے وہ بھی عجیب سا نمبر کہ اس پر رنگ بیک کیا کرتی وہ الجھ سی گئی۔

تربیت اولاد

اکثر والدین اپنی اولاد کی دینی اور اخلاقی تربیت کے حوالے سے پریشان رہتے ہیں۔ جب بچے بلوغ کی عمر کو پہنچ جاتے ہیں تو والدین کی پریشانی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بچے دین کی باتوں پر عمل کریں۔ باقاعدگی سے نماز پڑھیں، روزے رکھیں، قرآن کی تلاوت کریں۔ اسی طرح ان کی تمنا ہوتی ہے کہ ان کی اولاد پاکیزہ عادتیں اپنائے، برے طریقوں سے گریز کرے اور اپنی ذمے داریوں کے بارے میں سنجیدگی اختیار کرے۔ ان چیزوں کو اپنے بچوں میں پیدا کرنے کے لیے وہ بالعموم سختی اور زبردستی کا طریقہ اختیار کرتے ہیں جو سراسر غلط ہے دراصل انسان کو اللہ تعالیٰ نے اس ساخت پر پیدا کیا ہے کہ پہلے وہ کسی بات کو اپنے ذہن و فکر اور شعور و ارادے کا حصہ بناتا ہے اور اس کے بعد اپنے عمل کو اس کے مطابق کرتا ہے۔ یہ طریقہ اللہ تعالیٰ نے صرف جانور کے لیے رکھا ہے کہ اس کو جس طرف ہانکا جائے وہ اسی طرف مڑ جائے۔ انسان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ دو ہی راستوں سے کوئی بات قبول کرنے کے لیے آمادہ ہوتا ہے۔ ایک عقل کے راستے سے اور دوسرے جذبات کے راستے سے۔ یہی وجہ ہے کہ پیغمبروں نے ہمیشہ انسان کے ذہن کو مخاطب بنایا ہے اور اس کے دلوں پر دستک دی ہے۔ والدین اگر اپنی اولاد کی صحیح معنوں میں تربیت کرنا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ وہ دینی و اخلاقی تربیت کے حوالے سے جو بات بھی اپنے بچوں میں پیدا کرنا چاہتے ہیں، پہلے اسے ان کے شعور کا حصہ بنائیں۔ سختی، دھونس، دباؤ، زبردستی اور جبر کے تمام طریقے ترک کر دیں۔ ان کے علم کو اور ان کے فہم کو بہتر کریں۔

مرسلہ: مسز تسنیم، جہلم

''نیٹ ورک والوں نے بھیجا ہوگا۔'' اس نے خود کو تسلی دی۔ جتنی دیر وہ کریلے چھیلتی رہی یہ میسج اس کے دل و دماغ میں کلبلاتا رہا۔ کریلے تیار کر کے وہ پھر نہانے چلی گئی۔ نہا کر نکلی تو غیر ارادی طور پر اس نے خود کو آئینے میں ٹٹولا۔

پھیکی رنگت، گالوں پر چھائیاں، بے رونق آنکھیں، چھدرے بال، ڈھلکی ہوئی جلد...... وہ کہیں سے بھی پینتیس سال کی زہرا نہیں بلکہ آٹھ دس برس زیادہ سال خوردہ عورت دکھائی دیتی تھی۔

اس نے اپنا کیا حال بنا ڈالا تھا۔ خود پر توجہ دینی بھی چھوڑ دی تھی۔

جوان بیٹے کی ماں ہونے کا سوچ، سوچ کر بھی اس نے خود کو مٹا ڈالا تھا۔ وہ بیوی سے صرف ماں بن کر رہ گئی تھی۔ تھکے، تھکے انداز میں وہ لاؤنج میں آکر بیٹھ گئی۔ اپنا آپ سوچنے اور کھوجنے لگی۔ کب سے اس نے میک اپ کے نام پر لپ اسٹک تک نہیں لگائی تھی، آنکھیں، کاجل کے بغیر ویران دینے لگی تھیں۔ گھسے رنگ، پرانے کپڑوں میں وہ الجھے، الجھے بالوں کا جوڑا کس کر بنائے ذکا سے الجھتی رہتی تھی۔

دونوں میاں، بیوی میں ہر وقت تو، تو میں، میں ہونے لگی تھی۔ دونوں ایک دوسرے سے بیزار اور لاتعلق سے رہنے لگے تھے۔ سولہ سالوں میں وہ ساٹھ سال کے میاں بیوی دکھائی دینے لگے تھے۔

''اپنے آپ کو کیسے دریافت کیا جائے؟'' اب وہ اس معمے میں الجھی ہوئی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اب اسے دوسرے میسج کا انتظار تھا۔

☆☆☆

''آج کا دن کیسا رہا...... ؟ اچھا، شاندار یا زبردست؟'' وہ ہمیشہ کی طرح پوچھ رہی تھی۔ ذکا کی انگلیاں تیزی سے پھسلنے لگیں۔

''یار! آج تو کمال ہی ہوگیا۔ تمہارے کہنے کے مطابق میں زہرا کے لیے گجرے لے کر گھر آیا تو وہ روزانہ کی طرح منہ بسورے بیٹھنے کے بجائے مسکرا کر آگے بڑھی۔ اور تو اور اس نے آج لال لپ اسٹک بھی لگائی ہوئی تھی، روزانہ کی طرح ماسی نہیں بنی ہوئی تھی۔ لگتا ہے اسے بھی میری طرح کوئی نسرین مل گئی ہے۔''

''ہاہاہا......'' وہ دل کھول کر ہنسی۔

''تمہارا کیا خیال ہے، کیا میرا نام واقعی نسرین ہے؟ میرا تو کوئی بھی نام ہوسکتا ہے۔ تعبیر، تقدیر، ناصح وغیرہ، وغیرہ...... ہم روح سفر ہیں ہمیں ناموں سے نہ پہچان۔'' اس نے پھر الجھی، الجھی بات کی تو وہ بھی الجھ گیا۔

''ہماری دوستی کو اتنا عرصہ ہوگیا ہے مگر میں ابھی تک تمہیں نہیں سمجھ پایا ہوں، تم ابھی تک ایک سربستہ راز کے مانند ہو میرے لیے، بندی خدا ابھی تو اپنا اصلی تعارف کرواؤ، کوئی تصویر بھیجو...... مجھے تو دیکھو نہ اپنا آپ کھول کر تمہارے سامنے رکھ دیا ہے۔ اپنی تصویر بھی تمہیں بھیج دی ہے، بیوی کی بھی بھیج دوں گا...... مگر تمہیں تو میں نے دیکھا بھی نہیں ہے، روزانہ تمہارا وہ سڑیل میاں جاگ کر عین موقع پر کہانی کے کلائمکس میں آجاتا ہے۔''

''اب بھی وہ جاگنے والا ہے، پانی ما...

...اچھا بھئی شب بخیر۔'' ذکا نے دل ہی دل میں ایک نئی موٹی تازی گالی اس کے شوہر کو دے کر کروٹ بدل لی۔

☆☆☆

بھنڈیاں دم پر رکھیں اور اس نے لیموں نچوڑ کر ڈھکن بند کر دیا۔ لیموں کا چھلکا لے کر وہ کمرے میں آگئی۔ پنکھا تیز کر کے کرسی پر اطمینان سے بیٹھ کر اس نے چھلکا منہ پر رگڑنا شروع کر دیا، اسے بارہ بجنے کا انتظار تھا۔ روزانہ وہ تمام کاموں سے فارغ ہو کر بارہ بجے کا انتظار کرنے لگی تھی۔ اپنے اندر وہ

آج کل ایک نئی زہرا کو دریافت کررہی تھی۔ شانت اور پُراعتماد، اب اس کے اندر روزانہ والی کھلبلی، بیزاری اور افراتفری نہیں رہی تھی۔ کام بھی وقت پر ہوجاتے تھے اور اسے خود پر بھی توجہ دینے کا وقت مل جاتا تھا۔ منہ پر مسلنے کے بعد اب وہ اپنی کالی کہنیوں پر لیموں رگڑ رہی تھی کہ میسج کی ٹون ہوئی، وہ پوری طرح چوکنا ہوکر پیغام پڑھنے لگی۔

"جو محبت روزانہ نہیں انڈا کرتی وہ روزانہ مرتی رہتی ہے۔ اپنے اندر کی عورت دریافت کرنے کے بعد اب اپنی گمشدہ محبت کو دریافت کریں، دنیا آپ کی ہوگی۔" موبائل کی روشنی مدھم ہوگئی تھی۔ وہ سوچ میں پڑ گئی۔ کتنا عرصہ ہوگیا تھا اس نے ذکا سے کوئی محبت بھری بات نہیں کی تھی، دونوں اپنی ہی دنیاؤں میں الجھے رہتے تھے۔ نہ کہیں گھومنا پھرنا، نہ بیٹھ کر خوشگوار باتیں کرنا، نہ بارش میں نہانا اس کے سارے خوف سارے خدشات جوان بیٹے سے جڑ کر کنڈلی مار کر بیٹھے تھے۔

"لوگ کیا کہیں گے؟" یہ واہمہ اسے روز مار دیتا تھا۔

"جوان بیٹے کی ماں ہوکر یہ طور طریقے، یہ لچھن...... توبہ، توبہ۔" وہ خیال ہی خیال میں ڈر کر توبہ کرنے لگی۔

مگر جس دن اس نے نہا دھو کر لپ اسٹک لگا کر کاجل لگایا اور نکھری، نکھری سی لگنے لگی تو رضا نے بھی بہت خوش ہوکر کہا۔

"واہ، ماما...... آج آپ صحیح کی میری ماما لگ رہی ہیں، روزانہ ایسی ہی رہا کریں۔ ایکسیلینٹ!"

جب اس نے خود پر سو مرتبہ لعنت بھیجی کہ وہ ناحق جوان بیٹے کا غم پالے بیٹھی تھی اور اپنا آپ مار رہی تھی۔

☆☆☆

"کتابیں بالکل میری ذات جیسی ہیں
الفاظ بہت، مگر خاموش......"

آج کل وہ اسے کتابیں پڑھنے اور نیٹ جوائن کرنے کا مشورہ دے رہی تھی۔ اور وہ سدا کا پڑھنے کا چور...... نیٹ سے اسے دلچسپی نہیں تھی، وہ تو پرانی فلموں اور پرانے گانوں کا رسیا تھا۔ وقت ملتا تو رات کوئی وی سی آر پر کوئی پرانی فلم لگا لیتا مگر زہرا کی نیند خراب ہونے لگتی، وہ چیخ، چیخ کر سارا مزہ کرکرا کردیتی۔ مجبوراً اسے ٹی وی بند کردینا پڑتا، ہینڈ فری لگا کر گانے سننے لگتا۔ مگر آج وہ حیرت سے گرتے، گرتے بچا جب زہرا نے کہا۔

"آج کوئی پرانی مووی دیکھتے ہیں۔ بہت دن ہوگئے ہیں مووی دیکھے ہوئے۔"

پھر جب دونوں نے پاکیزہ پوری دیکھی اور اس دوران زہرا نے نادانستگی میں اپنا ہاتھ اس کے سینے پر رکھا تو جواباً اس نے بھی اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تھا۔ دونوں میں گہری چپ تھی بس سناٹا بول رہا تھا۔

☆☆☆

صبح سے زہرا مستقل گنگنا رہی تھی۔

"یونہی کوئی مل گیا تھا، سرراہ چلتے، چلتے......"

ذکا زیرلب مسکرا رہا تھا۔ وہ کتنے دنوں سے اس میں خوشگوار تبدیلیاں دیکھ رہا تھا مگر اظہار نہیں کررہا تھا، بس یہی ایک کمی تھی اس کے اندر کہ وہ محبت کے معاملے میں اظہار نہیں کرسکتا تھا۔

زہرا عورت تھی، اظہار چاہتی تھی، والہانہ پن چاہتی تھی۔ وہ روزانہ رات کو ہی اس کے کپڑے استری کرکے رکھ دیا کرتی تھی۔ جوتوں کو پالش کردیتی تھی ورنہ اب وہ یہ کام صرف رضا کے کرتی تھی۔

اب وہ آہستہ، آہستہ ماں سے بیوی کے روپ میں واپس آنے لگی تھی۔ اسے ذکا کے چھوٹے، موٹے کام کرکے دلی خوشی اور سکون ملتا تھا، وہ چاہتی تھی کہ ذکا اسے دل سے سراہے، اس کی تعریف

کرے..... مگر وہ چپ تھا۔ اور یہ چپ نہ جانے کب ٹوٹنی تھی۔

☆☆☆

"جسم سے خوں تک نچوڑ لیتا ہے
عشق، جب ہجر اوڑھ لیتا ہے"

آج کل اس پر شاعری کا بھوت سوار تھا، روزانہ نئے، نئے اشعار بھیجنے لگی تھی۔ وہ شاعری میں تراکورا تھا، اس کے سر سے شاعری گزر جاتی۔

"آسان باتیں کیا کرو نسرین، یہ شاعری، فلسفہ وغیرہ میرے بس کی باتیں نہیں....." وہ شکوہ کرتا تو وہ سادہ اور آسان باتیں کرنے پر اتر آتی۔

"زندگی خوب صورت اور آسان لگنے لگی ہے ناں اب.....؟"

"ہاں..... بہت۔ تمہارا بہت شکریہ..... تم نے زندگی کے ایک نئے رنگ اور انداز سے مجھے آشنا کروادیا ہے۔ لیکن تم نے کبھی اپنی زندگی، اپنے شوہر اور بچوں کے بارے میں کچھ نہیں بتایا؟ یہ گلہ ہے مجھے تم سے۔" ذکا کی انگلیاں تیزی سے تھرکیں۔

"ضرور بتاؤں گی، پہلے تمہاری دنیا تو سنور جائے۔" فوراً جواب آیا۔

"میری دنیا تو آدھی سے زیادہ سنور چکی ہے، میری گمشدہ بیوی مجھے مل گئی ہے لیکن سمجھ نہیں آتا کہ اسے سنوارنے اور سجھانے والا کون مسیحا ہے؟" وہ حیران تھا۔

"دنیا میں مسیحاؤں کی کمی تھوڑی ہے، ہوسکتا ہے اس نے خود کو ہی تراشا اور تلاش لیا ہو۔ تم ان باتوں میں نہ پڑو..... اس دنیا میں سب کچھ ممکن ہے، جیسے ہماری دوستی..... ایک عجوبہ اور معجزہ نہیں ہے کیا.....؟" وہ بڑے موڈ میں تھی۔

"بالکل..... نہ تم دوست بن کر میری زندگی میں آتیں اور نہ میری ٹھہری۔ بر [illegible] ی زندگی میں ہلچل ہوتی، میں سدا کونے کا پتھر بنا رہتا، بیکار، بے مصرف، زنگ آلود۔"

"واہ..... آج تو فلسفہ بول رہے ہو، چھپے رستم نکلے تم تو....." ترنت جواب آیا۔

"تم نے..... تمہاری دوستی نے بنادیا ہے، میں تو بالکل سیدھا سادہ آدمی ہوں۔" اس نے فوراً ہی اعتراف کیا۔ موبائل اچانک بند ہوگیا تھا، شاید چارجنگ ختم ہوگئی تھی، اس نے سکون سے آنکھیں بند کرلیں۔

☆☆☆

زہرا نہانے کے بعد بال سکھا رہی تھی، وہ پنکھے کے نیچے کھڑی غیر ارادی طور پر گنگنا رہی تھی۔

"یہ ہے ریشمی زلفوں کا اندھیرا نہ گھبرائیے
جہاں تک مہک ہے میرے گیسوؤں کی چلے آئیے"

وہ بار، بار ایک ہی جملے کی تکرار کررہی تھی۔ دونوں نے رات کو دیر تک یہ موو ی دیکھی تھی۔ اب بھی اس کے دل و دماغ پر اسی فلم اور گانوں کا نشہ طاری تھا۔

کرسی پر جم کر بیٹھ کر اس نے موبائل ہاتھ میں تھاما ہوا تھا اور مقررہ وقت کے انتظار میں تھی۔ جیسے ہی بارہ بجے موبائل کی لائٹ جلی۔

"اگر رشتے سچے ہوں تو زیادہ سنبھالنے نہیں پڑتے اور جن رشتوں کو زیادہ سنبھالنا پڑے وہ سچے نہیں ہوتے، سو سچے رشتوں کی قدر کرو، ان کی اچھائی کی قدر کرو، تمہارے ارد گرد بے شمار سچے رشتے ہیں انہیں اپنا اور مخلص ہمدرد ساتھی جان کر ان سے پیار کرو، ان میں فنا ہوجاؤ، وہ تمہارے ہو جائیں گے۔" آج مسیحا پر فلسفیانہ گفتگو کا دورہ پڑا تھا۔

"کوئی کام کی اچھی بات کرو، یہ کیا بورنگ باتیں ہیں؟" اس نے تھوڑا بد مزہ ہو کر لکھا۔

"کچھ اپنے بارے میں بتاؤ، تم کون ہو، مرد یا

عورت؟ کہاں رہتی ہو؟ میرا نمبر تمہیں کس نے دیا؟ میں روز تم سے یہ بات پوچھتی ہوں، تم ہو کہ جواب نہیں دیتی۔ آخر کیوں.....؟ تم نے خود کو اتنا پوشیدہ کیوں رکھا ہوا ہے؟"

"مسیحا کا کوئی نام اتا پتا نہیں ہوتا۔ وہ تو بس سنگریزے چنتے اور خار، خار ہونے کے لیے وجود میں آیا ہے۔ جتنا کھوجو گے اتنا ہی الجھو گے۔ بس خود اپنی ذات کی اور اپنی ذات سے وابستہ رشتوں کی قدر کرنا سیکھو۔" آج مسیحا کسی اور ہی رنگ... ڈھنگ میں تھا۔

وہ آگے سے کچھ بول ہی نہ پائی۔ موبائل کی لائٹ بند ہو چکی تھی۔ زہرا نے بکھرے بالوں کو سمیٹ کر ان کا جوڑا بنایا اور الماری کے سامنے کھڑی ہو کر رات کے لیے کپڑے دیکھنے لگی۔ آج ذکا کہہ کر گیا تھا کہ رات کا کھانا باہر کھائیں گے۔

☆☆☆

"دل کی دنیا سنوارنے کے لیے.....
عشق کرنا بہت ضروری ہے"

ذکا نے رات دو بجے آنے والا یہ شعر کئی بار زیرِ لب پڑھا اور مطلب جان کر دل ہی دل میں مسکراتا رہا۔

زہرا نے کروٹ بدل کر اسے یوں مسکراتا دیکھ کر اور موبائل ہاتھ میں لیے خوش باش دیکھ کر تیزی سے اس کے ہاتھ سے موبائل چھینا، ذکا دیکھتا ہی رہ گیا، مزاحمت بھی نہ کر سکا۔

زہرا نے چبا، چبا کر شعر پڑھا..... اس کی آنکھوں سے شعلے لپکنے لگے۔

"اچھا تو رات کو چھپ، چھپ کر عشق و عاشقی کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ میری ناک تلے سب ہو رہا ہے اور مجھے ہی خبر نہیں ہے۔ کیا نام ہے..... اس چڑیل کا.....؟" وہ ابرو چڑھا کر تیکھی نظروں سے اسے گھور رہی تھی۔

"نس..... نسرین نام ہے اس کا....." ذکا کے منہ سے بے ساختہ ہی نکل گیا۔ "اوہ نہیں، نہیں پتا نہیں کیا نام ہے۔ مجھے کیا پتا کون ہے.....؟" اس نے تیزی سے بیان بدلنے کی کوشش کی مگر زہرا کے آگے ایک نہ چلی، اس کے تو سینے پر گویا سانپ لوٹ رہے تھے۔

"جبھی میں کہوں اندھوں میں کانا راجا میاں صاحب کیسے بنتے جا رہے ہیں؟ ارے یہ نسرین نام کی عورتیں تو ہوتی ہی چنڈال چوکڑی اور مردوں کو پھنسانے والی۔" ذکا نے بلبلا کر دہائی دی۔

"دیکھو، دیکھو زہرا.....! اب تم زیادتی کر رہی ہو، میری آپا کا نام نسرین ہے اور جنہوں نے مجھے قرآن پاک پڑھایا تھا وہ بھی نسرین آپا تھیں۔ ناموں میں کچھ نہیں رکھا۔ عورت کا کردار اصل چیز ہوتا ہے..... ہاں۔"

"کردار کی ایسی کی تیسی....." زہرا نے موبائل زمین پر پھینک کر تنک کر کہا۔ "کب سے چل رہا ہے یہ معاملہ..... یہ عشق و عاشقی..... بتاؤ تو ذرا.....؟"

"قسم سے کوئی معاملہ نہیں، تم خواہ مخواہ شک کر رہی ہو۔ ایسے میسجز تو عام سی بات ہیں، تم بلاوجہ بات کو بڑھا رہی ہو، سو جاؤ چپ کر کے۔ رضا سنے گا تو اس پر کیا اثر پڑے گا، خواہ مخواہ بات کو طول نہ دو۔" اس نے اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی مگر وہ تو شیرنی کی طرح بپھری ہوئی تھی۔

"ہاں، ہاں اچھا ہے، اسے بھی تو پتا چلے کہ جوان بیٹے کے باپ کے کیا کرتوت ہیں....." اس نے جھک کر زمین سے موبائل اٹھایا، اس کی بیٹری دوبارہ سے لگائی اور ایک، ایک کر کے سارے میسجز پڑھنے لگی۔

اس کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔

ذکا اندر ہی اندر دہل رہا تھا کہ اب اس کا ری ایکشن نہ جانے کیا ہو؟ وہ بہت غصے میں تھی، پڑھتے، پڑھتے اس پر بھی نظر ڈالتی جارہی تھی۔ ذکا سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ میسج ڈیلیٹ کرنا بھول گیا تھا۔

"اب...... اب نہ جانے کیا کرے گی یہ عورت......؟ اس کا غصہ تو ویسے بھی بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اے اللہ، تو رحم کرنا، جوان بیٹے کے باپ پر۔" اس نے دل ہی دل میں دہائی دی تھی۔ زہرا نے تمام میسجز پڑھ کر گہری سانس لی۔

ذکا اس کا چہرہ بغور دیکھ رہا تھا۔

"بس دوست ہے میری...... اور کوئی بات نہیں...... خدا کی قسم یقین کرو میرا۔" اس نے منمنا کر کہا۔

"ذکا......!" زہرا کو اپنی آواز گہرے کنویں سے آتی محسوس ہوئی۔

"اب نہ جانے کیا کہے گی؟" ذکا کا رواں، رواں مجسم کان بن گیا۔

"ذکا کیا تجدید محبت کے لیے کسی تیسرے کا ہونا ضروری ہے؟" اس نے کہا تو ذکا نے بلا سوچے سمجھے نہ میں گردن ہلادی۔

"نہیں، ناں...... رشتوں کے نازک کانچ میں اگر دراڑ پڑ جائے تو جوڑنے کے لیے کوئی مسیحا کوئی چارہ گر ہی کیوں ہو، خود بھی تو پلکوں سے سنگریزے چنے جاسکتے ہیں ناں...... اپنی صلیب اپنے ہی کاندھوں پر اٹھانی چاہیے، دوسروں کا کاندھا کبھی دغا دے سکتا ہے۔" وہ کسی غیر مرئی نکتے کو تکتے ہوئے بولے جارہی تھی، ذکا ہونق ہوکر اسے دیکھ رہا تھا۔

"وعدہ کرو ذکا......اب کسی تیسرے کو اپنے اور میرے درمیان نہیں آنے دوگے، میں بھی تم سے یہی وعدہ کرتی ہوں۔ ہم اپنی محبت کی تجدید اور آبیاری اپنے خون سے کریں گے، کبھی کسی اور کو اپنے وعدوں، اپنے سپنوں کی ہوا بھی نہیں لگنے دیں گے۔ ہم لڑیں گے، جھگڑیں گے اور پھر ایک ہوجائیں گے...... کیونکہ کسی تیسرے نے ہمیں جینے کا ہنر سکھادیا ہے، ہے ناں ذکا......؟"

ذکا نے پھر سوچے سمجھے بغیر گردن ہلادی۔ زہرا نے آگے بڑھ کر اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں تھمادیا۔ جسے ذکا نے متاع حیات سمجھ کر سینے سے لگالیا۔ دونوں کے بیچ اب کوئی تیسرا نہیں تھا، بس محبت تھی۔

☆☆☆

تعبیر نے رائٹنگ ٹیبل پر اڑتے ہوئے اوراق کو سمیٹ کر یکجا کیا اور اپنے بکھرے بالوں کو سمیٹا، چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے اس نے دوسری بار اپنے لکھے پر نظر ڈالی، ہر لفظ مکمل تھا۔

پورے ایک سال سے وہ اس کہانی پر کام کررہی تھی، آج کہیں جاکر یہ مکمل ہوئی تھی۔ ذکا نے آج خود فون کرکے اسے اپنی کہانی سنائی تھی۔ پھر تھوڑی دیر بعد ہی زہرا کا بھی فون آگیا تھا، اس نے بھی کم و بیش وہی کچھ بتایا جو ذکا نے بتایا تھا۔ اس کے اندر تک روشنی اور سکون پھیل گیا تھا۔

انجام اس کی توقع کے عین مطابق تھا، کہانی مکمل ہوگئی تھی۔ وہ نسرین سے دوبارہ تعبیر بن گئی تھی، ایک نامور لکھاری، جو ہمیشہ سچ لکھا کرتی تھی اور اس سچ میں اسے اپنا حصہ بھی ڈالنا پڑتا تھا۔

"تھینک یو ذکا...... تھینک یو زہرا...... تمہارے سچ کے بغیر یہ کہانی کبھی مکمل نہ ہوتی۔" اس نے دل میں سوچ کر فائل بند کرکے رکھ دی اور طمانیت سے آنکھیں بند کرکے کرسی کی پشت سے ٹیک لگادی۔ اب اسے کسی اور نئی کہانی پر کام کرنا تھا۔

چاندنی گنگنانے لگی

ام مریم

"السلام علیکم! گڈ نون...... ہاؤ آر یو حرم۔"
فارہ نے اندر گھستے ہی بیگ اور چادر صوفے پر پھینک کر حواس بحال کرتے ہوئے اک گہری سانس بھر کر کہا۔ کمرے میں آتے ہی اے سی کی کولنگ نے اس کے گرمی، پسینے اور پیاس سے بے حال وجود کو جیسے کسی حد تک پُرسکون کرنے میں مدد دی تھی۔ فلور کشن گھسیٹ کر وہ حرمت کے پہلو میں ہی لمبی لمبی لیٹ گئی جو ٹی وی میں منہمک گویا اس کی آمد سے بھی بے خبر



تھی..... جواباً سلامی بھیجنا تو دور کی بات۔ فارہ نے ذرا سا سر اٹھا کر اس کی محویت کو دیکھتے خود ہی احساس دلانا چاہا۔

"یار اتنی دھوپ سے آئی ہوں..... پانی ہی پلا دو، یخ ٹھنڈا سا۔" اس نے حرمت کے ہاتھ سے ریموٹ چھیننا چاہا..... ارادہ ٹی وی آف کرنے کا تھا مگر وہ تو چیل کی طرح جھپٹی تھی۔

"خبردار..... خبردار فارہ کی بچی ڈسٹرب نہ کرو، دیکھ نہیں رہیں کہ میں اپنا پسندیدہ شو دیکھ رہی ہوں۔" وہ جس طرح بغیر لحاظ مروت کے آنکھیں نکال کر غرائی تھی فارہ کا منہ بن گیا تھا۔ اس نے اسکرین پر شاہزادوں کی سی شانِ بے نیازی سے جلوہ گر مشہور و معروف اور ہر دل عزیز ڈراما آرٹسٹ آزر خان کو کھا جانے والی نظروں سے گھورنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ دانت کچکچا کر بولی تھی۔

"غالباً یہ پروگرام تو تم رات کو بھی دیکھ چکی ہو گی اور اب پھر..... جی نہیں بھرا ابھی تک آنکھیں سینک سینک کر۔" اس نے بھی لحاظ مروت بالائے طاق رکھ کر بے نقط سنائیں اور تنتناتی ہوئی اٹھ کر خود فریج سے پانی کی بوتل نکال لائی۔ پروگرام میں وقفہ آ چکا تھا تبھی عزیزی حرمت کی توجہ اس پر ہو چکی تھی۔

"اچھا بتاؤ، کیسا گزرا پہلا دن تمہاری سو کالڈ جاب کا؟" وہ اپنی مسکراہٹ دبا رہی تھیں۔ آنکھیں پٹپٹا رہی تھی۔ چہرے پر شرارت کا عکس نمایاں تھا جو اس کی معصومیت بھری دلکشی کو مزید اجاگر کر رہا تھا مگر فارہ حلق تک بیزار تھی۔

"بکواس مت کرو مجھ سے..... خبردار جو میرے منہ لگیں تم..... بس تم اس آزر خان کو دیکھتی اور آہیں بھرتی ہی مر جانا..... خس کم جہاں پاک....." پانی کی بوتل کا ڈھکن اتار کر منہ سے لگانے سے قبل فارہ نے اس کی اچھی خاصی طبیعت صاف کرنا ضروری خیال کیا تھا۔ وہ برا مانے بغیر دانت نکالتی رہی۔

"اُف..... اتنا غصہ..... آج تو مجھے لگ رہا ہے اپنے بھائی کا زیادہ ہی درد اٹھا ہے تمہیں، تم جلتی کڑھتی رہنا مجھے کیا..... بہرحال بھول ہے تمہاری کہ اس کالو کو میں کبھی منہ لگاؤں گی۔" جواباً اس نے بھی جلتی پر تیل ہی ڈالا تھا۔ فارہ کا چہرہ غم و غصے کی زیادتی سے سرخ پڑنے لگا مگر حرمت کے پاس اتنی فرصت نہیں تھی کہ اس کی جانب دیکھتی اور اس کے دکھ کو سمجھ پاتی..... پروگرام ایک بار پھر شروع ہو چکا تھا۔

سہانی شام پوری طرح پر پھیلا چکی تھی۔ ہواؤں میں خوشگواری تھی۔ تبھی گرمی کا زور ٹوٹتا ہوا لگ رہا تھا۔ ورنہ سارا دن تو لو چلتی رہی تھی..... وہ بڑے فریش موڈ میں تھی، ہاتھ میں پائپ پکڑے پودوں کو پانی میں نہلاتے اپنی لے میں گنگنانے میں مصروف تھی۔ جب سویا سویا سا چہرہ اور بکھرے بال لیے فارہ بھی اپنے کمرے سے نکل کر اسی سمت چلی آئی۔

"تیرے نال میں لائیاں اکھیاں
وے توں فیر وی دوریاں رکھیاں
تیری بے پرواہی سجناں مینوں مار گئی"

"اس طرح تو ہوتا ہے میم! اس طرح کے کاموں میں۔" فارہ نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے پائپ لے لیا۔ نل وہ پہلے ہی بند کر چکی تھی۔

"مثلاً کس طرح کے کاموں میں؟" حرمت بھویں چڑھا کر بولی۔

"کبھی غور تو کرو حرم! کہاں وہ مشہور و معروف آرٹسٹ جس کی شہرت پاکستان سے نکل کر باہر کے ملکوں تک جا پہنچی اور کہاں تم ایک عام سی گھریلو لڑکی! تمہاری طرح کی نہ جانے کتنی اور بھی عام اور.... بے وقوف لڑکیاں ہوں گی جو یہ حماقت کر رہی ہوں گی۔ حرم! تمہیں نہیں لگتا کہ تم سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہو؟" اس کے لہجے میں محسوس کیے جانے والا دکھ اور تاسف تھا..... شاید تبھی حرم خلافِ معمول کچھ نہیں بولی۔ ہونٹ بھینچے دوسری جانب دیکھتی رہی..... البتہ

چہرے پر ناگواری کے تاثرات بتا رہے تھے کہ اسے فارہ کی بات کتنی بری محسوس ہوئی۔ دونوں کے درمیان طویل خاموشی کا تکلیف دہ وقفہ آیا۔ تب فارہ نے ہی اس خاموشی کے پردے کو چاک کیا۔

''اوہ ہاں! میں بتانا بھول گئی...... رات بھائی ہمارے لیے لان اور کاٹن کے سوٹ لائے ہیں، ابھی ویسے ہی رکھے ہیں...... میں نے سوچا پہلے تم پسند کرلو۔'' اب اس کا انداز پہلے کی طرح نارمل اور کسی حد تک صلح جو، اپنائیت لیے ہوئے تھا مگر حرم کی ناگواری اس کے لہجے میں بھی در آئی تھی۔

''دیکھو..... تم اپنے بھائی سے کہہ دینا کہ وہ اپنی توقعات اور امیدوں کو کم از کم مجھ سے، میری ذات سے الگ ضرور کرلے...... کیونکہ میرا کبھی اس کی پذیرائی کرنے کا ارادہ نہیں تھا اور نہ ہوگا۔'' فارہ نے دکھ کی شدید کیفیت میں بھر کر آنکھوں میں سرخی لیے اسے ایک نظر دیکھا اور بولی۔

''کیا سمجھوں میں اس کی وجہ..... آذر خان؟'' فارہ کا سوال بہت حتمی تھا، حرم دانت بھینچے کھڑی رہی، جواب دینا بھی گوارا نہیں کیا۔ ماما نہیں پکار رہی تھیں، وہ یونہی تنا ہوا چہرہ لیے آگے بڑھ گئی۔ فارہ وہیں کھڑی کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

☆☆☆

جب پہلی بار حرم پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ وہ اپنی نادانی کے دور میں ہی عمر کی منکوحہ بنا دی گئی تھی تو ایک ہنگامہ کھڑا کردیا تھا۔ کتنا چیخی اور چلائی تھی وہ اس ایک بات کی وجہ سے۔

''ایک یہی شخص ملا تھا دنیا میں آپ کو میرے لیے؟'' اس کے لہجے کی رعونت وہ بھی لاڈلے اور اکلوتے بھانجے کے لیے ماما کو بالکل اچھی نہیں لگی، جبھی اسے تنبیہا گھورا۔

''کیوں...... کیا کمی ہے عمر میں؟''

''خوبی کون سی ہے وہ بتا دیں؟'' وہ پھنکاری تھی۔ بس نہ چلتا تھا جیسے نکاح کوئی کانچ کا برتن ہو جسے وہ دیوار سے مار کر ٹکڑوں میں توڑ دے اور جان چھڑا لے۔

''بدتمیزی نہیں کرو حرم..... شوہر ہے وہ تمہارا...... تمیز سے ذکر کیا کرو سمجھیں!'' ماما کے لہجے میں صرف تنبیہ نہیں تھی بے حد ناگواری بھی اتر آئی۔ وہ بپھر اٹھی تھی۔

''ہونہہ شوہر..... زبردستی کا بنایا ہوا...... نہیں مانتی میں اس رشتے کو۔'' وہ کسی بھی پل رونے کو تیار تھی مگر ماما نے اس کا بازو پکڑ کر بے حد سختی سے جھٹک دیا تھا۔

''آج جو بکواس تم نے یہاں میرے سامنے کرلی ہے حرم وہی کافی ہے، آج کے بعد میں ایسی کوئی فضول بات نہ سنوں۔ یہ بندھن تمہارے بابا کا باندھا ہوا ہے اور بھائی جان کی شدید خواہش اور ہم سب کی رضامندی بھی شامل تھی۔ تمہاری بیکار ضد کی خاطر ہم اپنے رشتوں کو نہیں توڑ سکتے۔ سو بی کیئرفل نیکسٹ ٹائم اوکے؟'' ان کے سخت لہجے میں عجیب سی کاٹ دار تھی۔ وہ خائف نہیں بھی ہوئی تو محتاط ضرور ہوگئی تھی مگر اس کا مطلب یہ بھی نہیں تھا کہ اس نے سانولے سلونے عام سے نقوش کے مالک عمر حسن کو بھی جبراً قبول کرلیا تھا۔ اس نے اپنا کھیل دوسرے انداز میں کھیلنے کا فیصلہ کیا تھا۔ جس میں فتح کا امکان سو فیصد تھا اور وہ پُریقین تھی۔

☆☆☆

''السلام علیکم...... صبح بخیر......'' گرے پینٹ کوٹ میں ملبوس ہاتھ میں پکڑا سیل فون جیب میں منتقل کرتا ہوا وہ اپنے مخصوص باوقار انداز میں ڈائننگ ہال میں داخل ہوا تھا۔

''وعلیکم السلام! جیتے رہو میری جان...... خوش آباد رہو۔'' بابا نے اخبار رکھتے ہوئے مسکرا کر بڑی خوش دلی سے اس کا خیر مقدم کیا اور فارہ کو..... ناشتا لانے کو آوازیں دینے لگے۔

''فارہ جلدی آجاؤ بھئی..... آج مجھے ذرا جلدی نکلنا ہے.....'' وہ گھڑی دیکھتے ہوئے خود بھی پکارا تو وہ چونک کر اسے تکنے لگے۔

''کیوں، خیریت ہے ناں بیٹے؟''

''جی پاپا! آج بہت اہم آپریشن تو ہے ہی..... مجھے جنرل اسپتال کے دورے پر بھی جانا ہے، کچھ زخمیوں کی حالت تشویش ناک ہے، دیگر ڈاکٹرز کے ساتھ مجھے بھی ان کے چیک اپ کو جانا ہے۔ اس کے بعد فیصلہ ہو سکے گا کہ انہیں علاج کے لیے باہر بھجوانا چاہیے یا نہیں۔'' وہ کل ہونے والے بم دھماکے میں زخمیوں کی حالت ڈسکس کرنے لگا۔ وہ خاموشی سے سنتے رہے۔

''بیٹا اپنی صحت کا بھی خیال رکھا کرو..... روز بروز رنگت ماند پڑتی جا رہی ہے، رات بھی بارہ بجے کے بعد آئے ہو، ماما بتا رہی تھیں تمہاری۔'' ان کے ٹوکنے پر وہ نرمی سے مسکرایا تھا کہ حرم کو شرارت سوجھ گئی تھی۔

''چاچو انہیں فیئرنس کریم کا کمرشل دکھائیں..... پندرہ دن کا نکھار..... گارنٹی کے ساتھ، اگر یہ زیادہ بزی ہیں تو میں لا دوں گی ان کے لیے۔'' بظاہر مسکراتا شریر لہجہ مگر اس میں موجود اہانت کو فارہ ہی محسوس کر سکتی تھی۔ اس نے ایک تیکھی اور غصیلی نگاہ حرم پر ڈالی مگر وہ متوجہ ہی کہاں تھی۔ وہ تو اپنے ہی خیال میں تھی۔

''جتنی بھی بھاگ دوڑ کر لو ڈاکٹر عمر حسن..... بہرحال تم آزر خان کے جیسے تو کبھی نہیں بن سکتے..... یاد رکھنا ویسے بھی تم زندگی کو خواہ مخواہ مشکل بنا رہے ہو، جتنا پیسہ ہے ناں چاچو کے پاس..... تم بیٹھ کر بھی اڑاؤ تو ختم نہ ہو مگر تمہیں تو.....'' وہ سوچ کر رہ گئی تھی۔ فارہ نے سرد آہ بھر کر عمر کے سامنے ناشتے کے لوازمات سجانے شروع کر دیے۔

''آپ کو جلدی اسپتال پہنچنا ہے بھائی؟''

''ہاں پہنچنا تو ہے..... خیریت..... ؟ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟'' عمر نے چائے کا بھاپ اڑاتا مگ اٹھاتے ہوئے اسے ایک نظر دیکھ کر کہا۔

''اگر آپ کو جلدی ہے تو پھر رہنے دیں..... ایکچوئلی آج مجھے ایک گھنٹا لیٹ جانا تھا مگر حرم کا یونیورسٹی کا ٹائم تو یہی ہے..... میں سوچ رہی تھی کہ اگر آپ اسے ڈراپ کر دیتے تو.....؟'' وہ اپنا مسئلہ بتا رہی تھی، حرم نے سخت جز بز ہو کر فارہ کو گھورا وہ متوجہ نہیں تھی یا دانستہ نظر انداز کر رہی تھی۔

''اوکے..... کر دوں گا..... کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' وہ فی الفور جواب دے رہا تھا۔ فارہ نے بمشکل مسکراہٹ ضبط کی۔

''مگر آپ کو دیر ہو سکتی ہے، اتنا اہم کام ہے آپ کا۔'' فارہ نے جتنی سنجیدگی سے کہا تھا اتنی سنجیدہ وہ تھی نہیں۔ مسکان اس کے ہونٹوں اور آنکھوں میں مچل رہی تھی۔

''اٹس اوکے..... مینشن ناٹ..... حرم تم ناشتا کر چکی ہو تو اٹھ جاؤ..... ہری اپ۔'' اس نے پہلے فارہ کو تسلی دی تھی پھر حرم کو مخاطب کیا جو سخت نالاں اور جز بز نظر آ رہی تھی۔ عمر چائے کے ساتھ سلائس کے چند نوالے لے کر ہی کرسی پیچھے دھکیل کر اٹھ گیا تھا۔ فارہ کے ساتھ ماما نے بھی ٹوک کر ناشتا کرنے کو کہا مگر وہ رکا نہیں تھا اور حرم کو پورٹیکو میں آنے کا کہتا اپنا کوٹ اٹھا کر باہر نکل گیا۔ وہ فارہ کو گھورتے ہوئے اپنا جرنل اور بیگ اٹھائے اِک طرح سے پیر پٹختی ہوئی اس کے پیچھے گئی تھی۔ فارہ بے اختیار ہنسنے لگی کہ اب ہنسی کنٹرول کرنا اس کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ ماما نے اسے کچھ حیرانی سے دیکھا۔

''تمہیں آج کیوں دیر سے جانا ہے اور یہ خواہ مخواہ ہنس کیوں رہی ہو؟'' ان کے استفسار پر وہ..... گڑبڑاتی ہوئی فی الفور سنبھلی اور گلا کھنکھارا۔

''کچھ نہیں ماما.....! بس یہ سوچ رہی تھی کہ عمر بھائی کے ساتھ کتنی پیاری لگتی ہے ناں حرم۔'' وہ عمر کا

ادھورا چھوڑا ہوا ناشتا کرنے میں مصروف ہوئی، بہت خوب صورتی سے بات کا رخ بدل چکی تھی۔ مما بھی مسکرانے لگیں۔

ہاں بیٹے...... اللہ دونوں کی جوڑی سلامت رکھے۔ ہزاروں خوشیاں دکھائے، پیارے لگتے تھے دونوں جبھی تو ایک مضبوط بندھن میں باندھ دیا۔" ان کے جواب پر بجائے خوش ہونے کے وہ گم صم ہونے لگی۔

"شاید مضبوط بندھن بھی حرم کے نزدیک کوئی وقعت نہیں رکھتا ماما! بس کیا بتاؤں آپ کو وہ کیا حماقت کر رہی ہے، اپنے پیروں پر خود ہی کلہاڑی مارنا چاہتی ہے گویا احساس ہی نہیں ہے مگر میں اسے یہ حماقت نہیں کرنے دوں گی۔ وہ میرے بھائی کی بہت انمول خوشی ہے۔" وہ بے حد سنجیدہ ہو رہی تھی۔

"تمہارے لیے کھانا لاؤں؟" آفس سے واپسی پر وہ اب فریش ہو کے باہر نکلی ہی تھی جب حرم نے اسے بڑے دوستانہ انداز میں آفر کی تھی۔ فارہ کے ہاتھ اپنے گیلے بالوں میں حرکت کرتے اسی زاویے پہ ساکن ہوئے اور چہرے پر بڑا خوشگوار سا تاثر ابھرا۔ گویا اس نے کھانے کی آفر نہیں کی اس کے بھائی کو قبولیت کی سند بخش دی ہو مگر بظاہر نخوت دکھائی تھی۔

"کیوں ......؟ آج وہ ہمارے رقیب روسیا کا پروگرام نہیں آرہا ہے کیا ٹی وی پر؟ جبھی یہ اخلاقیات نبھائی جا رہی ہیں۔" اس جواب پر حرم کی بڑی بے ساختہ قسم کی ہنسی چھوٹی تھی۔

"واہ...... کیا ڈائیلاگ ہے یار...... قسم سے، ویسے میرا خیال ہے یہ تمہیں نہیں تمہارے بھائی کو بولنا چاہیے تھے۔" وہ جھوم جھوم گئی تھی۔ صاف ظاہر تھا موڈ خوشگوار ہے۔

"انہیں کبھی تم کوئی موقع دو تب ہے ناں۔" فارہ کا شکوہ جیسے لوک زبان پر آدھرا تھا۔

"ہونہہ...... اگر ایک ڈنے دار پوسٹ پر آکر بھی اس میں حوصلے اور جرأت کی کمی ہے تو اس میں میرا کیا قصور۔" وہ کلس کر بولی اور کاندھے اچکا دیے۔ فارہ کو اس کی بات البتہ ہرگز پسند نہیں آئی تھی جبھی گھورا۔

"بکو مت...... میرا بھائی بزدل نہیں ہے کہ حوصلے کی کمی ہو، بس عزت کرتا ہے تمہاری اور بہت شریف بھی ہے۔" حرم کو یہ صفائی اور یہ طرف داری کرنٹ بن کر ہی لگی تھی۔ جبھی بھڑک اٹھی۔

"اففوہ عزت...... محترمہ کسی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو تو بہتر ہے اور شرافت کا ڈھنڈورا بس تمہارے سامنے پیٹا ہے، گنوں کے پورے ہیں موصوف...... پتا بھی ہے اسے کہ مجھے اس کے ساتھ بائیک پر بیٹھنا پسند نہیں...... اس کے باوجود صبح گاڑی کی خرابی کا بہانہ بنا کر مجھے بائیک پر لے کر گیا...... اوپر سے اسپیڈ اتنی زیادہ...... لاکھ چاہا فاصلہ برقرار رکھوں مگر گرنے سے بچنے کو اس کا کندھا دبوچنا ہی پڑا......" وہ کلس کر کہہ رہی تھی۔ فارہ کا ہنستے ہنستے برا حال ہونے لگا۔

"اس میں خباثت کہاں سے آگئی۔ یہ تو محبت ہے میری جان۔" وہ اس کے پاس آکر گلے میں بازو حمائل کرتے ہوئے مدھر انداز میں گنگنائی۔ حرم نے بھرپور غصے سے اس کے ہاتھ جھٹک دیے اور اسے گھورتے ہوئے فاصلے پر ہوگئی۔

"مگر مجھے ایسی محبت نہیں چاہیے۔" اس کا لہجہ و انداز قطعیت سے بھرپور تھا۔ فارہ کے چہرے پر تاریک سا سایہ لہرا گیا تھا۔

"ایسے مت کہو حرم! میرے بھائی کا دل ٹوٹ جائے گا۔ وہ بہت چاہتے ہیں تمہیں...... اس بات کی میں تمہیں گارنٹی دیتی ہوں۔" فارہ تو جیسے تڑپ اٹھی تھی۔ حرم نے طنزیہ کاٹ دار نظروں سے اسے دیکھا۔

"ارسلان بھی بہت چاہتا ہے تمہیں۔ تم نے آج تک اس کی پزیرائی کیوں نہیں کی؟ جبکہ وہ تمہارے ساتھ کھڑا اتنا عجیب بھی نہیں لگتا جتنا تمہارا بھائی اپنے

دبے ہوئے رنگ کی بدولت میرے ساتھ کھڑا ہوا لگتا ہے۔" اس کا لہجہ بے حد تضحیک آمیز اور کاٹ دار تھا۔ فارہ کا چہرہ دھواں دھواں ہو کر رہ گیا۔ اگلے کئی ثانیوں تک وہ کچھ بھی بولنے کے قابل نہیں ہو سکی تھی پھر خود کو خاصی دقت سے سنبھال کر بولی تو لہجہ نارمل تھا۔

"بھائی کی رنگت سانولی ہے مگر وہ پُرکشش نظر آتے ہیں حرم! پھر سب سے اہم بات یہ کہ تمہیں بہت چاہتے ہیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ ہمارے بزرگوں کی خوشی بھی اسی میں ہے......"

"میں نے تمہیں اپنے بھائی کی شان میں قصیدہ پڑھنے کو نہیں کہا، اطلاعاً عرض ہے، محترمہ یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔" اس نے فارہ کی بات کاٹی۔

"وہ اور معاملہ ہے اسے چھوڑ دو۔" فارہ نے ایک گہری سانس کھینچی اور خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور اس سے نگاہیں چار کیے بنا اسی سنجیدگی سے بولی تھی۔ حرم کو عجیب سی آگ لگ گئی تھی اس جواب سے جبھی تند لہجے میں بول پڑی۔

"کیا وہ محبت کا معاملہ نہیں ہے؟ اور کیوں چھوڑ دوں اسے؟" فارہ نے بے بسی کا شکار ہوتے ہوئے اسے دیکھا جو بہت کچھ جانتے ہوئے بھی دانستہ اس کی اذیت کا سامان کر رہی تھی اور پیچھے ہٹنے پر آمادہ بھی نہیں لگتی تھی۔

"بتاؤ مجھے؟ کیا کمی ہے ارسلان بھائی میں......؟ آرمی میں کیپٹن ہیں، ہینڈسم ہیں اور سب سے بڑھ کر تمہارے خواہش مند ہیں۔" اس کا لہجہ صاف طنزیہ ہوا تھا۔ فارہ نے ہونٹ بھینچے اور جلتی ہوئی نظریں اس پر جمائیں۔

"کمی تو میرے بھائی میں بھی کوئی نہیں ہے...... وہ بھی پڑھے لکھے ہیں، اچھی پوسٹ پر ہیں، اور......"

"اللہ کے واسطے اب ہینڈسم نہ کہہ دینا...... مانا باقی کی خوبیاں ہوں گی مگر اس معاملے میں بہت غریب ہے تمہارا بھائی...... مجھے آزر پسند ہے، واضح رہے آزر اور تمہارے بھائی کا کسی بھی لحاظ سے موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔" اس کا انداز سراسر تمسخرانہ ہوا تھا۔ فارہ کا چہرہ ایک دم سے بے تحاشا سرخ پڑ گیا۔ وہ کچھ دیر اسے خاموشی سے دیکھتی رہی پھر اک لفظ کہے بغیر وہاں سے جا چکی تھی۔ آج وہ اس کے پھینکے تیروں سے اتنی زخمی ہوئی تھی کہ جواباً اسے سرزنش کرنا، صفائی دینا بھی یاد نہیں رہا۔ اسے لگتا تھا اگر وہ اک پل بھی اس بے حس لڑکی کے آگے ٹھہری تو اپنا ضبط کھو دے گی اور کم از کم وہ اس کے سامنے اپنے آنسو بے مایہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ آزر خان کا تجزیہ اور تعریفیں تو ایسے کر رہی تھی گویا وہ اسے اپنا پرپوزل ہی تو پیش کر چکا ہو۔

☆☆☆

عمر اپنے دھیان میں سلام کرتا اندر آیا تھا مگر وہاں پہلے سے ارسلان کو براجمان پا کر مسکرایا۔ ارسلان کا تپاک ہمیشہ کی طرح تھا وہ اٹھ کر بہت پُرجوش انداز میں گلے لگا تھا اس کے۔

"وعلیکم السلام......! آپ کیسے ہیں؟" عمر نے اس کا لمبا چوڑا... وجیہہ سراپا... نہایت محبت سے اپنے مضبوط بازوؤں میں بھینچا اور مسکرایا۔

"رات کو آیا تھا...... صبح ہوتے ہی یہاں بھاگا آیا مگر لگتا ہے کسی کو ہمارے آنے کی کوئی خوشی نہیں ہوئی۔" اس کی شکوہ کناں نظریں بالخصوص فارہ پر جا پڑیں۔ جو ٹیبل پر ناشتے کے لوازمات سجا رہی تھی۔ اس کی اس حرکت پر وہ بھی عمر کے سامنے بری طرح شپٹا کر رہ گئی۔

"ارے نہیں ڈیئر...... تمہیں غلط فہمی ہوئی ہوگی۔ یہاں سب کے لیے بہت خاص ہو تم۔" عمر جو اپنے سیل فون پر کوئی نمبر پش کر رہا تھا۔ اس کے شکوے کے جواب میں فطری سادگی سے وضاحت پیش کر گیا۔

"ریئلی......؟" وہ فوراً بھل اٹھا تھا اور چمکتی متبسم معنی خیز نظروں سے فارہ کو دیکھا جو بہت خوب صورتی سے اسے نظر انداز کیے ہوئے تھی جبھی اس کا منہ پھر لٹک گیا۔

"کیسے مان لوں میرے بھائی......دو گھنٹے سے آیا بیٹھا ہوں۔ مجھے تو کسی نے چائے کا بھی نہیں پوچھا۔ اب بھی دیکھ لو...... کپ میرے بجائے تمہارے آگے رکھا گیا ہے۔" اس نے نچلا ہونٹ دبا کر مسکراہٹ ضبط کی تھی مقصد صرف فارہ کو کچھ بولنے پر اکسانا تھا مگر وہ ہنوز نظر اندازی کے فارمولے پر عمل پیرا تھی۔ عمر کو ہی معاملہ سنبھالنا پڑا۔

"کیوں بھئی فارہ گڑیا! کیا واقعی مناسب پروٹوکول نہیں ملا ہے کیپٹن صاحب کو؟ بھئی خیال رکھا کرو۔"

عمر کا ہلکا پھلکا لہجہ ارسلان کے چہرے پر خجالت بھری مسکان سمیت لایا۔ جبھی وہاں حرم بھی آ گئی۔

حرم نے دونوں کو خوشگوار موڈ میں ناشتا کرتے دیکھا تو صرف سرد نظروں سے دیکھنے پر اکتفا کیا اور نخوت سے سر جھٹک کر فوراً وہاں سے چلی گئی۔ عمر کے چہرے پر تردد سا پھیل گیا۔ اداس آنکھوں میں الجھن تیر رہی تھی۔

"مجھے لگتا ہے عمر بھائی......! حرم آپ سے خفا ہیں؟" ارسلان کی قیاس آرائی پر عمر چند ثانیوں کو ساکن رہ گیا۔ اگلے لمحے خود کو سنبھال کر نرمی سے مسکرا دیا تھا۔

"نہیں، تمہیں غلط فہمی ہوئی۔ تم سناؤ؟ جاب کیسی چل رہی ہے؟" اس نے جلدی سے بات پلٹی تو فارہ سرد آہ بھر کے رہ گئی۔

"بہت اچھی، آپ کے حوالے سے جو خبر لگی تھی ناں اخبار میں وہ پڑھی تھی میں نے۔ بہت اچھی کاوش ہے آپ کی غریبوں کے لیے اسپتال بنوانے کی۔ اللہ پاک قبول فرمائے۔" ارسلان کے سراہتے لہجے میں حقیقی ستائش تھی۔ جہاں فارہ چونکی وہیں عمر خجل اور خفیف سا نظر آنے لگا۔ کوئی وضاحت نہ ہی کوئی اقرار......البتہ فارہ کے اشتیاق کی کوئی حد نہیں رہی۔

"یہ کب کی بات ہے؟ ہمیں تو پتا بھی نہیں بلکہ بھائی نے ذکر ہی نہیں کیا ہم سے۔" وہ شاکی بھی تھی اور بے تحاشا پُرجوش بھی......عمر کی کامیابی گویا اس کے لیے بھی تمغۂ امتیاز تھا۔ عمر نے اس موضوع کو چلنے نہیں دیا جبھی دانستہ بات بدل دی۔

"کاش آپ نے یہ بات حرم کے یہاں سے اٹھ کر جانے سے پہلے کی ہوتی......اس پاگل لڑکی کو بھائی کی جانب سے عجیب و غریب قسم کی شکایتیں ہیں۔" فارہ کے لہجے میں ملال تھا۔ ارسلان البتہ اس کے اپنائیت بھرے انداز تخاطب پر ضرور خوش ہوا تھا مگر عمر کی موجودگی میں کھل کر اظہار کرنے سے باز رہا۔

"کیا وہ ابھی تک مسٹر آزر خان سے انسپائر ہیں؟ سنا ہے وہ محترم بھی ڈاکٹر ہیں پیشے کے لحاظ سے۔" وہ اچنبھے میں گھِر کر سوال کر رہا تھا۔ عمر کے چہرے پر ایک سپاٹ تاثر ابھرا۔ فارہ نے گہری سانس بھری۔

"ابھی تک سے کیا مراد ہے آپ کی؟" فارہ نے عمر کو نارمل انداز میں ناشتا کرتے دیکھ کر ارسلان سے سوال کیا۔

"یعنی میرا مطلب ہے، یہ انسپائریشن تو ہمیشہ رہنے والی ہے، ویسے آزر خان بندہ ایسا ضرور ہے کہ اسے لائیک کیا جائے مگر اس کی یہ پسندیدگی کچھ قابل اعتراض اس لیے ہو رہی ہے کہ وہ اس وجہ سے حقیقی خوشیوں کے دروازے خود پر بند کر رہی ہے، نہ صرف خود پر بلکہ اپنے سے وابستہ لوگوں کو بھی ہرٹ کر رہی ہے۔" فارہ نے یہ سب کہتے ہوئے عمر کو دیکھا جو کانوں میں گویا کڑوا تیل ڈالے بیٹھا تھا۔ فارہ کو ایک دم سے غصہ آنے لگا جبھی وہ پھٹ پڑی۔

"بھائی آپ کچھ بولتے کیوں نہیں؟ آپ اتنے کول کیوں ہیں آخر؟ وہ آپ کی منکوحہ ہے اور......"

"نہیں...... مجھے برا نہیں لگتا...... شاید اس لیے کہ آزر کو میں خود بھی بہت پسند کرتا ہوں۔ وہ آرٹسٹ ہے اور لوگ اسے لائیک کرتے ہیں۔ میرا خیال ہے اس میں کوئی ایسا برا ماننے والی بات نہیں ہے۔" اندر کی تمام تر کیفیات کو عیاں کیے بغیر وہ بہت رسان سے کہہ رہا تھا۔ ارسلان نے عجیب نگاہوں سے اسے دیکھا جبکہ فارہ کے چہرے پر دبا دبا غصہ تھا۔

"مگر وہ پسندیدگی کے اس راستے پر اندھا دھند جس طرح بھاگ رہی ہے بھائی یہ تشویش ناک امر ضرور ہے...... محترمہ کے مستقبل کے ارادوں کا شاید آپ کو پتا نہیں...... شوبز میں نام کمانا چاہتی ہیں، آزر خان کے ساتھ کام کرنے کے خواب دیکھتی ہیں محترمہ...... بقول اس کے وہ اس گھر کے دیگر مکینوں کی طرح کنویں کی مینڈک نہیں بنے گی۔" غصیلے انداز میں وہ تیز تیز بول گئی۔ عمر نے بے اختیار نظریں چرالیں۔

"میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں، اگر چاچو، چاچی جان کو کوئی اعتراض نہیں ہے تو......"

"یعنی وہ شوبز میں جائے، کام کرے، آپ کو اعتراض نہیں ہوگا؟" فارہ شاکڈ سی عمر کو دیکھ رہی تھی۔ عمر نے گہری سانس بھر کے کاندھے اچکائے۔

"میں اعتراض کیوں کروں گا؟ میں آج تک اس کے راستے کی دیوار بنا ہوں نہ بننے کا ارادہ ہے، اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی پسند کا راستہ چن لے۔" اب کی مرتبہ عمر کا لہجہ دھیما، مدھم اور عجیب سی یاسیت لیے ہوئے تھا جسے فارہ ہی محسوس کرسکتی تھی۔ وہ خاموش مگر افسردہ نظروں سے اسے دیکھتی رہی...... پھر نم آنکھیں جھپکتی تیزی سے اٹھ کر وہاں سے چلی گئی۔

"اگر حرم نے میرے بھائی کا دل ہمیشہ کو دکھا دیا تو میں کبھی اسے معاف نہیں کروں گی۔" سارا دن وہ یہی سوچ کے خود سے عہد باندھتی رہی تھی جبکہ دوسری جانب عمر حسن تھا۔ جس کے اندر آج کی باتوں کے بعد عجیب سی بے چارگی و بے مائیگی اتر آئی تھی۔ وہ فارہ کی طرح جذباتی نہیں تھا...... نہ اپنے جذبوں میں بے اختیار...... اسے خود پہ بھی اختیار تھا اور وہ اپنے جذبات کی پامالی ہرگز برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اب بھی جب وہ ان کے ہاں عارضی طور پر رہنے آئی تھی تو ساتھ میں آزر خان کے بڑے بڑے پوسٹرز بھی اتار کر لانا نہیں بھولی تھی۔ جب وہ بہت ذوق شوق سے انہیں کمرے کی دیواروں پر سجانے میں مصروف تھی۔ فارہ خاموش نہیں رہ سکی۔

"چند دن کی بات تھی، کیا ضرورت تھی ان تصویروں کو اٹھا کر لانے کی...... نری فضولیات۔"

"خبردار...... جو آزر کو کچھ کہا...... اور سنو...... اب یہی تو ضرورت تھی۔ یہی بات ہے تمہارے بھائی کی شکل اتنے دن دیکھنے اور سہنے کا حوصلہ نہیں تھا مجھ میں...... فریش نیس کا یہ سامان ضروری تھا۔" اور عمر جو کسی کام کی غرض سے فارہ کو بلانے آیا تھا اتنی بات سن کر ہی الٹے قدموں مڑ گیا تھا۔ دکھ کی بات حرم کے الفاظ نہیں اس کا جتلاتا لہجہ تھا۔ وہ اس کی دروازے میں جھلک دیکھ لینے کے بعد ہی اتنی سفاک ہوئی تھی پھر اس کے بعد بھلا گنجائش تھی کہ وہ کوئی خوش فہمی پالتا، کوئی خواب بنتا...... فارہ تو پاگل تھی، اس کی امیدیں بھی اس کی طرح سادہ اور معصوم تھیں جبکہ وہ نہ تو احمق تھا نہ ہی خوش فہم......

☆☆☆

"جان چھوڑ دو بھئی اس کی...... اب ذرا پڑھائی بھی کرلو۔ ایگزامز نزدیک ہیں تمہارے۔" اسے ٹی وی میں مگن دیکھ کر فارہ جو اس کی لان کی شرٹ سی رہی تھی ٹوکتے ہوئے بولی۔

"یار یہ آزر کو کیا سوجھی؟"

"کیا ہو گیا......؟ خیریت؟" وہ شرٹ مشین

جب میرے کفیل میرے والدین تھے اور میں نابالغ ......ایسے نکاح کو لڑکی کی مرضی ہوتی ہے کہ وہ بالغ ہونے کی صورت میں قائم رکھنا چاہتی ہے یا نہیں؟" ایک ایک لفظ چبا کر کہتی وہ اس قدر بے حس، لاشعور، سفاک اور بے لحاظ لگی تھی عمر کا چہرہ تمام تر ضبط، تحمل اور برداشت کے باوجود دھواں دھواں ہو کر رہ گیا تھا۔ جبھی وہ فی الفور خود کو نہیں سنبھال سکا اور کچھ کہے بغیر وہاں سے ہونٹ بھینچتے ہوئے تیز قدموں سے واپس چلا گیا۔ اس کے بعد فارہ اور حرم کے درمیان کیا اور کس طرح بات ہوئی وہ نہیں جانتا تھا۔ وہ جاننا بھی نہیں چاہتا تھا۔ حرم کی اس قسم کی فضول اور بے تکی باتوں اور حرکتوں کو آج سے قبل وہ اس لیے بھی نظر انداز کرتا رہا تھا کہ اس کے خیال میں وہ ابھی کم عمر اور ناسمجھ تھی۔ اتنی چھوٹی عمر میں لڑکیاں ویسے بھی نادان اور بہت جذباتی ہوتی ہیں مگر اس طرح قدم قدم پر اسے حقیر گردانا اور بے مایہ کرنا بھی اسے زیب نہیں دیتا تھا، کتنی دیر وہ ٹہل ٹہل کر اپنے اندر جل اٹھنے والے الاؤ کو بجھانے کی سعی کرتا رہا تھا۔ تب ہی دروازے پر دستک ہوئی اور فارہ اجازت لیتی اندر داخل ہو گئی۔ عمر نے جھک کر سگریٹ دراز سے نکالنے کے بہانے گویا اپنے تاثرات اس سے مخفی رکھنے چاہے۔

"آئی ایم سوری بھائی......" وہ اس کے بازو سے آکر لگتے ہی سسکی۔ عمر نے کچھ کہے بغیر اس کا سر سہلایا تھا۔

"وہ بہت بدلحاظ ہو رہی ہے...... مجھے ڈر لگتا ہے، اس کا کوئی الٹا سیدھا قدم اس خاندان کو نہ بکھیر کے رکھ دے۔ آپ بھی کچھ نہیں کہتے ہیں اسے......" وہ الٹا اس سے شاکی ہونے لگی۔

"تم پریشان نہ ہو...... اس پر کوئی جبر کوئی دباؤ نہ ڈالو۔ فارہ یہ رشتے ایسے قائم رہتے بھی نہیں ہیں۔" عمر نے نرمی سے اسے سمجھایا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرنے لگے۔ یہ خیال بہت سوہان

سے نکال کر قینچی سے دھاگا کاٹتے ہوئے بولی۔

"اتنی فضول لڑکی ہے بسمہ...... اس کے ساتھ منگنی کر رہا ہے۔" اس کے لہجے میں تاسف اور... ملامتی تھی جبکہ وہ بے نیاز رہی۔

"ہاں تو کیا ہوا......؟ مرضی کا مالک ہے ہر کوئی؟" فارہ کا انداز لاشعوری طور پر جتلانے والا ہو گیا۔

"بالکل ہی احمق ہے آزر...... اتنی جلدی کیا ہے کی ہے...... آخر بسمہ میں ہے کیا جو اسے نظر آیا؟" سخت مضطرب لگ رہی تھی وہ ہر انداز سے...... ہونٹ بے دردی سے کچلتی...... گلابی نازک مومی انگلیاں مروڑتی فارہ کو بھی اس پر رحم آیا۔

"تمہارے اس طرح خود کو ہلکان کرنے سے کیا وہ یہ احمقانہ فیصلہ نہیں کرے گا؟ رحم کرو کچھ خود پر کیونکہ تم میرے بھائی کی امانت ہو۔"

فارہ کی اس درجہ فضول بات پر وہ اتنا جھلائی کہ جو ہاتھ لگا اس کی طرف پھینکتی چلی گئی۔ یہ شکست اس وقت مزید بے حال کر گئی تھی جب اس نے دروازے میں کھڑے عمر حسن کو دیکھا تھا جبھی خفت مٹانے کو اس پہ الٹ پڑی۔

"ایٹی کیٹس کسی چڑیا کا نام ہے۔ ذرا اس پر بھی دماغ کھپا لیا ہوتا...... ہونہہ...... کسی کے کمرے میں آنے سے پہلے غالباً دستک دینی چاہیے۔" لال بھبوکا چہرہ غصیلی آنکھیں...... اس کا بس نہ چلتا تھا کہ کیا کر لے۔

"مائنڈ اٹ محترمہ...... یہ ان کی بیوی کا کمرا ہے، جس میں آنے سے قبل اجازت کی وضع قانون نافذ کرتا ہے نہ ہی شریعت......" اس سے قبل کہ عمر کچھ بولتا فارہ نے بہت خوبی سے اس کی طبیعت صاف کر دی تھی حرم کا چہرہ اس جتلاتے ہوئے انداز پر مزید تپ گیا۔

"تم بھی غور سے سن لو، بیوی نہیں منکوحہ...... اور واضح رہے کہ یہ نکاح بھی میری نادانی کا نتیجہ تھا۔"

سوچ تھا کہ وہ دونوں خدانخواستہ ایک نہیں ہوں گے۔

"پہلے وہ اتنی بدتمیزی نہیں کرتی تھی مگر اب...... بھائی مجھے کبھی کبھار لگتا ہے وہ آپ کی توجہ کی خواہش میں یہ ساری فضول اور اوٹ پٹانگ حرکتیں کرتی ہے، ہے ناں......؟" وہ کسی خیال میں گم ہوتی کہہ رہی تھی۔ عمر حسن کے چہرے پر بہت تلخ قسم کی مسکراہٹ ابھری۔

"خوش فہمی کی حد بھی تم پر ہی ختم ہوتی ہے، احمق لڑکی......" اس کا ایک ایک لفظ زہر میں ڈوب کر ابھرا تھا جیسے، فارہ خفت زدہ سی ہوگئی۔

"نہ سہی...... لیکن آپ اسے ڈانٹیے گا ضرور...... اپنے رشتے کا استحقاق استعمال کریں بھائی...... اگر ڈانٹ نہیں سکتے تو پھر بھی اس سنجیدگی کے دائرے سے نکل کر اس پر بہت توجہ...... بہت محبت لٹا کر ضرور پرکھیے گا اسے۔ آئی ایم شیور...... وہ بہت مثبت رسپانس دے گی۔" اس کا لہجہ بہت مضبوط اور پُر یقین تھا وہ محض سر جھٹک کر رہ گیا۔ اس نے کہا نہیں تھا مگر وہ رشتوں میں زور زبردستی اور جبر کا بھی قائل نہیں رہا تھا اور وہ بھی میاں بیوی کا رشتہ......

☆☆☆

وہ سب ماموں کی طرف آئے ہوئے تھے۔ آج سائرہ (ارسلان کی بہن) کی مایوں کی تقریب تھی۔ حرم کی سج دھج دیکھنے والی تھی۔ سلور کلر کے لہنگے کے ساتھ پرل کا سیٹ، بالوں کا بہت خوب صورت اسٹائل بنا رکھا تھا۔ اس پر موتیے کے گجروں کی کلائیوں میں بہاریں...... وہ صحیح معنوں میں حواسوں پر سحر طاری کر رہی تھی۔ فارہ نے تو اسے دیکھتے ہی بالکل ماما کے انداز میں ہی اس کی بلائیں لی تھیں پھر شوخی سے آنکھیں گھما کر بولی تھی۔

"اُف...... اتنی قہر سامانیاں، آج بے چارے میرے بھائی کی خیر نہیں ہے، حسن کے سارے ہی ہتھیار تیز کرلیے تم نے۔" اور وہ جواب میں ناک چڑھا کر رہ گئی۔

"ہونہہ...... بات تو تم اس طرح کر رہی ہو جیسے مجھے ہی تو دیکھیں گے بس وہ محترم......" اور فارہ کو یہ ناز بھرا شکوہ ہی لگا تھا۔ جبھی جی جان سے خوش ہوگئی تھی۔

"ہوں...... بات تو تم بھی ایسے کر رہی ہو جیسے کبھی کسی موقع پر تم نے انہیں کسی اور پر لائنیں مارتے پکڑا ہو۔" اس کے لہجے کی شوخی اس کے الفاظ سے عیاں تھی اور حرم نے جواب میں نخوت سے ناک چڑھائی تھی اور کسی قدر سرد انداز میں گویا ہوئی۔

"نہیں بھئی...... یہ الزام تو میں واقعی نہیں لگا سکتی۔ شریف واقع ہیں وہ کہ کبھی مجھ پر بھی لائن نہیں ماری۔" وہ گویا اس کا مذاق اڑا کر ہنسی تھی۔

☆☆☆

آج آذر خان کی اسمٰہ خاتون سے باقاعدہ منگنی کی تقریب ہو رہی تھی۔ وہی شو بز کے چونچلے اور ادائیں، میڈیا پورا پورا ساتھ دے رہا تھا۔ لمحہ لمحہ کی خبریں...... بلکہ ایک نجی چینل تو تقریب کو براہ راست نشر کر رہا تھا۔ حرم سارا دن کمرے میں بند ٹی وی دیکھنے میں مصروف رہی اور ساتھ جلنے کڑھنے میں بھی۔ اگلی صبح یونیورسٹی جانے کو تیار ہو کر باہر آئی تو چہرہ سُتا ہوا جبکہ آنکھیں بے خواب لگ رہی تھیں۔ فارہ نے کن انکھیوں سے اسے دیکھتے اس خبر کو خوب مرچ مسالا لگا کر سب کو سنایا تھا۔ مقصد اسے دکھ دینا نہیں...... اس پر کچھ باور کرانا تھا۔ حرم چپ چاپ اپنا بیگ اٹھائے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"او کے چاچی...... اب اجازت دیجیے۔" وہ ان کے آگے جھکی۔

"فی امان اللہ! میری بچی......" انہوں نے اس پر آیت الکرسی پڑھ کر پھونک ماری اور پیشانی چوم لی۔ وہ باہر نکلی تو فارہ نے جانے کب کی سینے میں اٹکی ہوئی سانس آزاد کی۔

''آنکھیں دیکھیں اس کی ماما...... مائی گاڈ...... جیسے روتی رہی ہو...... مجھے تو اب ڈر لگنے لگا ہے۔'' فارہ نے جھرجھری سی لی تھی۔ ماما نے سیب کاٹتے ہوئے چھری ہاتھ میں رکھ دی۔

''پریشانی کی بات نہیں ہے کوئی...... سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بچیاں اس عمر میں ایسی ہی جذباتی حرکتیں کر جاتی ہیں۔'' ان کی بات پر فارہ کو خفقان سا ہونے لگا۔

''آپ ہی عمر بھائی کو کچھ سمجھائیں......'' اس کے زور ڈالنے پر ماما نے الجھ کر اسے دیکھا۔

''مطلب کیا سمجھاؤں؟'' وہ حیران تھیں۔

''یہی کہ حرم سے کھل کے بات کریں، وہ آخر اس طرح انہیں اگنور کیوں کر رہی ہے۔''

''ہاں میں کہوں گی عمر سے بھی...... اور خود بھی کروں گی بات حرم سے...... تم پریشان نہ ہو۔'' وہ مسکرائیں تو فارہ گہری سانس بھر کے رہ گئی۔

☆☆☆

''بھائی ایک منٹ رکیے......'' فارہ کے پکارنے پر وہ جو بہت اہم کیس کی فائل کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھا چونک کر متوجہ ہوا۔ فارہ سامنے بیڈ پر ٹک گئی تھی یعنی تسلی سے بات کرنے کے موڈ میں تھی۔ جبھی عمر نے فائل بند کر کے سائیڈ پر رکھ دی اور اس کا لایا کر رکھا چائے کا مگ اٹھا لیا۔

''آپ اسپیشلائزیشن کے لیے کیوں نہیں جاتے آخر؟'' وہ بے حد سنجیدگی سے سوال کر رہی تھی مگر عمر اس قدر اچنبھے میں گھر گیا۔

''خیریت...... تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''اِک بات مانیں گے بھائی؟'' عمر محض اسے دیکھ کر رہ گیا۔ اس کی نظروں کا انداز ایسا تھا کہ بنا کہے اس کا مطالبہ جان گیا ہو جبھی بے حد خاموش بیٹھا رہا۔

''آپ مزید پڑھنے کے لیے باہر چلے جائیں بھائی...... پلیز بھائی میری بات مان لیں۔''

''تم کیا سمجھتی ہو فارہ...... اگر میں ایسا کرلوں گا تو حرم اپنی چوائس بدل لے گی؟'' وہ جتنی بچی ہوئی تھی عمر اسی حد تک تلخ اور سفاک ہو گیا۔ سوال اور نظریں ایسی تھیں کہ فارہ کی نظریں شرمندگی سے جھک گئیں۔ اس کے لہجے کا ان کہا کرب جیسے پھانس بن کر فارہ کے دل میں پیوست ہو گیا تھا۔

''بھائی میں......'' اسے عمر کا یوں بکھرنا اچھا نہیں لگا تھا جبھی کچھ کہنا چاہا مگر الفاظ اس پل ساتھ چھوڑ گئے تھے۔

''چھوڑ دو فارہ گڑیا سب۔ بس جانے دو، جو جیسا ہے اسے چلنے دو، ہم اپنی کسی بھی کوشش سے تقدیر کے لکھے کو نہیں بدل سکتے...... سو بی بریو مائی سس! جو کل ہونا ہے بہتر ہے اس کے لیے خود کو آج تیار کر کے رکھو......'' وہ خود زخم زخم تھا مگر اسے حوصلہ دینے کو لفظ ترتیب دے رہا تھا۔

''آپ کیا سمجھتے ہیں؟ اس طرح اسے آزر خان مل جائے گا آپ کی قربانی سے؟ پالے گی وہ احمق لڑکی اس شخص کو؟ بھائی آزر خان منگنی کر چکا ہے اور......'' وہ بے ساختہ چیخنے لگی تھی کہ عمر نے اٹھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا اور وہ تڑپ کر سسکیاں بھرنے لگی۔

''فارہ...... کول یار...... کیا ہو گیا ہے بیٹے...... ٹیک اٹ ایزی......'' عمر کتنی محبت سے اس کے آنسو پونچھ رہا تھا۔ بے حد توجہ اور نرمی سے دھیرے، دھیرے سمجھاتا ہوا وہ ایک بے حد پیارے دل کا مالک بہت خاص انسان تھا، ہرگز بھی ٹھکرائے جانے کے قابل نہیں مگر یہ بات وہ بے وقوف لڑکی کہاں سمجھتی تھی۔

''تم اپنے دل پر بوجھ نہ ڈالو فارہ...... یقین کرو، مجھے اس سے فرق نہیں پڑتا کہ میری شادی حرم سے ہوتی ہے یا کسی اور سے......'' اسے ساتھ لگائے تھپکتا ہوا جو تسلی وہ بہن کو دے رہا تھا اس میں کس حد تک صداقت تھی یہ وہ بھی بہت اچھے سے جانتا تھا اور

خود فارہ بھی..... جبھی وہ مزید دکھ سے بھر گئی تھی لیکن یہاں خاموش رہ کر بھرم قائم رکھنا تھا۔ جواب اور بھی ضروری ہوتا جا رہا تھا مگر یہ خاموشی کسی کی سلگتی ہوئی روح کو مزید بھڑکانے کا باعث بن گئی تھی جو بہت جوش و خروش کے ساتھ فارہ کے پاس آئی تھی۔ واپس پلٹی تو قدموں سے بے حد شکستگی لپٹی ہوئی تھی اور آنکھیں ہر لمحہ دھند لائی جا رہی تھیں۔ اپنے کمرے میں آ کر وہ بیڈ پر اوندھے منہ گری تھی اور جیسے آنسوؤں کو اپنی من مانی کے لیے آزادی کا پروانہ مل گیا۔ خود پر چڑھایا ہوا خول آج بہت برے طریقے سے چٹخا تھا۔ رنجکشن کا لفظ جتنا تکلیف دہ ہے اس عمل سے گزرنا اس سے کہیں بڑھ کر اذیت ناک..... وہ تو بارہا اس جانکسل کیفیت سے گزری تھی۔ بہت نو عمری سے ہی یک طرفہ محبت کا عذاب اس پر مسلط ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ خود یہاں نہیں تھی مگر اس کے نام کا احساس ایسا بھرپور تھا جو اس کے گرد حصار باندھے رکھتا۔ اس نے ہمیشہ اپنے نام کے ساتھ عمر کا نام سنا تھا۔ ماما، پاپا اس کا تذکرہ اتنے پیار سے کرتے، ایسے اس کے قصیدے پڑھا کرتے گویا وہ دنیا کا سب سے حسین شخص ہو بلکہ جب اس نے اسے دیکھا تو وہ چہرہ دنیا کا سب سے حسین چہرہ نہ ہو کر بھی اسے سب سے زیادہ پیارا ضرور ہو گیا تھا۔ اس کا سامنا حرم کا رنگ متغیر کر دیتا۔ اس کا نام دل کی دھڑکنوں میں انتشار برپا کرتا رہتا۔ لیکن ضروری نہیں جیسا ہم چاہیں ویسا ہو بھی جائے..... یہ خمار اترنے کا باعث وہ باتیں تھیں جو یکے بعد دیگرے ہوئی تھیں۔ ماما کی فرمائش بلکہ بے حد اصرار پر وہ حرم کو ٹیوشن پڑھانے پر آمادہ ہو پایا تھا مگر بہت جلد عمر کو یہ آمادگی اپنی زندگی کی بھیانک غلطی لگنے لگی۔ وہ اسے دنیا کی نالائق لڑکی لگی تھی تو وجہ کچھ حرم کی پڑھائی میں عدم دلچسپی اور لاابالی پن تھا..... دوسری اہم وجہ عمر کی ذاتی الجھنیں تھیں جن کے باعث وہ ہر وقت جھنجلایا رہتا تھا۔ اسی جھنجلاہٹ میں جب اس نے معمولی غلطی پر حرم کو بے دریغ تھپڑ دے مارا تھا تو صحیح معنوں میں حرم کے سنہرے خوابوں کا تاج محل اس درجہ توہین و تذلیل پہ لمحوں میں بکھر کر رہ گیا تھا۔ اہمیت و محبت کے جواب میں ایسی بے رخی و..... بے اعتنائی کا مظاہرہ اس کے دل کو صرف شاکی نہیں کر رہا تھا بلکہ شدید دکھ سے بھی دوچار کر گیا۔ بات اگر یہیں تک رہتی تب بھی ٹھیک تھا۔ کالج میں ایڈمیشن کے بعد جب اسے پک اینڈ ڈراپ کرنے کی ذمے داری بھی عمر پر ڈال دی گئی جسے طوعاً و کرہاً قبول کرتے وہ اسے نصیحت کرنا نہیں بھولا تھا۔

"بات سنو..... کوئی ضرورت نہیں ہے کالج میں کسی کو اپنے اس فضول تعلق کے متعلق ڈھنڈورا پیٹنے کی سمجھیں؟" بے حد روکھے اور سرد انداز میں اسے باور کرایا تو وہ حرم کی آنکھوں سے بچے کچھے خوش فہمی کے باقی ماندہ احساس بھی نوچ کر پھینک گیا تھا۔ اس کے بعد اس حقیقت سے آگاہ ہونا بھی ضروری نہیں تھا کہ عمر نے یہ پابندیاں اس پر کس وجہ سے لگائی تھیں۔ وہ نہ صرف چڑی تھی بلکہ ہرٹ ہوئی تھی..... اس توہین آمیز انداز پر بپھر گئی تھی۔ وہ محبت جو کسی پر بھی آشکار نہ ہوئی تھی۔ ان جذبوں کو اس نے اذیت کی آگ میں جلتے دیکھا تو جواباً انتقام پر اتر آئی۔ نازک، معصوم اور دھیمی اور سبک حرم بہت اکھڑ، ضدی اور بے لحاظ ہو گئی تھی مگر اس کی اصل وجہ سے تو کوئی بھی آگاہ نہیں ہو سکا۔ یہ تو اس کی قسمت اچھی تھی کہ گھر کے سبھی افراد کیئرنگ اور لونگ تھے۔ اس کی بدتمیزی کو اگنور کر کے محبتیں لٹانے میں مصروف..... ایسے میں وہ کہاں تک یہ روش اپناتی جبھی یہ ہتھیار کند ہونے تھے..... مگر عمر کے لیے نہیں..... اس کا عہد تھا خود سے..... اس نے اس شخص کو اپنے سامنے جھکانا تھا..... بکھیرنا تھا مگر الٹا اسے لگنے لگا تھا کہ وہ خود بکھر گئی ہے..... ٹوٹ رہی ہے..... آزر خان اور اس سے وابستہ ہر بے وقوفی سراسر عمر کی توجہ حاصل کرنا، کسی طرح بھی سہی مگر اسے

اس نظر اندازی سے روکنا تھا..... مگر اک وقت آیا تھا جب اسے لگنے لگا ایسی حماقتیں کر کے اس نے خود اپنی راہوں میں کانٹے بچھا دیے ہیں، عمر کی بے نیازی تو کیا ختم ہوئی۔ وہ تو اسے خود سے کچھ اور بھی فاصلوں پر محسوس ہونے لگا تھا..... اور یہ نقصان ایسا نقصان تھا جو اسے گھنٹوں کے حساب سے رُلاتا تھا، جھنجلائے رکھتا تھا اور قارہ کا خیال تھا۔ وہ آزر خان کی کسی اور میں انوالومنٹ سے ہرٹ ہوئی ہے۔

اب کے عمر کے الفاظ اس کے اندر سناٹے اتار گئے تھے..... اسے واقعی اس کے ہونے نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا تھا۔ یہ خیال ..... یہ احساس جتنا بھی ہتک آمیز اور وحشت انگیز سہی مگر وہ کوئی حتمی فیصلہ کرنے پر ضرور مجبور ہو گئی تھی۔ بہر حال اسے عمر بھر کی یہ ذلت یہ نظر اندازی ہرگز گوارا نہیں تھی۔

☆☆☆

اس نے ٹہلنا موقوف کیا اور مضطرب نظروں کو وال کلاک کی جانب پھیرا..... رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ قارہ اس وقت تک لازمی سو جاتی تھی۔ چاچو اور چاچی تو رات کے کھانے کے بعد ہی اپنے کمرے میں چلے جاتے تھے۔ ان کی مداخلت کا ہرگز خدشہ نہیں تھا۔ گہری سانس بھر کے اس نے خود کو قدرے کمپوز کیا اور آگے بڑھ کر احتیاط سے دروازہ کھولا۔ راہداری نیم تاریک اور سنسان تھی۔ مدھم روشنی میں میرون کارپٹ کا گلابی ڈیزائن موتیوں کی طرح چمکتا نظر آتا تھا۔ جسے روندتی ہوئی وہ بے آواز قدموں سے آگے بڑھتی عمر حسن کے کمرے کے دروازے پر آن رکی۔ دستک کو اٹھا ہاتھ پھر سے احتیاط کا دامن تھامتا پہلو میں گر گیا۔ مدھم سی آواز پیدا کر کے بھی وہ کسی کو چونکانے کے حق میں نہیں تھی۔ یہ احتیاط اس امر میں رازداری کی اہم ضرورت تھی۔ تاب تھما کر اس نے دروازہ پش کیا اور ڈوبتے دل کے ساتھ اندر قدم رکھ دیا مگر پہلے ہی مرحلے پر شرمندگی اور بوکھلاہٹ سے دوچار ہونا پڑا تھا۔

"کون .....؟" وہ ڈریسنگ روم سے ہی پوچھنے لگا۔

"سوری میں کچھ دیر میں آ جاتی ہوں۔" اس کی آواز پر وہ واپس پلٹ گئی۔

"مجھے وائٹ ڈریس کی شرٹ ہی نہیں مل رہی..... پتا نہیں قارہ نے دھلائی کے بعد میرے کپڑے واپس کیوں نہیں رکھے۔ وارڈ روب میں..... پلیز تم میری مدد....." حرم ان سنی کیے تیزی سے نکل آئی۔ دل خالی سا تھا مگر اب اس میں عجیب الجھن سی بچ رہی تھی۔ ہونٹ کچلتے ہوئے وہ واپس اپنے کمرے میں آ کے صوفے پر ڈھے گئی۔ یہ فیصلہ ہرگز بھی آسان نہیں تھا۔ محض انا کی سربلندی کی خاطر وہ ہمیشہ کی دستبرداری اختیار کر سکتی تھی اس سے۔ عمر حسن کی عمر بھر کی ناگواری کو سہنا بھی آسان نہیں تھا۔ وہ اس گہری اذیت سے خود کو بچانا چاہتی تھی۔ اس سے دور بہت دور جا کے..... یہ ضروری تھا اس کے لیے۔

"خیریت.....؟ مجھے لگا تمہیں کوئی کام تھا مجھ سے..... میں نے مناسب سمجھا پوچھ لینا....." اس کی سوچوں کے بہاؤ کو روکنے کا باعث دروازے پر دستک کے بعد ابھرنے والی عمر حسن کی بھاری آواز تھی۔ وہ سلیپنگ گاؤن میں ملبوس آنکھوں میں نیند کے خمار کی سرخی لیے کتنی سنجیدگی سے متوجہ تھا اس کی جانب..... حرم چند ثانیوں کو کچھ بولنے کے قابل ہو سکی نہ اس سے نگاہ ہٹانے کے۔

"اچھا کیا آپ نے ..... یہاں تشریف لے آئے اگر یہ زحمت کر ہی لی ہے تو....." اس نے پہلے خود کو سنبھالا تھا پھر اپنے دل اور نظروں کو قابو میں کرنے کے بعد اپنے مخصوص کاٹ دار لہجے میں گویا ہوئی تھی۔ عمر نے کچھ توقف کیا پھر قدم بڑھا کر کمرے میں اس کے مد مقابل صوفے پر آ بیٹھا..... اتنا تو وہ بھی جان گیا تھا حرم نے اگر رات کے اس پہر کا انتخاب کیا

ہے تو وہ گھر کے افراد کے سامنے یہ بات کہنے سے گریزاں ہو گی۔ اس نے اپنی سوالیہ نگاہوں کو حرم کے چہرے پر جمایا تھا گلابی چہرہ اس پل متورم اور سُتا ہوا لگتا تھا۔ نم پلکوں کا بوجھل پن دلکشی سمیٹے ہوئے تھا۔

گلابی پھول سی لڑکی

اس کے ذہن میں اِک نظم کا مصرعہ گردش کرنے لگا۔

''تمہیں اندازہ تو ہو گیا ہو گا عمر حسن کہ ہم ذہنی اعتبار سے بہت فاصلے پر ہیں، مجھے نہیں لگتا کہ ہم دونوں اس بندھن کو نبھا سکیں گے جو بہت پہلے ہمارے بزرگوں نے باندھ دیا تھا۔ ہماری رضامندی کو اہمیت دیے بغیر......'' وہ جیتنے رسان سے گویا ہوئی تھی، عمر کا چہرہ اسی تیزی سے پھیکا پڑنے لگا۔

''تم میری ناپسندیدگی سے آگاہ تو ہو چکے ہو گے...... ایسے میں تم چاہو گے کہ زبردستی مجھے اپنے ساتھ لے کر چلو......؟'' یہاں اس مقام پر جب وہ سب ہار رہی تھی...... اس نے اپنی عزتِ نفس، انا اور خودداری کو پھر بھی ہارنے نہیں دیا تھا۔ عمر حسن نے ہونٹ بھینچ لیے تھے...... اتنی بے دردی سے اتنی سختی سے کہ منہ میں خون کا نمکین ذائقہ گھلتا محسوس ہونے لگا۔ وہ خاموش تھا، ساکن اور سکتہ زدہ...... وہ جانتا تھا یہ وقت اس کی زندگی میں آنا ہے، اس کے باوجود وہ خود کو تیار نہیں کر سکا تھا تو یہ لازماً اس کی اپنی غلطی تھی۔

حرم نے اس کی جامد خاموشی پہ اسے بغور دیکھا تھا۔ اس مقام پر جب وہ سب ہارنے پر آمادہ تھی مگر دل کے کسی کونے میں ایک خواہش بھی تھی۔ وہ روایتی مشرقی مردوں کی طرح ری ایکشن ضرور دے...... چیخ جائے، اسے بھلے تھپڑ رسید کر ڈالے...... مگر اس پر اپنا حق جتائے اور اس کا مطالبہ ماننے سے صاف، صاف انکاری ہو جائے...... اس کی رضا پہ اپنی مرضی کو ترجیح دے اور اس کی ماننے سے صاف انکار کر ڈالے مگر یہ سب تب ہوتا اگر عمر حسن کو اس کی ضرورت ہوتی۔ اس کے الفاظ نے ثابت کیا تھا، اسے اس کی ضرورت کبھی تھی نہ ہو گی۔

''ہاں، میں آگاہ ہوں...... اور زبردستی کا قائل بھی نہیں، تم بے فکر رہو میں وہی فیصلہ کروں گا جو تمہاری خواہش کے مطابق ہو۔'' اپنی بات مکمل کر کے وہ اس کے تاثرات دیکھے بغیر چلا گیا تھا۔ حرم...... بے مائیگی اور شکستگی کے احساس سمیت اس کمرے سے نکل کر پھوٹ پھوٹ کر روتی چلی گئی۔ اس کا آخری وار بھی بیکار گیا تھا۔ وہ ایک بار پھر جیتنے کی خواہش میں بری طرح لٹ گئی تھی۔ مکمل طور پر ہار گئی تھی۔

☆☆☆

''مجھے ان باتوں سے ہرگز کوئی مطلب نہیں ہے ماما...... میں بس اتنا جانتی ہوں کہ آپ فوراً سے بیشتر واپس آ جائیں، میں یہاں نہیں رہنا چاہتی، ایک منٹ بھی نہیں۔'' کسی دھیان میں اندر آتی ہوئی فارہ نے اس کی غصے سے چھلکتی تند و تیز آواز سنی تھی تو ایک دم جیسے دھک سے رہ گئی۔ وہ سیل فون پر محو گفتگو تھی۔ چہرہ غم و غصے کی زیادتی سے جیسے انگارہ ہو رہا تھا تو آنکھیں خون چھلکانے پر آمادہ لگتی تھیں۔ دوسری جانب ماما نے کیا کہا تھا فارہ کو علم نہیں ہو سکا کہ وہ تو اس کی آخری بات کو سن کر ہی شدید قسم کی تشویش میں مبتلا ہو چکی تھی۔

''وجہ بتانا اتنا ضروری نہیں ہے، کیا یہ کافی نہیں ہے کہ میں یہاں رہنا نہیں چاہتی...... اور سن لیں میرا دماغ ہرگز بھی خراب نہیں ہوا ہے۔'' اب کے وہ چیخنے کے انداز میں کہہ رہی تھی مگر گلے میں اترتی نمی نے اس کی آواز بے تحاشا بوجھل کر دی تھی۔ دوسری جانب ماما نے اس مطالبے پہ یقیناً اسے جھاڑ پلائی تھی جبھی وہ ایک دم سے سلسلہ منقطع کرتی طیش میں سیل فون دیوار پر کھینچ مارنے کے بعد یقیناً اگلا اقدام دھواں دھار انداز میں رونے کا انجام دینا چاہتی تھی کہ اس پر نگاہ پڑتے ہی چہرے کو دھواں ہونے سے نہیں بچا سکی۔

''اتنی خفا کیوں ہو حرم؟'' اسے تیزی سے پلٹ کر

باہر جاتے دیکھ کر وہ بے حد لجاجت اور عاجزی سے بولی تھی۔ حرم کے آنسو گالوں پر اتر آئے۔ فارہ کو ان آنسوؤں نے شدید قسم کے کرب سے دوچار کر ڈالا تھا۔

"اگر ہماری کوئی بات بری لگی ہے تو میں معافی مانگ لیتی ہوں۔" اس کی اپنی آواز بھیگنے لگی۔ اسے ابھی ابھی اندازہ ہوا تھا حرم کتنی عزیز ہے اسے۔ اپنی تمام تر بے اعتنائیوں اور بے رخی کے باوجود بھی۔

"تمہیں اگر معاف کر بھی دوں ناں فارہ تو تمہارے بھائی کو نہیں کر سکتی۔ شدید نفرت ہے اس سے مجھے، صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتی ہوں میں اس کی۔ اسی لیے یہاں سے جانا چاہتی ہوں، سنا تم نے......؟" وہ نمی بھرے لہجے میں غرائی تھی اور کترا کر بھاگتی چلی گئی جبکہ فارہ سکتے کے عالم میں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ وہ اپنے گھر چلی گئی تھی۔

☆☆☆

اس کی ضد اور خودسری کے سامنے وہ سب بے بس نظر آ رہے تھے۔ چاچو تک بھی یہ بات پہنچی تھی اور چاچی...... یہ پہلا موقع تھا کہ حرم کے اتنے شدید رویے کے باوجود وہ حرم سے متنفر نہیں ہوئیں بلکہ اسے بہلانے اور منانے کی کوشش میں مصروف رہیں۔

"ان سب باتوں کا اب کوئی فائدہ نہیں ہے فارہ! فارگیٹ اٹ......" فارہ کی دلجوئی سے بھی وہ نارمل نہ ہو سکی۔ یہ سب کہتے ہوئے جتنی مایوسی اس کے لہجے میں اتری تھی فارہ کو اس نے مزید اپ سیٹ کر دیا تھا۔ کچھ کہے بغیر وہ اس کے سامنے سے ہٹ گئی تھی اور مسلسل عمر کا نمبر ملا کر ایک ہی تقاضا کرتی رہی۔

"آپ فوری طور پر گھر آ کے میری بات سنیں۔"

"خیریت......؟ تم اتنی پریشان کیوں ہو؟" جواب میں عمر حسن اچنبھے میں گھر گیا۔

"یہ تو آپ کو روبرو ہی بتا سکتی ہوں میں...... بس گھر آ جائیں فوراً ورنہ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔" اس کے ضبط نے جواب دیا تو وہ صرف چیخی نہیں تھی...... سسکیاں بھی بھرنے لگی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ محض آدھے گھنٹے بعد عمر حسن اس کے سامنے تھا۔ تمام تر پریشانی و تشویش کے آثار چہرے پر سجائے ہوئے۔

"فارہ......!" "تم ٹھیک ہو ناں، کیا ہوا ہے؟" اس کا اضطراب چھلکا پڑتا تھا۔

"اس بات کو چھوڑیں، یہ بتائیں آپ گھر کیوں نہیں آ رہے تین دنوں سے؟ کس سے بھاگ رہے ہیں؟ اور حرم کو کیا کہا آپ نے کہ وہ یہاں سے جانے پر مجبور ہو گئی۔" فارہ کی نظریں اس کے چہرے پر جس مشکوک انداز میں جمی تھیں اس کے الفاظ کی نسبت عمر کو ان نظروں کے شاکی...... انداز نے تکلیف سے دوچار کیا تھا۔

"حرم کے تمام فیصلے اس کی ذاتی سوچ اور پسند کے مطابق ہوتے ہیں، میرا ان میں ہرگز بھی کوئی عمل دخل نہیں...... میں تمہیں پہلے بھی سمجھا چکا ہوں، بہتر ہے تم خود کو اس معاملے سے الگ رکھو۔" وہ بولا تو اس کا لہجہ بے حد سرد اور غصیلا ہو رہا تھا۔ فارہ تو اس کو اتنے غصے میں دیکھ کر ہی ششدر ہونے لگی۔

"بات سنیں بھائی......! آپ میری بات کا جواب دیے بغیر نہیں جا سکتے۔ اس لیے بھی کہ میں پہلی بار حرم کو نہیں آپ کو غلط سمجھ رہی ہوں۔ اس رات میں نے خود آپ کو آدھی رات کے بعد حرم کے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔ حرم کے اس فیصلے کے پیچھے یقیناً یہی وجہ......" عمر جو دروازے تک پہنچ گیا تھا کچھ ایسے زمین میں گڑا کہ ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکا۔ بہن کے الفاظ نے اسے عرق ریز کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ نظریں نہیں اٹھا سکا، اس کی سماعتیں سنسنا رہی تھیں۔ ہونٹ بھینچے وہ ایک لفظ کہے بغیر پلٹا تھا اور راہ میں آئی ہر شے کو ٹھوکروں کی زد پہ رکھتا بے حد خطرناک موڈ میں جس وقت حرم کے سامنے آیا وہ سر درد کی دوا لینے کے ارادے سے کچن میں آئی تھی مگر اسے سامنے پا کر وہ بھی نہایت خوفناک تاثرات کے ساتھ چند لمحوں کو

خائف ہو کر رہ گئی۔

''چلو میرے ساتھ.....'' اس نے حرم کا ہاتھ دبوچ کر گھسیٹ لیا۔

''کیا بدتمیزی ہے یہ...... چھوڑ دو مجھے۔'' وہ حواس باختہ ہو کر چیخی۔

''تم خود وضاحت کرو گی جو بھی بکواس تم نے فارہ کے سامنے کی ہے سمجھیں؟'' اس کی کلائی کو زوردار جھٹکا دیتے ہوئے وہ دبے ہوئے لہجے میں جواباً چلایا تو حرم کی گھبراہٹ الجھن میں بدلنے لگی۔

''واٹ نان سینس..... مجھے کچھ بھی سمجھ نہیں آرہی تم کیا چاہتے ہو اور دوسری بات یہ کہ اپنی حد میں رہو۔ میں تمہارا گھر چھوڑ کر یہاں آئی ہوں تو اس کا صاف مطلب یہی نکلتا ہے مجھے تمہاری شکل ہی نہیں دیکھنی۔'' اس کے لہجے میں جتنی بھی تلخی اور نخوت تھی وہ اس کے لیے تیار تھا مگر عمر اس پل جیسے تمام لحاظ بھلائے بے حد بھڑکے ہوئے انداز میں اسے بازوؤں سے جکڑ کر اشتعال بھرے انداز میں اپنے روبرو گھسیٹ لایا۔

''تم نے علیحدگی چاہی تھی مجھ سے...... میں یہ تمہارا مطالبہ ضرور پورا کر دیتا اگر تم نے اپنا دامن صاف رکھنے کی خاطر مجھ پر کیچڑ نہ اچھالا ہوتا...... میں رات کو تمہارے کمرے میں غلط ارادے سے گھسا تھا اسی لیے تمہیں میرا گھر چھوڑ کر آنا پڑا؟ محترمہ حرمت صاحبہ! یہ فضول کہانی سناتے آپ کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے تھا کہ آپ میری منکوحہ تھیں، میرا عمل کسی بھی لحاظ سے ناجائز نہیں تھا۔ جسے آپ نے ناجائز بنا کر پیش کیا گو کہ تم بھی جانتی ہو میرا ارادہ کیا تھا مگر اس کا بہتان تم اس طرح تھوپو گی کہ میں اب ہرگز بھی تمہارے ساتھ تعاون پر آمادہ نہیں ہوں، تمہاری تمام تر ناپسندیدگی کے باوجود تم سے ہی شادی کرنا پڑے گی تو اس کی وجہ صرف اپنی نہیں مجھے تمہاری عزت کا بھی بھرم رکھنا ہوگا۔ اس کے علاوہ اس فیصلے کے پیچھے کوئی اور خاص محرک نہیں ہے۔'' ایک، ایک لفظ چبا کر کہتا اسے گھورتا اس پل ہمیشہ سے کہیں زیادہ کروفر اور سفاک لگا تھا وہ حرم کو۔ اس کے اسی شدید موڈ میں واپس لوٹ جانے کے بعد وہ عجیب سی شکستگی کے احساس سے دوچار ہوتی وہیں گھٹنے ٹیک کر بیٹھ گئی۔ اسے سمجھ نہیں آسکی اس شخص کی بدگمانی پر آزردہ ہو یا پھر اس کے ہمیشہ کے لیے مل جانے پر باقی تمام نقصانات بھلا کر خوشی منائے۔

☆☆☆

''یہ تو کمال ہی ہو گیا ہے بھئی! بھائی نے تو بالکل ہیرو والا کام کر کے دکھایا۔ کاش میں نے بہت پہلے ان پر شک کیا ہوتا چاہے جھوٹا ہی سہی۔ ورنہ اب کے بجائے بہت پہلے ہی یہ کام انجام پا گیا ہوتا۔'' عمر نے جس طرح بات کی تھی کہ ان کی شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی تھی۔ یہاں تک کہ مام اور ڈیڈ نے بھی اعتراض نہیں کیا تھا۔ وہ لوگ حج کی ادائیگی کے فوری بعد پاکستان آرہے تھے۔ البتہ تاریخ مقرر کر کے شادی کی تیاریوں کی اجازت ضرور دے دی تھی پھر وہ جتنی ہراساں تھی کہ یہ دن اتنی ہی تیزی سے گزرتے چلے گئے تھے۔

''تم بتاؤ بنو رانی......! یہیں سے رخصت ہو کر جانا ہے یا آپ کے دولہا راجا کے گھر ابھی سے لے چلیں؟'' فارہ جتنی خوش تھی اسی حساب سے اس کا موڈ خوشگوار تھا۔ اتنے ہی چٹکلے سوجھ رہے تھے۔

''تم نے کیا کہا تھا عمر سے فارہ کہ وہ اتنے غصے میں تھا جبکہ تم جانتی بھی ہو کہ میں نے اس کے حوالے سے کوئی بات نہیں کی تھی تم سے۔'' حرم کا ذہن اسی ایک بات پر اٹکا ہوا تھا...... اسے نقصان در نقصان کے اس سلسلے کو روکنا تھا۔ وہ اسے صرف ناپسند نہیں کرتا تھا۔ اسے اب غلط بھی سمجھتا تھا اور زندگی غلط فہمیوں اور نفرت کی نذر کرنا ہرگز عقلمندی نہیں تھی۔

''سوری یار...... اس روز تمہاری محبت میں

میں کچھ ہائپر ہوگئی تھی بھائی سے بات کرتے ہوئے لیکن دیکھو ناں..... نتیجہ تو اچھا ہی نکلا۔" فارہ نے دانت نکالتے ہوئے حد درجہ حماقت کا ثبوت پیش کیا۔ حرم اسے دیکھ کر رہ گئی..... ہونٹ کچلتے ہوئے وہ مضطرب سی بیٹھی رہی۔

"تمہارے دل میں کوئی بات ہے..... جو تمہیں پریشان کر رہی ہے تو بتاؤ مجھے؟" فارہ سے اس کی پریشانی مخفی نہیں رہ سکی تھی۔ حرم نے جواب نہیں دیا تو وہ اٹھ کر اس کے قریب آئی کاندھے پر ہاتھ رکھ کر رسانیت سے گویا ہوئی تھی۔

"بھائی کا غصہ تو اتر بھی گیا ہے یار! کیوں خواہ مخواہ پریشان ہوتی ہو۔ مجھے پورا یقین ہے کہ دلہن بن کر تم اتنی پیاری لگو گی کہ ان کی رہی سہی ناراضی بھی دور ہو جائے گی۔" اس کا تسلی دینے کا بھی اپنا ہی انداز تھا۔ حرم بجائے ریلیکس ہونے کے پلکیں جھپک کر آنسو اندر اتارنے لگی۔ فارہ جو اس کی جانب متوجہ تھی کچھ ڈسٹرب نظر آئی۔

"پلیز حرم..... مسکرا دو اب ورنہ میں بھی رو دوں گی....." وہ بسوری تھی حرم نے سرد آہ بھری۔

"وہ بہت نالاں ہیں مجھ سے فارہ.....! سارے بدلے چکائے گا اب..... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، اتنا کہ جی چاہ رہا ہے کہ گھر سے ہی بھاگ جاؤں۔" وہ واقعی رونے لگی تھی۔ ایک لمحے کو تو فارہ بھی کچھ نہیں بول سکی۔ آزر خان کے حوالے سے اس سے جو حماقتیں سرزد ہوئی تھیں۔ وہ کسی بھی مرد کی انا و غیرت پر تازیانہ ہو سکتی تھی۔

"بس اسی آخری حماقت کی کسر باقی رہ گئی تھی۔ محترمہ اس زحمت کی ضرورت ہے نہیں۔ میں شادی سے ہی منع کر دیتا ہوں۔" دنیا بھر کا خشک ترین لہجہ بے حد قریب سے گونجا تھا۔ حرم کے ساتھ فارہ بھی ہڑبڑا کر رہ گئی۔ حرم کے تو اوسان ہی خطا ہو گئے تھے۔ اس کے چہرے پر نگاہ ڈالتے ہی جس پر اتنی خوفناکی کا تاثر تھا کہ اس کا دل لمحے کے ہزارویں حصے میں اچھل کر حلق میں آگیا۔ وہ جیسے بنا آہٹ کے آیا تھا ویسے ہی چلا بھی گیا۔ حرم نے فق چہرے کے ساتھ فارہ کو دیکھا جو سکتہ زدہ سی کھڑی تھی۔ فارہ بوکھلا کر اس کے پیچھے بھاگی تھی۔

"بھائی..... میری بات تو سنیں۔" مگر وہ ان سنی کر کے باہر نکل گیا۔ حرم منہ پر ہاتھ رکھے سسکیاں دباتی بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

"میرے خدایا..... کیا ہو رہا ہے یہ میرے ساتھ....." اس کی آہیں کراہوں میں بدلنے لگیں۔ فارہ اسے سنبھالنے کی کوشش میں ہلکان تھی جو ریت کے مانند ہر لمحہ بکھر رہی تھی۔

☆☆☆

اس نے ہونٹ سختی سے بھینچے اور اپنے کمرے کا دروازہ اپنے پیچھے ایک دھماکے سے بند کیا تھا۔ اس انکار کا ردعمل اتنا ہی شدید تھا جتنا ہونا چاہیے تھا۔ مما پر تو جیسے غشی طاری ہونے لگی تھی۔ اتنی سختی سے دوٹوک انکار وہ بھی شادی سے دو دن پہلے جبکہ کارڈ تک بٹ چکے تھے اور شام میں مایوں کی رسم ادا ہونا تھی۔ مہمانوں کے ساتھ خود حرم کی فیملی بھی آج ہی سعودیہ سے یہاں پہنچ رہی تھی۔ عمر جیسے میچور شخص سے تو انہیں ہرگز بھی ایسی جذباتیت اور احمقانہ بات کی توقع نہیں تھی مگر اب وہ جس شدت سے اپنی بات پر اڑا تھا اور کسی کی پروا نہیں کر رہا تھا یہ بات بہت تشویش ناک تھی۔ ان کے اعصاب مفلوج ہونے لگے تھے جیسے..... بلڈ پریشر شوٹ کرنے لگا۔

حرم اور فارہ تک بھی یہ خبر پہنچ گئی تھی۔ حرم کا رنگ تو بالکل سفید پڑنے لگا تھا۔ فارہ مما کی پٹی سے لگ کر بیٹھی تو حرم کچھ سوچے سمجھے بنا غم و غصے کی شدید کیفیت میں عمر کے کمرے تک چلی آئی تھی۔ عمر جو بیڈ کی پائنتی پر ٹکا جوتے اتارنے میں مصروف تھا۔ اسے دیکھ کر اس کی پیشانی ناگواری کی شکنوں سے بھر گئی۔

"شادی سے انکار کیوں کر رہے ہو تم؟" وہ

مٹھیاں بھینچ کر غرائی۔

"کیا کرنے آئی ہو یہاں......؟ ناؤ گیٹ لاسٹ فرام ہیئر!" اسے گھورتا وہ زور سے دہاڑا...... لیکن وہ ہرگز خائف نہیں ہوئی۔

"یہ میری بات کا جواب نہیں ہے...... جو پوچھا ہے اس کا جواب دو......" حرم کو آگ سی لگ گئی تھی۔ اس کا لہجہ تند بھی تھا اور تلخ بھی...... عمر کو اسی حساب سے غصہ آیا۔

"میں پابند نہیں ہوں تمہارا سمجھیں......؟ اور اب یہاں سے جاؤ...... میں نہیں سمجھتا کہ کسی وضاحت کی ضرورت اب باقی ہے۔" اس کے بے لحاظ سرد و سفاک انداز نے ایک لمحے کو حرم کو بالکل سن کر کے رکھ دیا مگر اگلے لمحے وہ اس توہین آمیز انداز پر بپھری گئی تھی۔ جبھی ایک جھٹکے سے اس کا گریبان پکڑ لیا۔

"کیسے پابند نہیں ہو تم...... کیوں ضرورت نہیں ہے وضاحتوں کی...... مسز عمر حسن تم میری زندگی سے کھیل جاؤ۔ مجھے تماشا بنا کے رکھ دو، میں چپ چاپ سہہ لوں...... کیوں؟" وہ گھٹی ہوئی آواز میں چیختے ہوئے بولے گئی تھی۔ عمر کا چہرہ جانے کس جذبے کے تحت بے تحاشا سرخ پڑ گیا۔ اس نے پہلے اس کا ہاتھ اپنے گریبان سے جھٹکا تھا پھر درمیانی فاصلہ بڑھایا۔ اس کے بعد بولا تھا اس بھینچے ہوئے لہجے میں ٹوٹتے کانچ کے جیسی چبھن تھی۔

"تماشا میں نہیں تم خود اپنے آپ کو بناتی رہی ہو، یہ تمہاری عزت کا ہی خیال تھا کہ میں اس فیصلے پر مجبور ہوا ہوں۔ تم گھر سے بھاگو، اس میں صرف تمہارا نہیں پورے خاندان کا تماشا لگے گا، یہ منظور نہیں تھا مجھے، بڑے نقصان سے چھوٹا نقصان برداشت کر سکتے ہیں یہ لوگ، نسبتاً چھوٹا غم...... آ جائے گا صبر بھی ان سب کو۔" وہ اب اسے نہیں دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھوں کا رنگ اس پل خطرناک حد تک سرخ تھا۔ حرم کا شرمندگی کے ساتھ خفت و ملال سے بھی برا حال ہونے لگا۔ کچھ کہے بغیر وہ گرنے کے انداز میں گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور اپنے منہ پر ہاتھ رکھے آنسو بھری آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔

"بس یہی شکایت تھی آپ کو مجھ سے؟" اس کے گلے کے ساتھ اس کی آواز بھی بھرانے لگی۔ عمر نے جھلا کر اسے اس کے انداز کو دیکھا تھا۔

"ان فضول سوالوں کا اب مقصد......؟"

"آپ اس شادی سے منع نہیں کریں گے۔ عمر پلیز ایسا مت کریں۔" وہ عاجزی سے کہتے سسکی۔ عمر اسی حساب سے جھنجھلانے لگا۔

"میں زبردستی کا قائل نہیں ہوں، جبر کا بھی نہیں، میں جانتا ہوں تم پسند نہیں کرتیں مجھے اور......"

"آپ کچھ نہیں جانتے مسٹر عمر! کچھ بھی نہیں...... بات نہیں...... میں کبھی اس راز سے پردہ نہ اٹھاتی اگر آج زندگی کے اس اہم موقع پر صورتِ حال یہ رخ نہ لے لیتی۔ آپ سمجھتے تھے میں آپ کو پسند نہیں کرتی......؟ مجھے آپ کی سانولی رنگت پر اعتراض ہے...... عمر!" وہ منہ پر ہاتھ رکھے سسکیاں دبانے لگی آنسو تواتر سے بہہ رہے تھے۔

"یہ سب دھوکا تھا، خود کو ڈھانپنے کا ایک بہانہ اور پردہ...... میں آزر خان سے نہیں روزِ اوّل سے آپ سے محبت کرتی تھی۔ اس سے قبل کہ اس کو عیاں کرتی...... میں نے جانا اس شخص کو میری محبت سے تو کیا مجھ سے بھی غرض نہیں ہے، جسے میرا سامنا خوشی نہیں دیتا جسے اس رشتے کی تشہیر پسند نہیں جبھی وہ اپنا مجھ سے بندھا یہ مقدس تعلق آشکار کرنے سے بالخصوص منع کرتا ہے، وہ عمر ایسی تھی جب میرے جذبے نوخیز تھے اور پذیرائی کے خواہاں بھی، آپ نے ان پر اوس ڈال دی۔ اتنی بے دردی سے کہ میں اندر ہی اندر گھٹتی اور سسکتی رہ گئی۔ توہین اور رد ہو جانے کا احساس اتنا جان لیوا ہوا تھا کہ میں قدم، قدم پر آپ کو رد کرنے اور جھٹلانے میں مصروف ہو گئی۔ بات اگر یہیں تک

رہتی تو بھی ٹھیک تھا میں نے آپ کی توجہ حاصل کرنے کو بے حد فضول حرکتیں شروع کردیں۔ آزر خان سے محبت اور جذباتی وابستگی کا اظہار..... میرا خیال تھا عام روایتی مردوں کی طرح آپ بھی شدید ری ایکشن دیتے ہوئے مجھ پر اپنا حق جتلائیں گے۔ مجھے اس حرکت سے سختی سے منع بھی کریں گے مگر آپ کی چشم پوشی نے الٹا مجھے بکھیر کے رکھ دیا جب میں نے یہ جانا کہ آپ کو مجھ میں اتنی بھی دلچسپی نہیں کہ....." بات ادھوری چھوڑ کر وہ اور شدت سے رونے لگی۔ عمر سکتہ زدہ کھڑا تھا، کھڑا رہا۔ غیر یقینی کے شدید احساس سمیت..... یوں جیسے اس کی کہی ہوئی باتوں نے اچنبھے میں مبتلا کر دیا ہو، معاً اس کے تاثرات بدلے، تحیر کی جگہ تنفر نے لی اور چہرے کے عضلات غصیلے انداز میں تن گئے۔ وہ بولا تو اس کا لہجہ بھی تلخ و ترش اور غصیلا پن لیے ہوئے تھا۔

"میں تو روایتی مرد نہیں تھا، ثابت ہو گیا مگر تمہیں بھی خود کو روایتی لڑکی بنا کر پیش نہیں کرنا چاہیے۔ مجبور..... بے بس، لاچار، روایتوں میں جکڑی ہوئی۔ منافق جھوٹی، لوگ چند دن باتیں ضرور کریں گے پھر بھول بھال جائیں گے تم عمر بھر کے لیے خود کو مصلوب کیوں کر رہی ہو؟" الفاظ ایسے تھے جو خنجر چھریاں بن کر حرمت کو لگے تھے۔ وہ پہلے تو جیسے کچھ نہیں، جب کچھ بھی تو غم و غصے اور صدمے کی کیفیت کے باعث پتھرا سی گئی۔ یعنی وہ اتنا ہی سمجھا تھا کہ اسے یا پھر اتنا فاصلے پر تھا اس سے کہ سچ اور جھوٹ کو پرکھ بھی نہیں پا رہا تھا۔

"آپ کو میری بات کا اب بھی یقین نہیں؟" وہ بولی تو اس کی آواز میں بلا کا رنج اترا ہوا تھا۔ گلے کی بھراہٹ لہجے میں اتر آئی تھی۔

"تمہارے پاس اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم جو کہہ رہی ہو وہ سچ ہے؟" وہ الٹا خفا ہوا۔

"کوئی ثبوت نہیں ہے، ہاں مگر میں آپ کو یقین دلانے کو کچھ نہ کچھ تو ضرور کروں گی۔" وہ یک دم بدلی ہوئی مگر خوفناک حد تک سرد آواز میں بولی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھتا وہ پلٹ کر بھاگتی کمرے سے نکلی۔ اس کا انداز کچھ ایسا غیر معمولی تھا کہ عمر ٹھٹکا پھر اس کے پیچھے لپکا تھا۔ اسے جنونانہ انداز میں ٹیرس کی جانب بھاگتے پا کر وہ کچھ اور بھی الرٹ ہوا تھا اور اگر ایک لمحے کی تاخیر ہو جاتی اسے پکڑنے میں تو وہ اسی جنونی کیفیت میں ٹیرس کی ریلنگ سے خود کو نیچے گرا چکی ہوتی۔

"یہ کیا حماقت ہے حرم.....؟" عمر کے اپنے حواس جھنجھنا اٹھے تھے اس کی اس درجہ حماقت پر۔

"چھوڑیں مجھے، اس بدنامی سے یہ موت ہزار درجے بہتر ہے جو آپ میرا نصیب کرنا چاہتے ہیں۔" وہ پہلی دفعہ پوری قوت سے روتے ہوئے چلائی۔ عمر اسی قدر خائف ہوا۔ بہر حال اس وقت وہ جس پوزیشن میں اس کے بازوؤں میں تھی کسی کا سامنا ہرگز بھی مناسب بات نہیں تھی جبکہ حرم اک حشر اٹھا دینے کے درپے تھی۔

"اوکے، اوکے فائن..... ہو ریلیکس حرم! مجھے یقین ہے تمہاری بات کا، وہی ہوگا جو تم چاہو گی، ٹیک اٹ ایزی۔" وہ اسے نارمل کرنے کو قدرے تیز تیز بولنے لگا تھا اور یونہی تھامے ہوئے کمرے میں لایا۔ حرم ہنوز سسک رہی تھی۔

"پلیز حرم! چپ ہو جاؤ، مان لیا غلطی میری تھی۔" وہ سخت عاجز ہوا کہہ رہا تھا۔

"تم نے یہ سوچا بھی کیسے کہ میں تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔" وہ یونہی سسکتے ہوئے چیخی۔

"سوری....." عمر نے بلا جھجک کہا۔ انداز جان چھڑانے والا تھا۔

"میں تمہاری جانب سے اظہار اور ردعمل کی خواہش مند تھی مگر......"

"ایگین سوری....." وہ پھر اسی انداز میں بولا۔

"مجھے دبّو اور کمزور مرد اچھے نہیں لگتے جو پسندیدگی کے باوجود اظہار سے ڈرتے ہیں۔" وہ اسی انداز میں بولی تو اب کے عمر زور سے چونکا اور اسے بے ساختہ انداز میں تکتا چلا گیا۔

"پسندیدگی کے باوجود.....؟" اس کا انداز خود کلامی کا تھا۔

"تم کیا سمجھتے تھے کہ مجھے خبر نہیں تھی۔ عمر میرے دھیان کے تمام ارتکاز تمہاری جانب لگے تھے تو کیسے ممکن تھا مجھے تمہارے جذبات و احساسات کی خبر نہ ہو پاتی۔"

وہ صرف شاکی نہیں ہوئی، روہانسی بھی ہوگئی تھی۔ عمر کو انجانی سی ندامت نے آن لیا۔ اسے یکایک احساس ہوا وہ اس بے حد خاص لڑکی کے ساتھ واقعی زیادتی کرتا رہا ہے انجانے میں۔

"اِک بات بتاؤ؟ تم میرا اتنا خیال کیوں رکھتے تھے؟ کیوں میری ہر بات مان لیتے تھے؟ میری بدتمیزیوں کے باوجود تم نے مجھے بھی ڈانٹ کے اس تعلق اور محبت کا احساس کیوں نہ بخشا؟ میں نے کہا مجھے تم سے الگ ہونا ہے، تم نے کہا ٹھیک ہے، کیا تمہیں فرق نہیں پڑتا کہ میں تمہاری زندگی میں نہ ہوں۔" بہتے آنسو پونچھے بغیر وہ بھرائی ہوئی آواز میں بول رہی تھی۔ عمر کو ندامت کے ساتھ اب پریشانی نے بھی اپنے حصار میں جکڑ لیا۔ وہ ہسٹیریک ہو رہی تھی یقیناً بے حد خود ترسی کا شکار.....

"مجھے تمہاری بات ماننا اچھا لگتا تھا۔ میرے نزدیک تمہاری خوشی اہمیت کی حامل تھی۔ اپنی خوشی سے بھی زیادہ..... کیا تمہیں اچھا نہیں لگتا تھا کہ میں تمہیں خود پر فوقیت دیتا تھا۔" وہ بہت سوچ سمجھ کر بولا تھا کہ وہ قدرے پُرسکون ہو سکے مگر وہ کچھ اور ہائپر ہوگئی تھی۔ جیسے چیخی۔

"نہیں لگتا تھا اچھا..... عمر مجھے بتاؤ تم مجھ سے محبت کرتے تھے؟ واقعی.....؟" اس کے لہجے میں عجیب سی حسرت تھی۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے حرم! میری محبت کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ میں تمہاری خوشی کی خاطر تم سے دستبردار ہوگیا حالانکہ مجھے عمر بھر ادھورا رہنا تھا مگر....." وہ پہلی بار کھل کر یوں اظہار کر رہا تھا۔ حرم کو لگا اندر بھڑکتی آگ پہ ٹھنڈے چھینٹے گرنے لگے ہوں۔

حرم کچھ دیر اسے آنسو بھری نظروں سے یونہی تکتی رہی پھر آہستگی سے سر جھکا کر بھیگی آواز میں گویا ہوئی۔

"کوئی بھلا ایسا کرتا ہے....." لہجہ یکایک حلاوت لیے ہوئے تھا۔

"کیا اب بھی تمہیں یقین نہیں آرہا کہ میں آزر سے نہیں بلکہ تم سے....." وہ چند ثانیے رکی پھر بولی۔

"یہ بات میں بھی جانتی تھی عمر کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو مگر مجھے اس انداز کی محبت نہیں چاہیے تھی۔ یہ خاموش اور مسکین قسم کی بے بس سی محبت مرد کی شان نہیں ہوتی اگر میں تمہاری محبت تھی تو ڈنکے کی چوٹ پر اظہار کرتے..... مجھ پر حکومت کرتے نہ کہ میرے تابع بن جاتے..... مجھے تو ایسی ہی محبت چاہیے۔ آئندہ تم مجھے غلط بات پر ضرور ٹوکو گے اگر میں نہ مانوں تو اپنی طاقت کے بل پر منواؤ گے تاکہ....."

"تاکہ..... یعنی؟" وہ اس کے رک جانے پر چونکتا ہوا بولا۔

"تاکہ میں کوئی غلط قدم نہ اٹھا بیٹھوں۔"

"اوکے مادام! پھر ٹھیک ہے..... اب چند دنوں بعد ہی ہماری شادی ہے، تم اس وقت اتنی پیاری لگ رہی ہو، کیا خیال ہے ابھی سے نہ روک لوں تمہیں اس کمرے میں..... آنا تو بالآخر تمہیں یہیں ہے ناں۔" وہ ایک دم پٹڑی سے اترتا ہوا بے حد گمبھیر لہجے میں بولا تو حرم کی گڑبڑاہٹ دیکھنے لائق تھی۔ وہ تیزی سے بھاگی تھی اور عمر کے قہقہے اس کا دور تک پیچھا کرتے گئے۔

"افوہ...... پھر لائٹ چلی گئی۔" علی سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ابھی اسے گھنٹا بھی نہیں ہوا تھا کمپیوٹر پر کام کرتے ہوئے کہ اچانک بجلی منقطع ہوگئی۔ وہ جھنجلا کر رہ گیا۔ اس کا بی بی اے کا آخری سمسٹر چل رہا تھا۔

انٹرنیٹ اور کمپیوٹر سے اسے ڈیٹا اور بہت سی انفارمیشن لینا ہوتی تھیں مگر یہاں بھی دیگر علاقوں کی طرح بجلی کی ترسیل ہر گھنٹے بعد منقطع ہونا معمول تھا۔ اسی لیے اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ جلد از جلد اپنا

اُمید کے جگنو

نیئر رانی شفق



کام مکمل کرلے۔

"یہ ملک اب شریفوں کے رہنے کے قابل نہیں رہا۔" وہ بڑبڑا رہا تھا اسی وقت ربیعہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس کا فقرہ اچک کر شرارت سے بولی۔

"آپ کب سے اس میں شامل ہو گئے ہیں۔"

"پیا! چپ ہو جاؤ، مجھے ہر وقت کا مذاق بالکل پسند نہیں۔" علی دانت کچکچا کر بولا۔

"مگر بھیا میں نے تو کوئی مذاق نہیں کیا۔" وہ معصومیت سے آنکھیں پٹ پٹا کر بولی۔

"ارے پھر تمہاری نوک جھوک شروع ہو گئی۔" اتنے میں زیب النسا کمرے میں داخل ہوئیں۔

"دیکھے ناں دادو! بھیا خواہ مخواہ مجھ پر ناراض ہو رہے ہیں۔" ربیعہ کے لہجے میں شرارت چھپی تھی۔ زیب النسا زیر لب مسکرا دیں۔

"کوڑھ مغز!" علی نے چیخ کر کہا اور ساتھ ہی صوفے پر پڑا کشن ربیعہ کو دے مارا، جسے اس نے بڑی پھرتی سے کیچ کر لیا اور ساتھ شرارت بھری معصومیت سے سوال کیا۔

"او...... اچھا تو وہ شریف آپ ہیں، تو کیا جو اس ملک میں باقی ایک کم اٹھارہ کروڑ افراد ہیں وہ بدمعاش ہیں؟"

اس سے پہلے کہ علی ایک مرتبہ پھر اس پر الٹ پڑتا، زیب النسا نے میدان گرم دیکھ کر فوراً مداخلت کی اور مصنوعی خفگی سے بولیں۔

"پیا! چپ ہو جاؤ، بھائی کو تنگ نہ کرو۔"

"علی بیٹا! کیا بات ہے پریشان کیوں ہو؟" وہ اپنے لاڈلے پوتے سے مخاطب ہوئیں۔

"دادو! میں صرف پریشان ہی نہیں بلکہ انتہائی غصے میں بھی ہوں۔"

"لیکن ہوا کیا؟"

"مجھے ابھی انٹرنیٹ سے انفارمیشن لے کر کمپیوٹر پر اسائنمنٹ تیار کرنا تھا کہ حسب معمول لائٹ پھر چلی گئی۔ مسلسل لوڈشیڈنگ نے زندگی عذاب بنا رکھی ہے۔ جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے، مجھے یاد نہیں کہ ہم نے کبھی سکون سے پڑھ کر امتحان دیے ہوں۔" اس کا غصہ بے بسی لیے ہوئے تھا۔

"یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے۔" اس مرتبہ ربیعہ بھی اس کی ہم خیال ہو گئی۔ "یہ تو رمضان شریف کی وجہ سے واپڈا نے ہم پر احسان کیا ہوا ہے کہ محترمہ بجلی صاحبہ آج کل نظر آ رہی ہیں۔ ورنہ لوڈشیڈنگ نے تو کاروبار حیات معطل کر کے رکھ دیا ہے۔" ربیعہ نے اپنے ابو کے جملے جو کل ہی انہوں نے بجلی کی موجودگی پر شکرانے کے طور پر کہے تھے دُہرا کر تائید طلب نظروں سے بھائی کو دیکھا تو وہ ایک مرتبہ پھر شروع ہو گیا۔

"ہم لوگوں نے ہمیشہ موم بتی اور ایمرجنسی لائٹ کی مدھم روشنیوں میں پڑھ، پڑھ کر امتحانات دیے ہیں اور اوپر سے ممتحن اور اساتذہ کو بھی ترس نہیں آتا کہ چیکنگ کرتے وقت طلبہ کو کوئی رعایت ہی دے دیں۔"

"نوجوان نسل جن ذہنی اذیتوں کا شکار ہے، کسی کو پروا ہی نہیں۔" زیب النسا نے ترحم آمیز نگاہوں سے پوتے کو دیکھا اور بولیں۔

"ہاں! یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔" علی نے دادی کی ہمدردی پا کر اپنے دل کا غبار نکالا۔

"پانی کا بحران، بجلی کا بحران، کبھی آٹے اور کبھی چینی کا بحران، دہشت گردی اور بم دھماکوں نے اعصاب شل کر دیے ہیں۔ لاشے ڈھوتے، ڈھوتے پوری قوم بے حال ہو چکی ہے۔ تعمیرات کے نام پر ضلعی حکومت نے پورا شہر ادھیڑ کر رکھ دیا ہے۔ صاف ستھری فضا ناپید ہو چکی ہے۔ دھوئیں اور فضائی آلودگی نے جینا حرام کر دیا ہے۔ عام آدمی انصاف کو ترس رہا ہے۔ پولیس غریبوں اور مظلوموں کا شکار کھیلتی ہے۔" اس کی بلا تکان گفتگو اس کی حساسیت

اور اس کی ذہنی اذیتوں کی ترجمان تھی۔ انہوں نے اسے ٹوکنے کی کوشش نہیں کی۔ وہ چاہتی تھیں کہ اس کے دل کا غبار نکل جائے۔ اس مرتبہ ربیعہ کی زبان بھی تالو سے جا لگی تھی اور وہ افسردہ بیٹھی بھائی کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں دادو! یہ ملک اب کم از کم ہم جیسوں کے رہنے کے قابل نہیں رہا۔ میں بی اے کرتے ہی ملک سے باہر چلا جاؤں گا اور تعلیم مکمل کر کے وہیں جاب کر کے رہائش اختیار کر لوں گا اور کبھی پلٹ کر نہیں آؤں گا۔"

زیب النسا کا دل دھک سے رہ گیا۔

"اللہ نہ کرے....." ان کے منہ سے... بے اختیار نکلا۔

"دادو.....! آپ کو معلوم تو ہے ناں پچھلے سال جو یہاں بم دھماکا ہوا تھا، اس میں جہاں اتنے سارے بے گناہ شہید اور زخمی ہوئے تھے، وہاں میرا دوست....." اس کی آواز بھرا گئی۔ "شاہد.....شاہد بھی اس حادثے کا شکار ہو گیا۔ وہ کالج میں موسم گرما کی تعطیلات کے سبب اپنی خالہ کے ہاں لاہور گیا ہوا تھا۔ اس دن شاہد اور اس کا کزن جمیل داتا دربار دعا کرنے گئے اور دونوں شہید ہو گئے۔" وہ سسک اٹھا۔ زیب النسا نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ان کی آنکھوں سے بھی آنسو بہنے لگے۔ وہ جانتی تھیں کہ شاہد اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا اور علی کا بچپن کا دوست تھا۔ اس حادثے نے علی پر بہت برے اثرات مرتب کیے تھے۔ وہ شدید ڈپریشن کا شکار تھا۔

اتنے میں کنزیٰ اور فرحان لڑتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے۔ "کنزیٰ کی بچی تم نے میری جھنڈیاں اور پاکستانی پرچم کیوں اتارا ہے؟" اس نے کنزیٰ کی چوٹی کھینچتے ہوئے کہا۔

"اوئی مما....." وہ رو دی..... اب زیب النسا نے اپنی مداخلت ضروری خیال کرتے ہوئے کنزیٰ کو چمکارا اور ساتھ ہی فرحان سے مخاطب ہو گئیں۔

"بیٹا! یوم آزادی تو کب کا گزر چکا۔ رمضان ختم ہونے میں دو چار دن باقی ہیں۔ عید کی آمد، آمد ہے۔ ظاہر ہے جھنڈیوں کو اتارنا تو تھا۔" ربیعہ نے فرحان کو کاندھے سے پکڑ کر اپنے قریب بٹھا لیا اور بہت پیار سے سمجھانے والے انداز میں بولی۔

"کنزیٰ نے مما کے کہنے پر جھنڈیاں اور پرچم اتار کر رکھا ہے۔ تمہیں یاد ہے پچھلے سال بارش اور آندھی کی وجہ سے جھنڈیاں پوری گلی اور محلے میں بکھری پڑی تھیں اور لوگ ان پر پاؤں رکھ کر گزر رہے تھے۔ اسی وقت پاپا نے کہا تھا کہ آئندہ کم از کم اپنے گھر اور گلی کی جھنڈیاں جشنِ آزادی کے فوراً بعد اتار لی جائیں گی تاکہ ان کی بے حرمتی نہ ہو۔" وہ سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے بولی۔ "اور تمہیں پتا ہے کہ گلی کی جھنڈیاں پاپا نے خود گلی کے بچوں کے ساتھ مل کر اتروائی تھیں۔"

"اچھا!" وہ حیران رہ گیا۔

فرحان، کنزیٰ سے دو سال بڑا تھا اور جماعت ہشتم کا طالب علم تھا۔ کنزیٰ جماعت ششم میں پڑھتی تھی۔ دونوں انتہائی سمجھ دار اور فرمانبردار بچے تھے۔ ربیعہ، علی سے دو سال چھوٹی تھی اور ایف ایس سی کر رہی تھی۔ علی، جو اتنی دیر سے یہ سب گفتگو سن رہا تھا بیزاری سے بولا۔

"بیا! بند کرو اس ٹاپک کو..... تم اتنا بولتی ہو تمہیں روزہ نہیں لگتا؟" سدا کی حاضر جواب اور ہنس مکھ ربیعہ ایک مرتبہ پھر کھلکھلا کر ہنس دی۔

"نہیں بھیا! مجھے روزہ نہیں لگتا صرف پیاس لگتی ہے۔"

"اچھا دادو! ظہر کی نماز کا وقت ہو رہا ہے، میں مسجد جا رہا ہوں۔" علی اسے گھور کر رہ گیا اور اٹھتے ہوئے بولا۔

"بھیا! میں آپ کے ساتھ چل رہا ہوں۔" فرحان بولا۔

"ہاں چلو۔" ساتھ ہی وہ دونوں کمرے سے

باہر چل دیے۔

"بیا! تمہاری مما اکیلی کچن میں مصروف ہیں۔ نماز ادا کر کے ان کا ہاتھ بٹا دینا۔" زیب النسا کو اپنی بہو کو خیال آیا کہ وہ اس قدر گرمی میں روزے سے اکیلی کچن میں مصروف تھیں۔

"جی دادو......" ربیعہ وضو کرنے چل دی۔

زیب النسا گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہوئیں تو اتنے میں سطوت خود ہی بڑے کمرے میں چلی آئیں۔

"اماں! آپ کھانا ابھی کھائیں گی یا نماز پڑھ کر۔"

"بیٹا.....! پہلے نماز پڑھ لوں۔" وہ محبت سے اپنی خدمت گزار بہو کو دیکھ کر بولیں۔

"اور ہاں، تم بھی اب نماز پڑھ کر کچھ دیر آرام کر لینا۔"

"جی امی جان......" سطوت ساس کی فکر مندی پر مسکرا دیں۔

زیب النسا شائستہ، پڑھی لکھی اور سلجھی ہوئی خاتون تھیں۔ وہ روایتی ساس نہیں تھیں بلکہ ہمیشہ انہوں نے اپنی بہو کا ایک ماں اور ایک مخلص دوست کی طرح خیال رکھا۔ 75 سال کی عمر میں اب نہ تو ان سے گھر کے کام انجام دیے جاتے تھے اور نہ ہی جوڑوں کے درد، انجائنا کی تکلیف اور ہائی بلڈ پریشر کے سبب وہ روزے رکھ سکتی تھیں۔ اسی لیے اللہ کے حکم کے مطابق وہ اپنے روزے کسی غریب خاتون سے رکھوا رہی تھیں اور شرع کے مطابق نہ صرف سحر اور افطار کے وقت کھانا اسے بھجواتیں بلکہ معقول رقم بھی اسے کھانے پینے کی مد میں ادا کر چکی تھیں۔

وہ انتہائی عبادت گزار اور تہجد گزار خاتون تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ رمضان المبارک کی وجہ سے ان کی عبادات میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ سب سے محبت برتنا، سب کا خیال رکھنا اور دعائیں کرنا ان کا خاص وصف تھا۔

☆☆☆

زیب النسا غازی ولا میں اپنے بیٹے سرمد غازی، بہو سطوت اور ان کے چار بچوں علی الترتیب علی غازی، ربیعہ غازی، فرحان غازی اور کنزیٰ غازی کے ہمراہ بہت پرسکون زندگی گزار رہی تھیں۔

ان کے شوہر عبداللہ غازی کی وفات کو تقریباً 6 برس گزر چکے تھے۔

رمضان المبارک میں ان کے گھرانے میں جہاں خصوصی عبادات کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ وہاں تمام اہلِ خانہ مع بچوں کے بھی نہ صرف روزے رکھتے بلکہ افطار اور سحر کے وقت غریب رشتے داروں اور غریب بستیوں میں کھانا پہنچانے کے علاوہ زکوٰۃ، خیرات، صدقات اور عیدیوں کی مد میں تحائف، اچھی خاصی رقم اور ملبوسات تک تقسیم کرتے۔ اس روایت کا جو آغاز زیب النسا کے ساس، سسر نے کیا تھا اسے آج بھی اسی طرح ان کے ہاں نبھایا جا رہا تھا۔

انہوں نے اعلیٰ تربیت کا جو تحفہ اپنی اولاد کو دیا تھا۔ انہوں نے وہی تحفہ ورثے میں اپنے بچوں کو دیا تھا۔ جس پر وہ اللہ کا شکر ادا کرتے نہ تھکتیں۔ مگر آج علی کے ڈپریشن اور اس کی مایوسانہ گفتگو نے انہیں اندر تک ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ جانتی تھیں کہ علی کی ہر بات بالکل ٹھیک ہے۔ اس وقت پوری قوم ہی ذہنی ابتری کا شکار ہے۔ معاشرہ اخلاقی پستی، مختلف بحرانوں اور دہشت گردی کے باعث روبہ زوال ہے۔ مگر نوجوان نسل اس طرح اپنے ملک اور قوم سے بیزار ہے، اس کا اندازہ نہیں تھا۔ علی کی گفتگو نے انہیں کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا اور وہ نماز کے بعد ملک وقوم کی خوشحالی اور نوجوان نسل کے اچھے مستقبل کے لیے رقت آمیز انداز میں دعا گو ہو گئیں۔

☆☆☆

"اب بس بھی کرو بیا! جو ہونا تھا ہو گیا۔" سطوت نے ربیعہ کو چپ کروانے کی کوشش کی مگر ربیعہ کو اپنے خوب صورت نئے ڈریس کا دکھ کھائے

جارہا تھا۔ جو وہ کالج میں عید ملن پارٹی میں پہننا چاہ رہی تھی اور آج ہی اسے مشہور بوتیک سے خریدا تھا۔ وہ سسکتے ہوئے بولی۔

''علی بھیا! ٹھیک کہتے ہیں، یہ ملک اب واقعی شریفوں کے رہنے کے قابل نہیں رہا۔ میں بھی کبھی نہ کبھی یہ ملک چھوڑ کر چلی جاؤں گی۔'' اس کی دھمکی سن کر سطوت کو ہنسی آگئی۔

''پر کتھوں؟'' علی نے شرارت سے ربیعہ کی پونی کھینچ کر اپنا بدلہ اتارا۔

''بھیا نہ کریں۔'' وہ روہانسی ہو رہی تھی۔ کنزئی اور فرحان بہت پریشان تھے۔

''لیکن بیا! جب آپ اور علی بھیا اس ملک سے چلے جائیں گے تو ہم یہاں کیا کریں گے؟''

''ارے بھئی! کون کہاں جارہا ہے؟''

سرمد جو کسی افطار پارٹی میں گئے ہوئے تھے کمرے میں داخل ہوئے تو کنزئی اور فرحان کی بات سن کر شگفتگی سے پوچھ بیٹھے۔

''کوئی کہیں نہیں جارہا، بس ربیعہ آج کے واقعے سے پریشان ہوگئی ہے۔'' زیب النسا مسکرادیں۔

''مگر ہوا کیا.....؟'' سرمد حیرت سے بولے۔

''پاپا یہ پوچھیں کیا نہیں ہوا؟'' ربیعہ ایک مرتبہ پھر سسک اٹھی۔ سطوت نے بیٹی کو آنکھ کے اشارے سے خاموش کرایا اور جلدی سے بولیں۔

''بس ہونا کیا تھا، عید کی شاپنگ کے لیے ربیعہ اور کنزئی میرے ساتھ بازار گئی تھیں۔ کچھ شرارتی لڑکے اچانک موٹر سائیکل پر سوار ہوئے اور ربیعہ کے ہاتھ سے کپڑوں کا بیگ چھین کر فرار ہوگئے۔'' سطوت نے ہلکے پھلکے انداز میں شوہر کو مطمئن کرنا چاہا، مگر بات ختم ہوتے ہی سرمد کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوگئیں۔

''یہ بات طے تھی کہ عید کی شاپنگ رمضان

کے آخری عشرے میں اور رات کے وقت نہیں ہوگی تو پھر آج اس وقت آپ لوگ بازار کیوں گئے؟" انہوں نے رسٹ واچ میں وقت دیکھا تو پونے گیارہ بجے تھے۔ ربیعہ تو رونا دھونا بھول کر ایک دم چپ ہوگئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کے بظاہر نرم مزاج پاپا اپنے اصولوں کے بہت پکے ہیں۔ ماحول کا رنگ بدلتے دیکھ کر زیب النسا نے بات کو سنبھالا۔

"ارے بیٹا! عید کی شاپنگ تو یہ لوگ کب کی کر چکے۔ بس چھوٹی موٹی چیزیں رہ گئی تھیں وہ اب لینے کے لیے گئے تھے۔ سلوت بے چاری کو گھر کے کاموں سے فرصت کب ملتی ہے؟ اور بیا!؟ میری بچی اکیڈمی اور اپنی پڑھائی سے بہ مشکل وقت نکال کر ماں کا ہاتھ بٹاتی ہے۔ اوپر سے گرمی نے مت ماری ہوئی ہے۔" وہ ابھی کچھ اور کہتیں کہ سرمد جھنجلا کر بولے۔

"وہ تو ٹھیک ہے امی جان! مگر اس وقت جانے کیا ضرورت تھی؟"

"میرے ہی اصرار پر گئی تھی، میں نے بہت ضروری چیزیں منگوانی تھیں۔" انہوں نے سارا الزام اپنے اوپر لے لیا۔

"لیکن بہتر ہوتا کہ کسی کو ساتھ لے جاتیں۔" ماں کی بات سن کر وہ نرم پڑ گئے۔

"ڈرائیور اور فرحان ہمارے ہمراہ تھے۔ ویسے بھی ہم لوگ مغرب کی نماز ادا کر کے فوراً ہی چلے گئے تھے اور ساڑھے نو بجے تک واپس آگئے۔" سلوت فوراً بولیں۔

"جی پاپا! ہم لوگ ساڑھے نو بجے اپنے گھر میں تھے۔" اس مرتبہ پاپا کا غصہ رفع ہوتے ہی ربیعہ نے گفتگو کا ڈول ڈالا۔

"مگر ہوا کیا تھا؟" اب وہ تفصیل جاننا چاہ رہے تھے۔ سلوت نے ہچکچاتے ہوئے تفصیلاً بتایا کہ "اماں نے کسی غریب رشتے دار کے لیے کچھ تحائف منگوائے تھے جو فرحان نے پہلے ہی گاڑی میں رکھ دیے تھے۔ اس لیے بچ گئے جبکہ ربیعہ کا بہت خوب صورت ریڈی میڈ سوٹ اور کنزیٰ کا یونیفارم کا بیگ وہ لڑکے لے بھاگے۔"

"اور رقم وغیرہ......؟" انہوں نے مزید پوچھا۔

"نہیں، وہ سب محفوظ ہے۔" سلوت اطمینان بھرے انداز سے بولیں۔

"شکر کرو کسی بڑے نقصان اور حادثے سے محفوظ ہو گئے آپ لوگ۔ جرائم میں بہت اضافہ ہو گیا ہے آج کل۔" وہ تاسف سے ایک گہری سانس لے کر بولے۔ "پتا نہیں کیا بنے گا ہماری قوم کا؟"

"واقعی زندگی بہت مشکل ہوتی جارہی ہے۔" علی نے کہا تو سب چونک گئے۔ وہ دل ہی دل میں علی کی بات سے اگرچہ متفق تھے مگر علی کے بڑھتے ہوئے ڈپریشن کے سبب ہنس سے بولے۔

"اللہ بہتر کرے گا یار، تم ہر بات دل پر نہ لیا کرو، جوان ہو لائف انجوائے کرو۔"

"ہائے میرا یونیفارم......" کنزیٰ کو ایک دم اپنا یونیفارم یاد آ گیا۔

"کیا تم نے یونیفارم عید پر پہننا تھا؟" سرمد حیران ہو کر بولے۔

"نہیں پاپا! اس مرتبہ موسم گرما کی تعطیلات چونکہ عید کے بعد ختم ہوں گی۔ لہٰذا ہمیں پہلے ہی بتادیا گیا تھا کہ جس دن اسکول کھلے گا اس دن مارننگ اسمبلی میں چھ ستمبر کے حوالے سے یوم دفاع کا پروگرام ہوگا اور میں نے اسمبلی میں چھ ستمبر کے شہدا کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے نغمہ گانا ہے۔" اس نے تفصیلاً بتایا تو سرمد مسکرادیے اور اپنی لاڈلی بیٹی کو چھیڑتے ہوئے بولے۔

"ہاں، یہ تو واقعی مسئلہ ہوگیا۔ میری بیٹی تو یونیفارم کے بغیر کیا کرے گی؟"

"چھوڑو کنزیٰ اس دن چھٹی کر لینا، ویسے بھی جشن آزادی اور یوم دفاع میں کیا رکھا ہے؟ کیا دیا

ہے اس ملک اور قوم نے ہمیں؟"

"کیا کہہ رہے ہو علی؟" علی کی بات پر زیب النسا تڑپ کر رہ گئیں تو ایک دم سناٹا چھا گیا۔

"بیٹا! ملک و قوم نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے۔ ہم ہی قرض نہیں اتار پائے اس وطن کا۔" سرمد نے شفقت سے بیٹے کے کاندھے تھپتھپائے اور ساتھ ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔ "اس موضوع پر پھر بات کریں گے۔" وہ جانتے تھے کہ ان کی ماں کے لیے یہ دونوں موضوع کس قدر حساس اور اہم ہیں۔

"ہاں، بارہ بج چکے ہیں۔ صبح سحری کے لیے اٹھنا آپ لوگوں کے لیے مشکل ہو جاتا ہے۔ چلیے بچوں! آپ لوگ سوئیں جا کر، شاباش۔" سلوت نے بھی فوراً کہا۔ سب اپنے، اپنے کمروں کی طرف چل دیے۔

"آپ کی افطاری کیسی رہی؟"

"ٹھیک تھی، وہیں چونکہ عشا کا وقت ہو گیا تھا لہٰذا میں نے سوچا کہ تراویح بھی وہیں ادا کر لی جائے ۔ اسی لیے مجھے دیر ہو گئی۔" زیب النسا ابھی تک گم صم بیٹھی تھیں۔ سرمد نے نرمی سے ان کا ہاتھ تھاما۔

"آئیں امی جان! آپ کو آپ کے کمرے تک چھوڑ آؤں۔"

"ہاں چلو......" وہ گہری سانس لے کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔

☆☆☆

"دادو! رمضان میں تو آپ نے کبھی بزم ادب نہیں سجائی تھی۔" ربیعہ نے حیرانی سے زیب النسا سے پوچھا۔

"ہاں دادو......! یہ اتنی مدت کے بعد آپ کو بزم ادب کا خیال کیوں آیا؟" علی نے تفتیشی انداز میں پوچھا۔

"ویسے بھی روزے کی حالت میں کون حصہ لے گا اس پروگرام میں۔ اور کم از کم میں تو ہرگز شرکت نہیں کروں گا۔" اس نے صاف انکار کیا۔ زیب النسا کو علی کے اس قسم کے رویے کی پہلے سے توقع تھی۔ لہٰذا وہ اپنی مخصوص شفیق مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔

"دیکھو بچو! میں مانتی ہوں کہ اس محفل کو منعقد کرنے کا خیال مجھے تقریباً دو سال بعد آیا ہے۔ آپ سب کو معلوم ہے کہ آپ لوگوں کی تعلیمی مصروفیات کے سبب ہم نے ان محفلوں کا انعقاد ترک کیا تھا۔" انہوں نے کچھ توقف کیا اور بڑے رسان سے کہا۔ "مگر ایک بامقصد اور خوب صورت روایت اگر مجبوری کے سبب تعطل کا شکار ہو جائے تو اسے دوبارہ شروع کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

"امی جان! بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ آج چونکہ میرے آفس کی بھی چھٹی ہے لہٰذا میں بھی اس محفل میں شرکت کروں گا۔" سرمد نے ڈرامائی انداز میں انٹری دی اور علی جو وہاں سے کھسکنے کے لیے پر تول رہا تھا اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے برابر صوفے پر بٹھا لیا۔ نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن کے مصداق علی کو بھی چاروناچار اپنے باپ کے ساتھ وہاں بیٹھنا پڑ گیا۔

"ارے بھئی اتنی اچھی محفل میں کون بیٹھنا نہیں چاہے گا۔ میں نے سوچ لیا ہے آج سارا کام ماسی خود کرے گی۔ رہ گئی افطار کی تیاری تو اللہ کا شکر ہے کہ آج سے ماسی کی بیٹی صفیہ بھی میرا ہاتھ بٹایا کرے گی۔" یہ کہہ کر سلوت بھی اطمینان سے بیٹھ گئیں۔

دراصل زیب النسا بیگم، بہو سے اس سلسلے میں پہلے ہی بات کر چکی تھیں اور ان کے آپس کے مشورے ہی سے علی کے رویے کے سبب یہ محفل منعقد کی گئی تھی۔ برسوں پہلے بچوں کی اخلاقی اور ادبی تربیت کے خیال سے بچوں کے دادا عبداللہ غازی نے اپنے گھر میں ہر جمعرات کی شام بزم ادب کا آغاز کیا تھا۔ اسکولوں کی طرح اس بزم میں بھی تقریب کا آغاز تلاوت کلام پاک سے کیا جاتا اور بعد ازاں

بچوں کے مابین مقابلہ نعت خوانی، مقابلہ تقاریر اور دیگر مقابلہ جات کرائے جاتے اور نمایاں پوزیشن لینے والے بچوں میں انعامات تقسیم کیے جاتے۔ ان پروگراموں میں قریبی عزیزوں کے علاوہ اہلِ محلہ بھی شرکت کرنے لگے اور تمام بچے نہ صرف جوش و خروش سے ان مقابلوں میں حصہ لیتے بلکہ بے چینی سے جمعرات کی شام کا انتظار کرتے تھے۔ عبداللہ غازی کی وفات کے بعد بھی زیب النسا نے یہ مقابلہ جات باقاعدگی سے کرائے۔ مگر بچوں کی تعلیمی مصروفیات کے سبب تقریباً دو سال پہلے یہ سلسلہ موقوف ہوگیا تھا۔ زیب النسا کے ساتھ سرمد اور سطوت بھی اپنے بڑے بیٹے علی کی وجہ سے بے حد پریشان تھے۔ وہ جانتے تھے کہ علی اب وہ بچہ نہیں ہے جسے بہ آسانی بہلالیا جاتا تھا۔ وہ اب حساس طبیعت کا باشعور نوجوان تھا، جسے ایک خاص طریقے ہی سے شدت پسندی اور نفسیاتی اور ذہنی دباؤ سے باہر نکالا جاسکتا تھا۔

زیب النسا نے مسکرا کر اس چھوٹی سی تقریب کا آغاز کیا۔ ”بچو! آپ کی دادو یعنی میرا روزہ نہیں ہے اور آپ سب کا روزہ ہے...... لہٰذا آج سب صرف سنیں گے۔ میں بولوں گی اور جب میری یہ کہانی ختم ہوجائے تو اس کہانی کا اخلاقی سبق اور اصل مقصد آپ لوگوں نے بتانا ہے۔ جو صحیح جواب دے گا اسے عید کا خصوصی تحفہ دیا جائے گا ٹھیک ہے!“ کنزیٰ اور فرحان خوشی سے چلائے۔ اب ربیعہ کو بھی دادو کی باتوں میں دلچسپی محسوس ہونے لگی۔ البتہ علی خاموشی سے بیٹھا رہا۔

”ہاں تو بچو سنو......!“ سب ہمہ تن گوش ہوگئے۔ ”یہ 1947ء کی بات ہے، جب تحریکِ پاکستان زوروں پر تھی۔ ہمارا گھرانا ایک پڑھا لکھا گھرانا تھا۔ ہمارے بابا جانی اور اماں جان سمیت سبھی لوگ تحریکِ پاکستان کے سرگرم کارکن تھے۔ وہ بھی ماہِ رمضان تھا۔ سب روزہ رکھتے، مسلم نوجوان بلوائیوں کے ڈر سے رات بھر جاگ کر پہرہ دیتے۔ ہندو، مسلم فسادات زوروں پر تھے۔ خوف و ہراس کی فضا میں ہندو اور مسلم بھی لوگ سانس لے رہے تھے۔ بالآخر 14 اگست 1947ء کو 27 رمضان المبارک کی مبارک شب کو پاکستان بننے کا اعلان ہوا۔ اس اعلان کے ساتھ جہاں قافلوں کی ہجرت اپنے، اپنے علاقوں کی طرف تواتر سے ہونے لگی وہاں ہندو، مسلم فسادات شدت اختیار کر گئے۔ میں اس وقت تقریباً دس برس کی تھی۔ مجھے آج تک یاد ہے کہ ہمارے گھرانے نے دیگر اہلِ محلہ اور رشتے داروں کے ہمراہ بذریعہ ٹرین پاکستان کی طرف سفر شروع کیا۔ برسوں بیت گئے مگر وہ خوفناک لمحات آج بھی میرے دل و دماغ کو جکڑے ہوئے ہیں۔ میری امی جان نے کہا تھا۔ ”بس بچو! ہماری منزل بہت قریب ہے۔ اسلام کے مطابق آزادی سے اپنے اپنے وطن میں اب ہم سب مل کر، ہنسی، خوشی زندگی بسر کریں گے۔

”وہ ہمارے خوف کو کم کرنے کے لیے امید کے جگنو دے کر ہمیں بہلا رہی تھیں مگر راستے میں اچانک ٹرین رک گئی۔ معلوم ہوا کہ پٹری پر رکاوٹیں کھڑی کی گئی تھیں۔ جونہی ٹرین رکی بلوائیوں نے نہتے مسلمانوں پر حملہ کردیا۔ کچھ نوجوانوں نے لاٹھیوں سے اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی مگر تلواروں اور بھالوں کے سامنے وہ زیادہ دیر نہ ٹھہر سکے۔ میری آنکھوں کے سامنے میرے دادا، تایا جان اور بابا جانی شہید ہوگئے۔ لوگ میری پھپھو کو اٹھا کر لے گئے صدمے اور خوف سے میں نے بند ہوتی ہوئی آنکھوں سے بس اتنا دیکھا کہ میری پیاری اماں مجھے اور میرے چھوٹے بھائی کو گھسیٹ کر کہیں لے جانے کی کوشش کررہی تھیں۔ وہ چیخ رہی تھیں۔ ”زیبو بیٹا بھاگو“ مگر میں بے ہوش ہوگئی۔ ہوش آیا تو پاکستان کے مہاجرین کیمپ میں اپنی نانی جان، خالہ اور

ماموؤں کے ہمراہ تھی۔ صد شکر کہ ننھیال والے مجھے ڈھونڈ کر لے آئے۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ میری ماں...... میری پیاری امی جان، مجھے مُردہ سمجھ کر چھوٹے بھائی کو لے کر جنگل کی طرف جان بچانے کے لیے بھاگ گئی تھیں اور آج تک ان کا پتا نہیں چل سکا۔" ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

"میں اپنے بچے کھچے ننھیالی رشتے داروں کے ساتھ اپنے پیاروں کی یاد کا درد سینے میں بسا کر زندگی بتانے لگی۔ میرے ماموؤں نے میری امی جان کو بہت ڈھونڈا پر وہ کہیں نہ ملیں۔

"اسی کیمپ میں ایک تقریباً 20 سالہ ہندو لڑکی بھی تھی، جسے کوئی شخص زبردستی اٹھا لایا تھا۔ وہ لڑکی جب میری خالہ اور نانی سے ملی تو انہوں نے میرے ماموؤں کی مدد سے کیمپ انچارج کے ذریعے بیگم رعنا لیاقت علی خان تک یہ بات پہنچائی اور اس لڑکی کو واپس باعزت انڈیا بھجوایا۔ وہ شخص اس بات پر بہت چراغ پا ہوا کہ ہندوؤں اور سکھوں نے ہماری ہزاروں بہو، بیٹیاں اٹھالی ہیں۔ ہمارے خاندان کے خاندان تہ تیغ کر دیے۔ میں نے ان کی ایک بیٹی اٹھائی تھی تاکہ ان سے انتقام لے سکوں۔ میرے ماموں نے اس سے کہا۔ "ریاض بھائی! پاکستان دینِ اسلام کے نام پر بنا ہے اور میرا دین یہ کہتا ہے کہ کمزور سے انتقام نہ لو، کسی انسان کی جان بچانا اور عورتوں کی حرمت کا پاس رکھنا انسانیت کی معراج ہے۔ اگر آپ نے اس چیز کا خیال نہ رکھا تو آپ میں اور کسی غنڈے میں کیا فرق رہ جائے گا۔" مجھے فخر ہے کہ میرے ماموں کے معتدل رویے اور حسنِ سلوک نے ایک گمراہ شخص کو راہِ ہدایت دی اور اس کا اثر اس شخص پر یہ ہوا کہ وہ خود ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہندو لڑکیوں اور پھنسے ہوئے لوگوں کو سرحد پار کرانے لگا۔"

سب بچے دم بخود بیٹھے سن رہے تھے۔ ان کی محویت پر زیب النسا اداس مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔

"وقت بہت بڑا مرہم ہے۔ یوں وقت گزرتا گیا اور مجھے میٹرک تک تعلیم دلوا کر آپ کے دادا... عبداللہ غازی سے میرا نکاح کر دیا گیا تو میں دلہن بن کر اس غازی ولا میں آگئی۔ سسرال میں سب کی محبتوں نے مجھے بہت سہارا دیا۔ مگر اس رمضان کی باتیں اور اگست کا مہینہ کبھی نہ بھلا سکی۔ میرے بزرگوں نے وطنِ عزیز کی آزاد فضاؤں کی خاطر جانیں تک قربان کر دیں۔ آپ کے دادا کے گھرانے کے بھی کم وبیش یہی حالات تھے۔ ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے پاکستان بنتے دیکھا اور اپنی نسل کو غلامی سے بچانے کے لیے مصائب برداشت کیے۔ 1965ء میں میرے گھرانے کو ایک مرتبہ پھر آزمائش سے گزرنا پڑا۔ جی ہاں! عبداللہ غازی کے منجھلے بھائی یعنی سرمد کے منجھلے چچا کیپٹن آفاق وطن کی سلامتی کی خاطر شہید ہو گئے اور پھر کارگل کے محاذ پر 1999ء میں میرے لختِ جگر یعنی آپ لوگوں کے چھوٹے چچا احمد غازی وطن کی آبرو پر قربان ہو گئے۔" کمرے میں سناٹا طاری تھا۔ وہ علی کی طرف دیکھ کر محبت سے بولیں۔

"یہ گھر ہم نے بہت محنت اور محبت سے بنایا اور سجایا ہے۔ علی بچپن میں بہت شرارتی تھا۔ کبھی، کبھی اس کی شرارتیں ہمیں زچ کر دیتیں اور بعض اوقات یہ اپنی بات منوانے کے لیے چیزیں بھی توڑ دیتا تھا۔ جس کی وجہ سے سب کو بہت تکلیف بھی اٹھانا پڑتی تھی۔ مگر کیا ہم میں سے کسی نے گھر چھوڑنے کی دھمکی دی؟" اب وہ باری، باری سب کو سوالیہ انداز میں دیکھ رہی تھیں۔

بے ساختہ سب نے نفی میں سر ہلایا۔ وہ بولتے، بولتے تھک چکی تھیں۔ سطوت نے پانی کا گلاس انہیں لا کر دیا تو وہ مسکرا دیں اور شکریہ کہہ کر گلاس لبوں سے لگا لیا۔ علی بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔

اسے اب تک سمجھ آچکا تھا کہ آج کی یہ محفل اس کی برین واشنگ کے لیے منعقد کی گئی ہے۔ وہ ذرا توقف کے بعد پھر مخاطب ہوئیں۔

"بس اب آخری بات جس دیس کے لیے سب نے اتنی محنت کی، قربانیاں دیں، جس نے ہم سب کو اپنا پن دیا، عزت اور وقار دیا۔ کیا اس کو چھوڑ کر مسائل سے گھبرا کر بھاگ جانا خود غرضی نہیں؟"

"دادو! آپ کی کہانی نے ہماری آنکھیں کھول دی ہیں۔" ربیعہ آبدیدہ ہوگئی۔

"مگر دادو! آپ میری معصوم شرارتوں کو دہشت گردوں اور نااہل کرپٹ حکمرانوں اور بیوروکریسی کی تباہ کاریوں سے کیوں ملا رہی ہیں؟" علی ناراضی سے بولا۔

"بیٹا! میرا مقصد صرف یہ ہے کہ بڑے جھگڑے اور تباہ کاریاں ہوں یا معمولی شرارتیں گھر تو آخر اپنا ہے۔" یہ کہتے وقت ان کے لہجے میں درد تھا۔

اب علی نے سر جھکا دیا۔

"ہر مسئلے کا کوئی نہ کوئی حل ہوتا ہے، مسائل سے فرار ہونا بہادری نہیں۔" اب سطوت نے بھی گفتگو میں حصہ لیا۔ سرمد نے ہاتھ کھڑا کیا۔

"اہلِ محفل اگر مجھے اجازت ہو تو میں بھی کچھ کہوں؟" علی نے جھکا ہوا سر اٹھایا مگر خاموش رہا۔ البتہ سطوت اور بچے زور سے بولے۔

"ضرور، ضرور......"

"قصہ مختصر! ہمارے آباؤ اجداد نے غلامی کی گھور شب کے اندھیرے کو دور کرنے کے لیے اپنے خون کے چراغ روشن کیے اور اس کے بعد کی نسل نے ان چراغوں کو اپنی نااہلی اور کرپشن کی بدولت آندھیوں کے سپرد کر دیا...... مگر نوجوان نسل زیادہ باشعور، مخلص اور حساس ہے۔ اب ملک کی باگ ڈور میرے علی جیسے سپوتوں اور ربیعہ جیسی بیٹیوں کے ہاتھ میں ہے۔

"نہ صرف مجھے بلکہ مجھ جیسے ہر دردمند شہری کی امید اور آس یہی نوجوان ہیں۔ مجھے امید ہے کہ یہی وہ طبقہ ہے جو نہ صرف اپنے اسلاف کی قربانیوں کو خراجِ تحسین پیش کرنے کے لیے جشنِ آزادی، یومِ دفاع اور کارگل کے واقعات کی یاد مناتا رہے گا۔ تمام شہدا کو سلام کرتا رہے گا بلکہ اپنے ملک وقوم کا وقار بحال کر کے آئندہ نسلوں کا مستقبل بھی تابناک بنائے گا۔"

"ان شاء اللہ!" بے ساختہ علی کے منہ سے نکلا۔ اس کی نمناک آنکھوں میں امید اور عزم کے نئے سورج چمک رہے تھے اور چہرہ جوش سے تمتما رہا تھا۔ کنزیٰ اور فرحان خاصے مایوس لگ رہے تھے۔ اچانک ہی ان کی گفتگو سن کر سب ان کی طرف متوجہ ہوگئے۔

"ہاں فرحان! تم صحیح کہہ رہے ہو، پاپا، بھیا اور بیا نے تو صحیح جواب دے دیا ہے۔ اب عید کا اسپیشل گفٹ دادو انہی تینوں کو دیں گی۔"

"ہمیں تو کچھ بھی نہیں ملے گا۔" فرحان نے بھی مایوسی سے کنزیٰ کی ہاں میں ہاں ملائی۔

اس پر سب ہنس دیے۔ علی نے بڑا جاندار قہقہہ لگا کر کہا۔

"فکر نہ کرو، عید کا صحیح مزہ تو اب آئے گا اور عید کا خصوصی تحفہ بھی آپ دونوں ہی کو ملے گا...... کیوں دادو......؟"

زیب النسا سرشاری سے مسکرا دیں۔ "تھینک یو امی جان......! جہاں آپ جیسی مائیں ہوں، وہاں مایوسی کا اندھیرا کیسے پھیل سکتا ہے؟" سرمد نے ماں کے ہاتھ تھام لیے۔

"واقعی ہمارے گھر میں تو عید کا صحیح مزہ اب آئے گا۔" سطوت نے بھی تشکرانہ انداز میں بھیگی آنکھوں سے ساس کو دیکھا اور علی اور ربیعہ کو اپنے ساتھ لپٹا لیا۔ امید کے جگنو سب کی آنکھوں میں جگمگا رہے تھے۔

چند دن پہلے آنے والے رضا کے فون نے گھر میں ہلچل مچادی تھی۔ رضا امریکا میں ہارٹ اسپیشلسٹ تھا...... اس نے اپنی ماں کی بچپن کی سہیلی صابرہ بیگم کو فون کر کے کہا تھا کہ وہ زندگی کا ایک بڑا فیصلہ کرنے جارہا ہے اور امی نے مرنے سے پہلے تاکید کی تھی کہ رضا جب بھی اپنا ایسا فیصلہ کرے تو صابرہ بیگم سے ضرور رابطہ کرلے...... سو وہ اسی غرض سے پاکستان آرہا تھا...... ادھر صابرہ بیگم اپنی بہن جیسی سہیلی کے بیٹے کی آمد سے بہت ایکسائٹڈ تھیں اور ان کی اس بے انتہا خوشی کے چکر میں سارا گھرانا چکرا رہا تھا۔

''دیکھو...... افسانوں میں ایسا ہی ہوتا ہے ناں...... امریکا سے بہت مالدار...... تعلیم یافتہ اور ہینڈسم ہیرو آتا ہے اور ہیروئن ہمیشہ ہمارے جیسے ایک عام سے گھر کی لڑکی ہوتی ہے......'' حنا نے ایمن کی بات حسب عادت بیچ میں سے اچکی اور قہقہہ مارتے ہوئے کہا۔

''ایگزیکٹلی ایسا ہی ہوتا ہے ناں......'' ایمن نے اپنی بات کی تائید چاہی۔

''اور پھر اس ڈیشنگ ہیرو کو ماڈرن...... خوب صورت...... لڑکی کے بجائے کچن میں کام کرتی...... معمولی صورت شکل والی یتیم لڑکی پسند آجاتی ہے۔'' جویریہ نے ایمن کی بات آگے بڑھائی۔

''لیکن ہمارے ہاں تو کوئی یتیم لڑکی نہیں ہے۔'' ہما جو ابھی، ابھی کچن میں داخل ہوئی تھی نے فکرمندی ظاہر کی۔

''لو بھی مینڈکی کو بھی زکام ہوا......'' زینب نے

سرپرائز

عقیلہ حق



ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے سلاد کی ٹرے سائڈ پر رکھی...... جو وہ بنا کم اور کھا زیادہ رہی تھی۔

اس وقت وہ سب کچن میں شام کے کھانے کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔

''خیر ہم لوگ یتیم ہوں یا نہ ہوں...... ہماری اماؤں نے جس طرح ہم کو دبا دبا کر پالا ہے، ہماری شکلوں پر یتیمی، مسکینی اور لاچاری سب دل کھول کے برستی ہے۔'' ایمن نے جل کر کہا۔

''اور یہ بھی تو ہوتا ہے کہ بعض اوقات ہم سوچتے ہیں کہ ہیروئن گھر کی سب سے مظلوم...... معصوم...... سی لڑکی ہو گی اور ہیرو کو لے اڑتی ہے گھر کی شوخ و شنگ اور لاڈلی بیٹی......'' زینب دور کی کوڑی لائی۔

''اور کبھی کبھی......''

''یار چھوڑو یہ سب باتیں...... فکر کی بات یہ ہے کہ سارے افسانے ہماری ماؤں نے بھی پڑھ رکھے ہیں۔'' زینب نے سب لڑکیوں کو معاملے کی سنگینی کا احساس دلایا۔

"oh my God" حنا کے منہ سے بے ساختہ نکلا...... اور پھر سب کو جیسے چپ سی لگ گئی...... لیکن......

☆☆☆

''یہ تم اس وقت کہاں جا رہی ہو......؟'' زینب جو بیگ کاندھے پر ڈالے یونیورسٹی کے لیے نکل ہی رہی تھی...... صابرہ بیگم کی آواز پر چونک کر پلٹی۔

''یونیورسٹی جا رہی ہوں امی...... اور کہاں جاؤں گی...... اور اس وقت اس لیے جا رہی ہوں کہ روز کی طرح 7:50 کا پوائنٹ لے لوں گی......'' زینب نے سوالیہ ماں کو حیرت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ تو مجھے بھی معلوم ہے کہ تم یونیورسٹی جا رہی ہو، روز کی طرح...... لیکن بیٹا آج رضا آ رہا ہے۔''

''کون رضا......؟'' سب کچھ جانتے بوجھتے بھی زینب نے معصومیت کے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے۔

''لو بھئی حد ہوتی ہے...... چار دن سے گھر میں رضا، رضا کا شور مچ رہا ہے اور ہماری باؤلی بیٹی پوچھ رہی ہیں کون رضا...... واہ بھئی واہ...... ارے میری سہیلی تھی ناں ساجدہ...... جس کا چند سال پہلے نیویارک میں کینسر سے انتقال ہو گیا تھا...... اس کا بیٹا ہے ڈاکٹر احمد رضا......'' صابرہ بیگم کے لہجے میں کم از کم دو کلو فخر اور غرور تو زینب کو بھی محسوس ہوا۔

''اچھا...... اچھا وہی ساجدہ آنٹی ناں جو ہمیشہ پاکستان آتے ہوئے ڈالرز اسٹورز سے one doller سیل میں سے روتے بسورتے چند تحائف لے آتی تھیں...... اور آپ ان کے تحفوں کے عوض صرف امریکا کی کلائمٹ سے متاثر ہو کر بیش قیمت تحائف دیا کرتی تھیں اور جس زمانے میں وہ آتی تھیں تو ہم کو بھی برسوں بعد کبھی زنگر تو کبھی پزا تو کبھی کچھ اور مل جاتا...... کاش وہ پھر سے آ جائیں۔'' زینب نے صابرہ بیگم کے کفایت شعار مزاج کو للکارا۔

''ارے زینی باؤلی ہو گئی ہے۔ کیسی باتیں کر رہی ہے تو......'' صابرہ بیگم کی ہنسی نکل گئی۔

''زینی...... آہا...... یا اللہ اس تئیس، چوبیس سالہ روبیر زندگی میں کبھی آپ نے مجھے اس قدر پیار سے نہیں بلایا...... بلکہ مائی ڈیئر امی مجھے تو آج ہی پتا چلا ہے کہ میرے نام کا تو ایک بہت خوب صورت نک نیم بھی بن سکتا ہے زینی......'' زینب نے زینی کو کھینچا۔

''پیاری امی ایک دفعہ اور کہیے ناں...... زینب......''

زینب نے چہرے پر درد اور خوشی کے ملے جلے تاثرات لاتے ہوئے گلوگیر لہجے میں کہا۔

''چپ رہو...... بہت ہی بولتی ہو۔'' صابرہ بیگم کی برداشت جواب دینے لگی۔

''رضا آ رہا ہے...... بس گھر میں بیٹھو...... تاکہ یہ جو یونیورسٹی جا جا کر تمہاری شکل دریائی گھوڑے جیسی ہو گئی ہے، یہ کچھ بہتر ہو کر...... اگر خوب صورت نہیں تو کم از کم انسانوں میں تو لگے......'' صابرہ بیگم

نے دل جلانے والے انداز میں کہا۔
"اگر امی میری شکل دریائی گھوڑے جیسی ہے تو پھر آپ مجھے کسی دریا میں چھوڑ دیں...... گھر میں کیوں بٹھا رہی ہیں۔" زینب نے برا منایا۔
"بس باتیں بند کرو...... سمجھ میں نہیں آتا تم لوگوں کو اتنی باتیں کیسے آجاتی ہیں..... چلو اندر جا کر اس شکل کو صحیح کرنے کی کوشش کرو....." صابرہ بیگم نے اپنی بات مکمل کر کے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔
"کیوں امی..... آخر کیوں......؟" زینب نے کسی ماہر وکیل کی طرح بلند آواز میں سوال کیا۔
"ارے زینب تم بے وقوفوں جیسی باتیں کیوں کر رہی ہو...... جو بھی آتا ہے۔ یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔ میرا تو بس رضا پر دل آگیا ہے۔ امریکن سٹیزن ہے..... اوپر سے ڈاکٹر بھی...... اپنا ذاتی گھر بار ہے اور کیا چاہیے..... میرا تو رُواں، رُواں رات، دن دعا کر رہا ہے۔ اللہ کوئی سبب پیدا کردے...... میں تو کسی بزرگ سے جا کر دعا بھی لے آئی ہوں۔ انشاء اللہ ......آج سے ہی عصر کی نماز کے بعد پڑھنا شروع کروں گی۔ میرا دل کہہ رہا ہے زینب، تیرا نصیب کھلنے والا ہے..... لیکن تقدیر کے ساتھ، ساتھ تدبیر بھی بہت ضروری ہے۔" وہ خوشی، خوشی کہہ رہی تھیں۔
"پتا ہے وہ بزرگ بھی کہہ رہے تھے کہ رشتہ حسبِ منشا ہوگا۔ ساری دنیا دیکھتی رہ جائے گی اور..... خبردار جو تم نے کسی سے ذکر کیا...... ارے جب چاند چڑھے گا تو کل عالم دیکھ ہی لے گا۔" صابرہ بیگم پائدان کی کلیا صاف کرتے ہوئے مسلسل بول رہی تھیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ زینب تو کب کی پیر پٹختی وہاں سے جا چکی تھی۔

☆☆☆

"میری پیاری سی زینب..... تمہاری کہانی اتنی دردناک نہیں ہے، کم از کم اس بہانے تم کو نئے کپڑے اور پارلر کے وزٹ تو مل گئے...... " ایمن نے خوب صورت نقش و نگار رکھنے والی زینب کو دیکھتے ہوئے اداس لہجے میں کہا۔
"مجھے دیکھو، ہماری اماں کا حکم ہے کہ جتنی مظلومیت میں چہرے پر لا سکتی ہوں لے آؤں...... اور ہر وقت سر جھکائے کچن میں کام کرتی رہوں۔ ان کا بس چلے تو میرا بستر ہی کچن میں لگوا دیں...... مجھے روز چار چوٹ کی مار ماریں..... مجھے اپنی بیٹی ہی ماننے سے انکار کردیں..... کیونکہ ان کا خیال ہے ہمیشہ ہیرو کو گھر کی سب سے مظلوم لڑکی ہی پسند آتی ہے۔ روزوں میں کام کرتے، کرتے میرا برا حال ہوگیا ہے۔ اللہ کے واسطے میرے بارے میں سوچو....." ایمن نے اتنے دکھ بھرے انداز میں کہا کہ ان سب کا بے ساختہ قہقہہ نکل گیا۔

☆☆☆

''تو بیٹا..... تمہاری فیملی کا کب تک آنے کا ارادہ ہے؟'' رقیہ بیگم نے افطاری کے بعد چائے پیتے ہوئے رضا سے پوچھا۔ رقیہ بیگم ایک لیے دیے رہنے والی خاتون تھیں لیکن رضا کے اعلیٰ اخلاق اور مؤدبانہ انداز نے ان کے دل میں اس کے لیے ایک خاص جگہ پیدا کر دی تھی۔

رضا کو آئے کئی دن ہوگئے تھے اور وہ بہت جلد ہی گھر کے فرد کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ اس میں اس کی اچھی عادتوں کے ساتھ ساتھ گھر میں موجود رقیہ بیگم کی بہوؤں کی خواہشات اور امیدوں کا بھی دخل تھا۔

ساس کے منہ سے نکلے سوال کو سن کر صابرہ بیگم جلدی سے رقیہ بیگم کے برابر آبیٹھیں کہ وہ دل سے چاہتی تھیں کہ جلد از جلد رضا کی فیملی پاکستان آئے..... اور ان کو یقین تھا کہ وہ ان کی زینب کا ہی ہاتھ مانگے گا۔

''بس دادی اماں! انشاء اللہ وہ لوگ عید سے ایک دو دن پہلے آجائیں گے۔ دراصل میرا تو کوئی ارادہ نہیں تھا ان لوگوں کو بلانے کا لیکن آپ لوگ اس قدر اچھے ہیں..... اتنی محبت کرنے والے، اتنے پرخلوص..... میرا دل چاہتا ہے..... میرا ایک تعلق آپ لوگوں سے قائم رہے.....'' رضا کے لہجے میں سچائیاں تھیں۔

''ویسے بیٹا کیا تم نے یہاں والی اپنی ساری پراپرٹی بیچ دی؟'' حبیب احمد نے بیوی کے اشارے پر زبردستی مداخلت کی۔

''نہیں انکل پہلے تو میرا ارادہ تھا کہ سب سیل کردوں لیکن اب آپ لوگوں سے ملنے کے بعد میں چاہتا ہوں پاکستان سے جڑا رہوں سو ڈیفنس میں خیابانِ اتحاد والی کوٹھی میں نہیں بیچ رہا..... وہ میں نے روک لی ہے تاکہ جب بھی پاکستان آؤں تو فیملی کے ساتھ اپنے ہی گھر میں ٹھہروں۔'' رضا نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

رضا کو آئے کافی دن ہوگئے تھے..... رقیہ بیگم بہوؤں کی بے چینی بھی محسوس کر رہی تھیں ..... رضا انہیں بھی پسند آیا تھا لیکن سب سے گھل مل جانے کے باوجود رضا کی مرضی کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

سو آج افطار کے بعد جب روز کی طرح ساری فیملی چائے پینے پر بیٹھی تو رقیہ بیگم نے وہ موضوع چھیڑ دیا..... جس پر ہر کوئی بات کرنا چاہتا تھا۔

''تو بیٹا جب بھی پاکستان آنا، ہمارے ہی گھر میں ٹھہرنا..... بلکہ ہمارا کیا، یہ تمہارا ہی گھر ہے۔'' آمنہ بیگم (ایمن کی ماں) نے جلدی سے کہا۔

''بالکل ہے..... میں آپ کو پاکستان کی سب سے خاص بات بتاؤں ..... کیا ہے۔'' رضا نے سسپنس پھیلایا۔

''ہاں، بیٹا بتاؤ.....'' صابرہ بیگم نے بے صبری کی حدیں کراس کرتے ہوئے کہا۔

''ایمن کے ہاتھ کی چائے۔'' رضا نے سامنے سے آتی ایمن کو دیکھ کر پرخلوص لہجے میں کہا۔

ایمن کو دیکھتے ہوئے اسے نہ تو صابرہ بیگم کے تیوروں کے بل نظر آئے اور نہ ہی گھر میں داخل ہوتی ناہید بیگم کی گھورتی نظریں..... نظر تو اوروں کو بھی بہت کچھ نہیں آرہا تھا لیکن پھر بھی.....

☆☆☆

''اماں آپ بھی حد کرتی ہیں۔ میں آپ کی اکلوتی بیٹی تھی اور آپ نے میری شادی نہ جانے کن لوگوں میں کردی ..... زندگی گزر گئی میری، ساس نندوں کا منہ تکتے، تکتے' ساری سسرال چیونٹیوں بھرا کباب ہے۔'' وہ نہایت غم زدہ لہجے میں کہہ رہی تھی۔

''بس گزر ہی گئی اب زندگی تیرا میرا منہ دیکھتے، دیکھتے ..... اور ہماری بھاوجیں ..... واہ ساری زندگی دندناتی رہیں اور اب..... اب بھی آپ کو حنا کا ذرا برابر خیال نہیں..... اب بھی آپ نے میری بچی کے بارے میں نہیں سوچا..... جبکہ وہ آپ سب سے کس قدر پیار کرتی ہے۔'' ناہید بیگم نے غصے سے کھولتے ہوئے رقیہ بیگم سے کہا۔

آج جب وہ آئیں اور انہوں نے اس طرح بھائی بھاوجوں کے درمیان گھرے ہوئے رضا اور شرماتی ہوئی ایمن کو دیکھا تو ان کے تو پتنگے ہی لگ گئے۔

رضا انہیں بہت پسند آیا تھا۔ وہ امریکا میں ڈاکٹر تھا اور حنا میڈیکل اسٹوڈنٹ تھی...... انہوں نے ساری زندگی سسرال والوں کی خدمت گزاری کی تھی، وہ چاہتی تھیں جو زندگی انہوں نے گزاری ہے ویسی زندگی کم از کم ان کی بیٹی تو نہ گزارے اور رضا میں ہر وہ خوبی موجود تھی جو ایک محبت کرنے والی ماں اپنے داماد میں چاہتی ہے۔

آج کئی دنوں کی سوچ بچار کے بعد وہ اس سلسلے میں اپنی اماں (رقیہ بیگم) سے مشورہ کرنے آئی تھیں لیکن یہاں بچھی بساط پر رکھے مہرے دیکھ کر ان کی تو جان ہی جل ہی گئی۔

"کیا ہو گیا ناہید، کیسی باتیں کر رہی ہو...... جو منہ میں آئے بس بولتی چلی جاتی ہو...... ارے بھئی میرے لیے ساری ہی بچیاں برابر ہیں۔" رقیہ بیگم نے جھنجلا کر بیٹی کو ٹوکا۔

"کوئی برابر ورابر نہیں ہے اماں......! آپ نے ہمیشہ اپنی پوتیوں کو میری حنا پر فوقیت دی ہے...... اب دیکھیں رضا کتنا اچھا لڑکا ہے، آپ خود اپنے ایمان سے بتائیں کیا آپ نے سوچا کہ رضا کی شادی حنا سے ہونی چاہیے؟" ناہید نے فوراً ماں کی بات کو رد کیا۔

"اچھا خیر...... تم فکر مت کرو، میں دیکھتی ہوں رضا کی فیملی انشاء اللہ چاند رات کو آ رہی ہے...... پھر دیکھو میں کوئی بات کر لیتی ہوں......" ناہید کی باتوں نے رقیہ بیگم کو ایک عجیب سی الجھن میں ڈال دیا تھا۔

"ویسے اماں...... رضا کے ماں، باپ تو ہیں نہیں...... اب اس کی فیملی میں کون، کون ہے؟" ناہید کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

"بھئی بہن، بھائی تو ہوں گے اور کون

ہوگا......؟ میں نے پوچھا تھا ایک بار تو ہنس کر کہنے لگا...... وادی بس یہ سرپرائز ہے......" رقیہ بیگم نے مسکراتے ہوئے کہا اور کھڑی ہوگئیں کہ انہیں تراویح بھی تو پڑھنی تھیں۔

☆☆☆

"میں نے سوچا حنا روزے میں کالج سے تھکی ہوئی آئی ہوگی اور آج تو گرمی بھی بہت ہے...... سو میں لے آیا...... کہ افطار کے بعد کھانا...... بھلا اس میں تکلف کی کیا بات ہے۔" رضا نے کپوں میں آئس کریم نکالتی جویریہ کو بڑبڑاتے ہوئے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"ارے میرے بھولے بھالے سے رضا بھائی! بات تکلف کی نہیں، دکھ بے قدری کا ہے۔ آپ کو لگا ایک حنا ہی کالج جاتی ہے، وہی سورج کی گرمی میں جھلستی ہوئی آتی ہے...... اور میں......" جویریہ نے ٹھنڈی سانس بھری...... "میں تو جیسے جھولوں میں جھولتی ہوں...... بادل کا ایک ٹکڑا میرے سر پہ سایہ کیے ہوتا ہے۔" جویریہ نے منہ بنایا۔

"ویسے تم مسلسل آئس کریم کھا رہی ہو...... حنا نے تو اب تک ایک اسکوپ بھی ختم نہیں کیا۔" رضا نے خاموش بیٹھی حنا کی سائڈ لی۔

"ارے رضا آئے ہیں......" ناہید بیگم جو ڈرائنگ روم میں سے آتی آوازوں کو سن کر اپنے کمرے سے باہر آئی تھیں...... رضا کو دیکھ کر جیسے کھل سی گئیں۔

"دیکھیے...... رضا بھائی، حنا کے لیے کتنی ساری آئس کریم لائے ہیں۔"

"حنا کے لیے......؟" ناہید بیگم نے حنا کے شرمائے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا اور پھر رضا کے جگمگاتے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا اور پھر جیسے ڈھیروں اطمینان انہیں اپنے اندر اترتا ہوا محسوس ہوا۔

☆☆☆

"رضا ہر وقت میرے ہاتھ کے پکے کھانوں کی تعریفیں کرتے رہتے ہیں...... لگتا ہے اب مجھے کوکنگ پر توجہ دینی ہی پڑے گی...... ہماری امی بھی تو خوب ہیں روز اتنے مشکل، مشکل کھانے پکا کر میرے نام کر دیتی ہیں۔

"مجھے تو یہ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر نرگسی کوفتے میں انڈا سلامت کیسے رہتا ہے اور ہماری امی صاحبہ بیٹھی کتنے فخر سے کہہ رہی ہیں کہ میری زینب تو ایسے نرگسی کوفتے پکاتی ہے کہ بندہ ہونٹوں سے توڑ لے۔

"نرگسی کوفتے تو بڑی بات...... مجھ سے تو فروزن فوڈ کے تیار کوفتے نہیں پکتے...... لیکن بے چاری امی کا بھی کیا قصور...... ہر ماں ہی چاہتی ہے کہ اس کی بیٹی عیش کرے...... بس رضا کی فیملی آجائے...... اور بات ذرا آگے بڑھے تو میں ان شاء اللہ ...... کوکنگ اور بیکنگ کے کورسز کرلوں گی...... تاکہ باقی زندگی رضا یہ نہ سوچ سکیں کہ میری امی نے جھوٹ بولا...... اور ویسے بھی مرد کے دل کا راستہ معدے سے ہو کر ہی گزرتا ہے...... اور لگتا ہے رضا بھی ایسے ہی مرد ہیں۔"

زینب نے کچن کا کاؤنٹر صاف کرتے ہوئے جیسے... اپنے آپ سے عہد کیا۔

☆☆☆

"آپ کو پتا ہے کہ آپ کی مسکراہٹ بہت خوب صورت ہے...... آپ خود بھی بہت خوب صورت ہیں اور آپ کلرز بہت ہی خوب صورت پہنتی ہیں۔"

"پاگل......" رضا کی آواز زینب کے دل سے ہوتی اس کے کانوں میں گونجی تو اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

☆☆☆

آج زینب کی برتھ ڈے تھی...... رضا کو کیسے پتا چل گیا۔ یہ بات زینب کے لیے معما تھی...... ابھی

تھوڑی دیر پہلے رضا اس کے لیے کئی ڈیزائنر سوٹ لے کر آیا تھا اور اس کے لاکھ منع کرنے کے باوجود زبردستی اسے تھما دیے تھے۔

"مجھے لگتا ہے..... میرا پاکستان سے دانہ پانی اٹھ گیا ہے..... امی کو تو ہمیشہ میری شکل پہاڑی بکروں جیسی لگتی ہے لیکن رضا..... رضا میری کتنی تعریفیں کرتے ہیں۔ انشاء اللہ اب میں بھی امریکا چلی جاؤں گی..... بلکہ رضا سے کہوں گی کہ ٹکٹ سنگاپور ... ائرلائن سے بک کروائیں..... چند دن ہم سنگاپور میں بھی گزاریں گے۔"

"امریکا..... land of opportunity"

وہ تصور ہی تصور میں کہیں پہنچی ہوئی تھی۔

"میں تو... وہاں جاب بالکل نہیں کروں گی..... خواہ مخواہ جاب کر کے میری شکل اب تو نہیں ہے لیکن تب ضرور..... کالی کوئل جیسی ہو جائے گی..... نہیں بھئی' میں تو بس آرام کروں گی..... زندگی کتنی بدل جائے گی۔ تفریح..... شاپنگ..... انجوائے منٹ میری زندگی تنگینی سے نکل کر رنگینی میں ڈوب جائے گی۔" وہ نہ جانے کب سے ان خوب صورت سوٹوں کے رنگوں پر نظریں جمائے اپنی زندگی کی رنگینیوں کو کھوج رہی تھی۔

☆☆☆

"یا اللہ اس قدر خاطر تواضع..... یار میں تو گھبرا گیا ہوں، گھر کے جس پورشن میں جاتا ہوں..... اس قدر آؤ بھگت ہوتی ہے۔ پاکستان آنے سے پہلے تو مجھے اپنی قدر و قیمت کا قطعی احساس نہیں تھا..... آج کل ایسے ایسے لذیذ کھانے، کھانے کو مل رہے ہیں لگتا ہے میں تو ساری زندگی گھاس ہی کھاتا رہا ہوں۔" رضا جو اپنے دوست احسن کے ساتھ ونچ ریسٹورنٹ میں بیٹھا افطار کا لطف اٹھا رہا تھا۔ سموسہ منہ میں رکھتے ہوئے بولا۔

"اوہ..... واہ..... ! تیرے تو مزے ہی آ گئے..... " حسن ہنسا۔ "ویسے ایک بات بتا کہیں وہ لوگ تجھے اپنا داماد تو بنانا نہیں چاہتے..... اور اگر ایسا چاہتے ہیں تو بہت ہی برا چاہتے ہیں یا تیرا ان کے گھر میں کسی لڑکی سے افیئر تو نہیں چل گیا کیونکہ بظاہر تو تیرے اندر ایسی کوئی خوبی نہیں ہے کہ تیری کوئی ایسی خاطر مدارات کرے۔" احسن نے سر سے پیر تک رضا کا جائزہ لیتے ہوئے پُرسوچ انداز میں کہا۔

"ویسے یار تیری ناک تو ابھی خاصی موٹی ہے....."

احسن نے رضا کی ستواں ناک کا بیڑا غرق کیا۔

"یہ تو مجھے پتا تھا کہ تم مجھ سے جلتے ہو..... لیکن اس قدر جلتے ہو..... اس بات کا تو مجھے اندازہ نہیں تھا..... لیکن آج میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔" رضا نے جل کر کہا۔

"تو خود سوچ..... تیری خاطریں..... تیری آؤ بھگت..... یار وہ لوگ سب ذہنی طور پر صحت مند ہیں ناں..... یا کراچی کے کسی نفسیاتی اسپتال کے ریگولر پیشنٹ ہیں؟" احسن نے رضا کے موڈ کو انجوائے کیا پر رضا بالکل خاموش رہا..... بس حسن کو گھورتا رہا اور حسن اس کے اس طرح دیکھنے پر بے ساختہ ہنس دیا۔

"ویسے چل چھوڑ، یہ بتا تیری فیملی کب آ رہی ہے؟" حسن نے ماحول کو بدلنا چاہا۔

"انشاء اللہ عید سے ایک دن پہلے..... یار بہت مدت ہوگئی پاکستان میں عید منائے ہوئے۔"

☆☆☆

"اگر رضا نے مجھے پروپوز کیا تو میں تو فوراً ہی ہاں کہہ دوں گی اور زینب اور ایمن اگر کہیں گی کہ تم تو اس طرح کی افسانوی سچویشن کا مذاق اڑاتی تھیں اب کیسے راضی ہو گئیں..... تو میں بھی بھئی صاف، صاف کہہ دوں گی کہ میری تو قطعی مرضی نہیں ہے لیکن ظاہر ہے میں امی کے آگے تو کچھ نہیں بول سکتی ناں۔

"اور پھر امریکا اور میں..... کتنے مزے آ جائیں گے، نیویارک میں عیش ہی عیش..... امی کی

پھٹکاروں اور میرے درمیان سات سمندروں کا فاصلہ......واہ......کیا زندگی ہوگی......نہ ساس نہ نند......میری تو وہی پچویشن ہوگی......"مکھول میاں نکھنا، میں گھر سنبھالوں اپنا۔"

"میرے اللہ جی میرے حق میں فیصلہ کردے......پلیز......" حنا نے آئینے میں نظر آتے اپنے عکس پر نظریں جماتے ہوئے دل ہی دل میں کہا۔

☆☆☆

زینب......ایمن اور حنا......تینوں جب بھی مل کر بیٹھتیں یہی ظاہر کرتیں جیسے انہیں رضا میں کوئی دلچسپی نہیں ہے بلکہ ان کے بڑے خاص کر ان کی مائیں جس طرح رضا کے آگے بچھے، بچھے جارہے ہیں تو انہیں یہ سب کچھ سخت برا لگ رہا ہے ورنہ...... درحقیقت وہ تینوں دل ہی دل میں یہ چاہ رہی تھیں کہ قرعہ ان کے نام نکل آئے لیکن قرعہ کس کے نام نکلے گا، کون دلہن بنے گی......؟ کون بازی جیتے گی......؟ یہ کون جانتا تھا......؟

☆☆☆

"دیکھیں اماں میں پھر آپ سے کہہ رہی ہوں آپ کو میری حنا کے لیے بات کرنی ہے اور اگر رضا کی شادی حنا سے نہیں ہوئی تو پھر میں کسی اور سے بھی رضا کا رشتہ نہیں جڑنے دوں گی......" ناہید نے خاموش بیٹھی تسبیح کے دانے پڑھتی رقیہ بیگم سے آدھے گھنٹے میں کوئی بارھویں مرتبہ یہی بات دُہرائی۔

"توبہ ہے، ناہید تم خود باؤلی ہوگئی ہو...... مجھے بھی پاگل کیے دے رہی ہو...... آنے تو دو ان لوگوں کو...... دیکھتے ہیں اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔" رقیہ بیگم نے توقف سے تسبیح کو گاؤ تکیے پر اس طرح رکھا کہ دانے نہیں مل جائیں اور پھر ناہید سے برہمی سے کہا۔

آج انتیسواں روزہ تھا...... شام پانچ بجے کی فلائٹ تھی...... رضا کے گھر والے آرہے تھے......

رضا انہیں لینے ائرپورٹ گیا ہوا تھا۔

افطاری کی تیاری عروج پر تھی......ساتھ ساتھ مہمانوں کے استقبال کے لیے سب دیدہ و دل فرشِ راہ کیے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ ناہید بیگم جو کبھی اپنے گھر سے بچی ہوئی دال لے کر بھی نہیں آتی تھیں بقول ان کے یہ ان کا میکا تھا۔ یہاں وہ صرف آرام کرنے اور خاطریں کروانے آتی تھیں......آج وہ چار مختلف قسم کے کھانے بھی تیار کر کے لائی تھیں۔

☆☆☆

"ٹھیک ہے......لیکن بال ذرا ڈھیلے باندھو، کس کر چوٹی میں عجیب ہونق سی لگ رہی ہو......" صابرہ بیگم نے صاف ستھری سی زینب کو تنقیدی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"اُف......امی......" زینب چیخی۔

"خاموش رہو......اس طرح اور بری لگ رہی ہو......رضا خود اس قدر خوب صورت لڑکا ہے......پتا نہیں، بہنیں کتنی پیاری اور خوب صورت ہوں گی......اب بیٹا......ایک تو تمہاری شکل صورت ویسے بھی واجبی سی ہے اوپر سے تم اور تیوریاں چڑھائے رکھتی ہو......اللہ خیر کرے، روزہ کھلنے میں تھوڑی ہی دیر رہ گئی ہے......رضا اب تک نہیں آیا......میرا تو دل ہول رہا ہے۔" صابرہ بیگم نے زینب سے بات کرتے، کرتے جو اچانک وال کلاک پر تیزی سے بھاگتی سوئیوں کو دیکھا تو گھبرا کر کھڑی ہوگئیں۔

"امی......! آپ تو بہت ہی گھبرا رہی ہیں......آپ تو ایسا کرتیں کہ ائرپورٹ ساتھ چلی جاتیں، یہ زیادہ بہتر رہتا......" زینب ایک تو اپنی بے عزتی پر جل رہی تھی اوپر سے صابرہ بیگم کی بے قراری۔

"ہاں، میں بھی تو یہی چاہ رہی تھی......لیکن کیا کروں رضا تو بہت ہی شرارتی ہے......کہنے لگا نہیں آنٹی آپ لوگ گھر پر ہی رکیں میں اکیلا ہی چلا جاؤں گا......کیونکہ میں نے آپ کی اپنے گھر والوں سے

اس قدر تعریفیں کی ہیں کہ ائر پورٹ پر پہلی ملاقات میں مزہ نہیں آئے گا۔" بچے نے اس قدر محبت اور معصومیت سے کہا کہ مجھے اس کی بات ماننا ہی پڑی......" صابرہ بیگم نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"ہونہہ......شریر......ابھی یہ بات ہم میں سے کوئی کرتا تو امی......وہ ،وہ باتیں سناتیں کہ زہر کھانے کو دل چاہنے لگتا......لیکن ہماری امی خیر پھر بھی بہت اچھی ہیں میری امی...... میرے لیے ہی تو اس قدر پریشان ہو رہی ہیں۔ اللہ کرے...... میں رضا کی فیملی کو... پسند آجاؤں۔" زینب نے دل ہی دل میں اللہ سے فریاد کی۔

☆☆☆

"ٹرن......ٹرن" وہ سب جو رضا کا انتظار کرتے ، کرتے خاموشی سے سر جھکائے افطار کر رہے تھے۔ کال بیل کی آواز پر جیسے چونک اٹھے۔

"لگتا ہے رضا بھائی آگئے......" جویریہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھی۔

"رضا......" ایمن کے لب تھرتھرائے۔

"میرا بچہ آگیا......" صابرہ بیگم نے بے قراری سے آلو چھولوں کا بھرا چمچہ واپس ڈش میں رکھا۔

"اٹھو حنا......دیکھو...... جاؤ دروازے پہ رضا کی فیملی آئی ہے۔" ناہید بیگم تے تیز قدموں سے چلتے ہوئے آمنہ بیگم کی تیز رفتاری کو مات دی۔

وہ گھر جہاں کا اتفاق اور محبت مثالی تھی ایک عجیب سی نفسا نفسی کا نمونہ لگ رہا تھا......رقیہ بیگم نے تاسف سے بیٹی اور بہوؤں کی طرف دیکھا۔

"یا اللہ میرا آنگن اتنا کمزور تھا؟" رقیہ بیگم نے اللہ سے سوال کیا۔

تینوں لڑکیاں ایک دوسرے سے نظریں چرا رہی تھیں۔ کون رضا کے دل کی شہزادی ہے، بلی کے تھیلے سے باہر نکلنے کا وقت آگیا تھا۔

"السلام علیکم......" رضا نے پُر جوش انداز میں سلام کیا اور پھر سب جیسے اپنی اپنی جگہ پتھر کے ہو گئے۔ عید کا چاند ہو چکا تھا......گلی میں پٹاخے چھوٹ رہے تھے۔ ٹی وی پر بریکنگ نیوز چل رہی تھی......اور رضا کہہ رہا تھا۔

"ان سے ملیے...... یہ ہیں میری بیگم...... عائزہ......اور یہ میرے دونوں بیٹے...... علی اور ہمایوں......علی گریڈ 4 میں پڑھتے ہیں...... چلو بیٹوں جاؤ دادی کو سلام کرو......اور عائزہ ان سے ملو...... یہ ہیں میری بہنیں...... آپ کہتی تھیں ناں کہ آپ کی نندیں نہیں ہیں، دیکھیں اللہ نے ایک ساتھ اتنی ساری نندیں دے دیں آپ کو۔" صابرہ بیگم کو لگا ان کا ہارٹ فیل ہو جائے گا...... ناہید بیگم اور آمنہ بیگم بہت خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئیں۔ یہ الگ بات ہے کہ باہر نکلتے، نکلتے وہ ڈائننگ ٹیبل پر سے سالن کی ڈشیں اٹھانا نہیں بھولی تھیں۔

"کیا رضا نے ہم کو دھوکا دیا......؟" صابرہ بیگم نے جیسے اپنے آپ سے پوچھا۔ "نہیں......اس نے کہاں دھوکا دیا......وہ تو بار بار کہہ رہا تھا...... میں اپنی زندگی کے اہم فیصلے کرنے آیا ہوں......اس کی زندگی کے اہم فیصلے اس کی پراپرٹیز کے متعلق تھے......خوش فہم تو میں تھی......" صابرہ بیگم کے اندر بیٹھی ایک ماں نے انہیں سمجھایا۔

"یا اللہ تیرے ہر کام میں مصلحت ہوتی ہے۔ تو نے میرے تسبیح کے دانوں کی طرح جڑے خاندان کو بکھرنے سے بچالیا۔" رقیہ بیگم، عائزہ کو سینے سے لگائے......دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کر رہی تھیں۔

"what' a su rprise!" ان تینوں نے ایک دوسرے کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے جویریہ کو کہتے سنا......اور پھر وہ سب بے ساختہ ہنس پڑیں اور ہنستی ہی چلی گئیں۔

یہ الگ بات تھی کہ یہ چاند رات ان کو کسی دھماکے سے کم نہیں لگ رہی تھی۔

بہار رُت بن کر آئی ہے عید

عذرا فردوس

"مائرہ... اپنی آزاد خیالی پر تم ایک دن بہت پچھتاؤ گی اور اس وقت تمہارا پچھتاوا بیکار ہوگا۔"
امی اس طرح کی نصیحتیں اسے اکثر کرتی رہتیں ..... مگر وہ امی کی باتوں کو سنتی ہی کب تھی ..... اگر انسان دوسروں کے تجربے سے سبق حاصل کرلے تو تباہی سے بچ جائے مگر یہاں تو جب تک کوئی خود تجربے کی چکی میں



رپس نہیں جاتا اسے بات سمجھ میں آتی نہیں اور جب بات سمجھ میں آتی ہے تو دیر ہو چکی ہوتی ہے۔

☆☆☆

''آج موسم بہت خوشگوار ہے، چلو لانگ ڈرائیو پر چلتے ہیں۔'' فراز نے آسمان پر اڑتے بادلوں کو دیکھتے ہوئے مائرہ سے کہا۔

''سوری، میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتی، آج میں آفس سے جلدی اس لیے آ گئی ہوں کہ مجھے رات میں ہونے والی پارٹی کے لیے تیاری کرنی ہے۔''

''کون سی پارٹی......؟''

''آفس ورکرز کی پارٹی ہے، میرے باس نے اپنے گھر پر رکھی ہے۔'' مائرہ بے پروائی سے بولی۔

''مت جاؤ ناں پارٹی میں.....تمہاری ڈیوٹی آفس تک ہی ہوتی ہے۔''

''کیوں نہ جاؤں بھلا....! میں اپنے باس کو ناراض نہیں کر سکتی۔ ویسے بھی مجھے اس طرح کی پارٹیوں میں جانے کا بہت شوق ہے۔''

''باس کو ناراض نہیں کر سکتیں......مگر شوہر کو ناراض کر سکتی ہو؟''

''یہ تم نے کیسی دقیانوسی باتیں شروع کر دیں.....شادی سے پہلے ہم نے طے کر لیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کے ذاتی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے۔ ہماری لو میرج ہے، ایک دوسرے کو سمجھ کر شادی کی ہے۔ اب دیکھو.....تمہاری بھی تو آفس میں کئی لڑکیوں سے دوستی ہے۔ میں تمہاری ذاتیات میں دخل نہیں دیتی تو تمہیں بھی اس طرح نہیں کرنا چاہیے۔'' اس نے خفگی کے انداز سے کہا۔

''سوری مائرہ......!'' فراز نادم ہو گیا۔ ''میرا دل چاہ رہا تھا کہ اتنے اچھے موسم میں ہم لوگ لانگ ڈرائیو پر چلیں۔ ہائی وے کے کسی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کھانا کھائیں اور اچھا سا میوزک سنیں......''

''اوکے، تم یہاں چھت پر بیٹھ کر خیالی پلاؤ پکاؤ، میں اپنے روم میں جا رہی ہوں، مجھے پارٹی میں جانے کے لیے تیار ہونا ہے۔'' مائرہ مسکراتی ہوئی سیڑھیاں اترنے لگی۔

مائرہ کے جانے کے بعد فراز کافی دیر تک اس کے رویے پر غور کرتا رہا.....اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ صرف نام کے لیے اس کی بیوی ہے، اس کا سجنا، سنورنا غیر مردوں کو دکھانے کے لیے ہوتا تھا، کافی دیر تک وہ انہی منفی سوچوں میں گم رہا۔ ہلکی، ہلکی ہوا کے ساتھ پھوار پڑنی شروع ہو گئی تھی۔ فراز چھت پر بارش میں بھیگتا رہا۔

''فراز! تم تو کھانا کھالو.....تمہاری لاڈلی بیوی تو تیار ہو کر ابھی نکلی ہے۔'' سلیمہ بیگم کا لہجہ خاصا ناگوار تھا۔

''امی مجھے بھوک نہیں ہے۔'' فراز کا موڈ سخت آف تھا۔

''بیٹا.....رات کو کچھ نہیں کھانا بڑھاپا لاتا ہے۔''

''اچھا امی فی الحال میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں، تھوڑی دیر آرام کروں گا، بھوک لگی تو کچھ کھا لوں گا۔''

بیڈ روم میں جاتے ہی وہ بے دم سا ہو کر بستر پر ڈھیر ہو گیا۔ ایسی ہی سوچوں کے بیچ اس کی آنکھ لگ گئی جو مائرہ کی آمد پر کھلی......وہ جدید تراش خراش کے سوٹ میں ملبوس خاصی حسین نظر آ رہی تھی۔

''آج تو خوب بادل برسے، سچ پارٹی کا مزہ آ گیا.....میں نے تو وہاں خوب انجوائے کیا اور تم یہاں گھر میں پڑے سوتے رہے ہو، خاصے بورنگ ہو۔'' مائرہ نے ڈریسنگ ٹیبل کے شیشے میں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مائرہ تم ایزی ہو جاؤ......تو میرے لیے کھانا گرم کر کے لے آنا، میں نے کھانا نہیں کھایا ہے۔''

''سو، سوری فراز، میں بہت تھک گئی ہوں، امی یا بھابھی سے کہہ دو وہ کھانا گرم کر کے لا دیں گی۔'' یہ کہہ کر وہ کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی۔ ڈریسنگ روم سے نکلی تو وہ کروٹ بدلے بدستور لیٹا ہوا تھا۔

مائرہ نے اس کا رخ اپنی طرف پھیرنا چاہا مگر وہ..... سختی سے اپنی پوزیشن پر قائم رہا۔

"سوری میں ۔فراز میں بہت تھک گئی ہوں، ایک تو صبح آفس..... پھر پارٹی نے تھکن سے نڈھال کر دیا ہے۔ وہاں پارٹی میں سب سے ملنے ، ملانے میں مصروف رہی ، بیٹھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔" فراز نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مائرہ نے بھی مزید اسے منانے کی ضرورت محسوس نہیں کی اور لائٹ آف کر کے وہ سونے لیٹ گئی۔ اسے کون سی فراز کی پروا تھی۔

صبح وہ آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا تو اس نے مائرہ کو جھنجوڑ کر اٹھا دیا۔

"کیا مصیبت ہے، تم نے مجھے کیوں اٹھا دیا۔" وہ ایک دم چیخی۔

"کیوں..... آج تمہیں آفس نہیں جانا.....؟ اٹھو تمہیں معلوم ہے ہم دونوں مل کر ناشتا کرتے ہیں۔"

"فراز ! پلیز تم ناشتا کر کے آفس چلے جاؤ، میں تھوڑا لیٹ جاؤں گی۔ ویسے بھی رات کو اتنی دیر سے واپسی ہوئی تھی کہ مجھے سونے کا موقع کم ملا، اوپر سے تم نے مجھے جگا دیا۔" یہ کہہ کر اس نے تکیے میں منہ چھپا لیا۔

اپنے روم سے نکل کر فراز ڈائننگ ٹیبل پر آبیٹھا۔

"نجمہ باجی ناشتا لے آئیں۔" اس نے ملازمہ کو اونچی آواز میں پکارا۔

وہ فوراً ناشتے کے لوازمات لا کر ٹیبل پر رکھنے لگی۔ فراز نے رات میں کھانا تو کھایا نہیں تھا۔ وہ ٹینشن کو بھلا کر ناشتے میں مصروف ہو گیا۔

"آج تم اکیلے ہی ناشتا کر رہے ہو؟ مائرہ کہاں ہے، کیا وہ آفس چلی گئی.....؟" وہ ناشتا کر کے نیپکن سے ہاتھ صاف کر رہا تھا کہ امی چلی آئیں۔

"مائرہ سو رہی ہے، کل رات وہ پارٹی سے تھکی ہوئی آئی تھی، دیر سے آفس جائے گی۔"

"اس طرح سے اکیلے تم اسے پارٹی میں کیسے بھیج دیتے ہو؟ رات کو تم نے کھانا بھی نہیں کھایا اور اپنے کمرے میں بند رہے، فراز میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا اگر بیوی کو اتنی آزادی دو گے تو وہ بھی تمہاری وفادار نہیں رہے گی، میں تو اس کی جاب کے حق میں ہوں ہی نہیں، جاب کے بہانے پورا دن گھر سے غائب رہتی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ وہ فیملی بنانے میں سنجیدہ نہیں ہے۔ شادی کو ایک سال سے اوپر کا عرصہ ہو گیا ہے۔ ابھی تک کسی خوشخبری کے آثار نہیں ہیں۔" اس سے پہلے کہ امی مزید کچھ کہتیں وہ آفس جانے کا بہانہ کر کے اٹھ کھڑا ہوا اور امی اُسے جاتا دیکھتی رہیں۔

☆☆☆

"آج تم لیٹ ہو گئے.....؟ میں ماسی سے کہہ کر کھانا لگواتی ہوں۔" آج رات وہ دیر سے گھر پہنچا تھا۔ مائرہ اپنے کمرے میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

"ہاں کھانا ضرور لگواؤ لیکن پہلے مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔"

"ہاں بولو..... کیا ایسی ضروری بات ہے؟" اس نے ٹی وی کی آواز کم کر کے کہا۔

"مائرہ دیکھو میرا اور تمہارا پلان اتنی جلدی فیملی بڑھانے کا نہیں تھا..... مگر اب میں چاہتا ہوں کہ میرا بھی پیارا سا بچہ ہو، جب میں آفس سے گھر آؤں تو اس کے ساتھ کھیلوں..... اس کی معصوم شرارتوں سے میں بھی لطف اندوز ہوں۔" وہ بہت پیار سے کہہ رہا تھا۔

"تم کن فضولیات میں پڑنا چاہتے ہو فراز..... اور میں ابھی اتنی جلدی اس بکھیڑے میں پڑنے کے حق میں نہیں ہوں، ویسے بھی بچے جلدی پیدا کرنے سے عورت وقت سے پہلے بوڑھی نظر آنے لگتی ہے۔" وہ اس کی بات پر ہنس کر بولی تھی۔

"یہ محض تمہاری غلط فہمی ہے، تمہاری بہن سارہ کے بھی تو تین بچے ہیں، تو کیا وہ بوڑھی ہو گئی۔ اس طرح کی کتنی ہی مثالیں ہیں، شادی کا مقصد اپنی نسل بڑھانا بھی ہوتا ہے، امی بھی یہی چاہ رہی ہیں کہ اب

ہماری جلد از جلد اولاد ہو جائے۔"

"فراز! ابھی تو عمر پڑی ہے، بچے بھی ہو جائیں گے، شادی کے شروع کے سال تو انجوائے کرنے کے ہوتے ہیں تاکہ بچے سنبھالنے کے..... سارہ تو بیوقوف ہے، انٹر کرتے ہی شادی ہو گئی، اس نے دنیا میں اپنے شوہر اور بچوں کے علاوہ دیکھا ہی کیا ہے، مجھ سے چھوٹی ہونے کے باوجود مجھ سے بڑی دکھائی دیتی ہے۔" مائرہ نخوت سے بولی۔

فراز کو اندازہ ہو گیا تھا کہ مائرہ سے بحث کرنا فضول ہے، اس سے پہلے کہ فراز کچھ کہتا وہ کمرے سے چلی گئی۔

☆☆☆

اس کی مطلوبہ ٹی شرٹ فراز کو الماری میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل رہی تھی۔

"مائرہ......ادھر آؤ۔"

"کیا مصیبت ہے، میں آفس کے لیے نکل رہی ہوں، جلدی بولو، کیا کام ہے۔" اس نے منہ لٹکائے کمرے کے باہر سے جھانکا۔

"مائرہ! میری بلیک ٹی شرٹ نہیں مل رہی۔"

"اوگاڈ! مجھے کیا پتا تم نے اپنی ٹی شرٹ کہاں رکھ دی، امی سے پوچھو، انہیں پتا ہوگا..... خوامخواہ میرا ٹائم برباد کیا۔" مائرہ یہ کہہ کر آفس جانے کے لیے نکل گئی۔ فراز نے الماری سے دوسری پینٹ اور اس سے میچ کرتی شرٹ نکالی اور غصے میں کپڑے تبدیل کرنے چلا گیا۔ اس دن کے بعد سے اس نے مائرہ سے گفتگو ہوں، ہاں تک محدود کر لی تھی۔ اس بات کو مائرہ نے بھی محسوس کر لیا تھا مگر وہ انجان بنی ہوئی تھی۔ تھک ہار کر فراز نے ہی اس سے بات چیت شروع کر دی۔

"سنو..... فرزان! آج آفس آیا تھا اپنی ویڈنگ اینورسری کا کارڈ دے کر گیا ہے۔" اس نے ایک دیدہ زیب کارڈ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے کہا۔

"واؤ......... اس نے یونیورسٹی کے اور دوستوں کو بھی انوائٹ کیا ہوگا۔ ہمیں اس پارٹی میں ضرور جانا چاہیے۔ اس بہانے یونیورسٹی کی یادیں تازہ ہو جائیں گی۔ مجھے تو اس قسم کی پارٹیوں میں جانے کا ویسے ہی بہت شوق ہے۔" مائرہ چہکی۔

"پارٹیوں میں جانے کا شوق ہے تو تم نے کل امی کے ساتھ ربیعہ خالہ کی نواسی کے عقیقے میں جانے سے کیوں انکار کیا تھا۔ امی بتا رہی تھیں کہ اس تقریب میں سب لوگ تمہیں پوچھ رہے تھے۔"

"اس قسم کی بورنگ تقریبات مجھے بالکل پسند نہیں، خاندانی تقریبات میں جانا مجھے ذرا سا بھی پسند نہیں ہے۔"

فراز، مائرہ کا جواب سن کر خاموش ہو گیا۔ وہ اس سے بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ فرزان کے گھر جانا اس کی مجبوری تھی کیونکہ وہ اس کا بہترین دوست تھا۔ اس کی دوستی فراز کے علاوہ مائرہ سے بھی تھی۔ یونیورسٹی کے دور سے ان کی دوستی قائم تھی۔

اتوار والے دن فرزان کے گھر ویڈنگ اینورسری کی تقریب تھی۔ اسی دن رمضان کا چاند متوقع تھا، وہ بنی سنوری مائرہ کو لیے اس کے جدید طرز سے بنے ہوئے بنگلے میں داخل ہوا۔

"ہیلو مائرہ! تم تو شادی کے بعد اور حسین ہو گئی ہو، فراز کی تو لاٹری نکل آئی جو تم جیسی بیوی مل گئی، ہم تو ہاتھ ملتے رہ گئے۔" فرزان نے مائرہ کو دیکھتے ہی تعریف شروع کر دی..... مائرہ نے اپنی مترنم ہنسی سے اس کی حوصلہ افزائی کی پھر وہ فراز سے مخاطب ہوا۔

"یار فراز تم تو لکی ہو، اتنی پیاری لڑکی کو لے اڑے۔" اپنے دوستوں کے منہ سے مائرہ کی تعریفیں سننے کا خواہش مند فراز اس وقت کوئی خوشی محسوس نہیں کر سکا..... جبکہ مائرہ بڑی ادا سے مسکرا رہی تھی۔ وہ اس طرح کی تعریفیں سننے کی عادی تھی۔ اسے دلی تسکین ملتی تھی۔

فرزان سے مل کر وہ آگے بڑھے تو انہیں دوسرے کلاس فیلوز نے گھیر لیا۔

"واؤ مائرہ! تم تو آفت لگ رہی ہو، کہیں سے نہیں لگتا کہ تم شادی شدہ ہو۔" میکال نے اسے ستائشی نظروں سے دیکھا۔

"شادی شدہ کہاں سے لگے گی، یونیورسٹی کو تن کی شادی کو ابھی عرصہ ہی کتنا ہوا ہے، بہ مشکل سال گزرا ہے۔" زکی بھی کہاں پیچھے رہنے والوں میں سے تھا۔ وہ مائرہ کی تعریف کر کے اس سے فری ہونے کے چکر میں رہتا تھا۔

"نہیں بھئی میڈم کے چہرے کی تازگی دیکھو یہ تو پہلے سے چھوٹی نظر آ رہی ہے، شادی کا تو لگتا ہے اس پر کوئی اثر ہی نہیں ہوا۔ لگتا ہے کوئی سسرالی ذمے داریاں بھی نہیں ہیں کیوں بھئی فراز تمہارا کیا خیال ہے؟" مزمل نے فراز کا ہاتھ دبایا مگر وہ کچھ نہ بولا۔ اسے تو اس وقت مائرہ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرنے والے اپنے دوست بہت برے لگ رہے تھے اور ان سب سے زیادہ اسے مائرہ پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ فرزان کی بیوی اور اس کے ارد گرد موجود خواتین کے پاس جانے کے بجائے اس کے دوستوں سے ہی مذاق میں لگی ہوئی تھی۔

"آؤ مائرہ...... اُدھر ٹیبل پر بیٹھتے ہیں۔"

"فراز! تم جا کر بیٹھو، میں تو یہاں اپنے ماضی کی یادیں تازہ کرنے آئی ہوں، بیٹھنے کے لیے نہیں۔" یہ کہہ کر مائرہ دوبارہ ان سے گپ شپ میں مصروف ہوگئی۔ فراز کا تھوڑی دیر میں جی اکتا گیا۔ اس کے سر میں درد ہونے لگا۔ اس وقت اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ یہاں سے اٹھ کر گھر چلا جائے۔

"مائرہ! میرے سر میں درد ہو رہا ہے۔ دل بھی گھبرا رہا ہے چلو گھر چلتے ہیں۔" اس نے مائرہ کو ایک طرف لے جا کر کہا۔

"فراز تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے، پارٹی ابھی تو شروع ہوئی ہے۔ اس قسم کے پروگرام تو لیٹ نائٹ تک چلتے ہیں۔ لوگ کیا کہیں گے۔"

"کچھ نہیں کہیں گے نفل روزے کا اعلان ہوگیا ہے۔ مجھے گھر جا کر آرام کرنا ہے، سحری میں اٹھنا ہے۔ ابھی جا کر دوا کھاؤں گا۔ تب ہی تو اٹھنے کے قابل ہوں گا ناں...."

"طبیعت تمہاری خراب ہے میری نہیں، تم جا کر روزے کی تیاری کرو میں کون سا روزہ رکھتی ہوں، یہ لو کار کی چابی، میں لفٹ لے کر آ جاؤں گی۔" مائرہ کا ٹکا سا جواب سن کر غصے کی ایک شدید لہر فراز کے دماغ میں اٹھی۔ اس نے فرزان سے اجازت لی اور باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔ تیز رفتاری سے کار ڈرائیو کرتے ہوئے وہ گھر پہنچا تھا اور جاتے ہی وہ سر درد کی گولی کھا کر بستر پر ڈھیر ہوگیا۔ اب اسے نہ تو بیوی کی ضرورت رہی تھی نہ اس کے حسن کی طلب...... وہ تو صرف ایسی بیوی کا خواہش مند تھا جو شوہر سے محبت کرتی ہو اس کا بجنا، سنورنا صرف شوہر کے لیے ہو۔

اسی وقت اس کے بیڈ روم کا دروازہ کھلا سامنے امی کھڑی تھیں۔ ان کی آنکھوں میں بے شمار سوالات تھے۔

"آئیں امی...." وہ انہیں دیکھ کر جلدی سے اٹھ بیٹھا۔

"فراز! تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟ شکل سے تو تم سخت پریشان لگ رہے ہو؟ تم تو فرزان کے گھر گئے تھے۔ اتنی جلدی کیسے آ گئے اور مائرہ کہاں ہے؟"

"امی! صبح سحری میں اٹھنا تھا اس لیے میں جلدی آ گیا۔ مائرہ اُدھر ہی ہے۔"

"تمہیں مائرہ کو اس طرح چھوڑ کر نہیں آنا تھا۔ چند دن پہلے بھی وہ اکیلی کہیں گئی تھی۔ تمہاری ڈھیل میری سمجھ سے باہر ہے، وہ تو بالکل بے لگام گھوڑی ہوگئی ہے۔"

"امی میں آپ کی باتوں سے بالکل متفق

ہوں۔ مائرہ سے شادی کرنا میری بہت بڑی غلطی تھی۔ میں نے اسے یونیورسٹی کی اچھی ساتھی سمجھ کر اپنا جیون ساتھی بنایا تھا...... مگر لگتا ہے وہ اس عزت کے قابل نہیں تھی۔ اس نے میرا ذہنی سکون برباد کر کے رکھ دیا ہے۔ ایک سال سے اوپر کا عرصہ ہو گیا ہے۔ مجال ہے جو اس نے میری کوئی بات مانی ہو۔ ہر بات میرے مزاج کے خلاف کرتی ہے۔"

"اب بھی کچھ نہیں بگڑا...... تم اسے سمجھانے کی کوشش کرو، ہو سکتا ہے وہ سُدھر جائے۔ مجھ سے تو وہ سیدھے منہ بات نہیں کرتی جبکہ میں نے آج تک اسے کسی بات پر براہِ راست نہیں ٹوکا۔" امی نے مشفق لہجے میں اسے سمجھایا۔

"جی امی ایسا ہی ہوگا...... آپ جا کر آرام کریں۔" فراز نے ماں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

ان کے جاتے ہی وہ پھر مختلف سوچوں میں گھر گیا۔ وہ خود چاہتا تھا کہ مائرہ اسے اہمیت دے اور بحیثیت شوہر اس کی عزت کرے۔ وہ نہ جانے کتنی دیر خیالات میں گھرا رہا کہ اچانک اس کے موبائل کی بیل بجی۔ اسکرین پر فرزان کا نام آ رہا تھا۔

"ہیلو...... فراز! میں فرزان بول رہا ہوں، مائرہ گھر پہنچ گئی؟" اس کے لہجے میں تشویش تھی۔

"نہیں تو......"

"مائرہ کو میں نے اپنے ڈرائیور کے ساتھ گھر بھیجنا چاہا تھا مگر اس نے ڈرائیور کے ساتھ جانے کے بجائے زلفی کے ساتھ جانا پسند کیا۔"

"انہیں نکلے کتنی دیر ہو گئی ہے؟"

"آدھے گھنٹے سے اوپر ہو گیا ہے، تم مائرہ کو فون کر لو...... کوئی مسئلہ نہ ہو گیا ہو۔"

"او کے، میں فون کر لیتا ہوں۔" فراز کا لہجہ نرم تھا۔

"گڈ بائے بیسٹ آف لک......" فرزان نے فون بند کر دیا۔ اس سے رابطہ منقطع ہوتے ہی فراز نے مائرہ کا نمبر ملایا۔

"ہیلو...... کہاں ہو تم؟"

"میں زلفی کے ساتھ آئس کریم کھا رہی ہوں۔ اسے اتنا منع کیا کہ پارٹی میں اتنا کچھ کھا لیا ہے مگر یہ ہے کہ مجھے زبردستی لے آیا ہے۔"

"تم منع نہیں کر سکتی تھیں۔ جلدی گھر آؤ۔" موبائل آف کر کے اس نے زور سے بیڈ پر پٹخا۔

"عجیب...... بے غیرت عورت ہے، ذرا بھی کسی کی عزت کا خیال نہیں۔" وہ بڑبڑایا۔

ایک گھنٹے کے طویل انتظار کے بعد مائرہ کمرے میں داخل ہوئی۔ آتے ہی وہ اپنی سینڈلز اتارنے لگی۔ "آج تو میں بہت تھک گئی ہوں۔ زلفی تو جان ہی نہیں چھوڑ رہا تھا۔ بے چارے کو ابھی تک یہی غم ہے کہ میری شادی تم سے کیوں ہو گئی؟"

"اور تم اظہارِ محبت سن کر خوش ہو رہی ہو گی، تمہیں تو ذرا بھی اپنی عزت کا خیال نہیں ہے۔ جب فرزان تمہیں اپنے ڈرائیور کے ساتھ بھیج رہا تھا تو تمہیں زلفی سے لفٹ لینے کی کیا ضرورت تھی؟" فراز غصے سے چلایا۔

"میری مرضی...... ویسے بھی میں نے تم سے کہہ دیا تھا کہ میں کسی سے بھی لفٹ لے کر آ جاؤں گی...... اور ہاں مجھ سے دھیمے لہجے میں بات کرو، میں اس طرح کی گفتگو کی عادی نہیں ہوں۔"

"آج کے بعد تم میرے ساتھ ہی ہر تقریب میں جاؤ گی اور میرے ساتھ ہی واپس آؤ گی۔ مجھے تم پر قطعی اعتبار نہیں رہا۔" وہ شدید غصے میں تھا۔

"تم مجھ پر شک کر رہے ہو، میں تمہاری خاطر اپنی دوستی ختم نہیں کر سکتی۔"

"تو ٹھیک ہے میری طرف سے تم آزاد ہو، میں تمہیں طلاق دے کر فارغ کر دیتا ہوں...... پھر چاہے جہاں مرضی جانا۔" وہ دہاڑا تھا۔

"دے دو طلاق مجھے، تم جیسے شکی مرد کے ساتھ

رہنے کی ضرورت بھی نہیں مجھے......تم اتنے بیک ورڈ ہو گئے میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔" وہ بھی دو بدو جواب دے رہی تھی۔

"میں تم جیسی آوارہ عورت کو ابھی فارغ کرتا ہوں۔" اس سے پہلے کہ فراز طلاق کے الفاظ منہ سے نکالتا۔ سلیمہ بیگم نے کمرے میں آکر اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے تھے۔

"امی یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟"

"فراز تم میرے گھر میں رہ کر یہ سب کچھ نہیں کر سکتے۔ میری دو بیٹیاں کنواری بیٹھی ہیں، میں کسی بدبختی کو دعوت نہیں دے سکتی۔ تم اس کو لے کر علیحدہ ہو جاؤ۔"

"امی یہ علیحدہ گھر میں مجھے کون سا چین لینے دے گی۔ ویسے بھی اس کا مسئلہ آپ نہیں ہیں۔"

"اچھا تم بیٹھو، میں تمہارے لیے پانی لاتی ہوں۔" سلیمہ بیگم کے جاتے ہی مائرہ اپنا سامان بیگ میں بھرنے لگی۔

"کیا بات ہے بیٹا؟ میاں، بیوی میں لڑائیاں ہوتی رہتی ہیں، تم کہاں جا رہی ہو؟" سلیمہ بیگم پانی لے کر آئیں تو ان کی نظر کپڑوں کو بیگ میں ڈالتی مائرہ پر پڑی۔

"لو پانی پیو......"

"مجھے پانی نہیں پینا، میں یہ گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ آپ رہیے اپنے بیٹے کے ساتھ آرام سے۔" مائرہ بدتمیزی سے بولی۔

"ٹائم دیکھا ہے، رات کے دو بجنے والے ہیں، جانا ہے تو صبح چلی جانا۔"

"نہیں، مجھے اسی وقت جانا ہے۔" وہ بدستور بدتمیزی سے جواب دے رہی تھی۔

"امی اسے جانے دیں، خود ہی اپنا انجام بھگتے گی۔"

☆☆☆

"آؤ اندر آؤ......اس وقت تمہیں یہاں دیکھ کر خیر نہیں لگ رہی۔ فراز کہاں ہے؟" مائرہ کی ممی اسے رات کے اس پہر دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

"میں فراز کا گھر چھوڑ کر آ گئی ہوں، مجھے اس کے ساتھ نہیں رہنا۔"

"تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے، اس عمر میں میرے سر میں خاک ڈالنی تھی۔"

"ممی آپ نے مجھے کس شخص کے پلے باندھ دیا، آپ کو اندازہ ہے؟" مائرہ ہچکیاں لینے لگی۔

"یہ بات تو تم مجھ سے مت کرو..... فراز سے شادی تم نے اپنی مرضی سے کی تھی، اب کیا بات ہو گئی جو تمہیں اس طرح اس کا گھر چھوڑنا پڑا۔" ممی نے فکرمند لہجے میں کہا۔

"بس یونہی ممی..... خوامخواہ مجھ پر شک کرنے لگا ہے اور مجھے شکی مردوں سے نفرت ہے۔"

"پھر بھی مجھے بات تو پوری بتاؤ...." ماں کے اصرار پر مائرہ نے انہیں تمام بات بتا دی۔

"تو یہ تمہارے نزدیک کوئی بات ہی نہیں...... جب تمہارے شوہر کو تمہارا غیر مردوں سے

حالات

ایک صاحب کے بارے میں مشہور تھا کہ ان کا طرز تحریر بڑا متاثر کن ہے ایک دن ایک ان پڑھ بوڑھا ان کے پاس جا کر بولا۔ "صدر مملکت کے نام میری طرف سے ایک درخواست لکھ دو جس میں برے حالات کا ذکر ہو۔" جب وہ شخص لکھ چکا تو بوڑھے نے کہا کہ مجھے پڑھ کر سناؤ کہ تم نے آخر کیسا لکھا ہے کہ اس پر کچھ اثر ہو گا بھی یا نہیں اور جب اس نے سنا تو وہ پھوٹ، پھوٹ کر روتے ہوئے بولا۔ "یہ تو آج مجھے پتا چلا کہ میرے حالات اس حد تک خراب ہیں۔"

مرسلہ: نگینہ ضیا نقش، کراچی

ملنا پسند نہیں ہے تو اس میں برائی کیا ہے، تمہیں تو خود کو شوہر کی مرضی کے مطابق ڈھال لینا چاہیے تھا۔"

"سوری ممی! میں یہ سب کچھ نہیں کر سکتی...... میں ایک روشن خیال عورت ہوں، فراز نے میری شخصیت کے ہر پہلو کو جانتے بوجھتے مجھ سے شادی کی تھی اب اگر اسے مجھ میں خامیاں نظر آ رہی ہیں تو میں کیا کر سکتی ہوں۔ بس میں اس سے طلاق لے رہی ہوں۔ اس سے اچھے لوگ مل جائیں گے مجھے۔" مائرہ کے لہجے میں بدستور اکڑ تھی۔

"بہر حال جو کچھ بھی ہوا وہ اچھا نہیں ہوا۔ اس میں قصور تمہارا ہے کیونکہ عورت ہی کو جھکنا پڑتا ہے اور تم میں لچک نام کو نہیں ہے۔ مرد اور عورت جب شادی کے بندھن میں بندھتے ہیں تو دونوں کو ایک دوسرے کی خواہشات کا احترام کرنا ضروری ہو جاتا ہے اگر تم غیر جانب داری سے سوچو تو تمہیں احساس ہوگا۔ جب فراز کی طبیعت خراب تھی اور اس نے تمہیں گھر جانے کے لیے کہا تھا تو لازم تھا کہ تم اسی وقت اس کے ساتھ چلی جاتیں تو بلا وجہ یہ فساد نہ ہوتا ...... اگر ٹھنڈے دماغ سے سوچو تو بات اب بھی نہیں بگڑی...... یہ حسین صورت اور جوانی ہمیشہ رہنے والی نہیں۔ وہ مرد جو تم سے چاہت کے دعوے دار ہیں جا کر انہیں بتاؤ کہ تم طلاق لے کر ان سے شادی کرنا چاہتی ہو۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہوگا جو تمہارا ہاتھ ہمیشہ تھامنے کے لیے تیار ہو جائے گا۔" ممی نے اسے حقیقت حال سے آشنا کرانا چاہا۔

"یہ تو آپ کہہ رہی ہیں...... آپ تو یہی چاہیں گی کہ میں ذلیل ہو کر فراز کے پاس واپس لوٹ جاؤں۔ وہ میرے مزاج سے آشنا تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ میں ایک ماڈرن اور آزاد خیال لڑکی ہوں۔ اس وقت تو میں اس کی آئیڈیل تھی۔ شادی کے بعد اب وہ تنگ نظر ہو گیا...... بس میں نے کہہ دیا میرا اس کے ساتھ گزارہ ممکن نہیں۔" مائرہ کسی صورت ماں کی بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھی۔

"میری بات نہیں مانو گی تو ایک وقت ایسا آئے گا۔ جب تمہیں ندامت اور پچھتاوا ہوگا۔ ابھی تمہارے پاس سوچنے، سمجھنے کا وقت ہے۔ آگے بڑھ کر فراز کو منا لو، اس کی خواہش کے مطابق خود کو ڈھال لو، بہر حال میرا کام تمہیں سمجھانا تھا۔ میری باتوں کے بارے میں ٹھنڈے دماغ سے سوچنا اس وقت تم غصے میں ہو۔" ممی یہ کہہ کر اپنے کمرے میں چلی گئی تھیں اور وہ صبح تک مختلف خیالوں میں کھوئی رہی۔ ممی کی اس بات پر اس کا دل یقین کرنے کو تیار نہیں تھا کہ دلشی، عدیل، فرخ وغیرہ اس کی پیش قدمی کرنے پر آگے بڑھ کر اسے اپنانے کے لیے تیار نہیں ہوں گے۔ وہ دلشی جو ہمیشہ فراز کی قسمت سے شاکی رہتا تھا کہ وہ بازی لے گیا۔ فرخ تو ویسے ہی اس کا بے دام غلام تھا۔ آخر کیسے اس کا ہاتھ تھامنے کے لیے تیار نہیں ہوگا۔ اسی کشمکش و پیچ میں پوری رات گزر گئی۔

☆☆☆

"کیا کہہ رہی ہو مائرہ...... تم فراز سے طلاق لے رہی ہو مگر کیوں......؟" اس کے کولیگ فرخ نے حیرانی سے اس کی بات سنتے ہی کہا تھا۔

"کیا کروں، اب میرا اس کے ساتھ گزارہ ممکن نہیں ہے۔" مائرہ کے لہجے میں اطمینان تھا۔

"فرخ تم بھی تو مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے۔ جب میں نے تمہیں بتایا تھا کہ میں انگیجڈ ہوں تو تمہیں شاک پہنچا تھا۔ آخر تمہارے دکھ کا مداوا بھی تو کرنا تھا۔"

"مائرہ وہ تو مذاق تھا، میری منگنی میری کزن سے ہو چکی ہے۔ چند ماہ میں میری شادی ہو جائے گی۔ بہتر ہے کہ تم فراز سے طلاق نہ لو ورنہ بہت پچھتاؤ گی۔ میرے رویے سے تمہیں جو غلط فہمی ہوئی ہے اس کے لیے میں تم سے معذرت چاہتا ہوں۔" فرخ نظریں چراتے ہوئے بولا۔

فرخ کی طرف سے مایوس ہونے کے بعد مائرہ اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر کام میں مصروف رہنے کے بعد اس نے زلفی کا نمبر ملالیا۔

"ہیلو......! زلفی میں مائرہ بات کررہی ہوں۔"

"زہے نصیب، آج کیسے فون کرلیا؟"

"تم سے ضروری کام تھا بلکہ یہ سمجھو تمہیں ایک نیوز دینا تھی۔"

"ہاں، ہاں ضرور دو۔"

"میں نے فراز سے طلاق لینے کا فیصلہ کرلیا ہے۔"

"واٹ؟ تم نے اتنا بڑا قدم کیسے اٹھالیا؟" زلفی کے لہجے میں حیرانی تھی۔

"تمہاری آنکھوں میں چاہت کے پیغام پڑھ کر میں اس روکھے، پھیکے شخص کے ساتھ کیسے گزارہ کرسکتی تھی۔ کل تو تمہیں مجھ سے بہت سی شکایات تھیں کہ میں نے تم جیسے ڈیسنٹ شخص کو چھوڑ کر فراز سے کیوں شادی کرلی۔"

"وہ تو میں نے ایسے ہی کہہ دیا تھا۔ یار تم خود سوچو.....اپنے ہی دوست کی مطلقہ سے کیسے شادی کے لیے راضی ہوسکتا ہوں اور پھر میری ماں، بہنیں میرے لیے ایک سے ایک لڑکی ڈھونڈ رہی ہیں۔ ایسے میں ایک شادی شدہ کے ساتھ......؟" زلفی نے مائرہ کی بات کے جواب میں کھرا، کھرا جواب دیا۔

"اوکے، میں فون رکھ رہی ہوں۔" شکستہ دل سے اس نے فون رکھا اور اپنی چاہت کے دعوے دار کا حال دیکھ کر اس کا آفس میں مزید رکنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس نے فائل اٹھائی اور باس کے کمرے میں چلی گئی۔

"کیا بات ہے مائرہ؟ تم کچھ پریشان لگ رہی ہو؟"

"جی سر، میں چھٹی لے کر گھر جانا چاہ رہی تھی۔"

"خیریت.....؟" باس نے بے تکلفی سے پوچھا۔

"سر میں اپنے شوہر سے طلاق لے رہی ہوں۔ انہیں میری آئے دن کی پارٹیوں میں جانے پر اعتراض ہوتا ہے۔"

"اوہ نو! مائرہ تم بہت بڑی غلطی کررہی ہو۔"

"سر اس میں غلط کیا ہے؟ میں ایسے تنگ نظر شخص کے ساتھ مزید گزارہ نہیں کرسکتی..... میں پابندیوں کی عادی نہیں ہوں، مجھے تو اب کسی ایسے چاہنے والے کی تلاش ہے جو مجھ پر اعتبار کرسکے۔"

"تمہارے لیے تو دعا ہی کی جاسکتی ہے کہ تم اپنی جستجو میں کامیاب ہو جاؤ۔"

"سر آپ بھی تو اپنی وائف کے رویے سے پریشان ہیں، دوسری شادی کیوں نہیں کرلیتے؟" وہ عجیب صورت حال سے دوچار تھی سو یہ بات کر بیٹھی۔

"توبہ کرو...... میرے سر پر جو چند بال نظر آرہے ہیں، کیا تم چاہ رہی ہو کہ میں ان سے بھی محروم ہوجاؤں، میری بیوی جیسی بھی ہے مجھے اپنی زندگی کا باقی سفر اسی کے ساتھ طے کرنا ہے۔ تم گھر جاؤ، جا کر آرام کرو اور اپنے فیصلے پر نظر ثانی بھی ضرور کرنا۔" ہر طرف سے ناامید ہو کر وہ آفس سے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔ ممی کی کہی ہوئی باتیں آج زندگی میں پہلی دفعہ اسے سچ لگی تھیں ورنہ بچپن سے اب تک وہ اپنی من مانی کرتی آئی تھی۔

"السلام علیکم......ممی۔" تکیے سے ٹیک لگائے تسبیح کے دانے گھماتی رخسانہ خاتون نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"وعلیکم السلام...... خیریت.....؟ آج آفس سے جلدی آگئیں؟"

"جی آج آفس میں دل نہیں لگ رہا تھا۔"

"یہ سب فراز سے ناراضی کا نتیجہ ہے، اب بھی کچھ نہیں بگڑا.....تم فراز کو فون کرکے بلالو اظہار بھی ساتھ ہی کرلو اور پھر ساتھ ہی وہ تمہیں گھر لے جائے گا۔"

"وہ کیا سمجھے گا کہ میں جس اکڑ سے گھر سے نکلی تھی چار دن بھی اس کے بغیر نہیں رہ سکی۔"

"مائرہ اب بھی وقت ہے تم اچھی طرح سوچ لو۔ تم نے شادی کو مذاق سمجھا ہوا ہے۔ ایک سے طلاق لے کر دوسرے سے اتنی آسانی سے شادی ہو جائے گی؟" ممی اسے سمجھا رہی تھیں۔

"ہاں، میں اپنا اچھا برا خود سمجھتی ہوں، اسے میری ضرورت ہوگی تو خود مجھ سے رابطہ کرے گا۔" مائرہ غصے سے پیر پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"اے میرے خدا! اس لڑکی کو نیک ہدایت دے۔" ممی کے لبوں سے بے ساختہ دعا نکلی۔

دن پر دن گزر رہے تھے فراز نے مائرہ کی طرف سے چپ سادھ لی تھی۔ مائرہ خود اندر سے پریشان تھی مگر وہ بڑی خوب صورتی سے اپنی دلی کیفیات چھپائے ہوئے تھی۔ اس کا دل اب آفس میں بھی نہیں لگتا تھا۔

اس روز تھکے، تھکے قدموں سے وہ گھر میں داخل ہوئی تو ممی فروٹ کاٹنے میں مصروف تھیں۔

"لائیں ممی میں آپ کی مدد کر دوں۔" مائرہ ممی کے برابر میں آ کر بیٹھ گئی۔

"رہنے دو تھوڑے سے بچے ہیں، میں خود ہی کاٹ لوں گی۔ ویسے بھی تمہیں کون سا ان کاموں سے دلچسپی ہے، آج میں نے سارہ کو افطار پر بلایا ہے تم فراز کو فون کر دو بیٹا وہ بھی آ جائے۔"

"مجھے نہیں لگتا کہ فراز آئے گا وہ مجھ سے خفا ہے، اس کی اجازت کے بغیر گھر سے نکلی تھی، اس کی امی نے مجھے روکا بھی تھا مگر میں نہیں رکی۔" مائرہ کے دل کی اداسی لبوں پر آ گئی۔

"تم نے غلط کیا مگر اب بھی کچھ نہیں بگڑا...... شوہر کی ناراضی ختم کرنا بیوی کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔ تم اپنے اندر لچک پیدا کرو۔ غلطی تمہاری ہی ہے فراز سے معافی مانگ لو۔ اب جلدی سے اٹھو اور اسے فون کرو اس سے پہلے کہ وہ تمہارے رویے کی وجہ سے کوئی سخت قدم اٹھانے پر مجبور ہو جائے۔"

"ممی مجھ سے یہ نہیں ہوگا وہ کیا سوچے گا۔"

"بیٹا وہ کچھ نہیں سوچے گا، تم اس کی بیوی ہو۔ میاں بیوی میں کھٹ پٹ تو ہوتی رہتی ہے مجھے تو ڈر اس بات کا ہے کہ تمہاری سرد مہری کی وجہ سے وہ کوئی انتہائی قدم نہ اٹھا لے۔" ممی کے اصرار پر مائرہ نے اپنے سیل فون سے فراز کا نمبر ملایا تھا۔

"ہیلو! فراز کیسے ہو؟"

"بہت جلدی خیال آ گیا، تمہاری بلا سے میں بھاڑ میں جاؤں۔"

"فراز! مجھے تم سے معافی مانگنا تھی۔ غلطی میری تھی مجھے غصے میں گھر سے نہیں نکلنا چاہیے تھا۔"

"اوکے، کوئی اور بات؟" اس کا لہجہ بدستور خشک تھا۔

"ممی نے آج سارہ کی فیملی کو افطار پر بلایا ہے، تم بھی ضرور آنا۔"

"سوری، میں نہیں آ سکوں گا۔" یہ کہہ کر فراز نے موبائل آف کر دیا۔

"کیا کہہ رہا تھا فراز؟" ممی نے موبائل ہاتھ میں لیے کھوئی، کھوئی سی مائرہ سے پوچھا۔

"وہ آنے سے منع کر رہا ہے۔ آپ نے دیکھ لیا وہ خود کو کیا سمجھ رہا ہے مجھے اس کی ہرگز ضرورت نہیں۔" وہ ہسٹریائی انداز میں چیخی۔

"مائرہ کیوں چیخ رہی ہو، میں خود فراز سے بات کروں گی۔ وہ مصروف ہوگا اس لیے منع کر دیا ہوگا۔"

"آپ کہتی تھیں کہ میری آزاد خیالی مجھے تباہ کر دے گی۔ آپ کی بددعا مجھے لگ گئی۔" وہ رو رہی تھی۔

"ماں اپنی اولاد کو کبھی بددعا نہیں دیتی، پریشان مت ہو سب ٹھیک ہو جائے گا۔" ممی اسے چپ کرواتے ہوئے بولیں۔

مائرہ کی ضد اور اپنی بات منوانے کی عادت سے وہ بچپن سے اب تک عاجز تھیں مگر اس صورت حال سے وہ کچھ زیادہ پریشان ہو گئی تھیں۔ سوان کی

دعاؤں اور مناجات میں شدت آگئی تھی۔

☆☆☆

رمضان کا پورا مہینہ اسی پریشانی میں گزر رہا تھا یہاں تک کہ چاند رات آن پہنچی۔

"مائرہ، نیچے آؤ فراز آیا ہے۔" ممی کی خوشی سے بھرپور آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی تو وہ خیالوں کی دنیا سے باہر آئی۔ تیزی سے سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

"السلام علیکم!" آہستہ سے سلام کرتے ہوئے اس نے فراز کی طرف دیکھا جو نظریں جھکائے بیٹھا تھا۔

"وعلیکم السلام۔" مائرہ نپے تلے قدموں سے چلتے ہوئے صوفے پر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ کمرے میں ان دونوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ چند سیکنڈ جب فراز کی طرف سے کوئی ردِعمل سامنے نہ آیا تو اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ بڑھا کر فراز کا ہاتھ تھام لیا۔

"سوری فراز، میں شرمندہ ہوں مجھے اس طرح نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تم مجھے معاف کر دو۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں بھی تمہارے ساتھ برابر کا قصور وار ہوں۔" وہ گلا کھنکھار کر بولا۔ "دراصل میں نے شادی سے پہلے تم سے جو وعدے کیے تھے افسوس کہ میں ان پر پورا نہیں اتر سکا۔ میں اپنے اندر اتنی جرأت نہیں پاتا ہوں کہ تمہاری غیر مردوں سے دوستی برداشت کر سکوں۔ شادی سے پہلے کی بات اور تھی شادی کے بعد تم مجھے اپنی ملکیت لگتی ہو بلکہ عزت ہو میری۔ میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے کہ اگر تمہیں میری شرائط قبول ہوں تو تم میرے ساتھ زندگی گزار سکتی ہو بصورتِ دیگر ہم دونوں کے راستے جدا ہوں گے۔" فراز کا لہجہ سپاٹ تھا۔

"کون سی شرائط؟" مائرہ اس کے بدلتے تیور دیکھ کر حیران تھی۔

"آج کے بعد تم پارٹیوں میں نہیں جاؤ گی اور نہ ہی غیر مردوں سے کسی قسم کی دوستی رکھو گی اور تمہارا کام آفس تک ہی محدود رہنا چاہیے۔ تمہاری مرضی ہے نوکری جاری رکھو یا چھوڑ دو۔ مجھے تم بیک ورڈ سمجھو یا کچھ اور...... تمہیں اگر میری شرائط قبول ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ میرا تمہارا گزارہ ممکن نہیں۔"

"اگر مجھے تمہاری ان شرائط کے ساتھ زندگی گزارنا قبول ہو تو پھر تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا ناں؟" مائرہ کے لہجے میں شوخی اتر آئی۔

"مائرہ! یہ تم کہہ رہی ہو، مجھے یقین نہیں آرہا۔"

"یقین کرلو، اس ایک مہینے میں مائرہ بالکل بدل چکی ہے۔ یہ پہلا رمضان ہے جس میں، میں نے روزے رکھے ہیں اور اللہ کی عبادت کی ہے۔ مجھے تو علم ہی نہیں تھا کہ میں ذلت کی کن گہرائیوں میں گرتی جارہی تھی اور ان لوگوں کی باتوں، مصنوعی محبت کے دعوؤں اور ریاکاری کو میں اصل زندگی سمجھ بیٹھی تھی۔ مجھے تو اپنے گناہوں کا احساس اب ہوا ہے۔"

"قصور تو میرا بھی تھا کہ میں شادی سے پہلے کیے گئے اپنے وعدوں پر قائم نہیں رہ سکا اسی وجہ سے میں نے فیصلہ کیا تھا کہ پہلے میں تم سے کلیئر بات کروں گا پھر گھر لے جاؤں گا۔" فراز کا لہجہ اطمینان بھرا تھا۔

"اب تو تمہیں مجھے اپنے گھر ساتھ لے جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا ناں؟"

"بالکل بھی نہیں۔" فراز نے خوش دلی سے کہا۔ "چلو تمہیں چاند رات میں شاپنگ کرنا بہت پسند ہے ناں تو آج میں تمہاری یہ خواہش ضرور پوری کروں گا۔"

"نہیں، آج میں شاپنگ پر نہیں جاؤں گی بلکہ گھر چل کر شکرانے کے نوافل پڑھوں گی۔" مائرہ نے کہا اور اپنا سامان لینے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی جبھی فراز مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔

مکمل ناول

اِک عمر کے بعد؟

نگہت سیما



"اور یہ میں ہوں سویرا اقبال......" میں نے آسمانی ساڑی کا پلو کندھے پر ڈالتے ہوئے اپنا جائزہ لیا۔

"دنیائے ادب کا ایک درخشاں ستارہ اور ایک ذمے دار سرکاری افسر...... لوگ کہتے ہیں میں بہت کامیاب عورت ہوں لیکن کیا میں واقعی کامیاب ہوں......؟ کبھی، کبھی مجھے لگتا ہے جیسے میں دنیا کی ناکام ترین عورت ہوں۔ زندگی کے ہر



میدان میں جھنڈے گاڑنے کے باوجود میرے جیسی ناکام عورت کوئی نہیں...... اور اس ناکام عورت کی زندگی پر بے شمار لوگ رشک کرتے ہیں...... صبح سے لے کر شام تک کتنی ہی بار یہ جملے میرے کانوں میں پڑتے ہیں۔

''میم! آپ بہت خوش قسمت ہیں۔''

''ارے سویرا اقبال بہت لکی ہیں۔''

ہاں ان کی نظروں میں واقعی میں خوش قسمت ہوں، کیا نہیں ہے میرے پاس دولت، شہرت، عزت، حسن، دلکشی...... ہاں بھی کچھ تو ہے بس....

میں نے ایک بار پھر خود کو آئینے میں جانچا...... میں کوئی ایسی حسین و جمیل نہیں ہوں کہ جس کے حسن کی تعریف میں صفحے کے صفحے سیاہ کر دیے جائیں لیکن اتنی خوب صورت ضرور ہوں کہ اکثر میں نے مردوں کی نظریں اپنی طرف اٹھتی اور پھر ٹھہرتی محسوس کی ہیں...... حالانکہ میں کوئی جوان لڑکی نہیں...... میری عمر بتیس سال ہے۔ یہ الگ بات ہے میں بتیس سال کی عمر میں بھی پچیس سال سے زیادہ کی نہیں لگتی۔

میں نے ڈریسنگ ٹیبل سے اپنا قیمتی پرفیوم اٹھا کر اسپرے کیا اور ایک آخری نظر آئینے پر ڈال کر باہر نکلی تو برآمدے میں ماسی خیراں کھڑی تھی۔

''میڈم جی وہ سراج الحق اور عرفان منیر صاحب آئے ہیں۔ وہی جی اخبار والے۔''

میں نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا...... میں پہلے ہی لیٹ تھی۔ آج ضلعے کے تمام اسکولوں کے... سربراہوں کے ساتھ میری میٹنگ تھی...... میٹنگ دس بجے تھی اور اس وقت نو بجے تھے...... میں عموماً آٹھ بجے تک آفس چلی جاتی تھی لیکن پچھلے دو ہفتوں میں مسلسل کام کی زیادتی نے مجھے تھکا دیا تھا۔ بہت سارے کام نمٹانے کے بعد میں رات نیند کی گولی کھا کر سوئی تو صبح میری آنکھ دیر سے کھلی تھی...... مجھے یہاں آئے دو ہفتے ہی ہوئے تھے اور ان دو ہفتوں میں بے حد مصروف رہی تھی۔ میرے آفس میں بہت سی فائلیں تھیں جنہیں دیکھنا تھا۔ ملاقاتیوں کی آمد اور انہیں مطمئن کرنا، کسی کی پنشن کا مسئلہ تھا، کوئی بینیوولینٹ فنڈ کے اجرا کے لیے خوار ہو رہا تھا۔ کسی کے ڈیوز ادا نہیں ہوئے تھے، کسی کو اپنا گریڈ چاہیے تھا اور کسی کو اپنے علاقے میں ٹرانسفر کروانا تھا...... دراصل ڈی ای او کی یہ سیٹ پچھلے دو ماہ سے خالی پڑی تھی اور بہت سے کام رکے ہوئے تھے۔ میں اس شہر میں نئی تھی اور چاہتی تھی کہ لوگوں پر میرا اچھا تاثر ہو اور میں انہیں مطمئن کر سکوں...... بظاہر تو سب نے ہی میری پوسٹنگ پر خوشی کا اظہار کیا تھا اندر کا حال اللہ جانتا ہے۔ غیر رسمی طور پر میری ملاقات چند مڈل اور پرائمری اسکولوں کے ہیڈ سے ہو چکی تھی اور مجھے علم ہوا تھا کہ بعض پرائمری اور مڈل اسکولوں میں بچوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ ایک مڈل اسکول کی ہیڈ نے مجھے بتایا کہ اس کے اسکول میں صرف پچیس طالبات ہیں، یہ فکر انتہائی پریشان کن تھا۔ سرکاری اسکولوں میں تعلیم فری ہونے کے باوجود لوگوں کا رجحان ابتدائی کلاسوں میں پرائیویٹ اسکولوں میں زیادہ کیوں ہے...... ایسے اسکول جن میں طالبات کی تعداد زیادہ نہیں ہے ختم ہو جانے چاہئیں کہ یہ حکومت کے خزانے پر بوجھ ہیں۔ ہاں ہائی اسکولوں میں تعداد بہت زیادہ تھی۔ جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ والدین بنیادی تعلیم کے لیے پرائیویٹ اسکولوں کے اخراجات برداشت کر لیتے ہیں لیکن ہائی کلاسز کے نہیں...... گورنمنٹ ٹیچرز کی تنخواہیں بہت تھیں...... جن کی سروس زیادہ تھی وہ کافی زیادہ تنخواہ لے رہے تھے پھر دوسری سہولتیں فل پینشن' اس کے باوجود معیارِ تعلیم پرائیویٹ اسکولوں کے مقابلے میں بہتر کیوں نہیں تھا...... اسی سب پر بات کرنے کے لیے میں نے یہ میٹنگ رکھی تھی۔ میں جانتی تھی میری باتیں کچھ کو بری لگیں گی...... لیکن مجھے کرنا بھی ضرور

تھیں کہ کم تنخواہ میں پرائیویٹ اسکولوں کے ٹیچرز اتنی محنت کرتے ہیں تو سرکاری اسکولز کے ٹیچرز کیوں نہیں کرسکتے اور مجھے یقین تھا کہ میری بات سنی جائے گی......اور ہم کوئی حل نکال لیں گے۔

''میڈم جی......!''

ماسی خیراں نے مجھے پھر پکارا تو میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''کیا کہوں جی انہیں......؟''

''اچھا چلو میں آتی ہوں، تم جوس لے آنا۔'' میں نے ایک گہری سانس لی اور سوچا کھڑے، کھڑے ہی بات کرلوں...... یہ شخص پچھلے تین دنوں سے آفس آرہا تھا اور میں مل نہیں پارہی تھی حالانکہ میرے آفس کے کلرک نے مجھے چھپے لفظوں میں ڈرانے کی بھی کوشش کی تھی کہ مجھے اخبار والوں کے ساتھ بنا کر رکھنی چاہیے کہ انہوں نے کچھ خلاف چھاپ دیا تو کون تردید کرتا پھرے گا۔ میں یہ بات جانتی تھی کہ کلرک صحیح کہہ رہا ہے۔ اپنی دس سالہ جاب کے تجربے نے مجھے بہت کچھ سکھا دیا تھا...... جاب کے دو، تین سال کے بعد ہی میں نے جان لیا تھا کہ مجھے لوگوں کے ساتھ کیسے اور کس طرح کا رویہ رکھنا ہے۔ سو میں نے سراج الحق اور عرفان منیر سے اپنی بے پناہ مصروفیت کی وجہ سے معذرت کر کے دو تین روز کی مہلت چاہی تھی لیکن یہ آج آفس کے بجائے گھر آگئے تھے اور اگر اس وقت میں نہ ملتی تو یقیناً وہ انسلٹ محسوس کرتے۔ میں خیراں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں آئی تو وہ دونوں کھڑے ہوگئے...... دونوں کی نظروں میں موجود اشتیاق کو بھانپتے ہوئے میں نے انہیں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''تشریف رکھیں پلیز...... میں معذرت خواہ ہوں کہ پہلے ملاقات نہیں کرسکی...... دراصل کام کی بے تحاشا مصروفیت ہے......اور......''

''ہم آپ کا زیادہ ٹائم نہیں لیں گے میم......!'' سراج الحق کی چھوٹی، چھوٹی آنکھوں میں بلا کی مکاری تھی۔

''جی فرمائیں، میرے لائق کیا خدمت ہے؟'' میں نے خیراں کو جوس لانے کے لیے کہا اور بیٹھ گئی۔

''ایکچوئلی ہم آپ کا انٹرویو لینا چاہتے ہیں، اپنے اخبار کے لیے...... میں دراصل ایک ہفتہ وار اخبار نکالتا ہوں۔''

''لیکن میرا انٹرویو کس سلسلے میں......؟'' میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''کیا آپ ہر نئے آنے والی ڈی ای او کا انٹرویو اپنے اخبار میں چھاپتے ہیں؟''

''ہر ڈی ای او سویرا اقبال نہیں ہوتی۔'' اس کے لبوں پر بڑی معنی خیز مسکراہٹ تھی مجھے مزید حیرت ہوئی تھی۔

''سویرا اقبال میں ایسی کیا خاص بات ہے؟'' میں نے اپنی حیرت چھپائی۔

''خاص بات......؟'' اس کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

''آپ کی نئی جاب نے تو تہلکہ مچا رکھا ہے جناب۔'' اب کے وہ کھل کے سامنے آیا تھا۔ ''مضامین پر مضامین لکھے جارہے ہیں۔''

''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ یہ شخص انتہائی کائیاں تھا، پتا نہیں اس کی معلومات کا ذریعہ کیا تھا۔ ورنہ میری حتی الامکان یہی کوشش ہوتی تھی کہ کسی کو معلوم نہ ہونے پائے کہ میں کون ہوں...... سویرا اقبال نام کی صرف ایک میں ہی تو نہیں سیکڑوں لڑکیاں ہوں گی...... لیکن اس نے جس یقین سے بات کی تھی لگتا تھا کہ یہ شخص پورا ہوم ورک کر کے آیا ہے، سو اب مکرنے کا کوئی فائدہ نہیں تھا...... البتہ دل میں مجھے انتہائی کوفت ہوئی تھی...... پچھلے شہر میں تقریباً دو سال میرا قیام رہا تھا

لیکن کسی کو علم نہیں ہو سکا تھا کہ میں وہ ہی سویرا اقبال ہوں جس کی شاعری کی دھوم ہے۔ میں اس سلسلے میں بہت احتیاط کرتی تھی۔ سراج الحق نے اس طرح چتاتی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو...... دیکھا تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ اب وہ میری شاعری کی تعریف میں رطب اللسان تھا...... عرفان منیر نے بھی تعریف کرنے کے بعد مشاعرے میں شرکت کا دعوت نامہ دیا۔

''سوری، میں مشاعروں میں نہیں جاتی۔''

''لیکن یہ مشاعرہ تو ہم آپ کے اعزاز میں کر رہے ہیں۔ آپ کا ہمارے شہر میں آنا ہمارے لیے بڑا اعزاز ہے۔''

''میرے لیے بھی یہ اعزاز ہے، عرفان صاحب کہ آپ یہاں تشریف لائے۔ اس عزت افزائی کے لیے میں آپ کی ممنون ہوں...... لیکن میں نے جب اس خار زار میں قدم رکھا تھا تو اپنے لیے کچھ اصول بھی بنائے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ مجھے مشاعرہ نہیں پڑھنا تو میں معذرت خواہ ہوں کہ اپنا اصول توڑ نہیں سکتی۔''

عرفان منیر کے چہرے پر مایوسی پھیل گئی تھی۔

''اور انٹرویو میڈم...... وہ تو آپ دے رہی ہیں ناں......'' سراج الحق کا لہجہ اب بھی پر یقین تھا۔

''پچھلے تیرہ سالوں سے میرا کلام اور میری کہانیاں ادبی پرچوں میں چھپ رہی ہیں۔ کیا آپ نے بھی کہیں میرا انٹرویو دیکھا، پڑھا؟''

''نہیں......'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ''لیکن میں چاہتا ہوں کہ آپ کے پہلے انٹرویو کا اعزاز میرے اخبار کو ملے۔''

''چلیں وعدہ رہا جب بھی میرا ارادہ بنا انٹرویو دینے کا تو یہ اعزاز آپ کے اخبار کو ہی ملے گا۔'' میں نے زبردستی ہونٹوں پر مسکراہٹ سجائی...... میں جانتی تھی کہ اگر یہ لوگ کبھی کسی مشکل میں کام آسکتے ہیں تو میرا جینا بھی حرام کر سکتے ہیں۔

''میری خوش قسمتی ہوتی اگر آپ کا انٹرویو ہمارے اخبار میں چھپ جاتا۔'' سراج الحق کے لہجے میں ہلکی رکھائی تھی جسے میں نے محسوس کیا۔

''بہرحال آپ کو مجبور تو نہیں کیا جا سکتا...... یہی اعزاز کیا کم ہے کہ آپ نے ملاقات کا شرف بخشا۔'' بظاہر وہ بچھا جا رہا تھا لیکن میں سمجھ سکتی تھی کہ میرے سامنے بیٹھا شخص کس قدر منافق اور دوغلا ہے۔

''کیا غضب کا لکھتی ہیں آپ...... جیسے تحریر نہیں موتیوں کی مالا ہے۔ ایک، ایک لفظ سونے میں تلنے والا۔ ویسے کیا آپ کے خاندان میں کسی اور کو بھی ادب سے دلچسپی ہے؟'' عرفان منیر بھی سراج الحق سے کم چالاک نہیں لگ رہا تھا۔

''نہیں......'' میں نے مختصر جواب دے کر اسی فیمران کی طرف دیکھا جو انہیں جوس پیش کر رہی تھی۔

''آپ کے والد بھی کیا ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ سے متعلق ہیں؟'' گویا وہ غیر رسمی انٹرویو کا آغاز کر چکا تھا۔

''نہیں......''

میرا جواب اب بھی مختصر تھا۔ میں سمجھ رہی تھی کہ وہ زیادہ سے زیادہ میرے متعلق جاننا چاہتا ہے اور میں ایسا نہیں چاہتی تھی...... میں نے کلائی موڑ کر ٹائم دیکھا حالانکہ میرے بالکل سامنے کلاک تھا۔

''اقبال آپ کے والد کا نام ہے یا......'' اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

''نہیں، یہ میرے نام کا حصہ ہے۔'' میں نے پھر کلائی موڑ کر وقت دیکھا اور بالآخر سراج نے سمجھ لیا جو میں سمجھانا چاہتی تھی۔

''اوہ سوری، آپ کو دیر ہو رہی ہے۔'' وہ ایک دم کھڑا ہو گیا تھا۔ ''ان شاء اللہ پھر ملاقات ہو گی۔''

''ضرور......'' میں اخلاقاً مسکرائی۔

''انٹرویو کے متعلق ضرور سوچیے گا میم...... آپ

پتا نہیں انٹرویو دینے سے کیوں کتراتی ہیں.....
حالانکہ آپ اگر انٹرویو دیں گی تو آپ کی شہرت کو چار چاند لگ جائیں گے۔" عرفان منیر نے بھی اٹھتے ہوئے کہا تو سراج نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے شاباش دی۔

"میرا خیال ہے جتنی شہرت اور عزت مجھے ملی ہے وہ میرے لیے کافی ہے اور شہرت حاصل کر کے میں کیا کروں گی، منیر صاحب۔"

"کوئی تو وجہ ہوگی، کیا فیملی پسند نہیں کرتی؟" عرفان منیر کی آنکھیں جیسے مجھے اندر تک کھوج آنا چاہتی تھیں۔

"یہی سمجھ لیں۔"

سراج الحق کی آنکھیں، لمحے بھر کے لیے تمسخر اڑاتی ہوئی سی محسوس ہوئیں۔ جیسے کہہ رہی ہوں کہ خوب سمجھتے ہیں ہم کہ تمہارے پس منظر میں ضرور کہیں کوئی گڑبڑ ہے۔

"دراصل اپنے پسندیدہ لوگوں کے متعلق سب کو ہی جاننے کا تجسس ہوتا ہے..... ان کا ماضی، خاندانی پس منظر سب کچھ....."

"چلیے سراج صاحب کبھی ان کا تجسس دور کردیں گے۔ فی الحال تو....." میں نے کلائی موڑ کر پھر وقت دیکھا تو وہ دونوں حضرات خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوگئے۔ میں انٹرویو کیوں نہیں دیتی تھی اور میرا پس منظر کیا تھا۔ میں جانتی تھی سراج ہی نہیں کئی دوسرے بھی جاننا چاہتے تھے..... اور یقیناً اندازہ لگاتے ہوں گے کہ میرے ماضی میں ضرور کچھ ایسا ہے جو بتانے لائق نہیں ہے۔

"منافق اور دوغلے لوگ....." میں نے زیر لب ....کہا اور ساڑی کا پلو درست کیا۔

"لیکن کیا تم خود بھی منافق نہیں ہو۔" میرے اندر سے آواز آئی لیکن میں نے اس آواز پر کان نہیں دھرے تھے۔ میں اپنے آپ کو منافق نہیں سمجھتی تھی بلکہ اپنے منافقت بھرے رویے کو اپنی مجبوری گردانتی تھی۔ اگر میں یہ رویہ نہ رکھوں تو یہ لوگ تو مجھے کچا کھا جائیں..... اور یہ میں نے بہت پہلے جان لیا تھا..... اور لوگوں کے باطن کی خباثتیں دیکھنا سیکھ لی تھیں۔

"میڈم جی آپ نے آفس نہیں جانا؟" ماسی خیراں نے ٹیبل سے خالی گلاس اٹھاتے ہوئے میری طرف دیکھا تو میں نے چونکتے ہوئے کلاک پر نظر ڈالی۔ پونے دس ہو رہے تھے۔ یک دم میرا دل ہر چیز سے اچاٹ ہوگیا..... اور ایسا ہوتا تھا کبھی کبھی۔

"نہیں....." میں ایک گہری سانس لے کر وہاں ہی صوفے پر بیٹھ گئی..... اور ہینڈ بیگ سے اپنا فون نکال کر اپنے آفس کے کلرک ساجد خان کو فون کر کے میٹنگ کینسل کرنے کے لیے کہا۔

"سب خیر ہے ناں.....؟"

"ہاں ساجد کوئی مسئلہ ہے..... مجھے کہیں جانا ہے۔ دوبارہ کب میٹنگ ہوگی پھر بتادوں گی..... کوئی آیا تو نہیں ہے ابھی تک؟"

"نہیں میڈم.....! صرف ایک پرائمری اسکول کی ہیڈ مسٹریس ہیں۔"

"ٹھیک ہے تم سب کو فون کر کے بتادو۔" میں نے فون بند کر کے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی۔ میں سویرا اقبال جو میانے ہزارے کی جم پل تھی۔ میں نے آج تک کسی کو انٹرویو نہیں دیا تھا۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی نہیں جب میری پہلی کتاب کو ہی آدم جی ادبی ایوارڈ سے نوازا گیا..... اس لیے کہ میں پورا سچ نہیں بول سکتی تھی اور آدھا سچ ہمیشہ ذلیل کرتا ہے۔ یا پورا سچ یا پورا جھوٹ۔

میں نے آج تک کسی اخبار یا رسالے کو انٹرویو نہیں دیا تھا اس لیے نہیں کہ خدانخواستہ میرا ماضی شرمناک تھا اور میرا پس منظر بتانے لائق نہیں تھا..... جیسا کہ سراج الحق کی چھوٹی، چھوٹی آنکھوں سے

شک جھلکتا ہے، میرا ماضی دوسروں کے لیے شرمناک نہیں ہوسکتا۔ ہوسکتا ہے میرے لیے ہو۔

میں میانے ہزارے کے ایک کسان دین محمد کے گھر پیدا ہوئی اور صوبیدار صابر حسین اور استانی جی کے گھر پلی بڑھی...... میرے حوالے میرا مان تو ہو سکتے تھے میری شرمندگی نہیں...... تو میرا باپ میانے ہزارے کا کسان دین محمد تھا جو غریب تھا نہ امیر...... بس اچھا گزارہ ہوتا تھا۔ پہننے، اوڑھنے، کھانے، پینے کو اچھا ملتا تھا...... مجھ سے بڑی میری چار بہنیں اور ایک بھائی تھا...... دو بہنیں بڑی تھیں پھر بھائی پھر دو بہنیں...... میرا باپ ایک خاموش طبع اپنے کام میں مگن رہنے والا انسان تھا۔ اس نے بہنوں کی پیدائش پر واویلا کیا نہ مزید بیٹے کی خواہش کی تھی، یہ اماں تھیں جنہیں مزید ایک بیٹے کی خواہش تھی۔

"میرا دانیال اکیلا ہے۔ ایک بیٹا اور ہو جائے تو میرے دانو کا بازو بن جائے۔ اس کا جوڑا...... کلّا (اکیلا) تو درخت بھی چنگا نئیں لگدا......" سو وہ دانی کے جوڑے کی خواہش میں مزار پر منت مانتی اور دیے جلاتی پھرتی تھیں اور دانی کے بازو کے بجائے میں آگئی...... مجھے یقین ہے مجھے دیکھ کر اماں نے نفرت سے منہ پھیر لیا ہوگا۔ مزید بیٹے کی خواہش میں اوپر تلے تین بیٹیاں تو آچکی تھیں۔ پتا نہیں میرے بعد اماں کے دل میں بیٹے کی خواہش مری تھی یا نہیں لیکن میرے بعد گھر کی نفری میں اضافہ نہیں ہوا تھا۔ میں چھ سال کی ہوگئی تھی۔ گھر میں سب سے چھوٹی تھی، سنا ہے چھوٹے بچے سب کو بہت پیارے ہوتے ہیں لیکن مجھے کبھی ایسا نہیں لگا تھا کہ میں گھر میں سب کی پیاری ہوں۔ ابا شام کو تھکا ہارا کھیتوں سے آتا تو اس کے پاس اپنی اولاد کے لیے کوئی محبت بھری نظر یا بول نہیں ہوتے تھے۔ وہ اکثر صحن یا برآمدے میں بچھی چارپائی پر بیٹھ جاتا، میری بڑی بہن شانو اس کے لیے حقہ تازہ کر کے لاتی۔ اماں چنگیر میں روٹیاں اور سالن کی کٹوری رکھ کر چارپائی پر رکھ دیتی...... ہمارے ہاں رات کا کھانا سر شام ہی کھا لیا جاتا بلکہ دیہاتوں میں اکثر گھروں میں کھانا اب بھی سر شام ہی کھا لیا جاتا ہے۔ ابا بھی کھانا کھا کر اور حقہ پی کر چارپائی پر لیٹ جاتا۔ دوسرے نمبر والی بہن عاشو، ابا کے پاؤں دباتی اور ابا دانی سے دو چار باتیں کر کے سو جاتا۔ میں ابا کی چارپائی کے گرد منڈلاتی رہتی کہ ابا مجھے گود میں اٹھائے، چارپائی پر پاس بٹھائے اور کھانا کھاتے ہوئے میرے منہ میں بھی نوالے بنا بنا کر ڈالے۔ پتا نہیں یہ کیسی حسرت تھی جو چھ سال کی عمر میں بھی دل کے اندر کہیں چھپ کر بیٹھ گئی تھی...... شاید میں تب سے ہی بہت گہرائی سے سوچنے لگی تھی۔ ابا تو ایک طرف اماں نے بھی میری طرف کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ شانو اور عاشو ہی مجھے نہلاتی، دھلاتی اور کپڑے پہناتی تھیں۔ شاید پیدا ہوتے ہی انہوں نے مجھے سنبھال لیا تھا۔ اماں نے صرف دودھ پلانے کا کام کیا تھا۔ ورنہ انہیں تو جب بھی موقع ملتا ایک آدھ دھموکا جڑ دیتیں...... میں گود میں جانے کو مچلتی تو دھکیل دیتیں۔

"چل پیچھے ہٹ نامراد......"

پتا نہیں نامراد میں تھی یا میری آمد سے وہ نامراد رہ گئی تھیں کہ وہ بے وجہ بلاوجہ مجھے ایک دو تھپڑ لگا دیتیں...... چھ سال کی عمر میں شاید کوئی اتنا حساس نہیں ہوتا ہوگا جتنا میں تھی...... تھپڑ کھا کر بھی انہی کی طرف لپکتی...... آنکھوں میں آنسو بھر کر اس سے انہیں تکتی کہ وہ مجھے بھی گود میں لے کر میرا ماتھا اور رخسار چومیں جیسے دانی کے چومتی ہیں بلکہ مجھ سے بڑی پینو کو بھی اماں کبھی کبھار چوم لیتیں۔ جب وہ سیڑھیوں سے گری تھی تب اور جب اسے بخار ہوا تھا تب...... میں نے دیکھا تھا۔ اماں بار، بار اسے پیار کر رہی تھیں۔ تب میں بھی سیڑھیوں سے گر گئی۔ پتا نہیں جان بوجھ کر گری تھی یا خود ہی گر گئی تھی شعور میں نہیں

ہے لیکن گرنے کے بعد آس سے اماں کی طرف دیکھا ضرور تھا کہ وہ مجھے بھی پھوپھو کی طرح پیار کریں گی لیکن اماں نے الٹا مجھے ایک تھپڑ جڑ دیا۔

"تو چھت پر کیا کرنے گئی تھی؟" ہاں شانو نے مجھے ضرور گود میں اٹھایا تھا اور ہمدردی سے میری چوٹ سہلانے لگی تھی۔ میں حلق پھاڑ، پھاڑ کر رو رہی تھی لیکن اماں ٹس سے مس نہیں ہوئی تھیں اور آرام سے بیٹھی دانی کے کرتے پر پھول کاڑھتی رہیں۔۔۔۔ اور یہ اس سے دو روز بعد کی بات ہے۔۔۔۔ اماں صحن میں مٹی کے چولہے کے پاس بیٹھی تھیں۔ لکڑیاں گیلی تھیں اور سارے گھر میں دھواں بھرا تھا اور پھونکنی سے پھونکیں مارتے، مارتے اماں کی سانس چڑھ رہی تھی اور دھوئیں سے آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے کہ دانی روتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔

"ارے کیا ہوا میرے لال۔۔۔؟" اماں نے کلیجے پر ہاتھ رکھا اور دانی رو، رو کر بتانے لگا کہ پہلے اسے خلیل نے مارا اور پھر اس کا بھائی شکیل بھی آگیا اور وہ بھی مارنے لگا۔۔۔۔ شاید اماں کا زخم تازہ ہو گیا تھا کہ انہوں نے ایک آہ بھری۔

"ہائے میرا اکلوتا (اکیلا) مارا گیا۔" اور جب ہی میں نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔۔۔۔ شاید میں پوچھنا چاہتی کہ بھائی کیوں رو رہا ہے۔

"اماں۔۔۔!" اور اماں نے چولہے سے لکڑی کھینچ کر میرے بازو پر دے ماری۔ سلگتی لکڑی نے میری نازک جلد کو جلا دیا، میں چیخ چیخ کر رونے لگی تھی۔ اس وقت جب اماں نے چولہے سے لکڑی کھینچی تھی تو استانی جی ہمارے گھر کے اندر داخل ہو رہی تھیں، انہوں نے بھاگ کر مجھے اپنی آغوش میں لے لیا۔

"ہائے غضب زرینہ، یہ اتنی معصوم بچی کے ساتھ اتنا ظلم۔۔۔۔!"

اماں بیزار سی لیے تڑنگے دانی کو گود میں سمائے بیٹھی رہیں اور استانی جی نے شانو سے کہہ کر کچا آلو پیس کر میرے بازو پر لگایا۔ میں ان کی گود میں سسکتی رہی۔۔۔۔۔۔ استانی جی نے تاسف بھری نظروں سے اماں کو دیکھا۔

"اگر پیار و محبت سے اولاد کو پال نہیں سکتے تو پیدا کیوں کرتے ہو؟" استانی جی کو بہت غصہ آرہا تھا۔

"چار تھوڑی تھیں میری جان کو مجھے کب شوق تھا استانی جی اس کا، میں نے تو اللہ سے دانی کے لیے بھائی مانگا تھا۔ یہ ٹپک پڑی۔" اماں کے دل کی بات زبان پر آگئی تھی۔

اگرچہ میری عمر صرف چھ سال کی تھی لیکن مجھے اس دن کا واقعہ پوری جزئیات کے ساتھ یاد ہے۔ شاید اس لیے کہ استانی جی اکثر اس دن کی بات دہراتی رہتیں۔۔۔۔ جبھی وہ میرے ذہن میں محفوظ رہ گئی۔۔۔۔ اماں، ابا کے گھر کی یہ آخری یاد تھی اس لیے کہ اس روز استانی جی نے مجھے اماں سے مانگ لیا تھا۔ میں نے اکثر سوچا کہ جب اس گھر میں میری کسی کو چاہ نہیں تھی تو پھر اللہ میاں نے مجھے اس گھر میں کیوں پیدا کیا تھا وہ مجھے کہیں کسی اور گھر میں بھی تو پیدا کر سکتا تھا۔۔۔۔۔ استانی جی نے مجھے اماں سے مانگا تھا اس لیے نہیں کہ وہ بے اولاد تھیں۔۔۔۔۔ بلکہ اس لیے کہ انہیں مجھ پر ترس آگیا تھا۔ ورنہ ان کے تین بیٹے تو پہلے سے ہی تھے۔

"لے جاؤ جی۔۔۔۔" اماں ابھی تک دانی کے بال سہلا رہی تھیں اور انہوں نے اتنی بے پروائی سے کہا تھا جیسے میں کوئی شے تھی، جیتی جاگتی انسان نہیں اور جیسے میری پیدائش پر اماں نے کوئی تکلیف نہیں سہی ہوگی۔ یہ بات بھی استانی جی نے کتنی بار ہی دہرائی تھی۔ سو حافظے میں اسی طرح موجود ہے، انہی الفاظ کے ساتھ۔

"اپنی بیٹی بنا کر رکھوں گی زرینہ، تو فکر نہ کرنا۔" استانی جی اپنی طرف سے اماں کو تسلی دے رہی تھیں لیکن اماں کو بھلا اس کی پروا کیا ہو سکتی تھی کہ

وہ مجھے اچھی طرح رکھیں گی یا بُری طرح..... میں تو تھی ہی بے طلب..... ان جان..... انہیں اگر فکر تھی تو صرف یہ کہ برادری والے کہیں باتیں نہ بنائیں کہ اپنی بیٹی بھاری پڑ گئی تو دوسروں کو دے دی..... پھر بھی انہوں نے استانی جی سے وعدہ کرلیا کہ وہ میرے ابا سے بات کریں گی اگر ابا نے اجازت دے دی تو بھلے استانی جی لے جائیں..... ابا نے اماں کی بات سن کر حیرت سے انہیں دیکھا تھا۔

"ارے پانچ بیٹیاں ہیں تو کیا..... ہم انہیں بانٹنے لگیں.....؟"

"یہ دیکھو گلی پیچھے ہی تو استانی جی کا گھر ہے، شانو کے ابا..... بہت پیار کرتی ہیں وہ اپنی بالی سے..... ان کے پاس رہے گی تو پڑھ لکھ بھی جائے گی..... دیکھتے نہیں ہو کتنا شوق ہے اسے پڑھنے کا، کوئلے سے دیواریں کالی کرتی رہتی ہے، دانی کی کتابیں اور کاپیاں اٹھائے پھرتی ہے۔"

"سوچ لے، زرینہ شریک باتیں کریں گے۔"

ابا کو بھی اماں کی فکر دامن گیر ہوگئی تھی۔

"شریکوں کی پروا کرلی ہے میری جوتی نے۔"

اماں فیصلہ کرچکی تھیں تو ابا بھلا کیا کرتے۔ اس روز پہلی اور شاید آخری بار ابا نے مجھے اپنے پاس بلا کر غور سے دیکھا۔

"تو استانی جی کے ساتھ ان کے گھر جائے گی؟"

میں نے سر ہلا دیا۔

"اچھا اگر اُدھر دل نہ لگا تو گھر آ جانا۔"

میں نے پھر سر ہلا دیا اس وقت مجھے علم نہیں تھا کہ مجھے ہمیشہ کے لیے اس گھر سے بے دخل کیا جا رہا ہے۔ میں اس گھر میں کسی کو مطلوب نہیں تھی۔

ابا کی دو انگلیوں نے پہلی بار نرمی سے میرے رخسار کو چھوا۔ ابا کی انگلیوں کا کھردرا لمس آج بھی کبھی کبھی مجھے اپنے رخسار پر محسوس ہوتا ہے اور میں کتنی ہی دیر اپنے رخسار پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس لمس کو اپنے اندر اتارنے کی کوشش کرتی رہتی ہوں۔

جس روز استانی جی مجھے لینے آئی تھیں، میری چاروں بہنیں اور اکلوتا بھائی قطار بنا کر کھڑے مجھے جاتے ہوئے یوں دیکھ رہے تھے جیسے کبھی، کبھی صحن میں کھڑے ہو کر کبھی کبھار گزرنے والے جہاز کو دیکھتے تھے، حیرت سے اور خوشی سے..... پتا نہیں ان کی آنکھوں میں حیرت بھری خوشی تھی یا حیرت بھرا دکھ..... لیکن وہ سب اس وقت تک صحن میں کھڑے رہے جب تک میں دروازے سے باہر نہ نکل گئی.....

اور ابھی ہم اپنی گلی میں ہی تھے کہ عاشو دوڑتی ہوئی آئی تھی اس کے ہاتھ میں کپڑے کی چھوٹی سی گٹھڑی تھی۔

"استانی جی استانی جی....."

استانی جی رک کر اسے دیکھنے لگی تھیں۔

"یہ بالی کے کپڑے اماں نے دیے ہیں۔"

میں نے حیرت سے عاشو کی طرف دیکھا تھا۔ بھلا اماں نے میرے کپڑے کیوں بھیج دیے ہیں لیکن میرے ننھے سے دماغ میں یہ بات نہیں آسکی تھی کہ اس گھر سے میرا رابطہ ختم ہو رہا ہے۔ استانی جی نے گٹھڑی پکڑلی تو عاشو کے جی میں پتا نہیں کیا آئی کہ اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر اس پر پیار کیا اور تیزی سے واپس مڑ گئی۔ میں جب اس منظر کو سوچتی ہوں تو میرے دائیں ہاتھ کی پشت پر عاشو کے گیلے، گیلے ہونٹوں کا لمس جاگ اٹھتا ہے اور میرا دل جیسے پگھل کر پانی ہونے لگتا ہے۔ پتا نہیں کیوں..... کبھی، کبھی تو میرا جی چاہتا ہے چیخیں مار، مار کر روؤں..... اور ایسے میں خود ہی اپنے ہاتھ کی پشت کو چوم، چوم کر تھک جاتی ہوں۔

استانی جی میانے ہزارے کے پرائمری اسکول میں پڑھاتی تھیں اور ان کے شوہر آرمی میں صوبیدار تھے اور چھٹیوں میں ہی گھر آتے تھے۔ استانی جی کا گھر ہمارے گھر سے صرف ایک گلی کے فاصلے پر تھا۔

جس وقت میں استانی جی کی انگلی پکڑے اپنے گھر

کے دروازے سے نکلی تھی تو مجھے نہیں پتا تھا کہ یہ ایک گلی کا فاصلہ میرے لیے اتنا طویل ہو جائے گا کہ میں اسے کبھی طے نہیں کر پاؤں گی۔ استانی جی نے گھر لاتے ہی سب سے پہلے میرے بازو کی طرف توجہ دی تھی......اور بڑے بیٹے کو دوائیوں والی دکان پر بھیج کر مرہم منگوا کر میرے بازو پر لگایا تھا جس میں اب بھی جلن ہو رہی تھی...... جب رات ہوئی تو میں نے سوچا ابھی استانی جی مجھے گھر چھوڑ آئیں گی لیکن استانی جی نے مجھے کمرے میں سونے کے لیے کہا۔ اس کمرے میں تین چارپائیاں تھیں ایک پر استانی جی سو رہی تھیں اور ایک پر انہوں نے مجھے سلایا تھا۔ جبکہ تیسری چارپائی پر ان کا چھوٹا بیٹا سو رہا تھا جو مجھ سے تھوڑا سا بڑا ہوگا...... بعد میں اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ سات سال کا ہے اور تھری کلاس میں پڑھتا ہے۔ دونوں بڑے بیٹے ساتھ والے کمرے میں سو رہے تھے۔ میں چپ چاپ لیٹ گئی تھی لیکن میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں دوڑتی ہوئی اپنے گھر چلی جاؤں اور چپکے سے جا کر عاشو یا شانو کی چارپائی پر ان سے چمٹ کر سو جاؤں۔ گھر میں اکیلی تو میں کبھی نہیں سوئی تھی۔ اپنی چاروں بہنوں میں سے کسی ایک کے پاس سو جاتی تھی۔ میری آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔ جب استانی جی لالٹین بجھانے کے لیے اٹھیں تو انہوں نے مجھ سے کہا۔

''سو جاؤ گڑیا......'' اور پھر ان کی نظر شاید میری بھری ہوئی آنکھوں پر پڑی تھی۔

''کیا بازو میں جلن ہو رہی ہے...... درد تو نہیں ہو رہا؟''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ کاش وہ پوچھتیں کہ اماں، ابا یاد آ رہے ہیں یا گھر اور بہنیں یاد آ رہی ہیں تو میں فوراً کہتی ہاں......اور پھر شاید زندگی مختلف ہوتی میں سویرا اقبال کے بجائے صرف اقبال ہوتی......دین محمد زمیندار کی بیٹی......

شاید میں سویرا اقبال کی طرح کامیاب عورت نہ ہوتی لیکن سویرا اقبال سے زیادہ مطمئن ہوتی......

لیکن استانی جی نے ایسا کچھ نہیں پوچھا تھا اور میں خود سے انہیں نہیں کہہ سکی تھی کہ مجھے اپنا گھر یاد آ رہا ہے' مجھے واپس بھجوا دیں۔ بھلے میں وہاں مطلوب نہیں تھی، اماں، ابا نے میرے ہونے کی دعائیں نہیں مانگی تھیں لیکن وہ میرا اپنا گھر تھا اور استانی جی کا گھر میرا نہیں تھا......میں آس بھری نظروں سے استانی جی کی طرف دیکھتی رہی کہ شاید اب، شاید اب وہ پوچھیں......لیکن انہوں نے کارنس سے لالٹین اتار کر اس کی لو نیچے کی پھر اس کا شیشہ اونچا کر کے پھونک ماری...... کمرے میں اندھیرا ہو گیا۔ ان دنوں میانے ہزارے میں بجلی نہیں تھی۔ پتا نہیں اب ہو......یا ہو سکتا ہے نہ ہو......

کمرے میں اندھیرا ہو گیا تو میں بے آواز رونے لگی اور پھر روتے، روتے سو گئی۔

استانی جی نے اگلے دن بھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ کیا مجھے گھر واپس جانا ہے، بہن، بھائی تو نہیں یاد آ رہے......بلکہ انہوں نے کبھی نہیں پوچھا۔ انہوں نے بھی شاید مجھے کوئی چیز ہی سمجھا تھا جیسا کہ وہ دوسروں سے میرا تعارف کرواتے ہوئے کہا کرتی تھیں۔

''اس کی ماں نے تو اسے یوں میری جھولی میں ڈال دیا جیسے اس نے درد نہیں سہے تھے۔ جیسے یہ کوئی چیز تھی اور اس نے نو ماہ پیٹ میں نہیں رکھا اس کا بوجھ نہیں اٹھایا......'' آخر اماں اور استانی جی میں فرق ہی کیا تھا۔ انہوں نے بھی تو کبھی نہیں پوچھا۔

''کیا تمہیں اپنے سنگ کھیلنے والی بہنیں یاد آتی ہیں؟ وہ اکلوتا بھائی، لاڈلا بھائی......ابا، اماں......''

استانی جی کئی دن تک میرے بازو پر مرہم لگاتی رہیں۔ میرا زخم ٹھیک ہو گیا۔ حتیٰ کہ جلنے کا داغ بھی نہیں رہا لیکن دل پر جو آبلے پڑے تھے وہ آج تک خون برستے ہیں اور وہ اسی طرح تکلیف دیتے ہیں۔

مجھے استانی جی کے گھر آئے تیسرا دن تھا۔

جب استانی جی کے شوہر چھٹی پر گھر آئے تھے اور استانی جی نے میرا بازو پکڑ کر انہیں دکھایا تھا۔

"ایسی ظالم ماں جلتی لکڑی دے ماری معصوم بچی کو...... میں تو لے آئی اسے کہ مجھے دے دو...... ہمیں ایک بچی بھاری نہیں ہے جہاں تین پل رہے ہیں وہاں یہ بھی پل جائے گی۔"

"ہاں اچھا کیا..... ویسے بھی تمہیں بیٹی کا شوق تھا۔ پورا ہو جائے گا۔" صوبیدار انکل کو کوئی اعتراض نہیں ہوا۔

استانی جی کے شوہر جنہیں میں بعد میں انکل کہنے لگی تھی۔ دو تین دن کی چھٹی پر گھر آئے تھے اور ان کے آنے کے بعد استانی دوسرے کمرے میں چلی گئی تھیں۔ ابرار اور میں کمرے میں اکیلے تھے۔ رات کو جب استانی جی لالٹین بجھا کر چلی گئیں تو میں چپکے، چپکے رونے لگی..... تب ابرار جسے استانی جی اور اس کے دونوں بڑے بھائی باری کہتے تھے۔ اپنی چارپائی پر اٹھ کر بیٹھ گیا..... باہر برآمدے میں جلتی ہوئی لالٹین کی مدھم، مدھم سی روشنی اندر کمرے میں بھی آ رہی تھی۔

"تم کیوں رو رہی ہو گڑیا......؟" میں نے جواب نہیں دیا تو وہ اپنی چارپائی سے اٹھ کر میری... چارپائی کے قریب آ گیا۔

"ڈر لگ رہا ہے؟"

میں اور زیادہ رونے لگی۔

"ڈرو نہیں......" اس نے مجھے تسلی دی۔

"میں ہوں ناں اِدھر...... اور تمہیں آیت الکرسی آتی ہے؟"

"نہیں......" میں نے نفی میں سر ہلایا۔

"مجھے آتی ہے...... اماں کہتی ہیں آیت الکرسی پڑھ کر سوئیں تو پھر ڈر نہیں لگتا...... میں پڑھ کر پھونک دیتا ہوں۔"

اور یہ باری سے میری دوستی کی ابتدا تھی۔

میرے آنسو تھم گئے تھے۔ وہ کچھ دیر مجھ سے باتیں کرتا رہا تھا۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی عمر سات سال ہے۔

استانی جی انکل کے آنے سے تھوڑی مصروف ہو گئی تھیں۔ میں برآمدے میں بیٹھی رہتی۔ کئی بار میرا جی چاہا کہ گھر چلی جاؤں۔ اماں نے کہا تھا کہ جی نہ لگے تو آ جانا...... لیکن پتا نہیں کیوں میں وہ ایک گلی پار نہ کر سکی..... بس منتظر رہی کہ کوئی مجھے لینے آئے...... لیکن کوئی نہیں آیا...... پتا نہیں میری گھٹی میں ہی اتنا اور خودداری تھی کہ میں خود نہیں گئی۔

انکل واپس چلے گئے تو استانی جی نے میرا یونیفارم سلوایا۔ نیلا فراک، سفید شلوار اور کالے بوٹ پہن کر جب میں پہلے دن استانی جی کے ساتھ اسکول گئی تو مجھے بہت اچھا لگا۔ اپنا آپ بھی اور اسکول جانا بھی..... استانی جی نے مجھے پہلی جماعت میں داخل کروایا تھا..... میرا بڑا جی چاہ رہا تھا کہ میری بہنوں میں سے کوئی آ جائے تو میں انہیں اپنا یونیفارم دکھاؤں اور شانو، عاشو دونوں ہی اسی روز استانی جی کے گھر آئی تھیں اور انہوں نے بتایا تھا کہ وہ سب نانی سے ملنے چنیوٹ گئے ہوئے تھے۔ کیا تھا اگر وہ مجھے بھی ساتھ لے جاتے میں اپنے ہوش میں کبھی نانی کے گھر نہیں گئی تھی۔ میرے دل میں جیسے ایک اور آبلہ پڑ گیا تھا۔ میں نے شانو اور عاشو کو کچھ بھی نہیں کہا تھا۔ بس چپ چاپ ان کی باتیں سنتی رہی تھی۔ شانو نے مجھے بتایا کہ نانی نے اماں کو بہت ڈانٹا ہے کہ انہوں نے مجھے استانی جی کے ساتھ کیوں جانے دیا۔

"تو گھر چلے گی باجی؟" عاشو نے مجھ سے کہا تو میں استانی جی کی طرف دیکھنے لگی۔

"نہ بھائی بھول جاؤ اسے..... یہ تو اب میری بیٹی ہے۔ تمہاری اماں نے اسے مجھے دے دیا ہے۔" میں نیچے دیکھنے لگی اور کہہ نہ سکی کہ نہیں میں

اپنے اماں، ابا کی بیٹی ہوں اور مجھے گھر جانا ہے اور میں کبھی دل کی کوئی بات نہیں کہہ سکی تھی۔ کبھی اماں سے نہ کہہ سکی کہ مجھے اپنی گود میں لٹا لیں...... کبھی ابا سے نہیں کہا کہ مجھے بھی انگلی پکڑ کر بازار لے جائیں۔ بس ٹکر ٹکر انہیں دیکھا کرتی اور دل میں خواہش اور لفظ گھٹتی رہتی۔

شانو، عاشو اور دوسری بہنیں کبھی، کبھی مجھے ملنے آتی تھیں۔ عاشو نے ایک روز مجھ سے کہا تھا۔

"پالی چل گھر، میں نے تیرے لیے کپڑے کی اتنی اچھی گڑیا بنائی ہے اور اماں کے پراندے سے دھاگے نکال کر اس کے بال بھی بنائے ہیں...... اور آنکھیں بھی۔"

میرا بڑا جی چاہا کہ عاشو کے ساتھ گھر چلی جاؤں۔ اماں، ابا سب کو دیکھنے کو جی چاہ رہا تھا۔ اماں شاید چولھے پر ہانڈی چڑھائے بیٹھی ہوں گی۔ اتنے دنوں بعد دیکھ کر ضرور مجھے گلے لگا کر چوم لیں گی اور کہیں گی بس اب تو نے کہیں نہیں جانا...... میں نے چپکے، چپکے استانی جی کی طرف دیکھا جو میری تختی پر اکرے (نقطے) ڈال رہی تھیں۔ جن پر مجھے سیاہی اور قلم پھیرنا تھا...... اور مجھے یاد آیا استانی جی کہتی ہیں کہ مجھے اماں نے انہیں دے دیا ہے اور اگر میں چلی گئی عاشو کے ساتھ تو استانی جی تو ضرور کہیں گی اماں نے تھوک کر چاٹ لیا ہے پھر تو اماں کی بہت بے عزتی ہو گی۔ پہلے ہی استانی جی اماں کو قصاب اور ظالم کہتی ہیں...... تو میں عاشو کے ساتھ نہیں گئی......

جب میں نیلی فراک سفید شلوار اور کالے بوٹ پہن کر اسکول جاتی تو مجھے لگتا جیسے میں عاشو، پو سب سے مختلف ہوں۔ جیسے میرے پر لگ گئے ہوں۔

استانی جی مجھے اپنے ساتھ اسکول لے کر جاتی تھیں اور ساتھ ہی واپس لاتی تھیں...... اپنے گھر والی گلی کے قریب سے گزرتے ہوئے میرے قدم سست پڑ جاتے تھے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں استانی جی کا ہاتھ چھڑا کر بھاگتی ہوئی اپنی گلی میں چلی جاؤں اور اپنے گھر پہنچ جاؤں...... لیکن میں کبھی ایسا نہیں کر سکی۔ ہاں میری آنکھیں ضرور اپنی گلی کی طرف نگراں ہو جاتیں...... استانی جی کی زندگی میں اور گھر میں بڑی ترتیب تھی۔ ہر کام گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ ترتیب سے ہوتا تھا۔ صبح سویرے اٹھ کر استانی جی ہمیں قرآن پاک پڑھاتیں، بڑے دونوں بھائی خود ہی پڑھ لیتے پھر ناشتا، ناشتے کے بعد اسکول، اسکول سے آ کر کھانا اور پھر آرام کرنا شام کو پھر اسکول کی پڑھائی...... لیکن مجھے اماں کے گھر کی...... بے ترتیبی یاد آتی...... جب جی چاہا کھیلا---- جب جی چاہا لیٹ گئے۔ دوپہر میں پو اور فرو گڑیا لے کر بیٹھ جاتیں---- عاشو اور شانو ان کے کپڑوں پر ستارے ٹانک دیتیں۔ میں بھی پاس بیٹھ کر دیکھتی۔ کبھی صحن میں سب ال کر کھیلتیں۔ اکل ڈالتیں، چھپن چھپائی، چھل دوج اور ڈھیروں کھیل تھے...... اماں چارپائی بھی سیدھی کھڑی کر کے گرمیوں کی دوپہروں میں اس پر ازار بند بنتیں...... ان کے ہاتھ بڑی تیزی سے بانس کی تیلیوں پر چلتے تھے۔ کوئی تیلیاں لگاتیں، کوئی نکالتیں، ڈیزائن بنتا جاتا۔ ایک بار میں نے تیلیاں کھینچ دی تھیں تو اماں نے مجھے کئی تھپڑ لگائے تھے۔

اماں کا پیار تو مجھے یاد نہیں تھا لیکن ان کی مار بھی مجھے یاد آتی تھی۔ مجھے اپنا گھر بھی یاد آتا تھا۔ جس کے صحن کے ایک کونے میں اپلوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا، سوکھنے کے لیے اور ایک کونے میں لکڑیاں ہوتی تھیں جو ابا ...۔ ٹال سے اٹھتی لے کر آتے تھے اور جب کبھی بادل آتے اور بارش شروع ہوتی تو سب بہنیں اور بھائی بھاگ، بھاگ کر یہ لکڑیاں اور اُپلے چھپر تلے رکھتے...... استانی جی کے ہاں مٹی کے تیل کا چولھا تھا جو برآمدے میں ایک کونے میں پڑا رہتا...... پاس ہی مٹی کے تیل کا کنستر تھا جس میں سے بمبو (پمپ) سے تیل نکال کر بوتل میں ڈالا جاتا اور کیف رکھ کر

چولہے میں۔ صحن میں ایک طرف مٹی کا چولہا بھی تھا لیکن استانی جی اس چولہے پر صرف پانی گرم کرتی تھیں۔ اماں کے گھر کی بے ترتیبی میں بھی کتنا حسن اور خوب صورتی تھی۔ گرمیوں میں جب شام کے وقت اماں تندور جلا کر روٹیاں لگاتی تھیں تو میں پاس کھڑی انہیں دیکھا کرتی تھی پورے صحن میں گرم، گرم روٹی کی سوندھی، سوندھی خوشبو پھیل جاتی تھی۔ اماں کے گھر جب بھوک لگتی تھی شانو، عاشو چنگیر ی میں پڑی بچی روٹی پر اچار رکھ کر کھا لیتی تھیں لیکن استانی جی کے گھر میں کسی کو بے وقت کھاتے نہیں دیکھا تھا۔ انصار اور ابصار بھائی تو ہر وقت پڑھتے رہتے تھے۔ مجھ سے زیادہ بات نہیں کرتے تھے لیکن باری میرے ساتھ کھیلتا تھا۔ اس نے اپنے سارے کھلونے مجھے دکھائے تھے۔ وہ عمر میں تو مجھ سے ایک سال ہی بڑا تھا لیکن پڑھائی کے لحاظ سے دو سال آگے تھا۔ میں سبق بھی یاد کر لیتی، کھیل بھی لیتی اور پھر بھی جیسے سارا دن میں فارغ بس استانی جی کے گھر کے برآمدوں اور کمروں میں گھومتی پھرتی...... کئی بار دروازہ کھول کر دیکھتی...... بس ایک گلی کا فاصلہ اور...... شروع میں شانو، عاشو، فرو تو کبھی کبھی آجاتی تھیں، تھوڑی دیر کے لیے لیکن اماں نہ جانے کیوں نہیں آتی تھیں...... دانی کو بھی میں کبھی کبھی اسکول سے آتے جاتے گلی میں دیکھ لیتی تھی لیکن اماں، ابا نہیں ملتے تھے۔ حالانکہ عاشو یا شانو جب بھی آتیں ضرور پوچھتی تھیں کہ مجھے گھر تو نہیں جانا اور اگر کبھی استانی جی سن لیتیں تو ضرور باور کرواتیں کہ اب میں ان کی بیٹی ہوں...... حالانکہ انہوں نے مجھے یہ کبھی نہیں کہا کہ میں انہیں استانی جی نہ کہوں باری اور انصار، ابصار کی طرح امی کہوں...... نہ ہی مجھے یہ کہا کہ صوبیدار انکل کو ابو کہو۔ یوں میں ہمیشہ ہی انہیں استانی جی اور انکل کہتی رہی...... میں پہلی سے دوسری میں آگئی۔ بہنوں کا آنا کم ہوتے، ہوتے ختم ہو گیا

لیکن شاید میرے گھر سے آنے کے بعد اماں نے پھر دانی کے لیے جوڑے کی خواہش دل میں پال لی تھی کہ ایک دن بڑے دنوں بعد فرو آئی تو اس نے استانی جی کو بتایا کہ ان کے گھر بھائی آیا ہے۔

"اماں بہت خوش ہوں گی کہ اب دانی کلا (اکیلا) نہیں رہا تھا۔" میں نے سوچا تھا۔ میرا دل اسے دیکھنے کو چاہ رہا تھا اور میں بار، بار فرو کو دیکھتی تھی کہ وہ مجھے ساتھ لے جائے گی۔ بھائی دکھانے کے لیے لیکن وہ تو استانی کو بتاشے دے کر چلی گئی تھی۔ اسے اور گھروں میں بھی بتاشے بانٹنے تھے۔ اس روز استانی جی بھائی کی مبارک باد دینے گئیں تو مجھے ساتھ لے گئیں...... اور میں اپنے ہی گھر کو حیرت سے تکتی رہی۔ جیسے صحن کے کونے میں رکھے اپلوں کے ڈھیر کو چھت کی طرف جاتی سیڑھیوں کو شانو صحن میں چولہے کے پاس بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی...... دونوں گھروں میں زندگی کتنی مختلف تھی۔ استانی جی نے ساتھ میں اماں کے پاس کمرے میں آئی تھی۔ وہ چارپائی پر لیٹی تھیں اور ان کا رنگ پیلا زرد ہو رہا تھا...... عاشو ان کی چارپائی پر بیٹھی ان کی ٹانگیں دبا رہی تھی۔ دوسری چارپائی پر فرو منے کو گود میں لیے بیٹھی تھی۔ اماں نے ہمیں دیکھ کر اٹھنے کی کوشش کی۔

"ارے، ارے لیٹی رہو زرینہ......" استانی جی نے کہا تھا لیکن اماں پھر بھی اٹھ کر بیٹھ گئی تھیں۔ پتا نہیں کیوں مجھے وہم سا ہوا تھا کہ میری طرف دیکھتے ہوئے اماں کی آنکھوں میں نمی تھی اور انہوں نے بے اختیار ہاتھ آگے کیے تھے اور پھر پیچھے کر لیے تھے۔ میں دوڑ کر اماں سے لپٹ جانا چاہتی تھی۔ ان کی گود میں سما جانا چاہتی تھی لیکن اپنی جگہ ساکت کھڑی رہی۔ اس روز استانی جی نے مجھے گلابی جالی کا پھولا پھولا سا فراک پہنایا تھا جو صوبیدار انکل شہر سے میرے لیے لائے تھے۔ میں نے سفید جرابیں اور سفید ہی شوز پہن رکھے تھے۔ شاید استانی جی مجھے یہ

نئے کپڑے اس لیے پہنا کر لے گئی تھیں کہ اماں کو لگے کہ میں اس گھر کے مقابلے میں اُس گھر میں زیادہ اچھی طرح اور زیادہ خوش ہوں..... اچھی طرح تو تھی لیکن میں زیادہ خوش نہیں تھی اور یہ بات صرف میں جانتی تھی اور میرے ساتھ مسئلہ یہ تھا کہ میں کبھی وہ بات نہ کہہ پاتی تھی جو میرے دل میں ہوتی تھی۔

میری بہنیں مجھے حیرت اور رشک سے دیکھتی تھیں اور مجھے اپنا آپ اس گھر میں بہت اجنبی، اجنبی سا لگتا تھا..... فرو نے مجھے بھائی دکھانے کے لیے بلا لیا تھا۔ وہ بہت چھوٹا سا تھا اور آنکھیں میچے سو رہا تھا۔ میں نے بہت ڈرتے ڈرتے اس کے رخسار پر ہاتھ رکھا تھا اور پھر فوراً اٹھا لیا تھا۔ فرو نے کہا تھا۔

”ہائے بالی تو تو بالکل شہری کڑی لگ رہی ہے۔“ میں چپ چاپ نگاہیں جھکائے بھائی کو دیکھتی رہی تھی۔ جیسے مجھے بولنا نہیں آتا تھا اور مجھے واقعی بولنا نہیں آتا تھا جب استانی جی جا رہی تھیں تو میرا جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا..... میں نے کئی بار الفاظ ترتیب دیے کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر کچھ نہ کہہ سکی..... اور بے بسی سے فرو کو دیکھنے لگی۔

”تھوڑی دیر اور رک جائیں استانی جی، شانو کے ابا آتے ہوں گے وہ بھی بالی سے مل لیں گے۔ یاد کرتے ہیں۔“ اماں لجاجت سے کہہ رہی تھیں۔

مجھے اماں کی بات کا یقین نہیں آیا تھا اگر ابا مجھے یاد کرتے تو ایک گلی کا فاصلہ اتنا طویل تو نہیں تھا کہ استانی جی کے گھر تک نہ آسکتے۔ اماں اب، ہولے، ہولے کچھ کہہ رہی تھیں میں پھر منے کو دیکھنے لگی۔

”اماں بہت بیمار ہوگئی تھیں بالی..... بس مرتے مرتے بچی ہیں۔“ فرو نے مجھے بتایا تھا میں نے مڑ کر اماں کو دیکھا۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہی تھیں یا شاید فرو..... فرو کو ہی دیکھ رہی ہوں گی۔

”نام کیا رکھا ہے؟“ اب استانی جی نے پوچھا تھا۔

”ابھی تو کچھ نہیں رکھا..... آپ بتائیں ناں اچھا سا نام جو دانیال سے ملتا جلتا ہو۔“ اماں کی آنکھیں یک دم لو دینے لگی تھیں، میں نے نظریں ان کے چہرے سے ہٹالیں۔

میرا نام اماں نے اقبال رکھا تھا۔ اب سوچتی ہوں شاید اماں نے پہلے سے ہی دانیال کے ساتھ ملا کر سوچ رکھا ہوگا لیکن جب میں آگئی تو اماں نے میرا ہی نام اقبال رکھ دیا..... لیکن جب استانی نے مجھے اسکول داخل کروایا تھا اور میونسپل کمیٹی سے میرا پیدائش کا سرٹیفکیٹ نکلوایا تھا تو اس میں میرا نام سویرا اقبال لکھا ہوا تھا۔ سو میرا پورا نام سویرا اقبال تھا۔ ضرور سویرا نام کا سابقہ شانو یا عاشو نے میرے نام کے ساتھ لگایا ہوگا اور ابا سے کہا ہوگا کہ یہی نام لکھوائیں۔ خود ان کے بھی تو دو، دو نام تھے۔ عاشو کا عائشہ نسیم، شانو کا رخسانہ جبیں، پنو کا پروین اختر اور فرو کا فریدہ زرین..... اس روز استانی جی ابا کے آنے تک رکی تھیں۔ ابا منہ ہاتھ دھو کر باہر برآمدے میں ہی چارپائی پر بیٹھ گئے تھے۔ فرو میرا ہاتھ پکڑ کر باہر لائی تھی۔

”ابا دیکھیں کون آیا ہے۔“

ابا کی آنکھیں کچھ دیر کو میرے چہرے پر رک گئی تھیں۔

”کیا ابا میری شکل بھول گئے ہیں؟“

”ادھر آ بالی.....“ ابا حیرت کے سمندر سے باہر آئے تھے۔ ”تو ٹھیک ہے ناں..... خوش ہے ناں.....“

میں نے سر ہلا دیا تھا۔

”جی تو نہیں گھبراتا..... گھبرائے تو گھر واپس آجانا۔“ ابا نے اسی روز والی بات دُہرائی تھی اور میرے سر پر ہاتھ پھیرا تھا۔ پتا نہیں کیوں مجھے پھر وہم ہوا تھا جیسے ابا کی آنکھیں پُرنم ہوں اور ان کا ہاتھ لرز رہا ہو۔ میرا جی چاہا تھا کہ میں کہوں ہاں میرا جی گھبراتا ہے، ابا مجھے گھر آنا ہے، مجھے نہیں جانا..... لیکن میں ہمیشہ کی طرح کچھ نہیں کہہ سکی تھی۔ کاش میں رو ہی پڑتی، ابا سے لپٹ جاتی لیکن..... میں تو یہ بھی

نہیں کر سکتی تھی۔ پچو کو کوئی بات اماں سے منوانی ہوتی تھی تو چیخ، چیخ کر روتی تھی۔ زمین پر لیٹ کر لاتیں چلاتی، مچل، مچل کر روتی..... کاش جب استانی جی مجھے لینے آئی تھیں تو میں بھی زمین پر لیٹ جاتی۔ مچل، مچل کر پاؤں رگڑ، رگڑ کر روتی اور ابا، اماں استانی جی کو منع کر دیتے لیکن نہ میں اس روز ایسا کر سکی تھی نہ اب اور استانی جی کے ساتھ ان کے گھر آ گئی تھی۔

اس روز میں نے باری سے بھی بات نہیں کی تھی اور چپکے سے اپنے بستر پر آ کر لیٹ گئی تھی۔ حالانکہ باری نے کہا بھی تھا کہ لوڈو کھیلتے ہیں لیکن میں سوتی بن گئی تھی مجھے بہت رونا آ رہا تھا اور پھر جب میں نے دوسری پاس کر لی تھی تو انصار بھائی بھی ساتویں پاس کر کے آٹھویں میں آ گئے تھے اور صوبیدار انکل چاہتے تھے کہ اب وہ شہر کے کسی اچھے اسکول میں پڑھے۔ چنانچہ استانی جی کھاریاں جانے کی تیاریاں کرنے لگی تھیں اور میں نے باری سے پوچھا تھا۔ "اب تم سب لوگ شہر میں رہو گے؟"

تب باری نے مجھے بتایا تھا۔

"ہاں..... اور تم بھی تو ہمارے ساتھ جاؤ گی..... تمہاری اماں نے تمہیں میری امی کو جو دے دیا ہے۔"

اور میرا دل جیسے ڈوب گیا تھا۔ میری اماں، ابا شالو، عاشو، پچو، فرو، دانی اور چھوٹا جمال جانے سے ایک دن پہلے استانی جی مجھے سب سے ملوانے کے لیے لے گئی تھیں۔ اس روز بھی انہوں نے مجھے عید والی نئی فراک پہنائی تھی۔

"ہم لوگ کھاریاں جا رہے ہیں تاکہ بچوں کو اچھے اسکولوں میں پڑھا سکیں۔ یوں تو آپ نے بالی مجھے دے دی ہے پھر بھی آپ کی چیز ہے سوچا آپ سے اجازت لے لوں..... یہ آپ کی امانت ہے جب کہیں گے لے آؤں گی۔"

"استانی جی کیسی باتیں کرتی ہیں آپ..... اب تو یہ آپ کی بیٹی ہے۔" اماں، استانی جی سے بات کرتے ہوئے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

"پھر بھی بیٹی تو آپ کی ہی ہے ناں زرینہ بہن، میں نے سوچا پوچھ لوں یہ نہ کہیں کہ ہماری بیٹی کو لے کر غائب ہو گئے۔" استانی جی مسکرائیں۔

"خوشی، غمی، عید، بقر عید تو اپنے گاؤں میں کریں گے ناں آپ لوگ؟" اماں کی آواز میں جیسے حسرت سی تھی۔

"ہاں، ہاں کیوں نہیں..... عید، بقر عید تو اپنے گاؤں میں ہی کرنی ہوتی ہے۔"

میں ادھر کی تھی نہ ادھر کی.....

استانی جی کی بیٹی تھی نہ اماں کی..... استانی جی کو مجھ سے ہمدردی تھی، ہمارے درمیان صرف ترس اور ہمدردی کا رشتہ تھا۔

اور اماں کو میری طلب نہیں تھی، میں بے طلب ہی ان کی جھولی میں آ گئی تھی..... مجھے محبت کی طلب تھی۔ جس کا تب مجھے ادراک نہیں تھا اور جب ادراک ہوا تو میرے اندر ناسور ہو گئے تھے کہ میں بن چاہی تھی۔ ایک اور بیٹے کی آرزو میں اماں نے مجھے جنم دیا۔ میں جو پانچویں بچی تھی اور مجھ سے پہلے چار اور بھی تھیں۔ اس لیے اماں مجھے استانی جی کو دے کر بھول گئیں۔ کھاریاں آ کر استانی جی نے مجھے اور باری کو ایک ہی اسکول میں داخل کروایا تھا۔ میں کلاس تھری میں تھی تو وہ فائیو میں..... یہاں پڑھائی تھوڑی مختلف اور مشکل تھی لیکن استانی جی نے میرے اور باری کے لیے ٹیوٹر رکھ لیا تھا۔ انصار بھائی اور ابصار بھائی بھی اکیڈمی جاتے تھے۔ میں ذہین تھی بلکہ اسکول کی ٹیچرز نے ایک بار استانی جی سے پیرنٹس میٹنگ پر کہا تھا کہ آپ کی بیٹی جینئس ہے..... اور استانی نے فوراً تردید کی تھی۔

"نہیں میم، اللہ اس کے ماں، باپ کو زندہ رکھے۔ یہ میری بیٹی نہیں ہے بلکہ ہمارے گاؤں میں

میرے بہت اچھے جاننے والے کی بیٹی ہے۔ پانچ بیٹیاں تھیں ان کی سو یہ ایک میں نے لے لی۔" ٹیچر کی تعریف پر جو میرے اندر خوشی کے چراغ جلے تھے وہ یک دم بجھ گئے۔

یہ وہ جملہ تھا جو وہ اکثر بولا کرتی تھیں۔ جب تک میں ان کے ہاں رہی اس جملے نے سیکڑوں بار مجھے زخمی کیا...... جب بھی کوئی کہتا آپ کی بیٹی بہت خوب صورت ہے، بہت پیاری ہے، ذہین ہے، جواب میں وہ اسی طرح کی یا اس سے ملتی جلتی بات کہتی تھیں۔ یوں میں نہ اماں، ابا کو بھلا پائی نہ استانی جی کو اپنا سکی۔ میں جیسے خلا میں لٹکی ہوئی تھی مگر میں زبان سے کچھ نہ کہہ پاتی حالانکہ میرا جی چاہتا تھا کہ ان سے کہوں مجھے میرے گھر واپس چھوڑ آئیں پر میرے اندر لفظ بنتے اور بگڑتے اور پھر کہیں کھو جاتے تھے۔ میں اس گھر کی فرد ہوتے ہوئے بھی اس گھر کی فرد نہیں تھی۔ اور جس گھر کی فرد تھی انہوں نے مجھے اپنے گھر سے بے دخل کر دیا تھا...... کھاریاں سے جہلم، جہلم سے راول پنڈی ہمارا قیام کئی شہروں میں رہا لیکن ہم پھر کبھی میانے ہزارے نہ گئے حالانکہ استانی جی نے اماں سے کہا تھا کہ "عید، بقر عید تو اپنے گاؤں میں ہی سجتی ہے۔ اجنبی شہروں میں کیسی عیدیں......"

اور ہر عید سے پہلے میں ایسے آس لگا کر بیٹھ جاتی تھی کہ اب استانی جی کہیں گی کہ تیاری کر لو۔ عید کرنے گاؤں جانا ہے.... لیکن ہمیشہ ہی کوئی نہ کوئی مسئلہ ہوتا...... کبھی...... انصار کے امتحان نزدیک ہوتے، کبھی ابصار کے، کبھی صوبیدار انکل کی چھٹی اتنی مختصر ہوتی کہ جا نہ پاتے اور میرے اندر جو دکھوں کا شکوؤں کا ڈھیر لگا تھا ان میں ایک اور دکھ کا اضافہ ہو جاتا۔ پھر ان دکھوں نے لفظوں کا پیراہن پہن لیا...... میں چھٹی میں تھی جب ہماری اردو کی ٹیچر مس ربانی نے ہمیں اپنے والدین پر مضمون لکھنے کے لیے دیا...... مس ربانی ایک کہانی نگار تھیں۔ ان کی کہانیاں مختلف ادبی پرچوں میں چھپا کرتی تھیں۔ لیکن مجھے اس کا علم بہت بعد میں ہوا تھا کہ وہ رائٹر ہیں۔ ان کی عادت تھی۔ وہ لڑکیوں کو آؤٹ آف کورس چیزیں بھی لکھنے کو دیا کرتی تھیں تاکہ ان کی رائٹنگ پاور بہتر ہو جائے تو اس روز جب میں لکھنے بیٹھی تو میری آنکھوں کے سامنے اماں اور ابا آ گئے تھے۔ میں نے لکھا...... میری اماں کو نہ میری طلب تھی نہ چاہ.... مجھے نہیں علم کہ میری اماں کی جب پہلی نظر مجھ پر پڑی ہو گی تو اس نظر میں میرے لیے کیا تھا، محبت یا نفرت.... میرا خیال ہے نفرت...... ناراضی، غصہ...... میرے اندر جے لفظ جیسے پگھل، پگھل کر صفحے پر گر رہے تھے...... اگلے روز مس ربانی نے میری کاپی دیکھی اور پھر اپنے پاس ہی ٹیبل پر رکھ لی تھی۔ باقی لڑکیوں کی کاپیاں انہوں نے واپس کر دی تھیں۔ میں نے ڈرتے، ڈرتے ان سے کاپی مانگی......

انہوں نے بغور مجھے دیکھا۔

"تمہارا مضمون کافی لمبا ہے.... بریک میں آفس میں آنا۔"

اس روز میرے اور مس ربانی کے درمیان ایک ایسے تعلق کی بنیاد پڑی تھی جو آج تک نہیں ٹوٹا...... اس روز انہوں نے میری انگلی تھام کر میری رہنمائی کا فریضہ سنبھال لیا تھا۔

"یہ تم نے خود لکھا ہے یا کہیں سے نقل کیا ہے؟"

"میں نے خود لکھا ہے۔"

میری آنکھوں میں میانے ہزارے سے آنے کے بعد پہلی بار آنسو آئے تھے۔

"میرے پاس اپنے والدین پر لکھنے کے لیے یہی کچھ تھا۔" اس روز استانی جی والی ڈیوٹی میں نے سنبھالی تھی اور مس ربانی کو وہی بتایا تھا جو استانی جی دوسروں کو بتاتی تھیں۔

"تمہاری تحریر بہت خوب صورت ہے، میرا

دل کہتا ہے تم ایک دن بہت بڑی رائٹر بنو گی۔" وہ مسکرائی تھیں۔

پھر انہوں نے مجھے بچوں کی کہانیاں پڑھنے کو دیں۔ وہ اخبار میں سے بچوں کا صفحہ میرے لیے لے کر آتی تھیں۔ انہوں نے مجھے کہانی لکھنے پر اکسایا...... اور چھٹی جماعت میں ہی میں نے بچوں کے لیے کہانی لکھی اور مس ربانی کو دی جو انہوں نے بچوں کے ایک میگزین میں چھپوا دی۔ یوں یہ سلسلہ چل پڑا..... پھر میں نے ساتویں میں نظم لکھی...... مائی مدر......

مس ربانی نے اس کی تصحیح کر کے چھپوا دیا۔ پھر میں نے اردو میں بھی نظمیں لکھنی شروع کر دیں۔ مس ربانی نے ہر، ہر لمحہ مجھے گائیڈ کیا۔ میٹرک تک یہ راز صرف میرے اور مس ربانی کے درمیان رہا۔ میں نے باری کو بھی اس کے متعلق نہیں بتایا۔ جس کے ساتھ میں اب اکثر باتیں شیئر کرنے لگی تھی لیکن اب بھی زیادہ وہ ہی بولتا تھا، میں تو صرف سنتی تھی...... میں جب نائنتھ میں آئی تو وہ میٹرک کر کے کالج میں داخل ہو چکا تھا۔ یوں اسکول کا ساتھ چھوٹ چکا تھا۔ اس نے میٹرک تک اسی اسکول میں پڑھا تھا جس میں ابھی میں پڑھ رہی تھی..... میں نے میٹرک میں پہلی غزل کہی...... وہ کوئی خاص تو نہیں تھی اور اس کے ایک دو مصرعے بے وزن تھے لیکن ایک بار پھر مس ربانی میری راہبر بن گئی تھیں۔

انہوں نے میری غزلوں کی اصلاح کی اور وہ ادبی پرچوں میں ان کے توسط سے چھپنے لگیں تو جب میں میٹرک میں تھی تو میں نے باری کو بھی اس راز میں شریک کر لیا تھا...... باری کو یقین نہیں آتا تھا۔

"یہ تم نہیں ہو سکتیں ویرا....." یہاں اس گھر میں مجھے بالی کے بجائے سب سے پہلے باری نے ہی ویرا کہنا شروع کیا تھا اور پھر سب ہی ویرا کہنے لگے تھے۔

"یہ میں ہوں، لیکن تم استانی جی کو مت بتانا....."

"اچھا اس جیسا ایک مصرعہ کہو۔ میرا مطلب ہے مصرعہ طرح میں دیتا ہوں۔

ابھی، ابھی وہ گیا ہے مگر زمانہ ہوا"

"جدائیوں میں تو پل بھر گزرنا مشکل ہے
ابھی، ابھی وہ گیا ہے مگر زمانہ ہوا
جو شاخ جھک نہیں سکتی وہ ٹوٹ جاتی ہے
سنبھل کے ہاتھ بڑھانا اگر جھکانا ہوا"

"گریٹ..... مجھے یقین نہیں آ رہا...... ٹیچرز تمہارے متعلق صحیح کہتی تھیں کہ تم جینئس ہو۔" اس روز اس نے میری اب تک کی چھپی ہر چیز دیکھی اور پڑھی تھی...... اور مجھے بے اندازہ سراہا تھا۔

اس روز پہلی بار مجھے اپنا آپ تھوڑا معتبر لگا تھا اور مجھے مس ربانی کی بات سچ لگی تھی کہ اللہ اپنی مصلحتوں کو بہتر جانتا ہے۔ اگر میں وہاں ہی ہوتی میانے ہزارے میں اپنی اماں کے گھر تو شاید اس وقت میری زندگی کا رنگ مختلف ہوتا...... اور مجھے لگا جیسے دل میں چھپے دکھ کے کانٹے کی چبھن کچھ کم ہو گئی ہے...... اور میں نے سوچا جب بھی ہم میانے ہزارے جائیں گے تو اماں، ابا اور باقی سب مجھے دیکھ کر کس قدر حیران ہوں گے اور جب میں انہیں بتاؤں گی کہ میرا لکھا اخباروں اور رسالوں میں چھپتا ہے تو کسی کو یقین نہیں آئے گا لیکن تب مجھے علم نہیں تھا کہ میں اب میانے ہزارے کبھی نہیں جاؤں گی۔

جس روز انصار بھائی کی پاسنگ آؤٹ پریڈ تھی اس روز کالج سے واپسی پر استانی جی اور صوبیدار انکل میانے ہزارے چلے گئے تھے۔ وہاں اپنا آبائی گھر اور زمین بیچ کر آئے تو سیالکوٹ میں اپنا گھر لے لیا اور باقی کی رقم بینک میں محفوظ کر دی۔ ان دنوں ہم سیالکوٹ میں رہ رہے تھے اور یہاں رہتے ہمیں پانچ سال ہو رہے تھے۔ اس لیے مستقل رہائش کے لیے بھی سیالکوٹ کو ہی منتخب کیا گیا تھا...... یوں بھی ابرار، ابصار اور میں ہم تینوں ہی یہاں کے اسکول اور کالجز میں پڑھ رہے تھے۔ ابصار کا ارادہ بھی آرمی میں

جانے کا تھا۔ البتہ ابرار نے ابھی تک فیصلہ نہیں کیا تھا کہ وہ کیا کرے گا۔ وہ ایف۔ ایس۔ سی کر رہا تھا۔

"تو اب میں کبھی میانے ہزارے نہیں جاسکوں گی اور کبھی اپنے ماں، باپ کا گھر دوبارہ نہیں دیکھ سکوں گی......" سب کے دھندلے دھندلے سے چہرے میری آنکھوں کے سامنے آرہے تھے...... میرے اندر سات سال سے جو آس کا دیا جل رہا تھا وہ ایک دم بھڑک کر بجھ گیا تھا۔ میری آنکھوں میں دھول اڑ رہی تھی اور اندر جیسے گہرا اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ میں اس وقت اوپر چھت پر جانے والی سیڑھیوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ کچھ دیر پہلے ہی مجھے استانی نے بتایا تھا کہ انہوں نے میانے ہزارے والا گھر اور زمین بیچ دی ہے اور انہوں نے بتایا تھا میرے گھر میں سب بھلے چنگے ہیں...... اور یہ کہ شانو اور عاشو دونوں کی شادیاں ہوگئی ہیں۔ میں چڑیا کے بھوکے پیاسے بچوں کی طرح منہ اٹھائے ان کی طرف دیکھ رہی تھی کہ ابھی وہ بتائیں گی کہ اماں مجھے یاد کرتی ہیں...... بخشن اداس ہیں، میرا ویرا دانی اور میرے ابا بھی مجھے بہت یاد کرتے ہیں لیکن چڑیا کے بچے چونچ کھولے بیٹھے رہے اور چڑیا ان کی چونچ میں دانہ ڈالے بغیر اڑ گئی۔ استانی جی ابصار کے ساتھ مکان دیکھنے چلی گئیں۔ صوبیدار انکل ڈیوٹی پر تھے اور ابرار پتا نہیں کہاں تھا۔ میرے غم کی شدت اتنی تھی کہ میں ہولے، ہولے سیڑھیوں کی دیوار کے ساتھ سر مارنے لگی۔

جب ابرار گھر میں داخل ہوا تھا۔

"کتنی دفعہ کہا ہے ویرا...... جب امی وغیرہ گھر پر نہیں ہوں تو دروازہ بند کرلیا کرو۔"

وہ مجھے دور سے ہی دیکھتا اور بولتا ہوا قریب آیا تھا اور پھر مجھے دیوار کے ساتھ سر مارتے ہوئے دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔

"یہ، یہ کیا کررہی ہو ویرو......" اس نے مجھے روکا...... میری آنکھوں میں وحشت تھی۔ میں نے ایک بار پھر سر دیوار میں مارا تھا۔ میرے ماتھے پر گومڑ بن گیا تھا لیکن مجھے درد کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ وہ درد اس سے کہیں زیادہ تھا جو میرے اندر تھا۔

"مت کرو، ایسا ویرا۔" اس نے پریشان ہوکر مجھے روکا۔

پھر وہ میرے پاس ہی سیڑھیوں پر بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا ہے، کیوں کررہی ہو ایسا...... ویرا مجھے بہت تکلیف ہورہی ہے۔" اس نے میرے ہاتھ تھام لیے۔

میری عمر سولہ سال تھی اور جو درد میرے دل میں اترا تھا وہ مجھ سے سہا نہیں جا رہا تھا۔ میں لاشعوری طور پر اس درد کو کم کرنے کے لیے جو اندر وجود کو کاٹ رہا تھا...... خود کو تکلیف دے رہی تھی لیکن اندر درد تو ایسا ہی تھا اور باہر کی تکلیف محسوس نہیں ہورہی تھی...... اس روز باری نے جس طرح میرے درد کو اور میری تکلیف کو محسوس کیا تھا اس سے میرے اور باری کے درمیان ایک نئے رشتے کی بنیاد پڑی تھی۔ محبت کے رشتے کی...... لیکن تب میں اس بات سے بے خبر تھی کہ میرے اور باری کے درمیان یہ کیسا بندھن بندھا ہے۔ میری آنکھیں آنسوؤں سے خالی تھیں لیکن میرے قلم نے اس رات آنسو بہائے تھے اور جب میں نے اپنی تخلیقات مس رہائی کو دکھائی تھیں تو مس رہائی نے حیرت اور خوشی سے مجھے گلے لگالیا تھا۔

"تم ایک دن بڑا نام کماؤ گی سویرا۔" اور ایسا ہی ہوا تھا۔ انیس سال کی عمر میں میرا پہلا مجموعۂ کلام تشنہ لب، جب منظر عام پر آیا تھا تو اسے جو پذیرائی ملی اس نے مجھے حیرت زدہ کردیا...... یہ سب مس رہائی کی کوششوں سے ہوا تھا۔ مجھے تو کچھ علم نہیں تھا۔ میں نے تو بس اپنا سارا کلام اکٹھا کر کے انہیں دے دیا تھا۔ مس رہائی چاہتی تھیں کہ کتاب کی تقریب رونمائی ہو اور میں بھی اس میں شرکت کروں لیکن میں نے منع

کر دیا۔ میں بہت خوف زدہ تھی۔ ابھی تک استانی جی اور صوبیدار انکل نہیں جانتے تھے کہ میں نہ صرف شاعری کر رہی ہوں بلکہ میری ایک کتاب بھی چھپ چکی ہے۔ میں نہیں جانتی تھی کہ ان کا ردِعمل کیا ہوگا...... ہوسکتا ہے انہیں یہ سب اچھا نہ لگے لیکن ایسا نہیں ہوا تھا جب باری نے استانی جی اور انکل کو بتایا تو سب نے حیرت بھری خوشی کا اظہار کیا تھا۔

"ارے، مجھے تو پہلے ہی پتا تھا کہ میری بچی بہت جینئس ہے۔" یہ استانی جی تھیں۔ میں چپ بیٹھی تھی۔

"ارے واہ...... ہماری بہنا تو چھپی رستم نکلی۔"

انصار بھائی بھی ان دنوں چھٹی پر آئے تھے۔

ان کی شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ انصار بھائی کی بھی منگنی ہو گئی تھی۔ انصار بھائی کی شادی کسی کرنل کی بیٹی سے ہو رہی تھی...... شادی میں سگی بہنوں کی طرح ہی مجھے نیگ ملے...... استانی جی نے ہر فنکشن کے لیے بہترین لباس تیار کروایا...... بلکہ شروع سے لے کر اب تک انہوں نے اچھا کھلایا، اچھا پہنایا، بہترین اداروں میں تعلیم دلوائی پھر بھی میرے اندر کیسی تشنگی تھی اور کتنی پیاس تھی...... میرے اندر ہر وقت کن من ہوتی رہتی تھی۔ میں کیا چاہتی تھی، کبھی کبھی تو مجھے سمجھ نہیں آتا تھا...... میں نے کبھی خوشی کو خوشی کی طرح محسوس نہیں کیا تھا۔ پھر بھی محبت کی ایک کونپل میرے اندر پھوٹ چکی تھی۔

باری کی محبت کی کونپل لیکن مجھے اس کا کبھی احساس نہیں ہوا تھا کہ یہ محبت ہے۔ باری میرا خیال رکھتا تھا۔ ہم گھنٹوں باتیں کرتے تھے لیکن نہ کبھی اس نے اور نہ میں نے اس سے کہا کہ مجھے تم سے محبت ہے۔ ہماری گفتگو اب زیادہ تر میرے کلام اور میری کہانیوں پر ہوتی تھی جو تو اتر سے چھپ رہی تھیں۔ نقاد میری کتاب پر تبصرہ کر رہے تھے۔ اکثر مضامین مجھے مس ربانی بھجوا دیا کرتی تھیں۔ چونکہ مجھے اب اسکول چھوڑے چار سال ہو چکے تھے اور میری ملاقات کم، کم ہو پاتی تھی۔ ہاں فون پر رابطہ رہتا تھا...... ایک روز انہوں نے مجھے مشاعرے کا دعوت نامہ بھجوایا...... لیکن باری نے مجھے منع کر دیا۔

"تم مشاعرے میں نہیں جاؤ گی ویرا......

وہاں لوگ تمہارے سامنے واہ، واہ کریں گے اور تمہاری عدم موجودگی میں تمہاری ذات پر تبصرہ کریں گے...... یہ لوگ خواتین شاعرات کے ساتھ فیئر نہیں ہوتے ...... عزت نہیں کرتے اور پھر خواہ مخواہ اسکینڈل بن جاتے ہیں۔"

"تم چاہتے ہو میں نہ لکھوں......؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں...... میں ایسا نہیں چاہتا...... تم لکھو، تمہارے اندر ٹیلنٹ ہے اسے ضائع مت کرو لیکن مشاعروں وغیرہ میں شرکت نہیں کرو۔"

"ٹھیک ہے......" میں نے دعوت نامہ پھاڑ دیا۔ اور پھر میں نے کبھی کسی مشاعرے میں شرکت نہیں کی۔ اندازے لگانے والوں نے اندازے لگائے۔

سویرا اقبال کسی کنزرویٹو فیملی سے تعلق رکھتی ہے، وہ بدصورت ہے۔ نقاد میری تحریروں پر تبصرہ کرتے ہوئے میری ذات کے متعلق کچھ نہ کچھ جملے لکھ دیتے تھے۔ کسی نے لکھا۔ میرا بیک گراؤنڈ مشکوک ہے، شاید اس لیے میں نے آج تک انٹرویو نہیں دیا۔

کسی نے میرے ماضی کو شرمناک کہا۔ کسی نے کہا کہ سویرا اقبال فرضی کردار ہے، پس پردہ کوئی اور ہے لیکن مجھے ایک بڑی شاعرہ قرار دینے والوں کی بھی کمی نہیں تھی...... جو میری ذات کو الگ کر کے میری تحریر دیکھتے تھے......

میری کتاب کو آدم جی ادبی انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ کئی دوسری تنظیموں نے بھی ایوارڈ دیے۔

میرے سب ایوارڈ مس ربانی نے ہی وصول کیے تھے۔ اکیس سال کی عمر میں میری دوسری کتاب ہجر بھی آگئی تھی۔ پہلی کتاب کے ان دو سالوں میں کئی ایڈیشنز آ چکے تھے اور میرے اندر عجب بے کلی سی

تھی ایک بار ہاری نے کہا تھا۔
"ویرا.....تمہارا دل چاہتا ہے میانے ہزارے جانے کو تو میں تمہیں لے چلتا ہوں۔ سب سے مل آؤ گی تو یہ بے کلی ختم ہو جائے گی۔"
میرے اندر سے ہاں، ہاں کی آواز آرہی تھی لیکن لب خاموش تھے..... میرے اندر ہاں اور نہ کی جنگ شروع ہو گئی تھی پھر انا کی اس جنگ میں طلب اور محبت ہار گئی۔ انا اور خودداری جیت گئی۔ انہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔ میری طلب نہیں..... بہنوں کی شادیوں پر اماں نے جھوٹے منہ بھی نہیں پوچھا۔ کیا تھا اگر وہ مجھے بلا لیتیں..... کتنا شوق ہوتا ہے ناں بہنوں کی شادیوں میں شریک ہونے کا لیکن دل کے اندر جیسے بہت سارے دیے جل کر بجھ گئے تھے۔
"نہیں..... میرا نہیں جی چاہتا۔" میں نے سارے آنسو اپنے اندر اتار لیے تھے۔ میں نے بی اے کیا اور پھر ماسٹر کیا پبلک سروس کمیشن کا امتحان دیا اور پہلے ایس۔ ایس ٹی پر تقرری ہوئی پھر ایک مڈل اسکول میں ہیڈ مسٹریس کی سیٹ ملی۔ استانی جی کے گھر میں سب ہی خوش تھے۔ میری کامیابیوں پر..... ہاری بھی اب اچھی پوسٹ پر تھا..... اور گھر میں اس کی شادی کی باتیں ہو رہی تھیں لیکن مجھے اس کا علم نہیں تھا۔ اس روز ہاری میری نظم مراجعت پر تبصرہ کر رہا تھا۔
"تمہاری اس نظم میں تڑپ ہے اپنے اصل کی طرف واپس پلٹ جانے کی۔"
"ہاں شاید۔"
"شاید نہیں یقیناً۔" وہ مسکرایا تھا۔
"مراجعت میں ہی نہیں کئی اور چیزیں بھی ہیں' تمہاری ایسی جن میں میانے ہزارے سے بچھڑنے کا دکھ ہے۔ واپس جانے کی تڑپ ہے، تم صرف نو سال کی تھیں تب لیکن تم میانے ہزارے کو نہیں بھولی ہو۔"
"میانے ہزارے" صرف ایک گاؤں نہیں ہے..... اس گاؤں میں میرے اماں، ابا، بہنیں اور بھائی ہیں۔ اس گاؤں سے تو خون کے رشتے جڑے ہیں ہاری۔" میں نے سوچا تھا لیکن کہا نہیں تھا۔
"اس گھر میں تمہیں اتنی محبت ملی..... امی، ابو نے ہمیشہ تمہیں بیٹی سمجھا ہے۔ کبھی تم میں اور ہم میں فرق نہیں کیا۔"
"محبت.....؟" میں نے خالی، خالی نظروں سے ہاری کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلایا۔
"نہیں..... محبت نہیں، ترس، ہمدردی....." جانے کب کا دبا ہوا لاوا ابھی نکلا تھا۔
"کیا صرف ترس اور ہمدردی میں کوئی اس طرح کرتا ہے..... اتنا.....؟" ہاری کی آنکھوں میں حیرت تھی۔
"امی تمہارا کتنا خیال کرتی ہیں..... اور ابو وہ تمہیں کتنا چاہتے ہیں۔"
"ہاں..... یہ سچ ہے، استانی جی نے میرا ہمیشہ خیال رکھا..... لیکن انہوں نے مجھ سے محبت نہیں کی..... انہوں نے مجھے اپنی بیٹی کی طرح رکھا..... کھلایا، پلایا لیکن بیٹی سمجھا نہیں..... مجھ پر ان کے احسانوں کا بوجھ ہے..... انہوں نے ہمیشہ سب سے یہی کہا کہ میری اماں کی پانچ بیٹیاں تھیں اور مجھ پانچویں کو اماں بلاوجہ مارتی تھیں۔ اس لیے وہ مجھے اپنے ساتھ لے آئیں۔" میری آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔
"استانی جی کہتی ہیں، میں جب پیدا ہوئی تو میری اماں کو میری ضرورت نہ تھی۔ انہیں تو دانی کے لیے بھائی چاہیے تھا..... اور استانی جی کو بھی میری ضرورت نہیں تھی..... وہ صرف مجھے اماں کی ناراضی اور غصے سے بچانے کے لیے اپنے ساتھ لے آئی تھیں اور پھر..... نیکی کمانے لگیں۔ میں کہیں بھی کسی کو بھی مطلوب نہیں تھی نہ ہوں ہاری۔"
"تم.....تم مجھے مطلوب ہو ویرا....." ہاری نے

بے اختیار میرے ہاتھ تھام لیے تھے۔

"میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اتنی محبت کہ تم اندازہ بھی نہیں کرسکتیں---- ہر رات سونے سے پہلے میں اللہ سے دعا کرتا ہوں...... اللہ مجھے سویرا کو دے، دے۔ اسے میرا رفیق بنادے...... میں، میں تمہیں چاہوں گا ویرا...... اتنا کہ تم میری محبتوں سے اکتا جاؤ گی، تھک جاؤ گی۔"

"محبتوں سے کبھی کوئی اکتایا ہے ہاری؟" میری آواز میں لرزش تھی۔ میں نے آہستہ سے اپنے ہاتھ چھڑائے۔

"ہاں، محبتوں سے کبھی کوئی نہیں اکتایا ویرا......" پہلی بار وہ اظہار کررہا تھا اور میرے اندر کا خلا جیسے بھرتا جارہا تھا اور دل کی پیاسی زمین سیراب ہورہی تھی۔ وہ شاعر یا ادیب نہیں تھا لیکن اس کے پاس اظہار کے اتنے خوب صورت لفظ ہوں گے۔ مجھے یقین نہیں تھا۔

ایک بار اس نے اپنے جذبوں کا اظہار کیا کیا تھا کہ اب تو آتے جاتے اس کی آنکھیں جذبے لٹاتیں۔ جب بھی وہ اور میں اکٹھے ہوتے، میری شاعری پر بات کرتے، کرتے وہ موضوع سے ہٹ جاتا۔

"ویرا تمہیں پتا ہے تم کتنی خوب صورت ہو..... لیکن تمہارا حسن ایک دم تو پہلی نظر میں دل میں نہیں کھبتا، ہولے، ہولے سر چڑھ کر بولتا ہے۔ پہلے یہ قاتل آنکھیں قتل کرتی ہیں پھر یہ پلکوں کے بھالے دل میں کھب جاتے ہیں اور پھر یہ دلکش ہونٹ اپنی رعنائیاں......"

"تمہیں تو ادیب یا شاعر ہونا چاہیے تھا ہاری۔" میں ہنسی۔

"میری بیوی شاعر ہوگی---- کیا یہ کافی نہیں ہے۔" اس کی نظریں میرا طواف کرتیں۔ ان دنوں میں اتنی خوش تھی جتنی کبھی نہیں تھی---- اور ان دنوں میری شاعری میں بھی تبدیلی آئی تھی۔ اب اس میں محبت کی میٹھی، میٹھی کسک بھی شامل ہوگئی تھی۔ مستقبل کے خواب تھے اور امیدوں کے جگنو تھے۔

"شادی کے بعد میں تمہیں میانے ہزارے لے چلوں گا۔"

"سچ......" میرے اندر چراغاں ہوگیا تھا۔

"کب......؟"

"تمہیں بہت جلدی ہے۔" وہ شرارت سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

میں دل کی بات کسی سے نہیں کہتی تھی اندر ہی اندر دفن کرلیتی تھی لیکن اب ہاری سے ہر بات کہنے لگی تھی۔

"چند دنوں کے لیے کراچی جارہا ہوں، واپس آکر طے کرتے ہیں کہ کب...... ویسے امی سے بات ہوگئی ہے، انہیں اعتراض نہیں ہے۔"

اور ہاری کراچی چلا گیا...... ادھر میرے ٹرانسفر کے آرڈرز آگئے...... ایک قریبی قصبے میں ایک پرائمری اسکول کو مڈل اسکول کا درجہ دیا گیا تھا اور مجھے وہاں بھیجا جارہا تھا۔ اس اسکول کی ہیڈ بنا کر...... میں نے ہاری کو فون کیا۔

"کوئی ضرورت نہیں کہیں جانے کی ریزائن دے دو اور یوں بھی میں بلاضرورت خواتین کی جاب کو پسند نہیں کرتا---- ہاں اگر تم کرنا چاہو تو منع بھی نہیں کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" مجھے ہاری کی بات سے کوئی اختلاف نہیں تھا۔ پھر بھی میں نے سوچا مجھے استانی جی کو بتانا چاہیے کہ میں جاب چھوڑنا چاہتی ہوں۔ اس روز میں بریک میں گھر آگئی تھی۔ استانی جی کے پاس ان کی کوئی پرانی کولیگ آئی ہوئی تھیں۔

"ارے ہاں، تم نے پھر ہاری کے لیے لڑکی پسند کرلی۔ اگر نہیں کی تو ایک لڑکی ہے، میری نظر میں۔" میں نے اپنے کمرے کی طرف جاتے، جاتے سنا اور غیر ارادی طور پر اپنے کمرے کے

دروازے کے پاس ہی رک گئی۔

''لڑکی تو گھر میں ہی تھی، میں خواہ مخواہ ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔''

استانی جی ہنسیں۔

''کون تمہاری بھابھی......؟''

''ارے نہیں، اپنی سویرا، ماشاء اللہ اچھی سگھڑ، سلیقہ مند، ذہین، پورا گھر سنبھالا ہوا ہے اس نے...... پہلے کئی بار ذہن میں آیا تھا۔ ابصار سے تو پوچھا بھی تھا میں نے لیکن اس نے کہا وہ سویرا کو سگی بہن سمجھتا ہے۔ ایک ساتھ پل کر بڑے ہوئے ہیں تو میں نے سوچا ہاری بھی ابصار کی طرح...... لیکن پھر ہاری نے خود مجھے کہا کہ وہ سویرا سے شادی کرنا چاہتا ہے تو......''

''اور بھائی صاحب کو اعتراض نہیں ہوا؟''

استانی جی کی کولیگ پوچھ رہی تھیں۔

''نہیں بھلا انہیں کیا اعتراض ہونا تھا۔ ظاہر ہے باہر سے جو آئے گی وہ نہ جانے کیسی ہو...... یہ اپنی دیکھی بھالی ہے۔ اور پھر لاکھوں میں ایک......''

استانی جی نے جواب دیا تھا۔

''تم نے بھی ایک ناتراشیدہ پتھر کو تراش کر ہیرا بنا دیا ہے۔ چلو جہاں اتنے احسان کیے ہیں اس پر وہاں بہو بنا کر ایک اور...... احسان سہی...... ورنہ ہاری کے لیے بڑے، بڑے خاندانوں......'' اور میں باقی بات سنے بغیر اپنے کمرے میں آ گئی۔

''احسان......'' میرے لبوں سے نکلا......

میرے اندر چند لمحوں پہلے جو گلستان آباد ہوا تھا وہ یک دم اُجڑ گیا تھا۔ جیسے آسمانی بجلی گر پڑی ہو یا اندر دھول اڑ رہی تھی اور آنکھوں میں وحشت تھی۔ کتنی ہی دیر تک میں یونہی ساکت بیٹھی رہی۔

''نہیں مزید احسان نہیں......'' بڑی دیر بعد میرے لبوں سے نکلا تھا اور میں جو پورا ایک گھنٹا اپنی ٹرانسفر کروانے کی خاطر ڈی ای او سے بحث کر کے آئی تھی...... انہیں فون کر کے کہہ رہی تھی۔

''ٹھیک ہے میم، میں جانے کے لیے تیار ہوں۔'' مجھے اب اپنے گلے میں مزید احسانوں کا طوق نہیں ڈالنا تھا۔ مجھے ہاری سے شادی نہیں کرنا تھی۔ میں نے فیصلہ کر لیا تھا لیکن یہاں رہ کر میں ہاری کی محبتوں سے دامن نہیں چھڑا سکتی تھی۔ اس کی محبت مجھے کمزور کر دیتی اور میں ایک اور احسان کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھانے کے لیے مجبور ہو جاتی۔ میری گردن پہلے ہی احسانوں کے بوجھ سے جھکی ہوئی تھی۔

مجھے ایک ہفتے بعد جوائن کرنا تھا لیکن میں اگلے ہی دن جانے کے لیے تیار ہو گئی کیونکہ میں ہاری کے آنے سے پہلے جانا چاہتی تھی۔ میں نے استانی جی سے اجازت نہیں مانگی تھی صرف مطلع کیا تھا۔ وہ پریشان ہو گئیں۔

''لیکن ویرا وہاں اکیلے کیسے رہو گی...... تمہارے انکل کسی سے بات کرتے ہیں ٹرانسفر رکوانے کی۔ انصار اور ابصار سے بات کرتی ہوں، اگر کچھ نہیں ہو سکتا تو جاب چھوڑ دو کیا ضرورت ہے۔''

''آپ پریشان نہ ہوں، استانی جی میں اب بچی نہیں ہوں...... وہاں اسکول کے ساتھ ہی ہیڈ کی رہائش کے لیے کوارٹر بنا ہوا ہے۔''

''لیکن پھر بھی ویرا...... میرا دل نہیں مانتا......'' وہ ہنوز پریشان تھیں۔ ''خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو میں تمہارے والدین کو کیا جواب دوں گی۔''

''میرے والدین......؟'' میرے اندر کڑواہٹ پھیل گئی۔

''وہ آپ سے کچھ نہیں کہیں گے کیونکہ برسوں پہلے وہ مجھ سے دستبردار ہو گئے تھے۔'' میری آنکھوں میں کنکر چبھنے لگے تھے۔ میں نے سوچا تھا میں بغیر بتائے چلی جاؤں لیکن وہ میرے سرپرست تھے...... مجھے بہرحال انہیں بتانا چاہیے تھا۔

ہاری کو پتا چلا تو وہ اسکول سے پتا لے کر بھاگتا

چلا آیا۔

"یہ کیا حماقت ہے ویرا......؟"

"حماقت......نہیں تو......" میری آنکھوں کے خالی پن نے باری کو چونکا دیا۔

"کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں......" میں نے نظریں چرائی تھیں۔

"میں تھک گئی ہوں......" میری جلتی ہوئی آنکھوں میں چبھن تھی۔

"مزید احسانوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ ان احسانوں کے بوجھ سے میری گردن جھک کر ٹھوڑی سے آ لگی ہے، اب ٹوٹ جائے گی۔ میں نے استانی جی کا گھر چھوڑ دیا ہے۔ مجھ پر ان کے احسانوں کا بوجھ ہے۔ میری گردن اس بوجھ سے ہمیشہ جھکی رہے گی......لیکن مجھ پر ان کی محبت کا بوجھ نہیں ہے۔ احسانوں کا بدلہ اتارا جا سکتا ہے ناں باری لیکن محبت کا نہیں......اور میرا رُواں، رُواں ان کا احسان مند ہے......میں ساری زندگی ان کی خدمت کر کے بھی ان احسانوں کا بدلہ نہیں چکا سکتی کہ انہوں نے مجھ بے مایہ، حقیر کو میانے ہزارے کے کچے ویہڑے سے اٹھا کر کیا سے کیا بنا دیا......میں جو کچھ ہوں ان کی وجہ سے ہوں......لیکن مجھے اپنے دل پر اختیار نہیں ہے......میں وہاں رہ کر اپنے دل کو......روک نہیں سکوں گی......تم نے مجھے کیوں چاہا......باری......کیوں محبت کی؟"

وہ چپ چاپ بیٹھا سنتا رہا......بڑی دیر بعد اس نے سر اٹھایا۔ "میں تم سے محبت کرتا ہوں سویرا۔" اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ "اور تم......کیا تم مجھ سے محبت نہیں کرتیں......؟" میں نے سر جھکا لیا۔

"میں ہوش سنبھالنے کے بعد سے محبت ہی کے لیے تڑپ رہی ہوں۔ اماں، ابا کی محبت کے لیے......استانی جی اور انکل کی محبت کے لیے......اور پھر اللہ نے بِن مانگے ہی میری جھولی میں محبت ڈال دی۔ ایسی محبت جس کی میں نے طلب نہیں کی تھی......اور اس محبت نے میرے اندر رنگ بکھیر دیے، روشنیاں پھیلا دیں لیکن......" میں نے ایک گہری سانس لے کر جھکا ہوا سر اٹھایا۔ وہ بے چینی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔

"بولو ناں......بولتی کیوں نہیں ہو......کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔"

مجھے اس سے محبت تھی......ہے......اور ہمیشہ رہے گی لیکن میرے اندر جو ایک پہاڑ سا اٹھ آیا تھا......انا کا پہاڑ یا پھر......پتا نہیں کیا......اس نے میرے لب سی دیے تھے۔ میں محبت کو محبت کی طرح قبول کرنا چاہتی تھی......احسان کی طرح نہیں۔

"اپنے ساتھ یہ ظلم مت کرو ویرا......میں جانتا ہوں تم میرے بغیر رہ نہیں سکو گی۔"

"اتنے سارے سال بھی تو محبت کے بغیر گزارے ہیں۔"

"ٹھیک ہے تم رہ لو گی لیکن میں نہیں......" وہ روہانسا ہو رہا تھا۔

"سنو ہم دونوں کہیں الگ رہ لیں گے جہاں تمہیں یہ نہ لگے کہ تمہیں چاہت سے اس گھر میں نہیں لایا جا رہا بلکہ احسان کر کے......"

"تم مجھے ایسا سمجھتے ہو باری؟" مجھے افسوس ہوا تھا۔ "استانی جی کے احسانوں کا بدلہ میں ان کا بیٹا چھین کر دوں۔"

اور وہ چلا گیا......مجھے پتا تھا کہ وہ پھر آئے گا۔ دو روز بعد وہ پھر آ گیا......اور وہ آتا رہا حتیٰ کہ میں ہار جاتی......میں اس کے سامنے کمزور پڑنے لگی تھی۔

"اچھا ایسا کرو میانے ہزارے چلی جاؤ......میں وہاں سے تمہیں پوری چاہت کے ساتھ بیاہ کر لے آتا ہوں۔" اس روز جب وہ آیا تھا تو اس نے کہا تھا۔

لیکن میں کیوں جاتی میانے ہزارے وہاں کسی کو میری چاہ نہیں تھی......اماں نے خود مجھے دے دیا

تھا اور پھر کبھی پلٹ کر پوچھا تک نہیں کہ میں زندہ بھی ہوں یا نہیں..... جب سے میں نے جاب کی تھی کئی بار سوچا تھا کہ کسی روز دین پر بیٹھوں اور چپکے سے میانے ہزارے میں دین محمد زمیندار کے گھر کا دروازہ کھول کر اس بڑے سے کچے صحن میں پہنچ جاؤں اور جہاں چارپائی پر بیٹھے حقہ پیتے ابا مجھے دیکھ کر حقہ پینا بھول جائیں اور چولہے کے پاس بیٹھی گیلی لکڑیوں کو پھونکیں مارتی اماں کی آنکھوں میں حیرت اتر آئے اور میری بہنیں اور بھائی قطار بنا کر حیرت سے مجھے دیکھیں..... لیکن میں بھلا کیوں جاتی..... انہیں کب میری طلب یا چاہت تھی اور میرے اندر جو انا کا پہاڑ ایک روز آپوں آپ کھڑا ہو گیا تھا وہ ہر روز پہلے سے بڑا ہوتا جاتا تھا۔ ہر روز میں سونے سے پہلے میانے ہزارے جانے کا ارادہ کرتی اور ہر روز صبح اٹھنے پر میری انا مجھے کچوکے مارتی اور میں خود سے کہتی۔ نہیں مجھے نہیں جانا..... سو میں نے سوچا وہ آتا رہتا تو ایک روز میں انس کی محبت کے سامنے کمزور پڑ جاتی یا اپنی محبت کے سامنے سو میں نے دو ماہ کی چھٹی لی اور مس ربانی کے پاس لاہور چلی آئی۔ مس ربانی جو ریٹائرمنٹ کے بعد لاہور سیٹل ہو گئی تھیں جو میری محسن تھیں، میری استاد تھیں..... اور جنہوں نے ابھی تک میری انگلی پکڑی ہوئی تھی پھر ان کی ہی کوشش سے میں نے کسی اور جگہ ٹرانسفر کروا لیا۔ مس ربانی نے مجھے سمجھایا۔

"محبت سے منہ موڑ کر دکھ پاؤ گی۔ وہ لوگ جنہیں تم چھوڑ آئی ہو، انہوں نے ہی تمہیں اس مقام تک پہنچایا ہے..... صرف ترس و ہمدردی میں کوئی ایسا نہیں کرتا سویرا..... کچھ لگاؤ تو ہوگا ناں انہیں۔" مجھے سمجھانے کے باوجود میرے عمل کو غلط سمجھنے کے باوجود انہوں نے میرا ساتھ دیا۔ میرے میگزین، میری ڈاک، میری رائلٹی سب انہی کے ایڈریس پر آتی تھی اور پھر وہ مجھے اکٹھی بھجوا دیتیں۔ میں نے کبھی کہیں کسی کو انٹرویو نہیں دیا، کبھی کسی مشاعرے میں شرکت نہیں کی..... جہاں کہیں میں جاتی وہاں میں نے کبھی کسی کو نہیں بتایا کہ میں ہی سویرا اقبال ہوں..... جس کا نام ادب میں معتبر سمجھا جاتا ہے......

کئی بار میرے سامنے بیٹھ کر میری کولیگ، میری شاعری کی تعریف کرتی رہیں لیکن میں لب سیے بیٹھی رہی..... میں نہیں چاہتی تھی کہ کوئی مجھے جانے اور مجھے کھوجتا ہوا یہاں تک پہنچے..... میں انٹرویو نہیں دیتی تھی کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو میرے ویراہاؤس کا پتا چلے اس لیے نہیں کہ میرے حوالے میرے لیے شرمناک تھے..... بلکہ اس لیے کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو پتا چلے کہ میں کسی کو مطلوب نہیں تھی اور اتنے سالوں بعد نہ جانے کہاں غلطی ہوئی تھی مجھ سے کہ سراج الحق اور عرفان حسیر کھوجتے ہوئے آ گئے تھے۔ میں نے سوچا اور......

"اوہ..... میرے خدایا!" میں نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

☆☆☆

یہ آج سے چار دن پہلے کی بات تھی۔ آفس میں وہ کون تھی..... مجھے نام یاد نہیں آ رہا تھا۔ کوئی اسکول ٹیچر تھی کسی کام کے سلسلے میں آئی تھی۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا۔

"ارے آپ سویرا ہو ناں..... ہم نے سیالکوٹ میں ایک ہی اسکول میں پڑھا ہے..... آپ نے ان دنوں لکھنا شروع کیا تھا..... میں دسویں جماعت میں تھی اور آپ نویں میں..... مس ربانی ہماری کلاس میں آتیں تو بہت تعریف کرتی تھیں آپ کی..... اب جہاں کہیں بھی آپ کی کوئی تحریر چھپتی ہے، میں ضرور پڑھتی ہوں، میں سب کو بتاتی ہوں یہ اتنی مشہور شاعرہ میری اسکول فیلو ہے۔"

وہ بغیر رکے بول رہی تھی اور اتنے یقین سے بات کر رہی تھی کہ میرے پاس انکار کا کوئی جواز نہیں

تھا...... میں اس سے یہ جھوٹ نہیں بول سکی تھی کہ نہیں میں وہ سویرا اقبال نہیں ہوں...... وہ مجھے بائے فیس بھی پہچانتی تھی اور...... اس نے میری کتابوں کے سلسلے میں ہونے والی ایک دو تقریبات میں بھی شرکت کی تھی۔

"میں تو صرف آپ کی خاطر وہاں گئی تھی لیکن پھر وہاں پتا چلا کہ آپ نہیں آتیں ایسی تقریبات میں۔ مس ربانی بتا رہی تھیں کہ آپ کے والدین پسند نہیں کرتے۔ دراصل میرے شوہر صحافی ہیں تو ہمیں ایسی تقریبات کے کارڈ مل جاتے ہیں۔"

"تو یہ بات ان محترمہ سے ہی لیک آؤٹ ہوئی تھی۔ او مائی گاڈ......"

مجھے یاد آیا جب آفس آئی تھی تو کسی نے بتایا تھا کہ مسز عرفان آئی ہیں تو...... وہ مسز عرفان......

"میڈم جی آپ کا فون ہے۔"

ماسی خیراں نے دروازے سے جھانکا تو میں چونک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آفس سے آیا ہے جی ساجد صاحب کا......"

ساجد سے بات کر کے میں ماسی خیراں کو ایک کپ چائے بنانے کا کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ جسم و جان میں اتنی تکلیف تھی جیسے زخموں کے ٹانکے کھل گئے ہوں۔ کسی پل چین نہیں...... دل بہت بے کل تھا میں نے اچھا کیا تھا یا برا...... میں آج یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔ اندر دور تک پیاس کا صحرا اگ آیا تھا۔ اس پیاسی زمین پر باری کی محبت کے جو چند قطرے پڑے تھے۔ ان کی ٹھنڈک ہمیشہ ہی رگ و پے میں سکون اتار دیتی تھی لیکن آج...... میں نے اپنی جلتی ہوئی آنکھوں کو رگڑا...... یہ میں نے کیا، کیا تھا میں باری کی محبت سے بھی بھاگ آئی تھی۔ باری جو کہتا تھا کہ وہ مجھ سے اتنی محبت کرے گا کہ برسوں کی پیاس بجھ جائے گی لیکن میں نے اس کی محبت کا مان بھی توڑ دیا تھا یہ اور استانی جی...... کتنا خیال رکھا انہوں نے میرا...... انصار بھائی اور ایثار بھائی بھی کبھی خالی ہاتھ نہیں آئے ہمیشہ کچھ نہ کچھ میرے لیے لاتے پھر بھی پتا نہیں کیوں مجھے لگتا تھا کہ جیسے انہوں نے مجھ سے محبت نہیں کی۔

"اور کیا میں احسان فراموش ہوں......؟"

میں نے اپنے آپ سے پوچھا اور خیراں کی لائی گرم چائے کا کپ ہونٹوں سے لگا لیا۔

"نہیں......" میں نے ایک بار پھر خود کو باور کرایا۔ "میں احسان فراموش نہیں ہوں، بس میں محبت کو محبت کی طرح دل میں زندہ رکھنا چاہتی تھی۔ اسے احسان نہیں بنانا چاہتی تھی۔ اس لیے تو میں نے باری سے التجا کی تھی کہ مجھ سے میری محبت مت چھینے لیکن وہ میری بات سمجھ ہی نہیں پا رہا تھا اور میں نے محبت کو احسان میں ڈھلنے سے بچا لیا تھا لیکن پھر بھی میرا دل کیوں خالی خالی سا لگتا ہے حالانکہ یہ باری کی محبت سے لبالب بھرا ہے۔ پھر بھی...... پھر بھی...... کیا میرے اندر کہیں پچھتاوے کی فصل اگ چکی ہے۔"

میری آنکھیں جلنے لگیں اور میں اپنی سوچوں سے گھبرا کر کچن میں خیراں کے پاس چلی آئی اور کوکنگ میں اس کی ہیلپ کرنے لگی لیکن دھیان تھا کہ بار بار پھر ماضی کی طرف چلا جاتا...... پورا دن میں بے کل اور بے چین رہی اور رات میں مجھے سکون کی گولی لینی پڑی۔ کبھی، کبھی مجھے یونہی نیند کی گولیوں کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ جب باری یاد آتا، جب اپنی بے قدری کا خیال آتا اور جب تنہائی ستاتی تو نیند کی ایک چھوٹی سی گولی میری بے چینیوں کو دور کرتی تھی۔ اگلی صبح میں اٹھی تو کسی حد تک فریش تھی۔ ناشتے کی ٹیبل پر میں نے عادت کے مطابق اخبار کھولا، ڈیلی اخبار کے ساتھ ایک مقامی اخبار بھی تھا۔ چار صفحوں پر مشتمل اس اخبار کے پہلے صفحے پر ہی ایک خبر نے مجھے چونکا دیا۔

"ہمارے شہر میں مشہور شاعرہ سویرا اقبال کی

آمد......" عرفان منیر نے ڈی ای او کی حیثیت سے میری تقرری کی خبر چھاپی تھی اور میری شاعری اور دوسری تحریروں کے اور ادب میں میرے مقام کے حوالے سے چھوٹا سا نوٹ لکھا تھا۔

مجھے از حد کوفت ہوئی لیکن ظاہر ہے اب میں کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ بہتر تھا کہ میں یہاں سے جلد از جلد تبادلہ کروانے کی کوشش کروں۔ میں نے سرسری سی نظر اخبار پر ڈال کر اخبار بے پروائی سے ایک طرف رکھ دیا، مجھے یہ اطمینان تھا کہ یہ ایک مقامی اخبار ہے اور اس شہر میں بھلا کتنے لوگ ہوں گے جنہیں ادب سے کوئی تعلق ہوگا اور جو سویرا اقبال کو جانتے ہوں گے...... ہاری، استانی جی سب سیالکوٹ میں تھے اور بھلا یہ اخبار کہاں سیالکوٹ جاتا ہوگا...... میں نے پرسکون ہو کر ناشتا کیا اور آفس آگئی...... میرا ارادہ تھا کہ میں آج شہر کے اسکولوں کا وزٹ کروں گی لیکن میرے آفس جانے کے کچھ ہی دیر بعد مسز افضل جو ہائی اسکول نمبر 2 کی ہیڈ مسٹریس تھیں...... آگئیں۔ انہیں رخصت کر کے میں جونہی مڑی ایک دم دروازہ کھول کر کسی نے کہا۔

"مے آئی کم ان میم!"

یہ آواز...... میں ایک جھٹکے سے مڑی اور پھر وہیں ساکت کھڑی ہوگئی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ ہاری ہوگا۔

"ہاری تم......؟" بہ مشکل میرے لبوں سے نکلا تھا۔

"تمہیں توقع تو نہیں ہوگی کہ میں کبھی تمہیں ڈھونڈتا ہوا تم تک آپہنچوں گا۔"

"ہاری آؤ بیٹھو......" میں نے تھوک نگلتے ہوئے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود میز کا چکر کاٹ کر میز کے پیچھے اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔ لیکن وہ اسی طرح کھڑا رہا۔ میں نے نظریں اٹھائیں وہ مجھے ہی دیکھ رہا تھا' مجھے لگا جیسے میرا دل ابھی سینے کی چار دیواری توڑ کر

باہر آ گرے گا۔

"بیٹھ جاؤ پلیز ......" میں نے اپنے خشک ہوتے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

وہ بولے، بولے چلتا ہوا میری ٹیبل کے سامنے آیا اور دونوں ہاتھ ٹیبل پر ٹکاتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

"سب...... سب کیسے ہیں ...... استانی جی، انکل، انصار بھائی؟"

"تمہیں کیا سویرا اقبال...... تم تو سب کو چھوڑ آئی تھیں۔ سو تمہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ کون کیسا ہے؟" اس کی آواز ویسی لیکن مضبوط تھی۔

"اگر ان میں سے کسی کو کچھ ہو جائے تو کیا مجھے کوئی فرق نہیں پڑے گا، کیا واقعی......؟" میں نے اپنے آپ سے پوچھا اور میرا دل زور سے کانپا...... "اللہ نہ کرے کسی کو کچھ ہو......" میں نے زیر لب کہا۔

"تم خود کو کیا سمجھتی ہو سویرا اقبال......؟" ناراضی اس کی خوب صورت آنکھوں سے جھلک رہی تھی۔ "تم نے کبھی سوچا کہ جن لوگوں کو تم بلا قصور چھوڑ آئی ہو، وہ تمہارے لیے کتنا ترسے ہوں گے، کیسے گزرتے ہوں گے ان کے شب و روز، کیسے تم نے سارے گھر میں خزائیں بکھیر دیں۔ کبھی سوچا تم نے؟ کب، کب یاد نہیں کیا ہوگا انہوں نے...... لیکن تم......"

"میں...... !" میں نے نظریں نہیں اٹھائیں لیکن میں جانتی تھی کہ اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ ہوگی۔

اور کیا میں نے یاد نہیں کیا انہیں صبح شام...... دن، رات جب کوئی عید، تہوار آتا تو مجھے یاد آتا تھا کہ کیسے انصار بھائی اور ابصار بھائی مجھے چوڑیاں پہنانے لے جاتے تھے، کیسے استانی جی میرے کپڑے تیار کرواتی تھیں، صوبیدار انکل، انصار بھائی، سبھی سے مشورہ کیا جاتا تھا...... میرے آنسو میرے اندر گرتے تھے اور میں نے ان بیتے سالوں میں کتنی راتیں جاگ کر گزاری ہیں۔

"یوں تو تم بڑی حساس بنتی ہو۔" اس نے میز پر ہاتھ کا دباؤ بڑھایا اور تھوڑا سا اور آگے جھکا۔

"لیکن تم نے شاید ہی کبھی سوچا ہو کہ وہ لوگ تمہارے لیے کتنا ترستے ہوں گے، کتنا یاد کرتے ہوں گے تمہیں۔ ان کی راتوں کا آغاز اور دن کا اختتام تمہاری باتوں پر ہوتا ہے، سویرا اقبال...... امی ہر صبح تمہارے کمرے کی صفائی کرواتی ہیں، تمہاری کتابیں اور تمہاری چیزیں یوں جھاڑ پونچھ کر رکھتی ہیں جیسے بس تم آنے ہی والی ہو...... ابو بے دھیانی میں دن میں کتنی بار تمہیں پکار بیٹھتے ہیں...... امی، ابو کا خیال ہے کہ ان کی محبت تمہیں واپس لے آئے گی لیکن......" وہ طنزیہ انداز میں ہنسا۔

"وہ نہیں جانتے کہ تم نے ان کی محبت کو محبت کب جانا۔ تمہارے خیال میں تو وہ ترس اور ہمدردی تھی رحم تھا۔ بیٹی کمانے کی خواہش تھی، وہ روتی ہیں، میں منع کرتا ہوں تو وہ کہتی ہیں، گھر میں مرغی بھی رکھو تو اس سے محبت ہو جاتی ہے، تمہیں تو وہ بیٹی بنا کر لائی تھیں اور بیٹی کی طرح ہی چاہا...... لیکن انہیں کیا پتا......" اس کا لہجہ مزید تلخ ہوا۔

"ان کی اکلوتی بیٹی کو محبت اور ترس کا فرق ہی نہیں پتا...... معاف کرنا سویرا اقبال، تم ساری زندگی محبت کی طالب رہیں لیکن محبت کو پہچان نہیں پائیں، تمہیں پتا ہی نہیں کہ محبت کیا ہوتی ہے، تمہارے پاس وہ نظر ہی نہیں ہے، تمہارے سارے لفظ اور جذبے کھوکھلے ہیں۔"

"نہیں......" میں نے تڑپ کر اس کی طرف دیکھا۔

"ہاں...... تم تو یہ بھی نہیں جان پائیں کہ میں تمہارے بغیر...... اور تم نے میری محبت پر بھی اعتبار نہیں کیا۔" اس کی آواز آہستہ ہوگئی اور آنکھیں جیسے کسی اندرونی تپش سے سلگنے لگیں۔

"تم ساری عمر خود ترسی میں مبتلا رہیں اور اپنے

اردگرد موجود محبتوں کو پہچان ہی نہیں پائیں۔ میں گیا تھا میانے بزارے...... میں نے دیکھی تمہاری اماں اور تمہارے ابا کی تڑپ...... تمہیں ایک نظر دیکھنے کو تڑپتے ہیں وہ...... میں نے بتایا انہیں کہ تم کیا بھٹکتی ہو کہ...... تمہاری اماں نے میرے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔"

"میرا اندر خالی ہو گیا ہے بیٹا...... ایک بار بالی کو لے آؤ اسے سینے سے لگا لوں تو......"

"بس کرو باری......" میرے لبوں سے یہ مشکل نکلا تھا۔ آنسوؤں نے میرے حلق میں گولا سا بنا دیا تھا۔

"کب سے ڈھونڈتا پھر رہا ہوں تمہیں، کتنی بار مس ربانی کے دروازے تک بھی پہنچا...... لیکن تمہارا پتا نہیں چل سکا...... آج آفس میں اگر اخبار پر نظر نہ پڑتی تو...... مجھے ایک سال ہو گیا ہے اس شہر میں آئے لیکن میں نے کبھی مقامی اخبار نہیں پڑھا...... خیر......" اس نے ایک گہری سانس لی۔

"پالنے والے ماں، باپ سے نہ سہی لیکن جنم دینے والی ماں سے ایک بار ضرور ملنے چلی جانا سویرا اقبال، جس کی نظریں ہر دم دروازے کی طرف ہی لگی رہتی ہیں۔" وہ جانے کے لیے مڑا۔

"باری......" میرے حلق سے چیخ کی طرح نکلا تھا اور پھر میرے اندر سے سمندر ابل پڑے، برسوں سے منجمد گلیشیر پگھل رہے تھے، میں پتا نہیں کیسے اٹھی تھی، کیسے میز کے پیچھے سے نکل کر باری تک آئی تھی اور اس کا بازو تھامے بلک رہی تھی اور وہ ساکت کھڑا تھا۔ پتا نہیں کتنی دیر گزر گئی میں اس کا بازو تھامے بلکتی رہی پھر اس کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی اس نے اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھ کر ہولے سے سہلایا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"مت رو ویرا مجھے تکلیف ہوتی ہے۔" اس نے آہستہ سے اپنا بازو چھڑا لیا اور جانے کے لیے پلٹا۔

"نہیں...... نہیں باری اس طرح مت جاؤ، اتنے برسوں کے بعد ملے ہو تو یوں خفا ہو کر مت جاؤ پلیز کچھ دیر تو بیٹھو...... سنو، میں بھی بہت تڑپی ہوں، بہت روئی ہوں اور پلیز میرا یقین کرو باری، تمہاری محبت...... ایک تمہاری ہی محبت پر تو اعتبار تھا مجھے...... اور اسے ہی تو زندہ رکھنا چاہتی تھی ہمیشہ......" اس نے بے حد شاکی نظروں سے مجھے دیکھا۔

"اسے زندہ رکھنا چاہتی تھیں؟ میری محبت کو اور مجھے ہی مار دیا۔"

"نہیں......"

میری آنکھیں پھر سمندر بن گئیں۔

"تم بہت احمق ہو ویرا۔" اس کے تنے ہوئے نقوش ڈھیلے ہوئے تھے لیکن اس کی آنکھوں سے ہنوز ناراضی جھلکتی تھی۔

"پلیز باری کچھ دیر تو بیٹھ جاؤ، مجھے بتاؤ اماں کے متعلق ابا کے متعلق...... استانی جی اور انکل کے متعلق۔ اچھا چلو یہ ساتھ ہی میرا گھر ہے وہاں چل کر آرام سے بات کرتے ہیں۔" میں نے ملتجی نظروں سے اسے دیکھا تو اس نے سر ہلا دیا۔ میں نے جلدی سے میز پر پڑا اپنا ہینڈ بیگ اٹھایا تو اس نے بغور مجھے دیکھا اور واش روم کی طرف اشارہ کیا۔

"جاؤ منہ دھو کر آؤ۔"

"ہاں۔" اب میں ان روئی آنکھوں اور بھیگے چہرے کے ساتھ باہر جاتی تو دیکھنے والے جانے کیا کیا گمان کرتے...... میں فوراً واش روم کی طرف چلی گئی اور جب اچھی طرح چہرہ دھو کر اور تازہ لپ اسٹک لگا کر باہر آئی تو وہ بے حد سنجیدہ سا بیٹھا تھا میرے آتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا...... اور کچھ دیر بعد وہ میرے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔

"اکیلے رہتے ڈر نہیں لگتا تمہیں......؟ تم تو بہت ڈرپوک ہوتی تھیں۔"

اسے شاید بہت پہلے کی بات یاد آئی تھی۔

"پہلے ہاسٹل میں رہتی تھی پھر جب اس سیٹ پر

آئی تو......" میں اسے مختصر لفظوں میں بیتے سالوں کی ساری روداد سنا رہی تھی۔ اس نے بھی مجھے بتایا کہ وہ کتنی بار میاں نے بزارے گیا اور یہ کہ اماں چاہتی تھیں کہ میں پڑھ جاؤں، میرا شوق دیکھ کر ہی انہوں نے دل پر پتھر رکھا تھا وہ مجھے ملنے اس لیے نہیں آتی تھیں کہ کہیں ان کا دل بے ایمان نہ ہو جائے اور وہ مجبور ہو کر مجھے استانی جی کے گھر سے لے جائیں۔

"میں نے ہر وہ بات ان سے کہہ دی ویرا جو تم نہیں کہہ سکتی تھیں۔" اب اس کی آنکھوں میں نرمی تھی...... اور وہی محبت بھری حدت جو ہمیشہ ہوتی تھی۔

"تمہارے ابا حیران ہو کر میری باتیں سنتے تھے کہ اتنی چھوٹی عمر میں تم اس طرح سوچتی تھیں۔ انہیں اگر تمہارے خیالات کا علم ہو جاتا تو وہ ضرور تمہیں گود میں بٹھا کر اپنے ہاتھ سے نوالے بنا کر کھلاتے، انہوں نے کہا انہوں نے کبھی بیٹیوں کی پیدائش پر خفگی یا ناراضی کا اظہار نہیں کیا۔ اللہ نے بیٹا بھی تو دیا تھا ناں شکر ادا کرنے کے لیے...... اور وہ کتنے بھی تھے وہ تم سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں کیونکہ تم ان سے دور رہو۔"

میری آنکھوں سے پھر جھرنے پھوٹ پڑے تھے۔

"اور امی کہتی ہیں کہ انہوں نے تمہیں کبھی اس لیے امی کہنے کے لیے نہیں کہا کہ کہیں تمہیں اچھا نہ لگے کیونکہ تم چھ سال کی تھیں تب اور تمہیں پتا تھا کہ تمہاری اماں اور ابا کون ہیں اور استانی جی تمہاری امی نہیں ہیں حالانکہ ان کا کتنا دل چاہتا تھا کہ تم انہیں بھی امی کہو......"

"یاری میں بہت بے وقوف ہوں۔"

"ہاں......" اس کے لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ کو میں نے نمودار ہوتے نہیں دیکھا لیکن مجھے لگا جیسے وہ مسکرا رہا ہو...... لیکن جب میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ سنجیدہ چہرہ لیے بیٹھا تھا۔

"ہاں ویرا تم...... تمہارے اندر جو یہ ادیب و شاعر چھپا بیٹھا تھا ناں...... اس نے تمہیں حساس بنا دیا تھا ورنہ ہر گھر کے اپنے طور طریقے ہوتے ہیں، اکثر والدین اس طرح اپنی اولاد سے اپنی محبتوں کا اظہار نہیں کرتے...... لفظوں میں پیار کر کے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ انہیں اولاد سے محبت نہیں ہے، تمہارے ابا صبح سے شام تک کھیتوں میں کام کر کے گھر آتے تو اتنے تھکے ہوئے ہوتے ہوں گے کہ بچوں سے لاڈ کرنے، پیار کرنے کے لیے ان کے پاس نہ وقت ہوتا ہوگا، نہ ہمت اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ...... وہ تم سے محبت نہیں کرتے تھے اور امی تمہارے جانے کے بعد وہ اکثر کہتی تھیں پیدا کرنے سے زیادہ پالنے کی محبت ہوتی ہے اور یہ پالنے کی محبت بڑی ظالم ہوتی ہے۔"

"لیکن پھر بھی یاری، محبت کو اظہار کی ضرورت تو ہوتی ہے، ہمیشہ نہ سہی کبھی، کبھی تو......" میرے لبوں سے بے اختیار نکلا تھا۔ "اگر تم مجھ سے محبت کا اظہار نہ کرتے تو مجھے کیسے پتا چلتا کہ تم مجھ سے محبت کرتے ہو۔"

"خیر مجھے تو پتا تھا کہ تم مجھ سے محبت کرتی ہو۔" اس نے بے پروائی سے کہا تو میں محجوب سی ہو گئی۔

"تم نے سب کا بتایا یاری اپنے بیوی، بچوں کا نہیں بتایا، کیا یہاں ساتھ ہی رہتے ہیں یا استانی جی کے پاس......؟"

"اول تو یہ کہ تم نے پوچھا ہی نہیں اور دوئم یہ کہ بیوی ہی نہیں ہے تو بچے کہاں سے آئیں گے۔"

"تو...... تو کیا تم نے شادی نہیں کی ابھی تک......؟" وہ اثبات میں سر ہلاتا ہوا کھڑا ہو گیا اور مجھے لگا جیسے میرے دل کی جلتی بلتی زمین پر کہیں سے ٹھنڈی پھوار پڑنے لگی ہو، ابھی کچھ دیر پہلے مجھے لگ رہا تھا جیسے پیاس سے میرے حلق میں کانٹے اگ آئے ہوں لیکن اب یوں لگ رہا تھا جیسے کسی نے ٹھنڈے،

میٹھے پانی کا گلاس میرے لبوں سے لگا دیا ہو۔

"ہاں اگر ہو سکے تو ایک بار اپنی انا کو بھول کر میانے ہزارے کا چکر ضرور لگا لینا۔" چہرے پر گہری سنجیدگی لیے وہ مڑا تو میں نے بے اختیار کھڑے ہوتے ہوئے اسے بلایا۔

"لیکن ہاری تم نے تو کہا تھا کہ تم مجھے اپنے ساتھ میانے ہزارے لے کر جاؤ گے تو کیا بھول گئے؟"

"نہیں، میں تو نہیں بھولا لیکن شاید تم بھول گئی تھیں۔" وہ یک دم واپس مڑ کر میرے مقابل کھڑا ہو گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بے تحاشا چمک تھی اور ہونٹوں پر مدھم سی مسکراہٹ......

"میں نے کچھ اور بھی کہا تھا دیبا...... لیکن تمہیں یاد نہیں۔"

"مجھے یاد ہے۔" میری نظریں جھک گئیں اور پلکیں لرزنے لگیں یوں جیسے میں کوئی ٹین ایجر لڑکی تھی۔

"تو تمہیں یہ تو نہیں لگے گا کہ میں تم سے شادی تم پر احسان کرنے کے لیے کر رہا ہوں؟"

میری لرزتی پلکوں پر موتی اٹک گئے۔ پتا نہیں آج کہاں سے اتنا پانی میرے اندر سما گیا تھا۔

"محبت احسان نہیں ہوتی دیبا۔" اس نے اپنی انگلیوں کی پوروں سے میری پلکوں کے موتی چن لیے۔

"اور محبت کو کبھی احسان مت سمجھنا۔" اس نے تنبیہ کی...... "اور یاد رکھنا...... میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں اتنی کہ ان سارے بیتے سالوں میں اللہ سے میں نے اس ایک دعا کے سوا اور کوئی دعا نہیں مانگی کہ تم مجھے مل جاؤ...... اور میری محبت کا یقین کر لو۔"

"تمہاری محبت کا یقین مجھے ہمیشہ رہا ہاری، میں کبھی بے یقین نہیں ہوئی۔" مجھے لگا میرے ہاتھوں کے ساتھ میری آواز بھی کانپ رہی تھی۔

"اور کبھی بے یقین مت ہونا دیبا۔" اس نے میرے لرزتے ہاتھ مضبوطی سے تھام لیے۔

"دیکھو دیبا ہو سکتا ہے میانے ہزارے کے اس کچے بڑے سے دالان میں رہنے والی تمہاری اماں کو تمہاری طلب نہ ہو لیکن یہ کبھی مت سوچنا کہ انہیں تم سے محبت نہیں تھی...... یہ محبت تو خود بخود ماں اور اولاد کے درمیان وجود پاتی ہے، بڑھتی ہے اور تناور درخت بن جاتی ہے۔" وہ ہولے، ہولے دھیمے لہجے میں ایک بار پھر سمجھا رہا تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ جیسے میرے ارد گرد پھول برس رہے ہوں۔ جیسے تپتے صحراؤں سے میں یکا یک ہرے بھرے گلستانوں میں آ گئی ہوں، میرے پاؤں تلے نرم ٹھنڈی مخملی گھاس ہو اور میرے چاروں طرف ٹھنڈی خوشبودار ہوائیں چلتی ہوں۔ اس روز میں ہاری کے ساتھ سیالکوٹ آئی تھی اور استانی جی کے گلے لگ کر بے تحاشا آنسو بہاتے ہوئے میں نے ان سے معافی مانگی تھی...... اور پہلی بار انہیں امی کہہ کر بلایا تھا۔ استانی جی نہال ہو رہی تھیں اور صوبیدار انکل خاموش ہو کر ہمیں دیکھتے تھے...... اور پھر اگلے دن میں ہاری کے ساتھ میانے ہزارے آئی تھی...... نو سال کی عمر میں میانے ہزارے سے بچھڑ کر آج پھر وہاں تھی...... اپنے گھر کے دروازے کے سامنے کھڑے کھڑے میری ہمت جواب دے گئی تھی لیکن ہاری نے مجھے سہارا دیا اگر وہ میرے ساتھ نہ ہوتا تو شاید میں اندر قدم رکھنے کا حوصلہ نہ کر پاتی لیکن وہ تھا میرے ساتھ اور میں نے اس کے ساتھ جیسے سیکڑوں سالوں کے بعد اس بڑے سے کچے صحن میں قدم رکھا تھا جہاں میں نے کتنی ہی بار پیو کے ساتھ ایکی ڈالی تھی اور پھر چکرا کر گر پڑتی تھی۔ اندر وہی منظر تھا جو میری آنکھوں کی پتلیوں میں ٹھہر سا گیا تھا۔ لمبا سفید اور سیاہ ڈبیوں والا کھیس اوڑھے نیم دراز تھے اور پاس ہی حقہ پڑا تھا اور ان کی چارپائی کی پائنتی ہی تو جمال ان کے پاؤں دبا رہا تھا۔ ہاں وہ جمال ہی تو تھا جسے میں نے صرف چند دن کا دیکھا تھا۔ اور اماں چولہے سے جلتے انگارے نکال کر ایک چترے پر

ڈالے ابا کے حقے کے لیے لا رہی تھیں۔

''اماں......!'' میں باری کا ہاتھ چھڑا کر ان کی طرف بھاگی...... چترا، اماں کے ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا...... وہ تیر کی طرح میری طرف آئی تھیں...... دوسرے ہی لمحے ہم ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی تھیں۔

''بالی...... بالی یہ تو ہے ناں...... میری بچی......'' وہ بار، بار میرا منہ چومتیں، دونوں ہاتھوں میں میرا چہرہ لے کر مجھے دیکھتیں...... آج ان کی آنکھوں میں بھی سمندر سا گئے تھے۔ ابا بار، بار کھیس کے کونے سے آنکھیں پونچھتے تھے اور جمال حیران سا مجھے دیکھتا تھا۔ اماں کے بازوؤں سے نکل کر میں ابا سے لپٹ گئی۔

''ابا...... ابا......'' میری ہچکی بندھ گئی۔

''چپ کر نہ رو جھلی نہ ہو تو......'' ابا ہولے، ہولے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے اور کہتے تھے۔

شام تک میری چاروں بہنیں بھی اپنے، اپنے بچوں کے ساتھ آ گئی تھیں...... اور آنکھوں میں خوشگوار سی حیرت لیے ہوئے مجھے گھیرے میں لیے بیٹھی تھیں۔ والی، دبئی میں تھا اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ۔

''والی اب پتا نہیں کیسا ہے؟'' میں نے پاجو سے ہولے سے پوچھا تھا...... لیکن جواب اماں نے دیا تھا۔

''کبھرو جوان ہے، تیری شادی پر بلاؤں گی اسے یوں بھی سال بعد چھٹی پر آتا ہے۔ تب ہی شادی کی تاریخ رکھوں گی۔'' اماں کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''میری شادی......؟'' میں نے دھڑکتے دل سے باری کی طرف دیکھا جو سامنے ہی چارپائی پر جمال کے ساتھ بیٹھا تھا اور لگا ہے، لگا ہے مجھے بھی دیکھ لیتا تھا...... اس نے راستے میں کہا تھا۔

''ویرا! میرے امی، ابو بہت جلد بہت چاؤ سے پوری عزت واحترام کے ساتھ تمہیں تمہارے اماں، ابا سے مانگنے آئیں گے۔'' باری نے مجھے کتنا مان دیا تھا۔

''ہاں تمہاری شادی......'' اماں جیسے جھوم گئی تھیں۔

''استانی جی تاریخ لینے آئیں گی بہت جلد...... باری نے کہا ہے اور ان کا ہی تو سب سے زیادہ حق ہے تم پر...... اور باری بہت اچھا ہے...... ہے ناں؟'' وہ سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگیں۔

میری پلکیں جھک گئیں...... رخساروں پر سرخی دوڑ گئی۔

''ہم نے آج تک تیرے لیے کچھ نہیں کیا ناں بالی، تیرے ابا کی خواہش ہے کہ دھوم، دھام سے تیری شادی کریں...... تیرا بھائی دبئی میں ہے ناں...... اچھا کماتا ہے، تیرے لیے بھی زیور بنا کر رکھا ہے میں نے...... ہم سے تمہارے معاملے میں جو کوتاہی ہوئی ہے، معاف کر دینا لیکن میں نے تو ہمیشہ تمہارا بھلا چاہا تھا۔''

''اماں...... اماں......'' میں ایک بار پھر ان سے لپٹ گئی۔

''مجھے کچھ نہیں چاہیے اماں...... کچھ بھی نہیں...... بس آپ کی محبت مجھے مل گئی ہے ناں......'' میری آواز میں نمی گھل گئی تھی اور اماں کی آنکھیں برس رہی تھیں...... اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے ایک عمر کی آبلہ پائی کے بعد زخموں کو مرہم مل گیا ہو...... اور میرا خالی دل محبتوں سے لبریز ہو گیا ہو...... میں نے اماں کے کندھے پر سر رکھے، رکھے باری کی طرف دیکھا۔ جو آنکھوں میں محبتوں کا جہاں بسائے مجھے ہی دیکھ رہا تھا...... اور یہ میں تھی سویرا اقبال...... جو ہمیشہ خود کو کمتر اور مظلوم سمجھتی رہی...... لیکن آج میرے اردگرد کتنے رنگ تھے اور روشنیاں تھیں، محبتیں تھیں۔





فسانہ نہیں حقیقت ہے یہ

ہم ٹی وی کی ہیڈ آف اسکرپٹس

اور من موہنی سی مومل شنید کی دلکش باتیں

رضوانہ پرنس

سب سے پہلے تو ہماری طرف سے آپ سب کو بہت، بہت عید مبارک ہو......اور بھئی بنا عیدی کے بھلا اس میٹھی عید کا کیا مزہ......سو پاکیزہ کے اس جگمگاتے عید نمبر میں آپ کی عیدی بھی آپ کے

فیورٹ سلسلے فسانہ نہیں حقیقت ہے یہ کی صورت میں موجود ہے اور ہمیں یقین ہے کہ اس افسانے کی معصوم اور کومل سی ہیروئن اپنی دل کش اور بھولی بھالی سی باتوں کے ساتھ یقیناً آپ کے دل میں اتر جائے گی تو آئیں آج ہم آپ کو "ہم ٹی وی" لیے چلتے ہیں جہاں خواتین کے اس پسندیدہ چینل کی ہیڈ آف اسکرپٹ اور سلطانہ صدیقی صاحبہ کی بڑی بہو مومل شنید جن کے منتخب کردہ اسکرپٹ ڈراموں کی شکل میں، آپ کے دلوں پر چھائے رہتے ہیں، آپ کی منتظر ہیں۔ ہم چاہ رہے تھے کہ شنید صاحب سے بھی اسی نشست میں باتیں ہو جائیں مگر ان کی ڈھیروں مصروفیات کے باعث صرف مومل شنید کی گفتگو سے ہی افسانہ مکمل کیا مگر اس میں شنید صاحب بھی ان کے ساتھ ساتھ قارئین کو نظر آئیں گے۔ آف وائٹ شلوار سوٹ میں ملبوس اپنی بہت فریش لک کے ساتھ وہ ہمیں جون کی اس تپتی دوپہر میں ایک بہت خوب صورت سی ٹھنڈک کا احساس دلا رہی تھیں۔ قارئین ان کے معصوم سے چہرے پر بکھری ملاحت کو بس کوئی شاعر ہی بیان کر سکتا ہے یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔

اس پر مستزاد ان کا نرم اور شیریں انداز گفتگو ان کی شخصیت میں مزید حسن بھر دیتا ہے۔ ایمان سے ہماری اس تعریف میں ذرا بھی مبالغہ نہیں...... آپ کبھی ان سے مل کر تو دیکھیں ہماری رائے سے سو فیصد متفق ہو جائیں گے۔

❖ مومل ہم آپ کے افسانے کا آغاز آپ کے بچپن سے کریں گے۔ اس خوب صورت اور بے فکر دور میں ذرا ہمیں بھی تو لے کر چلیں۔ ہم نے ٹھنڈی یخ کوک کا سپ لیتے ہوئے ان کی طرف دیکھا تو مومل کی خوب صورت آنکھوں میں جیسے یادوں کے بے شمار جگنو چمک اٹھے۔

مومل شنید...... "میرے ابو گورنمنٹ آفیسر تھے۔ ہم تین بہن بھائی ہیں جن میں سب سے بڑی میں ہوں لیکن بحثیت میرا اپنے بہن اور بھائی پر ذرا بھی رعب نہیں جیسا کہ بڑی بہنوں کا ہوتا ہے۔ شاید اس لیے بھی رعب نہیں تھا کہ ایک تو ہم لوگوں میں بس دو، دو سال کا ہی فرق تھا اور دوسرے یہ کہ طبیعتاً میں کچھ زیادہ ہی نرم مزاج اور اپنے آپ میں گم رہنے والی لڑکی تھی۔ کسی پر رعب ڈالنا آتا ہی نہیں تھا۔ سب سے زیادہ سکون مجھے اپنے بیڈ روم میں ملتا تھا جہاں میرا پسندیدہ میوزک اور میری بے شمار بکس میری ساتھی ہوتی تھیں۔ مجھے کتابیں پڑھنے کا کچھ زیادہ ہی شوق تھا۔ اسی لیے میں اپنے کمرے میں زیادہ پائی جاتی تھی۔"

مومل ایک لمحے کو رکیں پھر جیسے کچھ اور بیتے ہوئے دن پوری جزئیات کے ساتھ ان کی آنکھوں میں جگمگا اٹھے۔ "وہ دن بھی مجھے کبھی نہیں بھولتے۔ جب ہم اکثر و بیشتر کراچی سے حیدر آباد جایا کرتے تھے جہاں میرا، پورا ددھیال مقیم تھا۔ عید، بقر عید یا کوئی بھی تہوار یا چھٹی پڑ جاتی تو ہم لوگ حیدر آباد چلے جاتے۔ میں اپنی پھپھیوں کی بے حد لاڈلی تھی۔ اِن فیکٹ ایک طرح سے انہوں نے مجھے پالا بھی ہے، ہم جب حیدر آباد پہنچتے تو ہمیں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ زبردست کھانے بنتے ایک خوشگوار سا ہنگامہ ہر سو بکھر جاتا وہاں کی شامیں بھی بہت حسین ہوتی تھیں۔ ٹھنڈی، ٹھنڈی سی ہواؤں میں ہم سب بچے باہر بچھی ہوئی چارپائیوں پر بیٹھ کر خوب ہلا گلا کرتے رہتے۔ تیل وغیرہ کے خالی ڈبوں سے ڈھولک کا کام لیا جاتا۔ اتنا انجوائے کرتے تھے ہم لوگ کہ واپس آنے کو دل ہی نہیں کرتا تھا۔" مومل جیسے ان دنوں میں بالکل ہی کھو گئی تھیں۔

❖ اوہو مومل آپ نے تو ہمیں ان افسانوں اور ناولوں کی یاد دلا دی ہے جن میں سارے کزنز چھٹیوں میں ایک جگہ جمع ہوتے ہیں پھر ایک پیاری سی کزن کو اپنا کوئی تایا زاد یا خالہ زاد...... ؟ مومل کی



مومل شنید اور مسز شنید اپنے پیارے بچوں کے ہمراہ

بے ساختہ ہنسی نے ہمارا سوال ادھورا ہی رہنے دیا۔

مومل شنید......"ارے نہیں، ایسی کوئی صورتِ حال نہیں پیش آئی۔ میں ننھیال اور ددھیال دونوں سائڈ میں سب سے بڑی ہوں۔۔۔ سو میرے افسانے میں افسوس کہ ان باتوں کی کوئی گنجائش نہیں۔ ویسے ان دنوں کی یادیں اب بھی مجھے اندر سے فریش کر دیتی ہیں۔" مومل ہنوز انہی دنوں میں اپنے آپ کو محسوس کر رہی تھیں۔ "ابو گھومنے پھرنے اور ایڈونچرز کے بہت شوقین تھے۔ ہم لوگ ہر لمبی چھٹیوں میں بائی روڈ کراچی سے کوئٹہ یا کوہ مری جایا کرتے تھے اور صرف ہماری فیملی ہی نہیں۔ ہماری پھپھو اور چچا کے خاندان بھی ہمارے ساتھ شامل ہوتے تھے۔ میری ننھیال میں صرف میری نانی اور خالہ ہی تھیں۔ ان کا بھی ساتھ لازمی ہوتا تھا اور مزے کی بات یہ کہ ان سارے trips کی ارینجمنٹ ابو کی طرف سے ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ میرے پھوپا اور چچا کی پوسٹ کچھ ایسی تھیں کہ پورے سندھ میں ان کے مختلف شہروں میں ٹرانسفر ہوتے رہتے تھے اور ہم لوگوں کا بھی پھر ان سے ملنے ہر شہر میں جانا ہوتا تھا۔ اس طرح سمجھ لیں، میں نے پورا سندھ دیکھا ہوا ہے۔" مومل ایک جذب کے ساتھ یہ سب بتا رہی تھیں اور ہم سوچ رہے تھے مومل کی ان تمام انجوائمنٹ اور خوشیوں میں ان کے پورے خاندان کی آپس میں محبت اور کتنا ایکا چھپا ہوا ہے اور ان ہی چیزوں سے تو بچی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ مومل کو اپنے بچپن کی وادیوں میں گھومنا بہت اچھا لگ رہا تھا لیکن ہمیں اپنے افسانے میں مزید خوب صورت رنگ بھرنے تھے۔

❖ اچھا مومل اب ہم آپ کے کالج کے دور میں آتے ہیں...... ذرا اس بارے میں بھی کچھ بتائیں......؟ ہمارے سوال پر وہ اپنی مخصوص دلکش مسکراہٹ کے ساتھ بتانے لگیں۔

مومل شنید-----"ہاں کالج کا دور بھی بہت خوب صورت تھا۔ st.joseph,s کالج کی ایک

مزے دار یاد میں آپ سے ضرور شیئر کرنا چاہوں گی۔ جب میں انٹر میں تھی تو فائنل ایئر کی تین بہت خوب صورت لڑکیاں کالج کی کونسل ممبر ہوا کرتی تھیں۔ یعنی سارے کالج کی supervision وہ کرتی تھیں اور آپ کو پتا ہے وہ کون تھیں......؟'' موِل نے اپنی چمکتی آنکھوں سے ہمیں دیکھا تو ہم سمجھ گئے کہ وہ کوئی خاص نام لیں گی اور ایسا ہی ہوا ہمارے تجسس کو ختم کرتے ہوئے انہوں نے بتایا۔

''ان تینوں میں ایک حنا بیات تھیں (بہت مشہور ٹی وی آرٹسٹ) اور دوسری وسیم اکرم کی بیوی ہما (مرحومہ) تھیں۔ تیسری کا نام یاد نہیں۔ ہمارا گروپ ان تینوں کو ان کے حسن اور اسمارٹنس کی وجہ سے بہت admire کرتا تھا، بہت ہی پیاری لگا کرتی تھیں وہ لوگ ہمیں لیکن جونیئر ہونے کی وجہ سے ہم بس دور سے ہی انہیں دیکھا کرتے تھے۔ بہت عرصے کے بعد جب میں ٹی وی اسٹیشن پر حنا بیات سے ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں وہ وقت یاد دلایا تو وہ بہت خوش ہوئیں اور کہنے لگیں کہ تبھی مجھے تمہاری شکل کافی دیکھی بھالی سی محسوس ہو رہی تھی۔'' موِل کے اس قصے کو انجوائے کرتے ہوئے اس بار ہم نے تھوڑا سا ان کے دل میں جھانکنے کی بھی کوشش کی۔

❖ موِل اپنی زندگی کے اس نوخیز دور میں کبھی کوئی اپنے دل کے قریب محسوس ہوا؟

موِل شنید...... ''نہیں......'' انہوں نے فوراً ہی انکار کر دیا...... ''اصل میں اپنی زندگی میں دو چیزیں میں نے بہت کلیر رکھی تھیں۔ ایک تو یہ کہ میں ارینج میرج کروں گی، دوسرے یہ کہ محبت وغیرہ کے چکر میں کبھی نہیں پڑوں گی کیونکہ مجھے اپنے ابو، امی کی مرضی سے ہی شادی کرنی تھی۔'' موِل کے جواب نے ہمیں مطمئن نہیں کیا۔

❖ لیکن موِل ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک پیاری سی لڑکی کسی کے دل کو نہ بھائے یا اسے کوئی بھی اچھا ہی نہیں لگے؟ ہماری بات پر موِل نے ہنستے ہوئے ہمیں دیکھا۔

موِل شنید...... ''یقیناً یہ عمر ایسی ہوتی ہے کہ کوئی اچھا لگ سکتا ہے۔ مجھے بھی کبھی اچھا لگ جاتا تھا لیکن بس بات صرف اچھے لگنے تک ہی محدود رہ جاتی تھی۔ مجھے اپنے ماں، باپ کو let down نہیں کرنا تھا اور یہ فیلنگ اتنی اسٹرانگ تھی جو میرے سارے احساسات پر حاوی ہو گئی تھی۔'' موِل نے ایک لمحہ رک کر شرارت سے لہجے میں مزید تفصیل بتائی۔ ''ویسے پڑوس وغیرہ سے درخت پر چڑھ کر لڑکے پرچیاں وغیرہ پھینکا کرتے تھے اور ہم ان کی یہ حرکتیں نظر انداز کر دیا کرتے تھے لیکن ہنسی بھی بہت آتی تھی اور اپنی اہمیت بھی محسوس ہوتی تھی۔'' موِل نے اتنے مزے سے کہا کہ ہم بے اختیار ہنس دیے اور موِل نے مسکراتے ہوئے اپنے افسانے کو آگے بڑھایا۔

''کالج ختم کرنے کے بعد ماسٹرز میں ایڈمیشن لینے کے لیے درمیان میں ساتھ آٹھ ماہ کا گیپ تھا۔ اس دوران میں نے ایک پولیٹکل میگزین نیو لائن میں جاب کی، جہاں مجھے بہت کچھ سیکھنے کو ملا...... بچوں کے رسالہ fun line میں بھی اسسٹنٹ ایڈیٹر رہی...... اور پھر ماسٹرز کرنے کے بعد......'' انہوں نے جملہ پورا بھی نہیں کیا تھا کہ ہم نے ایکسائٹڈ ہو کر ان کی بات کاٹ دی۔

'' اچھا تو اب ہمارے افسانے میں وہ موڑ آ رہا ہے جس کا قارئین یقیناً کافی دیر سے انتظار کر رہے ہوں گے۔'' موِل نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

❖ ''موِل آپ ماشاء اللہ سلطانہ صدیقی صاحبہ کی بہو ہیں، جن کا چینل ''ہم ٹی وی'' خواتین

میں بے پناہ مقبول ہے۔ ذرا یہ تو بتائیں کہ بقول آپ کے یہ ارینج میرج ہے تو سلطانہ صاحبہ نے کون سا چراغ لے کر آپ کو ڈھونڈا؟" ہمارے شرارت بھرے لہجے پر ان کے چہرے پر بہت خوب صورت سی مسکان نے ایک روشنی سی بکھیر دی۔

موئل شنید..... "نہیں، انہیں چراغ لے کر ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ ان کی میرے امی ابو سے جان پہچان تھی۔ آنا جانا تو نہیں تھا بہرحال کسی تقریب میں ملنا ہوتا تو علیک سلیک ہو جاتی تھی۔ ان دنوں وہ شنید کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی تھیں۔ شنید ان کے سب سے بڑے بیٹے ہیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب سلطانہ آنٹی پی ٹی وی میں ڈائریکٹر تھیں اور میوزک شوز بھی کیا کرتی تھیں۔ تب ان کے اور ابو کے کامن فرینڈ ڈاکٹر ہارون نے انہیں اس رشتے کے بارے میں مشورہ دیا۔ طے یہ پایا کہ ان کے گھر دونوں فیملیز جمع ہوں۔ لڑکا اور لڑکی کو بھی ساتھ لایا جائے تاکہ وہ لوگ بھی ایک دوسرے کو دیکھ لیں۔"

❖ اوہو..... تو شنید سے آپ کی پہلی ملاقات کیسی رہی..... پسند آئے تھے وہ پہلی نظر میں.....؟ ہم نے موئل کو چھیڑتے ہوئے پوچھا تو وہ ہنس دیں۔

موئل شنید..... "ارے بس کیا بتاؤں وہ کیسی سچویشن تھی۔ ڈرائنگ روم میں کم از کم پندرہ لوگ بیٹھے ہوئے تھے۔ اور اس پر ستم یہ کہ شنید ایک کونے میں اور میں کافی فاصلے پر امی، ابو کے ساتھ دوسرے کونے میں بیٹھی ہوئی۔ بھلا اتنے لوگوں میں کیسے ہم دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے یا بات کرتے بس میں تو چپکے سے کبھی کبھی کن انکھیوں سے ان پر ایک نظر ڈال لیتی تھی پھر شاید کسی کو خیال آیا تو connecting lounge میں کچھ دیر کے لیے ہم دونوں کو آپس میں بات کرنے کے لیے ٹائم دے دیا گیا۔"

❖ اچھا تو پھر کیا باتیں ہوئیں.....؟ ہم نے دلچسپی سے پوچھا۔

موئل شنید..... "بہت سمپل سی باتیں ہوئیں..... پسند ناپسند..... پڑھائی وغیرہ کے بارے میں..... ہاں البتہ میں نے ایک سوال ان سے ضرور پوچھا تھا کہ آپ اسموکنگ یا ڈرنک تو نہیں کرتے اور انہوں نے جب نہیں میں جواب دیا تو مجھے اطمینان ہو گیا تھا کہ ان دونوں چیزوں سے مجھے سخت نفرت ہے۔"

❖ اچھا تو پہلی ملاقات میں ہی وہ آپ کو اچھے لگے تھے اور آپ دونوں نے فوراً ہاں کر دی تھی؟ ہمارے سوال پر موئل کے چہرے پر ایک انوکھی سی چمک بکھر گئی۔

موئل شنید..... "ہاں بات تو فوراً طے ہو گئی تھی لیکن شادی آٹھ مہینے بعد ہوئی تھی اور وہ پیریڈ مجھے اپنی زندگی کا سب سے حسین وقت لگتا ہے۔ مجھے ان کے ساتھ dating پر جانے کی اجازت نہیں تھی لیکن ہم فون پر بات کیا کرتے تھے۔ اکثر وہ ہمارے گھر آ جاتے، ان لمحات کا کوئی بدل ہو ہی نہیں سکتا۔ اور نہ ہی وہ خوب صورت انتظار جو ان کے آنے یا ان کے فون کا ہوتا تھا پھر کبھی زندگی میں نہیں آ سکتا ہے۔"

موئل کی اس بات سے ہم سو فیصد متفق ہیں کہ منگنی سے شادی تک کا عرصہ ایک لڑکی کی زندگی کا سب سے خوب صورت وقت ہوتا ہے کہ میاں، بیوی بننے کے بعد تو زندگی ایک دوسری ڈگر پر رواں دواں ہو جاتی ہے۔ خیر بات کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے موئل نے شادی کی تفصیلات بتائیں۔

موئل شنید..... "چونکہ یہ دونوں گھرانوں میں پہلی شادی تھی میں اور شنید اپنے، اپنے گھروں میں سب سے بڑے تھے اس لیے دونوں طرف سے ہی تیاریاں زبردست تھیں۔ مہینوں پہلے سے ڈانس

وغیرہ کی پریکٹس شروع ہوگئی تھی۔ شنید صرف تین بھائی ہیں ان کی کوئی بہن نہیں لیکن ان کی ساری کزنز نے بھرپور participate کر کے اس شادی کو یادگار بنا دیا۔ بری کی ساری شاپنگ سلطانہ آنٹی نے میرے ساتھ کی اور ہر چیز میں میری پسند کا خیال رکھا..... ان کی دوست بہت بڑی ڈیزائنر ہیں، سو آنٹی نے انہی سے بری تیار کروائی تھی۔ خاص طور پر میری شادی کا جوڑا اتنا خوب صورت تھا کہ سب ہی تعریف کر رہے تھے۔"

❖ یقیناً ایک تو دلہن پیاری اوپر سے اتنا حسین ویڈنگ ڈریس دھوم تو مچ گئی ہوگی، اچھا یہ بتائیں منہ دکھائی میں کیا ملا اور ہنی مون کے لیے کہاں گئیں؟

سول شنید..... " ہنی مون کے لیے ہم لوگ پیرس اور سوئٹزرلینڈ گئے تھے اور منہ دکھائی میں انہوں نے ڈائمنڈ کی رنگ دی تھی۔" یہی یادیں جگمگاہٹ بن کر ان کی آنکھوں میں چمک اٹھی تھیں۔

❖ "اچھا شوہر کی حیثیت سے آپ نے شنید کو کیسا پایا.....؟ اور آپ کی ساس جو خود بھی ایک سلجھی ہوئی ہیں ان کے ساتھ آپ کی ریلیشن شپ کیسی ہے؟" اب ہم ذرا ان ٹاپکس کی طرف آ رہے تھے جو ہنی مون پیریڈ ختم ہونے کے بعد شروع ہوتے ہیں یعنی Realities of life۔

سول شنید..... "شنید بہت اچھے شوہر ہیں..... کافی خیال رکھتے ہیں اور میرے خیال میں اس کا کریڈٹ سلطانہ آنٹی کو جاتا ہے۔ as a single parent انہوں نے اپنے تینوں بیٹوں کی تربیت بہت اچھی کی ہے۔ بیویوں کا خیال کیسے رکھنا چاہیے..... شوہر اگر بیوی کو محبت، عزت اور کانفیڈنس دے گا تبھی زندگی خوشگوار گزر سکتی ہے۔ یہ سب خیالات ان کے بیٹوں نے اپنی ماں سے ہی لیے ہیں۔ سلطانہ آنٹی میری ساس ہی نہیں، میری بہت اچھی دوست بھی ہیں۔ بیٹوں کی بہ نسبت وہ بہوؤں کی بات زیادہ سنتی ہیں۔"

❖ کیا شادی کے بعد آپ جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت سلطانہ صدیقی صاحبہ کے ساتھ ہی رہی تھیں۔

سول شنید..... "جی ہاں، ویسے بھی شنید اپنی امی کے سب سے بڑے بیٹے ہونے کے ناتے بہت زیادہ کلوز ہیں۔ آنٹی خود بھی کہتی ہیں کہ شنید میرے سب سے زیادہ قریب ہے، ہر جگہ میں نے اسے اپنے ساتھ ساتھ رکھا..... ہر بات اس سے share کی ہے اور اس نے بھی اپنی فیملی کو باپ کی کمی نہیں محسوس ہونے دی ہے بلکہ ایک باپ کی جگہ پر اس نے ہمیشہ اپنے آپ کو رکھا ہے۔"

❖ "آپ کے شوہر اپنی ماں سے بہت زیادہ قریب ہیں، عام عورتوں کی طرح آپ جیلس تو نہیں ہوتیں.....؟" ہم نے بہت بے ساختہ ان سے پوچھا تو بلا توقف انہوں نے جواب دیا۔

سول شنید..... "نہیں، میں نے اس بات کو بہت جلدی accept کر لیا اور اسے اپنی زندگی کا ایشو نہیں بنایا۔ ویسے بھی سلطانہ آنٹی اتنی مہربان شخصیت ہیں، ان کی محبت کا جواب جیلسی سے کیسے دیا جا سکتا ہے۔" سول کی بات بہت گہرائی لیے ہوئی تھی۔ یہ زندگی کا بہت بڑا سچ ہے کہ جو لڑکیاں شادی کے بعد شوہروں سے وابستہ ان کے پیارے رشتوں کی محبت صرف اپنے نام کروانا چاہتی ہیں۔ ان کی زندگی کبھی پُرسکون نہیں گزرتی..... یہ سوچتے ہوئے ہم پھر سول کی طرف متوجہ ہوگئے جو بتا رہی تھیں۔

"شادی کے دو ماہ بعد ہی سلطانہ آنٹی نے گھر کی چابیاں اور پیسے میرے ہاتھ میں تھما دیے کہ لو اب یہ گھر تم ہی سنبھالو، میرے دونوں دیور اس وقت باہر پڑھ رہے تھے۔ بس میں شنید اور سلطانہ آنٹی ہی تھے سو میں نے بھی ان کی اور شنید کی خواہش کے



احترام میں اپنے آپ کو گھر داری میں مصروف کرلیا۔"

❖ واہ موبل آپ تو واقعی ایک آئیڈیل بیوی اور بہو ثابت ہوئیں، اچھا یہ بتائیں کہ دیوروں کی شادی کے بعد نئے رشتوں کے ساتھ خاندان کو لے کر چلنے میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی؟"

موبل شنید...... "نہیں اللہ کا شکر ہے کہ ٹیپیکل دیورانی، جیٹھانی والا رشتہ نہیں ہے، ہمارے درمیان، ہم تین بہویں آپس میں دوست ہیں۔ میرے بعد مومنہ دریہ اور پھر سب سے چھوٹی ملکہ ہیں۔ جو خوش بخت شجاعت صاحبہ کی بیٹی ہیں اور کیلی فورنیا میں ہوتی ہیں اور آرکیٹیکٹ ہیں۔ مومنہ نے MBA کیا ہوا ہے۔ ان کے شوہر کو کوئی ایشو نہیں تھا مومنہ کے جاب کرنے پر اس لیے اس نے جلد ہی پروڈکشن کا کام سنبھال لیا تھا۔ ویسے وہ دونوں lums میں ساتھ پڑھتے تھے اس لیے ان کی شادی کو پسند کی شادی کہہ سکتے ہیں۔" موبل کی اس بات پر ہم نے شرارت سے ان کی آنکھوں میں جھانکا۔

❖ آپ کی ارینج میرج تھی اور ان کی لو میرج ہے، اپنی اور ان کی لائف میں آپ کو کیا فرق محسوس ہوتا ہے؟ موبل نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

موبل شنید......"میرے خیال میں شادی کے بعد سب میاں بیوی ایک جیسے لائف اسٹائل پر ہی آجاتے ہیں۔ مومنہ اور دریہ دوستوں کی طرح رہتے ہیں، میری اور شنید کی بھی اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے، البتہ شنید چاہتے تھے کہ میں جاب کے بجائے گھر اور بچوں پر توجہ دوں، پہلے بیٹے کے بعد میرے ہاں جڑواں بچوں کی آمد نے بھی مجھے بہت مصروف کردیا تھا۔ دوسری بات ایک بیٹا اور بیٹی ایک ساتھ دے کر اللہ نے میری فیملی تو کمپلیٹ کردی لیکن مصروفیات بہت بڑھ گئی تھیں پھر بچے جب کچھ بڑے ہوئے تو اسی زمانے میں سلطانہ آنٹی نے چینل کی بنیاد ڈالی۔ موبل پروڈکشن بھی میرے نام پر رکھا گیا۔ تب میں نے بھی اپنی صلاحیتیں آزمانے کا فیصلہ کیا اور اسکرپٹ کا شعبہ سنبھال لیا اور ماشاءاللہ اسے کامیابی سے چلا رہی ہوں جبکہ مومنہ نے پروڈکشن کا کام

سنبھالا ہوا ہے۔

❖ "یعنی آپ دونوں بہوئیں سلطانہ صدیقی صاحبہ کی محنت میں ان کا بھرپور ساتھ دے رہی ہیں؟"

موبل شنید...... "جی بالکل......! ہم سب ورکنگ ویمن ہیں، بہت مصروف زندگی ہے ہماری...... میری دیورانی ملکہ امریکا میں بہترین جاب کررہی ہیں اور میں مومنہ اور سلطانہ آنٹی یہاں بزی رہتے ہیں، ہمارے پاس عام عورتوں کی طرح چھوٹی، چھوٹی باتوں کو مسئلہ بنا کر جلنے کڑھنے کا ٹائم ہی نہیں ہے۔"

❖ تو کیا آپ سب لوگ جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت ایک ہی گھر میں رہتے ہیں؟" ہم نے موبل کی باتوں سے متاثر ہوتے ہوئے پوچھا۔ واقعی ان گھروں میں جھگڑے اور رنجشیں زیادہ ہوتی ہیں جہاں پر عورتیں اپنا دماغ صرف گھریلو سیاست و ایک دوسرے کی کاٹ میں ضائع کرتی ہیں۔

موبل شنید...... "آپ یہ کہہ سکتی ہیں، ہم ساتھ بھی ہیں اور ہماری اپنی لائف اور پرائیویسی بھی ہے۔ ہمارے گھر کے تین پورشنز ہیں، نیچے سلطانہ آنٹی رہتی ہیں، فرسٹ فلور پر ہم لوگ اور سیکنڈ پر مومنہ ہوتی ہیں، رات کو ہم سب اپنا کھانا لے کر سلطانہ آنٹی کے پورشن میں آجاتے ہیں اور پھر ہم سب مل کر ڈنر کرتے ہیں۔" موبل کے چہرے پر بے انتہا طمانیت تھی یہ سب بتاتے ہوئے...... رشتوں میں محبت اور یگانگت ہو تو گھروں اور دلوں میں کتنا سکون رہتا ہے اور ایسا ہی ماحول خود ہماری فیملی میں بھی ہے اپنوں کی یاد کو دل سے جھٹکتے ہوئے ہم پھر موبل کی طرف متوجہ ہوئے۔

❖ واقعی موبل، اللہ تعالیٰ نے سلطانہ صدیقی صاحبہ کو ان کی محنت اور نیک نیتی کا صلہ "ہم ٹی وی" کی کامیابی کے علاوہ ان کے اتنے اچھے بچوں کی صورت میں بھی دیا ہے۔ اچھا یہ بتائیں موبل کچھ عرصے سے آپ بھی کیلی فورنیا شفٹ ہوگئی ہیں، اس کی کیا وجہ ہے؟"

موبل شنید...... موبل نے گہری سانس لے کر ہماری طرف دیکھا۔

"اس کی وجہ ہمارے بچوں کی ایجوکیشن ہے۔ اپنے بچوں کی خاطر میں نے اتنا بڑا فیصلہ کیا......" موبل کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ اپنی خوشی سے امریکا نہیں گئی ہیں بلکہ ایک ماں نے صرف اپنے بچوں کے متعلق سوچا ہے۔

❖ یہاں تو ماشاء اللہ آپ ایز اے ہیڈ آف اسکرپٹ، بے حد بزی رہتی ہیں لیکن جب واپس کیلی فورنیا جاتی ہیں تو بوریت محسوس نہیں ہوتی؟" ہمارے پوچھنے پر جیسے بوریت ان کی آنکھوں میں جھلک آئی۔

موبل شنید...... "ہاں بہت بوریت محسوس ہوتی ہے، مجھے اپنے کام سے بے حد پیار ہے اور وہاں زیادہ کچھ کرنے کو نہیں ہوتا۔ بس اپنے آپ کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ ویسے بھی امریکا میں پاکستان کی طرح عورتوں کی وہ آرام دہ زندگی نہیں ہے۔ ہر کام خود ہی کرنا پڑتا ہے، میں تو وہاں پر کھانے بھی بنا لیتی ہوں۔"

❖ اچھا تو کیسے...... مختلف ڈشز بنانا سیکھیں؟ ہم نے کچھ حیرت سے پوچھا۔

موبل شنید...... "شان مسالے زندہ باد......" انہوں نے کچھ اتنی بے ساختگی سے کہا کہ کمرا ہم دونوں کے قہقہوں سے گونج اٹھا۔

"اس کے علاوہ وہاں ڈرائیونگ کے بغیر بھی گزارہ نہیں...... لیکن لائسنس بڑی مشکل سے ملتا ہے، مجھے تقریباً آٹھ ماہ لگے لائسنس ملنے میں۔ یہاں کی اور وہاں کی زندگی میں بہت فرق ہے، اگر میں اپنے دیور اور دیورانی کے ساتھ نہ رہ رہی ہوتی تو مزید بوریت ہوتی۔" موبل کی اس بات پر ہم نے

حیرانی سے انہیں دیکھا۔

❖ واہ...... یہ تو آپ لوگوں کی آپس میں محبت کی ایک اور بڑی مثال سامنے آئی ہے ورنہ آج کل کے زمانے میں ایسا کم ہی ہوتا ہے؟ ہماری حیرانی پر موئل نے مسکراتے ہوئے بتایا۔

موئل شنید......"میں اور میرے تینوں بچے ان لوگوں کے ساتھ بہت آرام، خوشی اور سکون کے ساتھ رہ رہے ہیں، ملکہ اور میرے دو میاں آپس میں بہت انڈر اسٹینڈنگ ہے بلکہ یوں کہیے ایک دوسرے سے بہت ڈھارس ہے ہمیں...... اگر کبھی اس کی طبیعت خراب ہو تو میں اس کا بہت خیال کرتی ہوں اور اسی طرح وہ بھی کرتی ہے۔ اصل میں بات یہ ہے کہ ساتھ رہنے کے لیے دل بڑا رکھنے کی ضرورت ہے چھوٹی، چھوٹی باتوں کو اگنور کر کے positivity کے ساتھ رہنے والوں کے دل کبھی ایک دوسرے سے خراب نہیں ہوتے، اب دیکھیے ناں میں یہاں پاکستان آگئی ہوں لیکن میرے بچے وہیں ان لوگوں کے پاس ہیں، اسی طرح میں بھی ہمیشہ ان کے کام آنے کو تیار رہتی ہوں...... ویسے میرے بچے انشاء اللہ آج رات یہاں آ بھی رہے ہیں۔" موئل کے لہجے میں ناسٹلجی کی مٹھاس سمٹ آئی۔

❖ موئل، آپ وہاں ہوتی ہیں اور آپ کے پیا جی یہاں پاکستان میں---تو کیسا لگتا ہے، یاد تو آتی ہوگی؟ ہمارے ہجر و وصال کے اس سوال پر وہ ایک لمحے کو خاموش سی ہوئی تھیں۔

موئل شنید......"ہاں بہت یاد آتے ہیں ظاہر سی بات ہے کہ ان کی کمی دل ہر پل محسوس کرتا ہے، دل زیادہ اداس ہوتا ہے تو جم چلی جاتی ہوں یا پھر ملکہ کے ساتھ کہیں شاپنگ وغیرہ پر......"

❖ اور پھر جب کافی مہینوں کے بعد ملاقات ہوتی ہے تو نئے پن کا احساس بھی جاگتا ہوگا؟ ہم نے انہیں چھیڑتے ہوئے پوچھا۔

موئل شنید......"ہاں دس پندرہ دنوں کو سب کچھ نیا، نیا اور کافی رومینٹک لگتا ہے اور پھر ہم واپس اسی روٹین میں چلے جاتے ہیں۔" موئل نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔

❖ میاں جی آپ کی سالگرہ یاد رکھتے ہیں، تحفے اور کارڈ ملتے ہیں آپ کو؟

موئل شنید......"عام بیویوں کی طرح مجھے تو ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں، بس مجھے chill رہنا پسند ہے، البتہ انیورسری پر اگر میں امریکا میں ہوں تو شنید کی طرف سے پھول آتے ہیں اور اگر یہاں ہوں تو ہم ڈنر پر چلے جاتے ہیں۔"

❖ اچھا موئل امریکا کی اور یہاں کی عید میں تو آپ کو بہت فرق محسوس ہوتا ہوگا؟

موئل شنید......"ایسا ویسا فرق...... پاکستان کی عیدیں جتنی پُر رونق ہوتی ہیں، امریکا میں اتنی ہی بورنگ ہوتی ہیں۔ وہاں پر عید کی صبح نماز کے لیے عورتیں بھی مسجد جاتی ہیں، وہاں سے واپس آ کر بچے اسکول اور جاب پر جانے والے اپنے کام پر چلے جاتے ہیں، شام کو کہیں کھانے پر چلے گئے اور بس جناب عید ختم...... ویسے میں پاکستان میں بھی عید پر اپنے لیے کوئی خاص اہتمام نہیں کرتی، البتہ بچی کے لیے عید کی تیاری میں کوئی کمی نہیں آنے دیتی۔"

❖ یعنی عام خواتین کی طرح عید پر نئے کپڑے شوز فیشل وغیرہ وغیرہ کچھ بھی نہیں......؟ ہم نے ناقابلِ یقین نظروں سے دیکھا۔

موئل شنید......"آپ یقین کریں میں خاص طور پر عید کا ڈریس کبھی نہیں سلواتی اور نہ ہی میچنگ چوڑیوں یا دوسری چیزوں کے لیے پریشان ہوتی ہوں۔ بس وارڈ روب میں رکھا ہوا کوئی بھی اچھا سا سوٹ پہن لیتی ہوں۔"

❖ "چلیں، یہ تو اچھی بات ہے ویسے آپ کو اپنی کون سی عادت بری لگتی ہے؟" ہمارے سوال پر

وہ ہنس دیں۔

موبل شنید...... "سچ بتاؤں...... میرا دل چاہتا ہے کہ میں بہت رعب و دبدبے والی ہوتی جبکہ میں کافی نرم مزاج اور soft spo ken ہوں ویسے میرا اسکرپٹ کا شعبہ کچھ ایسا ہے کہ کبھی، کبھی رائٹرز سے بہت صاف گوئی سے کہنا پڑتا ہے کہ اسکرپٹ پسند نہیں آیا۔" ہم ان کے ملیح چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے ہنس دیے۔

❖ لیکن موبل اس وقت بھی آپ کا لہجہ بہت شیریں ہوتا ہوگا یقیناً رائٹرز مائنڈ نہیں کرتے ہوں گے۔ اچھا چلیں یہ بتائیں آپ کو کبھی کسی رشتے سے دکھ پہنچا......؟ موبل نے کچھ سوچتے ہوئے ہماری طرف دیکھا۔

موبل شنید...... "ہاں، مجھے دوستی کے رشتے نے دکھ دیا ہے۔" ان کے اس جملے میں چھپے شکوے کو محسوس کرتے ہوئے ہم نے ذرا ایک مسکراتا ہوا سا سوال ان کے روبرو کردیا۔

❖ ذرا یہ تو بتائیں کہ چھوٹی موٹی کھٹ پٹ کے بعد منانے میں کون پہل کرتا ہے؟ آپ یا شنید صاحب......؟

موبل شنید...... "زیادہ تر منانے کا کام میں ہی کرتی ہوں، ویسے وہ بھی کبھی کبھی یہ کام کر لیتے ہیں...... ویسے شنید جب گھر پر ہوں تو ان کی خواہش ہوتی ہے ان کی فیملی بس ان کے اردگرد ہی رہے...... اس معاملے میں بہت sensitive ہیں وہ۔"

ہماری ہیروئن کا افسانہ اب آخری مراحل میں داخل ہورہا تھا۔

❖ موبل آپ کی ہنستی مسکراتی زندگی میں کوئی ایسی یاد جو آپ کو کبھی اداس کردیتی ہو؟

موبل شنید...... "ہاں، ایک بہت تکلیف دہ یاد ہے، جسے بھولنا بہت مشکل ہے۔" دکھ جیسے ان کی آنکھوں میں جھلک آیا تھا۔

"میں نے اپنے ابو کو دس سال کینسر سے جنگ کرتے ہوئے دیکھا ہے...... وہ بہت بہادر تھے، اتنے طویل عرصے میں کئی بار انہوں نے اس مرض کو شکست دی لیکن یہ موذی مرض دوبارہ پھر ہوجاتا تھا...... میں نے ان کو بیڈ پر لیٹے ہوئے دیکھا ہے جس تکلیف سے وہ گزرتے تھے اس کی اذیت اپنے دل پر محسوس کی ہے۔ شدید ترین ٹینشن میں گزرے تھے وہ دس سال، میری فیملی جیسے ہل سی گئی تھی۔ امی تو اس وقت سے کچھ ایسی ٹوٹیں کہ ابو کی موت کے بعد سے اب تک نہیں سنبھل سکی ہیں۔"

کچھ دیر کے لیے ہم دونوں ہی خاموش ہوگئے...... بیٹی ہونے کے ناتے موبل کا دکھ ہمیں بھی اپنے دل پر اترتا ہوا محسوس ہورہا تھا۔ بہرحال ہمارا افسانہ بھی اب اختتام پذیر ہورہا تھا۔

❖ موبل اپنے اس خوب صورت افسانے کے اینڈ پر ہم چاہیں گے کہ آپ پوری دنیا میں پڑھے جانے والے ہمارے پاکیزہ ڈائجسٹ کے قارئین کو بہت پیارا سا کوئی پیغام دیں۔

موبل شنید...... "میں سب خواتین کو یہ بتانا چاہتی ہوں کہ دنیا میں ہر رشتہ خوب صورت ہوسکتا ہے اگر اسے positivity کے ساتھ لیا جائے اس کی ایک کلاسک مثال میری ساس سلطانہ صدیقی ہیں جنہوں نے اپنی تینوں بہوؤں کو اپنے گھر اور اپنے دل میں اتنی محبت سے ویلکم کیا جیسے کوئی ماں اپنی بیٹیوں کو کرتی ہے۔"

ہمیں موبل کی اس بات سے مکمل اتفاق ہے...... سلطانہ صدیقی کے اس آئیڈیل خاندان میں ہر سو بکھری محبتیں، سکون اور آپس میں اتنی یگانگت ہم سب سے کہہ رہی ہے کہ اگر دلوں میں وسعت اور حسن خلق ہو تو خوشیاں سو واٹ کا بلب بن کر ہر گھر میں جگمگا سکتی ہیں۔ (بلاشبہ)

ملائشیا یہ تو نے کیا کیا!

عظمیٰ آفاق سعید



''امی، امی! اسکول کی طرف سے ملائشیا کا ٹرپ آیا ہے۔ آپ چھٹیوں میں مجھے جانے دیں گی ناں؟'' اجیہ اسکول سے واپس آتے ہی چیختے ہوئے بولی۔

'' بیٹا، پاگل ہوگئی ہو لڑکیوں کو کوئی اکیلے گھومنے پھرنے جانے کی اجازت دیتا ہے بھلا، میرے سامنے تو کہہ دیا ہے۔ پاپا سے تو کہنا بھی مت۔'' میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"بھئی ساری کلاس جا رہی ہے، ٹیچرز بھی ساتھ ہوں گی، میں کوئی اکیلی جہاز میں بیٹھ کر تھوڑی جا رہی ہوں۔" اب وہ روہانسی ہو گئی تھی۔

"چلو اگر ہم ایسا کریں کہ چھٹیوں میں پوری فیملی ملائشیا کا پروگرام بنالے پھر تو میری بیٹی خوش ہو جائے گی نا" میں نے اسے مناتے ہوئے کہا۔

"بس، بس رہنے دیں! پاپا اتنے بزی ہوتے ہیں۔ وہ کبھی نہیں جائیں گے، وہ اپنا آفس... چھوڑ نہیں سکتے اور آفس ظاہر ہے ملائشیا گھومنے جانے سے تو رہا......" اجیہ غیر یقینی تاثر سجائے مجھے دیکھ رہی تھی یا شاید مجھے دیکھ کر اندازہ لگا رہی تھی کہ میں سیریس ہوں بھی یا نہیں۔ مگر میں نے اسے مطمئن کیا کہ میں ضرور تمہارے پاپا کو منانے کی کوشش کروں گی کہ ہم اس دفعہ چھٹیوں پر ضرور ملائشیا چلیں اور آخرکار میں اس کوشش میں کامیاب ہو ہی گئی۔ اس کے لیے کیا، کیا پاپڑ بیلنے پڑے۔ اس پر ایک الگ سفرنامہ کسی اور وقت کے لیے چھوڑ دیتے ہیں۔ (ویسے اسے آپ میرا ریسرچ ورک بھی کہہ سکتے ہیں) تو طے یہ ہوا کہ ہماری فیملی اور دیور کی فیملی پندرہ دنوں کے لیے ملائشیا جائیں گے۔

بچوں میں تو خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ سارے بچے ایسے بھاگ، بھاگ کر تیاریوں میں حصہ لے رہے تھے کہ اگر ایسی تیاریاں اپنے سالانہ امتحانات میں کرلیں تو ٹاپ کریں۔

(دیور) نایاب اور (دیورانی) صائمہ گھومنے پھرنے میں کافی ماہر ہیں، انہیں شوقین نہیں کہہ رہی کہ وہ تو اکثر لوگ ہوتے ہیں جو باہر جا کر پریشان ہوتے ہیں اور کرتے بھی ہیں۔ ہاں تو انہیں ہمارے خاندان کا ابنِ بطوطہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کی فیملی جس میں ان کے چار بچے نیہاں، اشعر، منال اور ارحم شامل تھے اور ہمارے سفر کے ساتھی تھے۔

جب دبئی میں رہائش پذیر نند امبر کو پتا چلا کہ ہم لوگ ملائشیا جا رہے ہیں تو اس کی بیٹی ریحاب جسے ہم ڈولی کہتے ہیں وہ بھی دبئی سے ہمیں جوائن کرنے آ گئی..... اور یوں ہمارے چھوٹے سے گروپ میں ایک شوخ و چنچل مگر بے حد سمجھدار لڑکی آ گئی۔--- جو آگے جا کر گائیڈ بھی ثابت ہوئی۔

"چلو بھئی اب تو ڈولی آ گئی ہے، اب سفر کا مزہ دوبالا ہو جائے گا۔" میں نے ڈولی کو پیار کرتے ہوئے کہا...... یہ لڑکی سب کی لاڈلی ہے.... بلکہ ہماری امی کی بھی ہے۔

"مامی! میں تو جا چکی ہوں تو میں نے سوچا کہ آپ لوگوں کے ساتھ کوئی ٹور گائیڈ بھی تو جانا چاہیے۔" ڈولی کسی ماہر ٹور گائیڈ کی طرح ہاتھ لہرا لہرا کر ہمیں سمجھا رہی تھی اور وہاں کے خاص مقامات کے بارے میں بتا رہی تھی۔

ہم سب لوگ اس کی باتوں کو بڑے اشتیاق سے سن رہے تھے کہ ویسے بھی وہ ڈیبیٹر تو ہے ہی۔

اور آخرکار..... وہ دن بھی آ ہی گیا جب ہمیں بذریعہ سری لنکن ائیر لائنز ملائشیا کے شہر کوالالمپور پہنچنا تھا۔ شام پانچ بجے کی فلائٹ تھی مگر ہمارے بچے صبح کے ناشتے کے بعد سے تیار ہو کر مٹک مٹک کر گھوم رہے تھے۔ اجیہ صاحبہ کی خوشی دیدنی تھی کیونکہ ان کے دل کی مراد جو پوری ہو رہی تھی۔ ایمان، علی اور کیسوئی بھی بہت خوش تھے۔ ان بچوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مسجد میں اعلان کروا دیں کہ حضرات، ایک ضروری اعلان سماعت فرمائیں آفاق میاں اپنے خاندان کے ساتھ ملائشیا جا رہے ہیں۔ سب مبارک باد دینے ان کے گھر پہنچیں شکریہ۔ ہر بچہ اپنی اوقات سے زیادہ تیار تھا۔ گھر سے نکلنے کا ٹائم ہو رہا تھا اور آفاق ابھی تک آفس سے واپس نہیں آئے تھے۔

"امی، کیا پاپا کو پتا نہیں ہے کہ ہم آج ہی جا رہے ہیں؟" ایمان کافی دیر.... انتظار کرنے

کے بعد چڑ کر بولا۔

"اگر وہ نہیں آئے، تو ہم ان کو چھوڑ کر چلے جائیں گے۔" علی تو بالکل معاف کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"بیٹا، آرہے ہیں پاپا راستے میں ہیں، بس تم لوگ ریڈی رہو۔ جیسے ہی پہنچیں گے ہم نکل جائیں گے۔" میں نے بچوں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ حالانکہ مجھے بھی گھبراہٹ ہورہی تھی۔ آفاق ہر چیز کو بہت لائٹ لیتے ہیں۔ یہ ان کی پرانی عادت ہے۔ ایک دفعہ ہم لوگ اسلام آباد جارہے تھے۔ یہ اپنے آفس سے آتے آتے لیٹ ہو گئے حالانکہ میں کہہ بھی رہی تھی کہ دیر ہو گئی لیکن وہی سکون اور نو ٹینشن۔ جب ہم کاؤنٹر تک پہنچے تو کاؤنٹر بند ہو چکا تھا۔

"آپ نے تو اخروٹوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا......!" کاؤنٹر پر بیٹھا ہوا عملہ ہمیں ایسے گھور رہا تھا جیسے ہم کسی اور سیارے کی مخلوق ہوں۔

آج بھی کہیں تاریخ نہ دہرائی جائے...... میں سوچ کر ہول رہی تھی کہ آخر کار آفاق آگئے۔ جیسا کہ آپ کو پتا ہے کہ ہیرو آخر میں ہی آتا ہے۔ اسی طرح ہمارے میاں نے کسی ہیرو کی طرح انٹری دے کر ہم سب کو انتظار کی اذیت سے نجات دلائی۔

ہمارا تیرہ لوگوں کا قافلہ جب ائرپورٹ کے امیگریشن کے مراحل سے فارغ ہو کر لاؤنج میں آبیٹھا تو تب میرے دل کو تسلی ہوئی کہ واقعی ہم لوگ گھومنے جارہے ہیں۔

بچے پورے لاؤنج میں سرگشت کررہے تھے۔ کوئی کسی اسٹال پر بھاگ رہا تھا تو کوئی کافی پی رہا تھا۔ آفاق کسی سے ٹیلی فون پر ایسے مصروف دکھائی دے رہے تھے جیسے ان کے جانے سے سارے آفس کا نظام درہم برہم ہو جائے گا۔

"بیٹا...... یہاں سے میگزین خریدنے کی کیا ضرورت تھی؟ پتا ہے ناں کہ ائرپورٹ کے اندر ایک روپے کی چیز سو روپے کی ملتی ہے۔" اجیہ جب ایک میگزین خرید کر لائی تو میں نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

"چلتے وقت نانی نے ہم سب کو پیسے دیے ہیں کہ اپنی پسند کی جو چیز اچھی لگے اسے خرید لینا۔" اجیہ مجھے یاد دلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"بیٹا، جتنی اسپیڈ سے تم لوگ پیسے خرچ کررہے ہو مجھے نہیں لگتا کہ وہاں پہنچنے تک بچیں گے۔" نایاب کی فیملی کے ساتھ ہمارے بچے اور ہم لوگ بہت انجوائے کرتے ہیں۔ ایک تو ان کے بچے اور ہمارے بچے تقریباً ہم عمر ہیں اور دوسرا وہ بچوں کے آگے کسی کی بھی نہیں چلنے دیتے۔ اگر کوئی بچہ کسی چیز کی ضد کررہا ہے تو وہ ضرور پوری ہوگی۔ بچوں کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے جبکہ میری اور آفاق کی بھی یہ عادت ہے کہ جگہ اور حالات کے حساب سے کام کیا جائے۔ یہی ہم اپنے بچوں کو سمجھاتے ہیں۔

تھوڑی دیر بعد ہی جہاز پر جانے کی اناؤنسمنٹ ہوگئی اور ہمارا پورا خاندان جہاز پر سوار ہونے کے لیے روانہ ہوا۔ جہاز کے دروازے پر ہی دو ائرہوسٹس ہاتھ جوڑے کھڑی تھیں اور آئی بوڈ...ے کہہ رہی تھیں۔

"امی شاید اندر ہمیں آئی پوڈ ملے گا؟" ایمان صاحب میرے کان میں منمنائے۔

"ابھی ملے گا تو لے، لے ناں۔" میں بھی خوشی خوشی بولی۔

"اپنا پرانا والا سیل کردوں گا۔ ویسے بھی ایک جگہ سے ٹوٹ گیا ہے۔" ایمان اب آگے کے پروگرام بنا رہا تھا۔

"جو مرضی آئے وہ کرنا، ابھی سیٹ پر تو بیٹھ جاؤ۔" میں نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

چونکہ ہم سری لنکن ائرلائنز سے سفر کررہے تھے اسی لیے سارا عملہ سری لنکن تھا۔ کالی، کالی ائرہوسٹس اور کالے، کالے اسٹیورڈز نگران کی پھرتی غضب کی تھی۔ لال ساڑیوں میں جوڑا باندھے بلا کی کشش

لیے یوگنڈا کی فلموں کی ہیروئن لگ رہی تھیں۔ گورے، گورے تو لیے تھوڑی دیر بعد ان کالے، کالے ہاتھوں سے ملے تو اللہ کی قدرت پر سبحان اللہ کہنے کو دل چاہا۔ سارا عملہ انتہائی مستعدی سے اپنے کاموں میں مشغول تھا۔ کوئی کسی مسافر کو سیٹ بتا رہا تھا تو کوئی کسی کا بیگ اوپر کے خانے میں رکھ رہا تھا۔ کوئی کسی کو پانی لا کر دے رہا تھا تو کسی کو کمبل دے رہا تھا۔

مجھے پچھلے سال پی آئی اے سے کہیں جانے کا اتفاق ہوا۔ شدید گرمی تھی تو شاید میں نے بیٹھتے ہی پانی مانگ لیا۔

''بی بی جہاز تو اڑنے دیں پھر دیں گے آپ کو پانی۔'' ائر ہوسٹس نے غصے بھری مسکراہٹ سے مجھے جواب دیا تھا۔

شاید میں دوبارہ مانگتی تو وہ مجھے ڈانٹ بھی دیتی..... کہ زمین پر پانی کی بلوبلو ہے اور تم آسمان پر آتے ہی پانی مانگ رہی ہو۔ مجھے پرانی باتیں یاد آرہی تھیں اور ہنسی بھی آرہی تھی۔ جب سب سے موبائل سوئچ آف کرنے کے لیے کہا گیا تو میں نے فوراً امی کو فون کر کے خدا حافظ کہا۔ دوسری طرف سے اماں دعائیں دینے اور سب کا خیال رکھنے بچوں کو اپنے پاس رکھنے اور جانے کیا کیا نصیحتوں کی پٹاری کھول رہی تھیں..... اور یہ ان کی ہمیشہ کی عادت ہے کہ وہ اپنے سے زیادہ دوسروں کا خیال جس طرح خود رکھا کرتی ہیں اسی طرح رکھنے کے لیے مجھ سے بھی کہتی ہیں.....!

''امی..... اچھا، اچھا میں سمجھ گئی، بس آپ دعا کیجیے گا کہ ٹرپ بہت مزے کا گزرے۔ اب میں وہاں پہنچ کر فون کروں گی' خدا حافظ۔'' میں نے خود ہی فون بند کیا جبکہ دوسری طرف سے اب بھی وہ مجھ پر کچھ پڑھ کر پھونک رہی تھیں بلکہ ان کی دعاؤں کے حصار میں پورے جہاز کے مسافر ہوں گے۔

ہماری اماں ایسی ہی ہیں مجھتی، جاں نثار، شاید ساری مائیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔

ہماری کراچی سے یہ فلائٹ تین گھنٹے کی تھی پھر تین گھنٹے کا سری لنکا کے شہر کولمبو میں stay تھا۔ جبکہ ہم سب ملنے جلنے والوں کو بتا کر آئے تھے کہ ہم سری لنکا بھی گھومیں گے اور وہاں کی بھی سیر کریں گے۔

''کتنا جھوٹ بولتی ہو تم عظمیٰ؟'' آفاق جہاز میں بیٹھ کر مجھ سے کہہ رہے تھے..... یوں بھی انہیں ڈانٹنے کے بہانے ڈھونڈنے پڑتے ہیں..... ہمارے ہاں مذاق کی بات کب سیریس ہو جاتی ہے، یہ مجھے پتا ہی نہیں چلتا..... چاہے لاڈ سے ہی شروع ہو۔

''کیا جھوٹ بول دیا میں نے؟'' میں نے انہیں سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''جب لوگ کہیں جاتے ہیں..... تو اتنے زیادہ قصے سناتے ہیں جتنے کہ ہوتے بھی نہیں ہیں۔ تو کیا میں جھوٹ بول رہی ہوں سب سے۔''

''جو تم سب سے بول کر آئی ہو کہ ہم دو تین ملک گھومنے جا رہے ہیں..... یہ کوئی اچھی بات ہے..... بعد میں اگر کسی نے مذاق اڑا دیا تو سب سے زیادہ تم ہی برا مانو گی، ہے ناں؟''

''کس سے بول کر آئی ہوں۔ آپ کی بہنوں سے اور اس میں جھوٹ کیا ہے۔ ابھی یہ جہاز کہاں اترے گا؟ سری لنکا میں ناں۔'' میں نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں تو۔'' وہ مسکرائے۔ (یا مسکرانا پڑا..... کہ بات گھر سے شروع ہو رہی تھی)

''بھئی پورا اوپر سے اڑتا ہوا سری لنکا پر سے جائے گا ناں..... تو گھوم لیا ہم نے سری لنکا۔'' میں نے بات بناتے ہوئے کہا..... اور ان سے پہلے میری دیورانی چھمن سے ہنس دیں..... اور دیور تائید میں سر ہلانے لگا۔

کچھ دیر بعد جہاز میں کھانا سرو کیا گیا۔ کھانے

کو بھی برا نہیں کہنا چاہیے مگر جب کسی ملک کی کوئی چیز کھائی نہ ہو۔ اس کے ذائقے سے بھی زبان ناواقف ہو تو جیسا ان حالات میں کھانا لگنا چاہیے ویسا ہی لگا۔

ہمارے بچے تو اوقات سے باہر ہو جاتے ہیں۔ کھانا سمجھ نہیں آیا تو ہر فلیور کی ڈرنک ہی پینے میں لگ گئے۔ کوئی جوس مانگ رہا تھا تو کوئی کافی۔ تھوڑی دیر برداشت کرنے کے بعد جب میں نے اپنے بچوں کو آنکھیں دکھائیں تب سیدھے ہوئے۔

”میری یلو والی ڈرنک رہ گئی امی۔“ چھوٹی کیسوئی کافی دیر بعد بولی۔

”کوئی بات نہیں رہنے دو۔“ میں نے اسے چپ کراتے ہوئے کہا۔

جہاز میں ناہاب اپنی فیملی کے ساتھ جبکہ میں آفاق کے ساتھ بیٹھی تھی تاکہ سب لوگ اپنی، اپنی فیملی کے ساتھ انجوائے کرسکیں، کوئی کسی کی وجہ سے تکلف میں نہ پڑے۔ مگر بچوں نے اپنی ٹیم الگ بنائی تھی اور وہ ہم بڑوں سے کافی دور تھے۔

”ہم بھی تو گھومنے جارہے ہیں۔ ہمیں بھی تھوڑی آزادی دے دیں۔“ جب میں نے ایمان و علی کو قریب بیٹھنے کے لیے کہا تو دونوں صاحبزادے کسی افلاطون کی طرح مجھے ہی سمجھانے لگے۔

تین گھنٹے کی فلائٹ کے بعد جہاز کولمبو اترا۔ دروازے پر وہی ائر ہوسٹس دوبارہ ہاتھ جوڑے کھڑی کچھ کہہ رہی تھیں۔

”امی، امی...... آنٹی مجھ سے معافی مانگ رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے ڈرنک نہیں دی تھی ناں۔ اس وجہ سے!“ کیسوئی مجھے بتارہی تھی۔

غور کرنے پر پتا چلا کہ وہ سب کو ”آئی بوان“ کہہ رہی تھی جس کا یقیناً مطلب ان کی زبان میں ”السلام علیکم“ ہی ہوگا۔

جسے ہم پہلے جانے نہیں آئی بو ڈو وغیرہ سمجھ رہے تھے۔

سری لنکا کی سیر

کولمبو کا ائر پورٹ جہاں ہمیں تین گھنٹے رکنا تھا ائر پورٹ کم شاپنگ سینٹر زیادہ دکھائی دے رہا تھا۔ بیوٹی پارلرز، کپڑوں کی دکانیں، سری لنکا کی روایتی چیزیں، گفٹ شاپس، لوکل کپڑوں کی دکانوں کے ساتھ برانڈڈ کپڑوں کی بھی بے تحاشا دکانیں یہاں پر موجود تھیں۔ گوتم بدھ کا بڑا سا اسٹوپا بیچ لاؤنج میں رکھا ہوا تھا۔ جس کے آگے دیے اور پھول کے تھال بھی موجود تھے۔ ساتھ ہی ایک بورڈ لگا تھا کہ یہ ہمارے خدا ہیں ان کی طرف پیٹھ کر کے تصویر نہ بنوائیں۔ تو ہم نے ان کے قانون کے احترام میں ان کے برابر کھڑے ہو کر چند تصویریں لیں۔

سری لنکا میں ہاتھی بہت پائے جاتے ہیں۔ شاید یہاں کا قومی جانور بھی یہی ہو۔ یہاں کے لوگ بھی اسی کی طرح کے ہوتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ہاتھی میں کنفیوژن نہیں ہوتی سری لنکن میں ہوتی ہے۔

چونکہ ہمارے پاس وقت بہت تھا اور مقابلہ بھی سخت نہیں تھا اس لیے ائر پورٹ کے چپے، چپے کو ایسے ازبر کررہے تھے جیسے میٹرک کے امتحانات میں جوابات کو کرتے تھے۔

ائر پورٹ پر تھوڑے تھوڑے وقفے سے فلائٹس آرہی تھیں۔ انٹرنیشنل کراؤڈ دیکھنے کو مل رہا تھا۔ جو آج کل پاکستان میں بالکل بھی نظر نہیں آتا۔ وجہ صرف اور صرف امن...... ورنہ سری لنکا جیسا ملک جہاں تھوڑے عرصے پہلے تک تامل ٹائیگرز جیسے گروپ سرگرم تھے اور انہوں نے پورے ملک کا امن و امان خراب کررکھا تھا۔ سب لوگ سری لنکا کے نام سے ہی گھبراتے تھے...... مگر صرف گورنمنٹ کے درست فیصلے اور سری لنکن لوگوں کا اپنی گورنمنٹ کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کا عہد اس ملک کو دہشت گردی جیسے موذی مرض سے نجات دلا گیا۔

کاش ہمارا ملک، جس کو نہ جانے کس کی نظر لگ

گئی ہے۔ اس دہشت گردی، بدانتظامی، کرپشن اور لوٹ کھسوٹ جیسی بلاؤں سے نجات حاصل کرلے۔ اللہ اس کو سلامت رکھے اور اس کا برا چاہنے والوں کو اندھے گڑھے میں گرادے، آمین۔

مجھے ہر جگہ اپنا ملک پاکستان شدت سے یاد آرہا تھا۔ میں جس چیز کو بھی دیکھ رہی تھی تو بار بار یہی سوچ رہی تھی کہ یہ تو ہمارے ملک میں بھی ہوسکتی ہے اور ہونی چاہیے۔

مثال کے طور پر کولمبو ائرپورٹ کے کاریڈور کے ایک کارنر کو ڈیکوریٹ کرنے کے لیے انہوں نے سائیکل سجا رکھی تھی کیونکہ اس ملک کے زیادہ تر لوگ اسی سواری پر سفر کرتے ہیں۔ کسی کارنر پر ٹھیلا رکھا ہوا تھا۔

پوری دنیا کے دیکھنے والے مسافروں کو اس ملک کی سواریاں اس ملک کی ثقافت دیکھنے کو بھی مل رہی تھی۔ کسی کارنر پر ڈھول ڈرم لٹک رہے تھے تو کہیں ڈمی پر عورت اور مرد کا قومی لباس نظر آرہا تھا۔

"کیا یہ سب ہمارے ہاں نہیں ہوسکتا؟" میں نے آفاق سے کہا جو میرے ساتھ ہی کھڑے تھے۔

"بس ساری بات نیت کی ہے......!" آفاق بھی ساری چیزوں کو دیکھ کر حیرت زدہ ہورہے تھے۔

بچے مختلف کارنرز پر کھڑے ہوکر تصویریں اور موویز وغیرہ بنانے میں مصروف تھے۔ جبکہ نایاب اور صائمہ چائے کا آرڈر دے کر ہمیں اشارے کررہے تھے۔

"یہاں کی چائے تو پوری دنیا میں معروف ہے۔ چائے پی جائے تاکہ فرق تو پتا چلے کہ گھر کی چائے سری لنکا کی چائے سے جیتی یا نہیں......!" صائمہ ہمیں مطلع کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

بچے ہوٹل میں اپنا، اپنا آرڈر دینے میں بزی تھے۔

"بیٹا ذرا آرام سے...... ابھی چار گھنٹے کی فلائٹ اور ہے طبیعت نہ خراب ہوجائے۔ تھوڑی کم چیزیں لو۔" جب میں نے بچوں کو زیادہ چیزیں آرڈر کرتے ہوئے دیکھا تو پریشان ہوکر انہیں ٹوکا۔

ائرپورٹ پر صرف امریکن ڈالرز چل رہے تھے۔ تقریباً پاکستانی پانچ ہزار کی چار کپ چائے پی تو کافی تکلیف ہوئی بلکہ چائے پینے سے پہلے تو کم سر درد ہورہا تھا بل دینے کے بعد کافی زیادہ ہوگیا۔

"اب یہ کیک، جوس، برگر وغیرہ سب کھانا نہیں چھوڑو گے تو بتاؤں گی۔" میں نے کھا جانے والی نظروں سے ایمان اور علی کو دیکھا۔

بچے حیران و پریشان مجھے دیکھ رہے تھے کہ تھوڑی دیر پہلے تک تو امی ہنس رہی تھیں اب ناگن کیوں بن گئی ہیں۔ اب انہیں کیا بتاتی کہ پانچ ہزار تو تمہاری ماں چائے میں سوڑھ گئی باقی دس، پندرہ تم لوٹ ڈکار جاؤ۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

کافی دیر دوڑ بھاگ کرنے کے بعد بچے تھکن سے اب چُور ہورہے تھے۔ بچے تو بچے بڑے بھی تھکن محسوس کررہے تھے۔ مجھے بھی زیادہ دیر بیٹھنے سے طبیعت خراب محسوس ہورہی تھی۔ اجیہ اور نیہاں بھی کسی کاسمیٹک شاپ سے اپنا میک اپ کروا آئی تھیں۔

"بیٹا پاگل ہوگئی ہو، کیوں لپ اسٹک لگا کر آگئیں......" میں نے اجیہ کو ڈانٹتے ہوئے کہا۔

"بھئی ان آنٹی نے فری سیمپل میں سے اپلائی کیا ہے کہ اچھا لگے تو لو نہیں تو مت لو۔ فری میں لگوا کر آئی ہوں، نیہاں تو بال بھی بنوا کر آئی ہے۔" اجیہ اطمینان دلاتی ہوئی بولی۔

اب جو میں نے نیہاں کو دیکھا تو اس کے بال کرل بھی ہوئے تھے۔

"چاچی ہم پرفیومز بھی لگا کر آئے ہیں، سونگھیں تو......" نیہاں قابل بنتے ہوئے بولی۔

"اب مت جانا......! لوگ سمجھیں گے کہ فقیر نیاں ہیں، لینا دینا کچھ ہے نہیں۔ بس چیزیں لگوانے آگئیں......" میں نے دونوں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

اللہ کا شکر ہے کہ تھوڑی ہی دیر بعد فلائٹ کا ٹائم ہوگیا۔ کیونکہ اگر اس سے زیادہ دیر ہوتی تو واقعی میری طبیعت خراب ہوجاتی۔

چار گھنٹے کی مزید فلائٹ تھی اور پھر ہمیں ملائیشیا کے شہر کوالالمپور پہنچنا تھا۔ فلائٹ کافی آرام دہ رہی کیونکہ رات کا وقت تھا اور پوری فلائٹ کی لائٹس بھی آف تھیں۔ تقریباً سارے ہی مسافر سوتے ہی رہے۔

میری جب طبیعت خراب ہوتی ہے تو میں کچھ نہیں کھا سکتی۔ فوڈ سرو ہوا تو میں نے فوراً منع کردیا بلکہ اس کی خوشبو سے بھی مجھے متلی محسوس ہورہی تھی۔ سارا راستہ تقریباً سوتے ہوئے ہی گزرا۔ بچے بھی تین گھنٹے کی بھاگم دوڑی سے نڈھال ہوچکے تھے تو وہ سب بھی سوگئے۔

ہم پہنچے کوالالمپور میں!

رات کے وقت جب جہاز ملائیشیا کی حدود میں داخل ہوتا ہے تو یہ ملک زمین پر بالکل ستاروں کی طرح جگمگا رہا ہوتا ہے۔ اوپر سے ایسا لگتا ہے جیسے سونے اور ہیروں کے جڑاؤ زیورات لائن سے لگے ہوئے ہوں۔ پورا شہر روشنیوں سے جگر جگر کر رہا تھا۔

چونکہ جہاز اب کوالالمپور ائرپورٹ پر اترنے والا تھا۔ میں نے سوتے ہوئے بچوں کو جگایا۔ لیکن بچے اتنے تھک چکے تھے کہ کوئی اٹھنے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"بیٹا گھومنے کا وقت تو اب آیا ہے۔ تم لوگ سفر میں ہی تھک گئے۔" میں نے علی کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ جو بالکل غٹ سو رہا تھا۔

"اگر تھک گئے ہو تو واپس گھر چلتے ہیں۔" آفاق نے بچوں کو چڑاتے ہوئے کہا۔

بس یہ ہی وار کاری ضرب ثابت ہوا۔ سارے بچے دھڑا دھڑ اٹھ بیٹھے۔

تھوڑی دیر بعد ہی جہاز نے کوالالمپور ائرپورٹ پر لینڈ کیا۔

ہم بچوں کو جمع کرکے جہاز سے اترے آفاق کو تو بعض دفعہ اتنی پریشانی میں دیکھا کہ ٹوٹل تیرہ لوگ پورے کرنے میں دو کسی اور کے بچوں کا بھی ہاتھ پکڑ لیا۔ اب جو گنتے تو پندرہ ہوگئے۔ ہر جگہ آفاق اور نایاب بچوں کی فکر میں تھے کہ کہیں کوئی بچہ مس نہ ہوجائے۔

کوالالمپور کا ائرپورٹ بھی ایک بھول بھلیاں ہے۔ کوئی شریف اور سیدھا سادہ آدمی تو تقریباً ایک ہفتے بعد ائرپورٹ سے باہر نکل پائے گا۔ اب ہم لوگوں کو عادت ہے کہ یہاں ائرپورٹ سے نکلے تھوڑا سا آگے چلے تو سامان بیلٹوں پر چکر پہ چکر کاٹ رہا ہوتا ہے۔ اپنا، اپنا سامان اٹھایا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔ ہوگیا سفر ختم......! جناب ہم بات کررہے ہیں ملائیشیا کے شہر کوالالمپور کی جہاں جہاز سے اترنے کے بعد لاؤنج سے باہر آکر ائرپورٹ کے اندر ہی ایک ٹرین چل رہی تھی۔ جو مسافروں کو اس مطلوبہ مقام پر لے جارہی تھی۔ جہاں پر مختلف بیلٹ پر کئی فلائٹس کا سامان آرہا تھا۔ کیونکہ ایک وقت پر کئی فلائٹس ایک ساتھ لینڈ ہوئی تھیں۔ وہ تو اللہ بھلا کرے کہ ہمارے دیور نایاب اور نند کی بیٹی ژولی پہلے بھی آچکے تھے اور ہم سارے لوگ ان کے پیچھے، پیچھے دیوانہ وار بھاگ رہے تھے ورنہ جہاز سے اتر کر جب میں نے ٹرین دیکھی تو سوچا۔ "پاگلوں نے جہاز اور ٹرین ساتھ ہی چلادی شاید یہاں کی گورنمنٹ نے یہ سوچا ہو کہ غریب ٹرین سے سفر کرلیں اور مفت میں ائرپورٹ بھی دیکھ لیں۔"

ائرپورٹ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا اور باہر نکلنے کا دروازہ ہمیں مل نہیں رہا تھا۔ پتا ہی نہیں چل رہا تھا کہ کہاں سے آئے ہیں؟ اور کہاں جارہے ہیں۔ جب ایک ہی کاؤنٹر تین دفعہ نظر آیا تب سمجھ میں آیا کہ کچھ گڑبڑ ہورہی ہے۔

"اجیہ آج کے دن اگر ائرپورٹ سے باہر نکل

جائیں تو غنیمت سمجھنا۔'' میں نے اجیہ سے کہا جو پریشانی سے بے نیاز اپنے آئی فون سے تصویریں لینے میں مگن تھی۔

''امی پریشان نہ ہوں...... ان ملائی لوگوں کی شکلیں ایک ہی جیسی ہوتی ہیں اس وجہ سے کنفیوژن ہورہی ہے۔'' اجیہ مجھے حوصلہ دیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

خیر کافی تگ ودو اور خون، پسینہ ایک کرنے کے بعد ائرپورٹ سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔

''آج تو کافی گھوم لیا ہم نے۔ باقی پروگرام کل رکھیں گے۔'' ایمان مجھ سے غصے سے کہہ رہا تھا۔ واقعی ائرپورٹ پر چلتے، چلتے سب ہی نڈھال سے ہوگئے تھے۔

''ارے لڑکے آہستہ بولو تمہارے ابا ابھی سن لیں گے ناں تو غصہ ہوں گے۔'' میں نے ایمان کو ڈانٹا جو کافی مارچ پاسٹ کے بعد تھک چکا تھا۔

ائرپورٹ کے باہر ہی آفاق اور نایاب کے مشترکہ دوست ندیم بھائی ہمیں پک کرنے کے لیے کھڑے تھے۔ ان کی بڑی سی گاڑی میں ہم سب لوگ مع سامان بہ آسانی آگئے۔ یہ صاحب گزشتہ سات سال سے یہاں مقیم ہیں۔ ان کا کمپیوٹر اور ہوٹل کا بزنس تھا۔ ہم سب ان کے ہی ہوٹل جارہے تھے۔

جیسے، جیسے راستہ طے ہورہا تھا کوالالمپور مجھے بالکل اسلام آباد جیسا لگ رہا تھا۔ ہر طرف ہریالی، اونچی، اونچی عمارتیں اونچے، نیچے راستے اور بے انتہا صفائی۔

''اور بھائی کیسے گزر رہے ہیں روز وشب؟'' آفاق، ندیم بھائی سے مخاطب ہورہے تھے۔

آفاق بھی پورے ایک دن کے بعد کسی ہم وطن سے مل رہے تھے۔ ہوم سکنیس کا شکار ہونا شروع ہوچکے تھے۔ یہاں دور بیٹھے ندیم بھائی بھی وطن کے لوگوں سے مل کر بہت جذباتی ہورہے تھے۔

''بس بھائی، وطن سے دور بیٹھے ہیں۔ پردیسی ہیں۔ وطن کی یاد ہر وقت ستاتی ہے کیا کریں ملک کے حالات دیکھ کر دل خون کے آنسو روتا ہے۔'' ندیم بھائی نان اسٹاپ بول رہے تھے اور صحیح بھی کہہ رہے تھے۔

''باہر رہنے والا جب اپنے ٹی وی سیٹ پر ملک کے حالات جانتا ہے کہ پندرہ بندے مرگئے، ہڑتال ہورہی ہے۔ نوکری پہ جانے والا بلڈنگ سے گر گیا وغیرہ، وغیرہ تو وہ یہ سوچتا ہے کہ اللہ کا شکر ہے میں ملک میں نہیں ہوں۔''

''یہاں کے بارے میں کچھ بتائیں بھئی...... ! ہم تو یہاں کے بارے میں جاننے آئے ہیں۔'' گفتگو جب کافی سنجیدہ ہونے لگی تو نایاب نے باتوں کا رخ موڑتے ہوئے کہا۔

''ملائشیا میں پینسٹھ فیصد ملائی لوگ ہیں۔ تیس فیصد چینی قوم جبکہ پانچ فیصد انڈین لوگ ہیں۔ پاکستانی تو صرف بیس یا پچیس ہزار کی تعداد میں ہیں۔ ملائشیا میں سارے پاکستانی کاروبار سے وابستہ ہیں کوئی بھی ورکنگ کلاس سے تعلق نہیں رکھتا۔ زیادہ پاکستانی کمپیوٹر یا پھر کپڑوں کے کاروبار سے منسلک ہیں۔ یہاں لوگوں کو حیرت ہوتی ہے جب وہ سنتے ہیں کہ پاکستان میں لائٹ جاتی ہے یا ہڑتال پر پورا شہر تو کیا پورا ملک بند کروادیا جاتا ہے۔ یہاں پر ان باتوں کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی بھی پاکستانی جو ملائشیا میں مقیم ہے دوبارہ ملک میں رہائش اختیار کرنے کو تیار نہیں۔ معاشی حالات سے تو شاید وہ پھر بھی سمجھوتا کرلیں لیکن امن وامان کے حوالے سے ان کے دلوں میں کافی تحفظات ہیں۔ ملک کے روز بروز بگڑتے ہوئے حالات پر دیار غیر میں مقیم پاکستانی کافی پریشان ہیں اور شاید مایوس بھی۔''

ندیم بھائی بھی شاید کافی دنوں بعد کسی جان

پہچان والے ہم وطن سے ملے تھے نان اسٹاپ ہی بولے جا رہے تھے۔ وہ اپنے سارے گزرے ہوئے .... روز و شب بیان کر رہے تھے کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔ یہاں آفاق میاں بھی اپنے دوست سے مل کر کافی خوش تھے۔

''کرنسی کی کیا پوزیشن ہے یہاں پر؟'' ہمارے میاں اب اپنے مطلب کی باتوں پر آ رہے تھے۔

''یہاں کی کرنسی رنگٹ کہلاتی ہے۔ ایک رنگٹ پاکستانی 33 روپے بنتے ہیں۔''

''یہ تو کافی ہو گئے۔'' میں کچھ پریشان ہو کر آفاق کو دیکھ رہی تھی۔

''ارے اس پر گورنمنٹ کا ٹیکس بھی عائد ہوگا اگر آپ نے کوئی چیز خریدی تو۔'' ندیم بھائی اور ڈرا رہے تھے۔

''اب ہم پاکستان کیا گفٹ لے کر جائیں گے۔ ایک گھر نہیں تقریباً پندرہ بیس فیملیز تو ہیں جن کے لیے اچھے گفٹ لے کر جانے ہیں۔'' میں دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔

''اگر ہمیں شاپنگ کرنی ہے تو اس کے لیے کہاں جانا چاہیے؟'' میں نے ہمت کر کے ندیم بھائی سے پوچھ ہی لیا۔

''اگر آپ کو شاپنگ کرنی ہے تو یہاں سے مت کیجیے گا بھابی......!'' ندیم بھائی کافی مطمئن انداز میں جواب دے رہے تھے۔

''تو کیا خالی ہاتھ ہلاتے ہوئے واپس جائیں۔ تاکہ لوگ ہماری شکلیں دیکھیں اور باتیں کریں کہ بڑی گئی تھیں گھومنے ڈنڈے بجاتی ہوئی آ گئیں۔'' دماغ پتا نہیں کیا، کیا سوچ رہا تھا۔

''شاپنگ آپ لوگ لنکاوی سے کیجیے گا۔ وہ ڈیوٹی فری زون ہے جا رہے ہیں ناں وہاں؟'' ندیم بھائی نے کہا۔

ہاں، ہاں جا رہے ہیں ہم!'' اس دفعہ نایاب ان سے مخاطب ہو رہے تھے۔

اب کچھ میری جان میں جان آ رہی تھی۔

ائر پورٹ سے ان کے ہوٹل کا راستہ تقریباً دو گھنٹے طویل تھا۔ مگر باتوں میں وقت کیسے گزرا پتا ہی نہیں چلا۔

ہوٹل پہنچتے، پہنچتے صبح کے دس بج چکے تھے۔ ہم سب لوگ بچوں سمیت اتنا تھک چکے تھے کہ جو سوئے تو شام کو ہی اٹھے۔

تیار ہونے کے بعد فیصلہ ہوا کہ ٹوئن ٹاور دیکھنے کے لیے چلا جائے۔

ٹوئن ٹاور کی شان

ملائشیا کی پہچان

ہمارا ہوٹل چونکہ ٹوئن ٹاور سے نزدیک تھا۔ اسی وجہ سے ہوٹل کا ایک ویٹر جو ملائی ہی تھا (ملائشیا کے لوکل لوگوں کو ملائی کہتے ہیں حالانکہ وہ بودو باش سے تو بالکل دودھ ملائی نہیں لگتے چھوٹے قد کاٹھ کے ٹھگنے ٹھگنے سے مرد، عورتیں رشتے میں بنگالیوں کے سوتیلے بہن بھائی لگتے ہیں سوتیلا اس وجہ سے رنگ روپ ان کا صاف ہے اور نقشہ بھی تکھا چپٹا)

خیر بات ہو رہی تھی ٹوئن ٹاور کی سیر کی۔

''اب، آپ لوگ ٹوئن ٹاور جا چکے ہیں تو میٹرو گئی۔''

ملائی ویٹر غلط اردو بول کر اپنے آپ کو شاید بہت قابل تصور کر رہا تھا۔

''ہاں، ہاں! جب ہم جا چکے ہوں گے تو میٹرو میں جائیں۔'' یہاں ہمارے میاں آفاق اس کا دل رکھنے کے لیے غلط ہی اردو میں اس سے ایڈریس سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''اوہو یہ ہو رہا ہے پھر تو ہم پہنچ گئے ٹوئن ٹاور۔'' صائمہ نے اپنے کمرے سے باہر نکلتے ہی جب یہ منظر دیکھا تو بے اختیار بول پڑی۔

کسی طرح ہم نے اس سے یہ سمجھنے کی کوشش کی

ہم تیرہ بندے کس طرح ٹوئن ٹاور دیکھنے جائیں۔ سمجھ میں یہ آیا چونکہ ٹوئن ٹاور بہت نزدیک ہے تو آپ لوگ میٹروٹرین سے جائیں اور نزدیکی ٹرین اسٹیشن پر اتر کر پیدل ہی نکل کر ٹوئن ٹاور سامنے آجائے گا۔ زیادہ سے زیادہ دس منٹ کی واک ہوگی...... سب بڑے بچے اس طرح جانے پر متفق ہو گئے۔ چونکہ میٹروٹرین پر جانے کا بھی تجربہ کرنا چاہ رہے تھے۔ سب لوگ کافی ایکسائٹڈ تھے۔

جس علاقے میں ہم ٹھہرے تھے وہ چوکٹ کہلاتا تھا اور ہمیں لوکن ٹانا جانا تھا جہاں پر ٹوئن ٹاور واقع ہے۔ یہ وہاں کا نزدیک ترین اسٹیشن ہے۔

سب بچوں کو گن کر ہمیشہ کی طرح ان کی ریل گاڑی بنائی گئی دو بندے آگے اور دو بندے پیچھے۔ یہاں کا میٹروٹرین سسٹم کسی بھی ترقی یافتہ ملک کے ٹرین سسٹم کی طرح کا ہی تھا۔ اس ٹرین کا ٹکٹ ایک سکے کی شکل کا تھا جو آٹومیٹک دروازے نما جنگلوں کے باکس پر رکھنا تھا۔ جس مشین کے اوپر وہ سکہ ڈال دیتے تھے صرف اس وقت تک اس کا دروازہ کھل جاتا تھا جتنی دیر میں ایک آدمی اس جگہ سے گزر سکے پھر دوبارہ سے دروازے کا جنگلا بند ہو جاتا تھا۔ سامنے ہی مطلوبہ ٹرین کھڑی تھی۔ یقیناً پڑھنے والوں کو یہ سسٹم سمجھ میں آگیا ہوگا کہ کس طرح سکہ مشین پر رکھ کر اس جنگلے کے نیچے ہوتے ہی گزرا جا سکتا تھا۔

بچوں.......... کو ان کے سکے دے دیئے گئے کہ سب مشین پر رکھ کر آگے، آگے جاؤ۔ پتا نہیں کیا چکر تھا یا اللہ کی طرف سے حکم نہیں تھا یا پھر اپنی کم عقلی کہ جس طرف سکہ رکھتے تھے اور الرٹ کھڑے ہوتے تھے کہ جیسے ہی دروازے کا راڈ ہٹے گا اندر جائیں گے دوسری طرف کا راڈ کھل جاتا تھا۔ اتنا بھاگ کر دوسری طرف جاتے تھے تو اتنے میں وہ بھی بند ہو جاتا تھا۔ تھوڑی دیر بلکہ میں غلط کہہ رہی ہوں کافی دیر تک یہ تماشا چلتا رہا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ہم صبح تک ہی ٹرین میں بیٹھ پائیں گے۔ صائمہ اور میرا ہنس ہنس کے حال برا ہو رہا تھا۔ آفاق اور نایاب بچوں کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

پھر کسی بچے کی عقل چلی وہ راڈ کے نیچے سے گھس گیا۔ دیکھا دیکھی تقریباً چھ سات بچے راڈ پار کر چکے تھے۔ نزدیک بیٹھے کاؤنٹر والے نے جب ہمیں یہ سرکس کرتے کافی دیر تک دیکھا تو وہ غریب خود ہی اٹھ کر ہماری مدد کرنے چلا آیا۔ یوں ہم تیرہ لوگ ٹرین میں سوار ہوئے۔ ٹوئن ٹاور تک کے لیے ٹرین کا سفر بہ مشکل دس پندرہ منٹ کا تھا مگر ٹرین میں بیٹھتے، بیٹھتے ہمیں دو گھنٹے لگ گئے تھے۔

میٹروٹرین سے اتر کر سامنے ہی ٹوئن ٹاور نظر آرہا تھا۔ سب لوگوں نے ساتھ سڑک کے کنارے، کنارے چلنا شروع کر دیا کہ سب کو ٹوئن ٹاور پہنچنے کی جلدی تھی سب اس تاریخی عمارت کو قریب سے دیکھنا چاہتے تھے جو ملائیشیا کی پہچان ہے اور کچھ عرصے پہلے تک دنیا کی بلند ترین عمارت میں شامل تھی۔ اب تو دنیا کی بلند ترین عمارت کا اعزاز دبئی کے "برج الخلیفہ" کے پاس ہے۔

خیر بھئی، چلتے جا رہے تھے آگے بڑھتے جا رہے تھے لیکن یہ کیا جتنا ہم آگے جاتے جا رہے تھے ٹوئن ٹاور اتنا ہی دور ہوتا جا رہا تھا۔

"آخر یہ چکر کیا ہے؟ کہیں اس ویٹر کے بچے نے ہمارے ساتھ دھوکا تو نہیں کیا؟" ہمارے صاحبزادے ایمان جب کافی چل، چل کر تھک گئے تو بولے۔

"کیا کہا تھا اس نے جس سے ایڈریس سمجھا تھا؟" میں بھی کیسوئی کو گود میں لیے ہوئے تھک گئی تھی۔

"بھئی اس ملائی ویٹر کو اردو آتی نہیں تھی۔ ملائی زبان ہمیں نہیں آتی ہے۔ تو یہ ہی سمجھ آیا تھا کہ ٹرین سے اتر کر ٹوئن ٹاور آجائے گا۔"

"اشاروں کی زبان میں پوچھ لیتے کہ گاڑی میں جانا تھا ٹرین کے بعد۔" علی گاڑی چلانے کا اشارہ کر رہا تھا۔

"یہ بھی سیر ہی ہے بھئی۔ گھومنے آئے ہیں، گھوم رہے ہیں۔" یہ نایاب صاحب تھے نرالی منطق لائے تھے۔

راستے میں کئی تاریخی عمارتیں آ رہی تھیں جن کو ہم لوگ رک، رک کر دیکھ بھی رہے تھے جیسے کنونشن سینٹر، ہوٹلز اور پارک وغیرہ شامل تھے...... مگر جلدی تھی ٹوئن ٹاور پہنچنے کی۔ جیسے تیسے آخر کار ٹوئن ٹاور کا مین گیٹ آ ہی گیا۔ سب بچوں نے سرپٹ دوڑ لگائی وہ جلد از جلد اس تاریخی عمارت کو اپنے کیمروں اور موبائل فون میں محفوظ کر لینا چاہتے تھے۔

یہ ٹاور وسیع و عریض جگہ پر بنا ہوا ہے۔ ہر طرف ہریالی۔ پودے، پھول اور سجاوٹ تھی اور کافی ٹورسٹ یہاں پر موجود تھے۔ کئی جوان جوڑے ٹاور کے سامنے لیٹ کر تصویریں بنوا رہے تھے کیونکہ اگر سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں تو اپنی بلندی کی وجہ سے کیمرا اس کا پورا ویو نہیں لے پاتا۔ کئی منزلہ بلند عمارت میں نچلی منزلوں پر شاپنگ سینٹرز بنے ہوتے ہیں۔ جن میں مشہور ڈیزائنرز کی دکانیں موجود تھیں۔ بچوں کے فن لینڈ کے علاوہ کھانے پینے کی بھی کئی دکانیں ہیں۔ چونکہ انٹرنیشنل کراؤڈ یہاں کافی آتا ہے تو ایک وائن شاپ پر فادرز ڈے کا اسپیشل آفر کارڈ نظر آیا کہ "فادرز ڈے پیکج فری وائن۔" مختلف دکانوں پر بروشرز اور کارڈز اٹھائے ویٹریسز ہیلو اور ویلکم کہہ رہی تھیں۔ جن کو ہم ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال رہے تھے۔

"آپ انڈیا سے ہیں؟" اپنے پیچھے سے ایک غیر مانوس آواز سن کر میں پلٹی تو دوسری طرف ایک خاتون حجاب میں کھڑی تھیں۔

"جی نہیں، ہم پاکستان سے ہیں۔" میں نے مسکرا کر انہیں جواب دیا۔

"اچھا، اچھا میں الحمدللہ انڈیا سے ہوں اپنے بچوں کے ساتھ گھومنے کے لیے آئی ہوں۔ آپ کو



میں عید کیسے مناؤں؟

سجاؤں بھرا آنچل
مہندی سے سجے ہاتھوں میں
کھنکتی چوڑیاں
چھن چھن بجتی پائل
چھنکتا کنگنا
دلہن کی سی سج دھج، زیب بھی
مگر میں خود کو کیسے سجاؤں
عید مناؤں تو کیسے مناؤں
دکھی پتھرائی ہوئی آنکھیں
آئینہ دیکھتی ہیں
تو خود سے بھی خوفزدہ سی ہو جاتی ہیں
یہ مضطرب آنکھیں
جن کے پیچھے
ان گنت لہو میں ڈوبی ہوئی
دکھ بھری کہانیاں ہیں
جن سے ستارے ماند پڑ گئے
حنا کا رنگ پھیکا ہے
کھنکتی چوڑیاں اور پائل کی جھنکار
سوالیہ نشان ہے
سجنے سنورنے کی تازگی کہیں کھو گئی ہے
ایسے میں عید کیسے مناؤں
خود کو کیسے سجاؤں
کہ فصیل شہر پر
نصب ہیں
پتھرائی ہوئی آنکھیں
سر بریدہ لاشیں

کلام: سیما سراج، پرنسپل، حشانیہ گرلز کالج کراچی

ہندی بولتے سنا تو کہا آپ بھی انڈیا سے ہی آئے ہیں۔" وہ بتا رہی تھیں۔

"ہم پاکستان سے ہیں اور ہماری قومی زبان میں ہندی کے لفظ بھی موجود ہیں۔ اس کے لیے آپ کو ایسا لگا ہوگا۔ کتنے بچے ہیں آپ کے؟" میں نے ان کا دل رکھنے کے لیے پوچھ لیا---- اور وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔

"الحمدللہ پانچ بچے ہیں۔ الحمدللہ سب شادی شدہ ہیں۔ الحمدللہ میرا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ الحمدللہ میرے شوہر کا پچھلے سال انتقال ہو چکا ہے۔ الحمدللہ بیمار تھے اسی میں الحمدللہ ختم ہوئے ہیں۔ اب میں الحمدللہ اکیلی رہ گئی ہوں۔" وہ نان اسٹاپ بول رہی تھیں۔

اور میں یہ سوچ رہی تھی کہ بعض لوگوں کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کون سی بات کس طرح کہنی ہے انہیں الحمدللہ کہنے کی اتنی عادت تھی کہ انہیں یہ تک نہیں پتا چل رہا تھا کہ کس بات کے ساتھ الحمدللہ لگانا کس کے ساتھ نہیں۔

"جی الحمدللہ مجھے میرے میاں بلا رہے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو پھر ملیں گے۔" میں بہانے سے وہاں سے ہٹی۔

صائمہ سارے بچوں کو سنبھالنے کی ڈیوٹی نبھا رہی تھی۔

"اب تم بیٹھو، میں بچوں کو دیکھتی ہوں۔" میں نے صائمہ کو بیٹھنے کا کہا اور جو چھوٹے بچے فن لینڈ میں ہیلی کاپٹرز اور چھوٹی بیٹری والی گاڑیوں پر بیٹھے تھے ان کو گننے میں لگ گئی۔

ٹوئن ٹاور کے ٹاپ تک جانے کا ٹکٹ ہے۔ لفٹ کے ذریعے اس کے ٹاپ تک لے کر جایا جاتا ہے۔ مگر ہم لوگ ذرا لیٹ پہنچے اور آخری لفٹ بھی جا چکی تھی۔ بچے منہ بنانے لگے کہ اتنا دور آئے تھے اور اوپر تک بھی نہیں جا سکے۔

"بھئی اوپر سے بھی یہی تو نظر آتا ناں....."

میں اجیہ، نیہاں وغیرہ کو سمجھاتے ہوئے بولی۔

"ہمیں تو نہیں ناں۔ اب جا کر کیا بتائیں گے کہ ٹوئن ٹاور کو ہاتھ لگا کر آ گئے۔" ایمان اب ناراض ہو رہا تھا۔

"بھئی کہہ دینا کہ گئے تھے ٹاپ تک کسی کو کیا معلوم۔" میں نے ایمان اور علی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"ایسے نہیں ہوتا امی، سب سمجھ جاتے ہیں کہ جھوٹ ہے یا سچ۔ اگر کسی نے پوچھ لیا کہ تصویر دکھاؤ پھر؟" علی بالکل ماننے کے موڈ میں نہیں تھا۔

"تو اپنی جہاز والی تصویر دکھا دینا جو تم نے جہاز میں بیٹھ کر نیچے کی کھینچی تھی۔" آفاق بھی بچوں کی ناراضی سے محظوظ ہو رہے تھے۔

خیر بچوں کو سمجھا بجھا کر اور پھر آنے کا وعدہ کر کے دوبارہ ہوٹل کے لیے روانہ ہوئے۔ مگر بعد میں اوپر تک بچوں کو لے کر گئے تھے..... اوپر جانے میں ایک بچہ لفٹ میں بیٹھنے سے رہ گیا تھا۔ یہ الگ کہانی ہے۔ مگر ماشاء اللہ..... ایمان بہت سمجھدار بچہ ہے۔ وہ دوسری لفٹ سے..... ہم سے پہلے اوپر پہنچ گیا تھا..... جبکہ ہم بیچ میں اتر کر نیچے چلے گئے تھے.....!

خیر..... اس طرح تو ہوتا ہے..... اس طرح کے کاموں میں اور سفر کرنے سے انسان بہت سی ایسی باتیں سیکھتا ہے جو گھر میں بیٹھ کر کبھی تو جا سکتی ہیں مگر سیکھی نہیں جا سکتیں---- اسی لیے تو لوگ کہتے ہیں کہ نگر نگر گھومنے پھرنے والے لوگ زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔

اپنے گھر کے آنگن میں ہریالی مجھے ہمیشہ سے ہی اچھی لگا کرتی ہے۔ اسلام آباد اور لاہور کی ہریالی مجھے بے حد پسند ہے مگر کراچی کی شاہراہوں پر سوکھے، سوکھے اور اجڑے ہوئے درخت دیکھ کر مجھے ہمیشہ دکھ سا ہوتا ہے کہ ہریالی آنکھوں میں تراوٹ سی پیدا کرتی ہے اور ملائشیا کی ہریالی..... مجھے بے حد بھائی..... اور دل چاہا کہ قومی اسمبلی میں یہ بل پاس کروا دوں جس نے اچھے، اپنے علاقے کو سرسبز و شاداب نہیں کیا۔

اس...... اس...... اس سے آگے آپ جو بھی سمجھنا چاہیں اپنی ذہنی اُپج کے ساتھ سمجھ لیں۔

میں کچھ نہیں کہہ رہی...... ہاں......!

ملائشیا، مچھر اور ملنگ

جب ہریالی اور شادابی ساتھ ساتھ ہوں...... تو نظر ٹھہر جایا کرتی ہے۔

ملائیشیا میں اتنی ہریالی اور خوب صورتی ہے۔ لگتا ہے کہ قدرت نے اس پر اپنا خاص کرم کیا ہوا ہے۔ اتنی صفائی اور اتنا سسٹم کہ لگتا ہی نہیں کہ کسی ایشیائی ملک میں موجود ہیں بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کسی فرنگی زمین پر ہیں۔

ایک خاص چیز جو میں دو تین روز سے محسوس کر رہی تھی کہ کوئی مانگنے والا یا فقیر یہاں پر نظر ہی نہیں آ رہا تھا۔ جہاں جانا ہے آرام سے جاؤ نہ کوئی پیچھے لگ رہا ہے۔ نہ کوئی صدائیں آ رہی ہیں۔ نہ کوئی قمیص کھینچ رہا ہے۔

"تم بڑا مِس کر رہی ہو فقیروں کو؟" جب میں نے آفاق سے اس بارے میں پوچھا تو وہ الٹا چھیڑتے ہوئے بولے۔

"ہاں! زندگی میں کچھ کمی، کمی سی لگ رہی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

لیکن بات ساری یہ ہے کہ یہاں کی معیشت ہی اتنی مضبوط ہے کہ کسی کو مانگنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ حالانکہ اس ملک کو بنے زیادہ ٹائم نہیں گزرا۔ لیکن محنت اور ایمانداری سے ان لوگوں نے پوری دنیا میں اپنا لوہا منوالیا ہے۔

لیکن ایک بات جو پاکستان اور ملائشیا میں مشترک لگی وہ تھے وہاں کے مچھر، ویسے ہی انٹرنیشنل مچھر جیسے ہمارے پاکستان میں ہوتے ہیں۔ رات سونے کے لیے لیٹے تو مچھروں نے جو سیٹیاں بجانی شروع کیں جیسے ہمارے آنے پر استقبالیہ دیا جا رہا ہو۔

جس میں سازندے مختلف سُر چھیڑ رہے ہوں۔ ماشاءاللہ ...اتنے سارے مچھر ایک ساتھ دیکھ کر وطن سے دوری کا احساس جاتا رہا۔ چلو کوئی تو قدر مشترک تھی پاکستان اور ملائشیا کی۔

سن وے لیگون کی تیاری

کوالالمپور کی فضاؤں میں پتا نہیں کیا نشہ تھا کہ جب رات کو سوئے صبح گیارہ بارہ بجے سے پہلے نہیں اٹھ پائے شاید گھوم، گھوم کر تھک رہے تھے یا کچھ زیادہ ہی ایزی فیل کر رہے تھے۔ اللہ معاف کرے ہم سب فجر کی نماز قضا پڑھ رہے تھے۔

"بچوں جلدی، جلدی اٹھو، آج سن وے لیگون جانا ہے۔" آفاق اور نایاب بچوں کو اٹھانے میں مصروف تھے۔

"بیٹا کیا یہاں سونے آئے ہو؟ پاکستان جا کر کیا بتاؤ گے کہ ملائشیا جا کر ہم سوئے۔" جب بچے اٹھنے میں دیر کرنے لگے تو میں نے انہیں سمجھاتے ہوئے اٹھانے کی کوشش کی۔

"پہلے ناشتا کر لیا جائے۔ ویسے ہی دیر ہو رہی ہے۔" صائمہ جو سب سے پہلے اٹھ کر تیار بھی ہو گئی تھی۔ اب ناشتا پیک کر رہی تھی۔

ویسے یہ بالکل صحیح بات ہے کہ پکنک میں جتنے زیادہ لوگ ہوں اتنا ہی مزہ آتا ہے۔

سارے بچوں نے جو اب آہستہ، آہستہ نیند سے ہوش میں آنے لگے تھے تیاریوں کے لیے دوڑ لگانی شروع کی۔

ہوٹل کا ناشتا دو دن سے ٹرائی کر رہے تھے تو سوچا آج باہر سے ناشتا منگوایا جائے۔ ذرا ذائقہ مختلف ہو جائے گا۔ مگر ہائے ری قسمت، ناشتے میں پراٹھے اور پتلی دال آ گئی جیسے جیل کے قیدیوں کو ملتی ہے۔ یہ معلومات بھی اللہ رکھے فلموں کی بدولت نصیب ہوئی ہے ورنہ اچھی خاصی جنرل نالج سے

محروم رہ جاتے۔

ویسے پتا نہیں ملائی لوگ پراٹھوں کے ساتھ آملیٹ کیوں نہیں کھاتے؟ ہم نے تو صبح کے ناشتے میں ملائی لوگوں کو دال چاول اور چٹنی کھاتے ہوئے بھی دیکھا۔ یعنی نہ یہ دیکھنا کہ صبح ہے یا شام جب آنکھ کھلی یا بھوک لگی تو دال چاول شروع۔ ایک اور بات ملائی لوگوں کے بارے میں پتا چلی کہ یہ لوگ ایک دن میں پانچ دفعہ کھانا کھاتے ہیں۔ ویسے اچھا ہی ہے کیونکہ اگر پانچ دفعہ کھانا کھانے کے بعد اتنے سے قد اور صحتیں ہیں۔ اگر اللہ نہ کرے دو تین دفعہ کھاتے تو دوربین لے کر دیکھنا پڑتا کہ کہاں گئے۔

چونکہ شروع دن میں ہی ندیم بھائی سے سارا پلان فائنل کرلیا تھا کہ کہاں، کہاں جائیں گے۔ اسی لیے آج کا دن سن وے لیگون کا تھا۔ یہ ایک واٹر پارک ہے جو یہاں کے خوب صورت واٹر پارکس میں سے ایک ہے۔ ایک بہت بڑی جگہ پر۔ یہاں واٹر پارک جس کے اندر ایک زو، ایک شاپنگ سینٹر وغیرہ بنایا ہوا ہے۔

چونکہ ہوٹل سے سن وے لیگون تک کا راستہ تقریباً ایک گھنٹے کا تھا تو فیصلہ یہ ہوا کہ ٹیکسی کر لیتے ہیں۔ جو ہوٹل کے ہی نزدیک سے مل جائے گی۔ تو جناب ہم تیرہ لوگوں کا قافلہ روڈ کے کنارے کھڑا ہوگیا اور جیسے ہی کسی ٹیکسی کو دیکھا سارے بچے ہاتھ دینے کو دوڑے۔ مگر یہ کیا ٹیکسی ہم لوگوں کو دیکھ کر رک ہی نہیں رہی تھی۔

''صائمہ شاید ٹیکسی والوں کو ہم پسند نہیں آرہے۔'' جب چار پانچ خالی ٹیکسیاں ایسے ہی ہمیں دیکھ کر نکل گئیں تو میں نے اپنی دیورانی صائمہ سے کہا جو خود بھی اسی صورتِ حال سے خاصی لطف اندوز ہو رہی تھی۔

''کیا ہم روکیں ٹیکسی؟'' صائمہ مجھے آنکھ مار کر کہہ رہی تھی۔

''کیا مطلب؟ شرم کرو صائمہ اب کیا ایسے ٹیکسی روکنی پڑے گی۔ جیسے انڈین فلموں میں ہیروئن روکتی ہے۔ جب ہیرو سے کوئی گاڑی نہیں رکتی۔'' اب میرے اور صائمہ کے قہقہے آسمانوں سے باتیں کر رہے تھے۔

''امی ہنسیں نہیں...... ٹیکسی رک گئی ہے؟ کہیں آپ لوگوں کے خوفناک قہقہوں کی وجہ سے یہ ٹیکسی والا بھی بھاگ نہ جائے۔'' اجیہ ہمیں چپ کراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''کیسے رک گئی ٹیکسی اجیہ؟'' اب صائمہ، اجیہ سے مخاطب تھی۔

''بچوں کو چھپایا گیا چاچی۔ تب یہ ٹیکسی رکی ہے۔'' اجیہ رازدارانہ لہجے میں بول رہی تھی۔

تھوڑی دیر بعد پتا یہ چلا کہ یہاں ایک ٹیکسی میں پانچ یا زیادہ سے زیادہ چھ لوگ بیٹھ سکتے ہیں۔ ہم تیرہ لوگ ایک ٹیکسی میں بیٹھنے کے چکر میں تھے۔ اگر زیادہ لوگ بیٹھ جائیں گے تو آگے جاکر... ٹیکسی والے کا چالان ہوجائے گا۔ تو طے یہ ہوا کہ دو ٹیکسیاں کرلی جائیں۔ اس فیصلے میں بھی یعنی ٹیکسی روکنا بچے چھپانا وغیرہ میں ایک گھنٹا لگ گیا۔ خیر کرتے، کرتے آخر کار ہم لوگ سن وے لیگون پہنچ ہی گئے۔

ملائشیا کے تفریحی مقامات وغیرہ میں صرف سانس لینے کا ٹکٹ نہیں ہے ورنہ ایک جگہ پر اگر تین چیزیں بنی ہوئی ہیں تو تینوں جگہ کا الگ، الگ ٹکٹ ہے۔

جیسے کہ ہم پہلے وائلڈ لائف پارک گئے کہ پہلے بچوں کو ذرا زو دکھا دیں پھر واٹر سلائڈز میں جائیں گے۔ تو جانے سے پہلے بچہ، بچہ بوٹا، بوٹا کا ٹکٹ لینا پڑا۔ وہاں پر انہوں نے ایک ٹرین چلائی ہوئی ہے اور سارے جانور ایک چھوٹے سے مصنوعی سے جنگل میں کھلے چھوڑے ہوئے ہیں۔ ٹرین میں بیٹھ کر آپ ان کے پاس سے گزر سکتے ہیں۔ جانور بھی اس ٹرین کے اتنے عادی تھے کہ وہ نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھ رہے

تھے۔ حالانکہ ہم سب لوگوں سمیت ٹرین میں بیٹھے ہوئے تمام لوگ جو زیادہ تر ٹورسٹ ہی تھے جانوروں سے زیادہ ایکسائٹڈ تھے۔ ایسے، ایسے صحت مند چیتے تھے کہ کسی اکھاڑے کے پہلوان محسوس ہو رہے تھے۔ اپنے بے تحاشا وزن کے سبب ان سے چلا تک نہیں جا رہا تھا۔ ہرن تھے تو ان کی۔۔۔ بے تحاشا اقسام اور تعداد۔ زندگی میں پہلی دفعہ ہمارے بچے دانتوں والے ہاتھی دیکھ رہے تھے۔

''امی یہ کون سا جانور ہے؟'' علی معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

''جاہل...... یہ ہاتھی ہے۔'' میں نے اسے آہستہ سے کہا تاکہ دوسرے بچے نہ سن لیں۔

''لیکن اس کے منہ سے کیا نکل رہا ہے؟ اور یہ اتنے سارے کیسے ہیں؟ ہمارے زو میں تو ایک ہوتا ہے۔'' علی کافی حیران ہو رہا تھا۔

طرح طرح کے نایاب اور بیش قیمت پرندوں کی بے شمار اقسام اس وائلڈ پارک میں موجود تھیں۔ ڈیڑھ سو قسم کے پرندے اور جانور اس پارک میں اپنی اپنی زندگیاں گزار رہے تھے۔ چھوٹے قدوں والے گھوڑے (ہم تو انہیں پونی کہتے ہیں) وہ بچوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا رہے تھے۔ چھوٹی بیٹی کیسوٹی تو پونی سے اپنا قد ملا رہی تھی۔

''امی یہ گھوڑا میرے برابر ہے۔ اسے گھر لے کر چلیں۔'' کیسوٹی گھوڑے کی لگام پکڑتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''ہاں بیٹا، گھوڑا، ہاتھی، طوطے سب ہی کچھ لے چلتے ہیں۔ اچھا ہے گھر میں ہی زو بن جائے گا۔ کمائی الگ ہو جائے گی......'' میں نے بچوں کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔

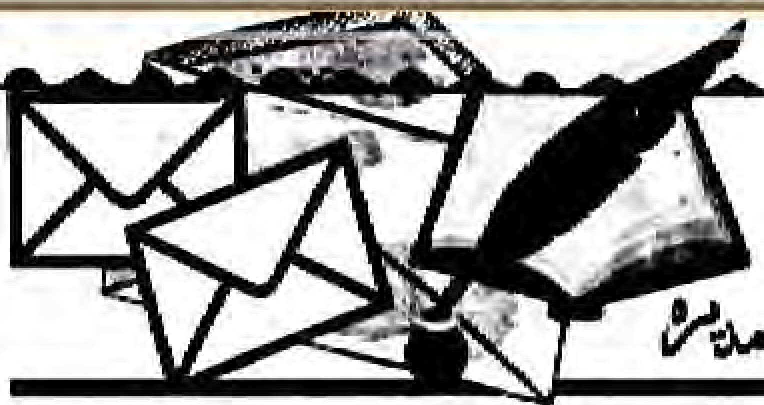
''اب نکلا جائے کب تک یہ طوطے، بکرے دیکھتے رہیں گے۔'' ایمان بور ہوتے ہوئے بولا۔

اصل میں تو ان کو واٹر پارک جانا تھا۔ خیر سب نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور واٹر پارک کی طرف بڑھے۔ اس واٹر پارک میں تقریباً اٹھ واٹر سلائڈز تھیں۔ جن میں کچھ چھوٹے بچوں کی تھیں۔ دنیا کی سب سے بڑی واٹر سلائڈ بھی تھی۔ گیارہ منزلہ اونچی اس پانی کے جھولے پر کافی سیڑھیاں چڑھ کر جانا پڑتا تھا۔ پھر پانچ، پانچ آدمی ایک ٹیوب میں بیٹھ کر نیچے پھسلتے ہوئے آتے تھے۔ نیچے تک آنے میں شاید چند سیکنڈ یا ایک منٹ ہی لگتا ہوگا مگر جو ڈر خوف اس پانی کی سلائڈ میں تھا وہ ناقابل بیان تھا۔ بس ایسا لگتا تھا کہ اب یہ ٹیوب الٹی اور ہم باہر گرے اور پتا نہیں نیچے تک بھی پہنچ پائیں گے یا نہیں۔ ٹیوب کے نیچے تیز پانی بہہ رہا ہوتا ہے جو اسے پھسلنے میں مدد دیتا ہے اور آخر میں یہ سب کو پانی کے پول پر جا کر پھینک دیتا ہے۔ میں اور صائمہ تو ایک دو سلائڈز لینے کے بعد ہی کونے میں بیٹھ گئے دل اور دماغ قابو میں ہی نہیں ہو رہا تھا مگر شاباش ہے ہمارے خاندان کے بچوں کو کہ ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری سلائڈ میں ایسے جا رہے تھے جیسے ایک گاڑی کے بعد دوسری میں بیٹھ رہے ہوں۔

تین سال سے چھوٹے بچوں کو لے جانا منع تھا اور ہمارے ساتھ تین چھوٹے بچے تھے پھر بھی کوئی نہ کوئی بچوں کو سنبھالنے کے لیے آ جاتا تھا کہ ہم انہیں دیکھتے ہیں آپ لوگ جائیں۔

ایک بالکل نیا تجربہ اور خوشگوار حیرت کا سامنا ہم لوگ کر رہے تھے۔ انٹرنیشنل کراؤڈ بے تحاشا نظر آ رہا تھا۔ کوئی سن باتھ لے رہا تھا تو کوئی تولیے سے اپنے آپ کو خشک کر رہا تھا۔ کوئی بکنی میں بھاگ رہی تھیں تو کوئی نہا رہی تھیں...اور میں سوچ رہی تھی کہ اگر ساحلوں پر ایسی خواتین ریت اوڑھ کر ہی لیٹ جایا کریں تو مٹی سے باہر ان کے چہرے کیسے دکھائی دیں گے؟

جاری ہے



بہنوں کی محفل

مدیرہ

☆ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ!

☆ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

☆ پیاری بہنو! آپ سب کو دلی عید مبارک..... اس ماہ ہم عید الفطر بھی منا رہے ہیں اور یوم آزادی بھی..... دلی دعا ہے کہ ہمارے ملک کے معاشی اور معاشرتی حالات ٹھیک ہونے کے ساتھ ساتھ اخلاقی حالات بھی اچھے ہو جائیں..... ہمارے صرف سیاست دان برے نہیں ہیں، صرف صنعت کار ہی برے نہیں ہیں بلکہ ایک عام شخص بھی اپنی جگہ جہاں وہ کام کر رہا ہے، اگر وہ چوری کر رہا ہے یا خیانت کر رہا ہے تو وہ بھی اس برائی میں برابر کا شریک ہے۔ ہم دوسروں کو تو یہ سب بتانا چاہتے ہیں مگر خود نہیں اپناتے..... ہم جب تک اپنے حصے کا کام ایمانداری سے نہیں کریں گے تو ہمارے ملکی حالات کیونکر سدھر سکتے ہیں..... دنیا کی جو اقوام آگے کی جانب بڑھ رہی ہیں انہوں نے ایمانداری سے کام کرنا سیکھ لیا ہے اور ہم جو آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے کی طرف جا رہے ہیں تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے اپنے وہ تمام اوصاف بھلا دیے ہیں جو مسلمانوں کی آن بان اور شان ہوا کرتے تھے۔ ابھی بہت دیر نہیں ہوئی ہے، آئیں ہم بھی اپنے ملک کے استحکام کے لیے اس میں اپنا حصہ بھی ڈالیں..... کہ ہم جہاں، جہاں پر ہیں وہاں ایمانداری اور سچائی کے ساتھ، ساتھ کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ کیا خیال ہے؟

☆ گزشتہ ماہ معروف مصنفہ غزالہ نگار اور کنزیٰ کا انٹرویو ہماری قارئین نے بے حد پسند کیا..... ابھی تک ہمارے پاس اتنے خطوط نہیں آئے۔ جتنے کہ ٹیلی فونز آ چکے ہیں۔ ہم آپ سب کا بے حد شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ نے اپنی رائے سے آگاہ کیا..... بلاشبہ غزالہ نگار اور کنزیٰ جیسی مایہ ناز رائٹرز ہمارا اثاثہ ہیں۔

اس ماہ..... محفل ہم کی روح رواں شیبہ کا انٹرویو بھی یقیناً آپ کو پسند آئے گا..... جس میں انہوں نے سادگی سے، کچھ شرماتے ہوئے..... اور کچھ برجستہ جوابات بڑی خوب صورتی کے ساتھ دیے ہیں..... اور رضوانہ پرنس نے انٹرویو کا افسانہ بڑی خوبی سے پنچ لائن پر ختم کیا ہے۔ (ماشاء اللہ)

☆ عزیز قارئین کرام! مجھے لگ رہا ہے کہ جیسے میں نے ایک خواب سا دیکھا ہے..... یقین ہی نہیں آ رہا کہ میں مکے اور مدینے ہو کر آ گئی ہوں۔ یہ میری چوتھی بار حاضری تھی مگر مجھے ایسا ہی لگ رہا تھا جیسے وہاں پہلی مرتبہ گئی ہوں..... ایسا وقت جو صرف اپنے حساب سے اپنے لیے گزرے..... نمازیں پڑھنے اور قرآن پاک پڑھنے کے سوا کوئی کام ہی نہیں تھا۔ میں نے عظمیٰ سے کہا..... مجھے تو لگ رہا ہے کہ کوئی اچھی سی جاب لگ گئی ہے۔ نماز پڑھ کر ہوٹل، وہاں سے کھانا کھا کر پھر مسجد..... اس کے سوا کچھ دل چاہ رہا ہے اور نہ کچھ کرنے کو دماغ راضی ہے..... ہاں اللہ ہماری ان ٹوٹی پھوٹی نمازوں کو قبول کر لے..... وہ ہنسی..... "ان شاء اللہ اللہ..... ضرور کرے گا..... ورنہ وہ بلاتا ہی نہیں۔ ان دنوں تو ہم اللہ تعالیٰ کے مہمان ہیں۔" میرا لہجہ وثوق بھرا تھا میں دبئی جانا نہیں چاہتی تھی مگر اللہ کو اسی طرح منظور تھا کہ میں، میرے شوہر اور عظمیٰ کی فیملی پہلے دبئی پہنچے..... وہاں پانچ دن رہے..... یہاں ہمارے میزبان عظمیٰ کی نند اور نندوئی..... امبر اور مسرت تھے (ماشاء اللہ) انہوں نے وہاں آ کر ہمیں علیحدہ ایک لگژری فلیٹ میں ٹھہرایا اور کون سی جگہ تھی جو دکھائی نہ ہو۔ کبھی ڈیزرٹ سفاری، کبھی برج خلیفہ تو کبھی میری ورلڈ..... تو کبھی برف گھر کی سیر..... غرض ان پانچ دنوں میں دبئی، شارجہ، عجمان اور ابوظہبی تک گھما ڈالا اور ہم یوں گھومتے، گھمانے کے بعد پہلے مدینہ شریف پہنچے۔ اس مرتبہ ہمارا ہوٹل موون پک مین مسجد نبوی کے سامنے تھا اور ہم سب با آسانی ہر نماز میں مسجد پہنچ جاتے تھے۔ ریاض الجنہ جانے کے بھی کئی بار مواقع ملے۔ یہ ہمارے پیارے نبی ﷺ کے حجرے اور چبوترے کے درمیان جنت کا ایک حصہ ہے۔ جس پر ان دنوں سبز قالین، بچھے

ہوتے ہیں۔ مسجد نبوی تک پہنچ جاؤ اور ریاض الجنہ نہ جاؤ..... یہ تو کوئی سوچ ہی نہیں سکتا مگر یہ چھوٹا سا حصہ ہے، حضرات کے لیے تو یہ حصہ ہر وقت کھلا ہوا ہے مگر خواتین کے لیے نماز، فجر، نماز ظہر اور نماز عشا کے بعد صرف ایک گھنٹے کے لیے کھولا جاتا ہے۔ خواتین کا جم غفیر..... جو آن کی آن میں وہاں جانا چاہتی ہیں۔ خواتین کے مجمع کو سنبھالنے کے لیے وہاں عربی منتظمین خواتین موجود ہیں جو ساری زبانیں جانتی ہیں، اگر وہ نہ ہوں تو ہر روز دو چار خواتین زخمی تو لازمی ہو جائیں۔ رش کے باوجود مجھے وہاں نفل پڑھنے کی سعادت مل گئی..... مگر وہاں پہنچ کر مجھے ڈر سا لگا..... کہ کہیں اتنے بڑے آقا مجھے نکال نہ دیں کہ دیکھو یہ عورت دنیاداری میں اتنی گرفتار ہے کہ اکثر نماز کی سنتیں چھوڑ دیتی ہے۔ مگر ہر گناہ گار کو جگہ دینے والے نے مجھ گناہ گار کو بھی جگہ دے دی..... آپ ﷺ پر لاکھوں سلام ہوں..... اللہ کے محبوب کی مسجد میں بیٹھ کر اپنا آپ معتبر سا لگا..... کہ میرے اللہ نے مجھے ایسی جگہ پہنچایا جہاں کی خاک تک میں شفا موجود ہے۔ سبحان اللہ..... بے شک میرا رب سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ مسجد نبوی میں بیٹھ کر مجھے یہ نظارہ دیکھنے کی بھی سعادت حاصل ہوئی..... کہ مسجد کی خوب صورت اشارہ کلیوں والی چھت آہستہ آہستہ کھلا کرتی ہے..... کیسا پیارا منظر ہوتا ہے..... گولائی میں لکڑی کے منقش کام والی چھت جب دھیرے دھیرے ہٹ جاتی ہے..... اور روشنی ہر سو پھیل جاتی ہے..... ایسا دن میں فجر اور ظہر کی نماز کے بعد ہوا کرتا ہے..... جس سے اے سی کے خنک ماحول میں تازہ ہوا اور دھوپ بھی شامل ہو جاتی ہے۔ کیسے ماہر کاریگروں نے کیسی اچھی چھت بنائی ہے..... وہاں پر موجود ایک خاتون نے مجھے بتایا..... اس قسم کی 58 چھتیں ہیں..... جو اسی طرح کھلتی ہیں اور بند ہوتی ہیں۔ ماہرانہ کاریگری ایک مثالی جگہ نظر آتی ہے کہ مسجد نبوی میں بیٹھ کر اس کے ستونوں، دیواروں اور چھتوں کو بھی تکتے رہو..... تو نہ دل بھرتا ہے اور نہ ہی وہاں سے اٹھنے کو جی چاہتا ہے..... کہ ہم اپنے پیارے رسول ﷺ کے کتنے قریب ہیں..... پتا نہیں پھر کبھی آنا ہو کہ نہیں جب تک یہاں ہیں اس کے ہر پل کو اپنی یادوں میں چھپا لیں اور یہ سب مناظر اپنی آنکھوں میں قید کر کے لے جائیں جس سے بعد میں سیراب ہوتے رہیں۔ چھ دن مدینے میں قیام رہا مگر ایسا لگ رہا تھا جیسے اب یہاں سے کہیں نہیں جانا وہ بیگ جو کچھ کے لیے بنایا گیا تھا وہ بھی کھل گیا تھا اور کمرے میں اتنا سامان تھا کہ لگتا تھا برسوں کے لیے یہاں آئے ہیں، اس دفعہ سوائے کھجوروں کے مدینے سے کچھ نہیں خریدا بس دل تھا کہ مسجد نبوی میں ہی لگا کرتا تھا کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کا رزق مکے اور مدینے سے بندھا ہوا ہے واقعی دل سے رشک آتا ہے مجھے ان لوگوں پر..... وہاں قیام کے دوران وہاں کی تمام مساجد، احد کا پہاڑ اور وادی جن تک گئے..... اور سنی سنائی باتوں میں یہ صداقت ہم نے بھی محسوس کی کہ وادی جن میں گاڑی از خود چلتی ہے جس کا رخ مدینے کی جانب ہو۔

مدینے سے اگلی منزل مکہ تھی..... مدینے سے ہم بائی روڈ مکہ پہنچے..... اور بفضل خدا یہاں ہماری رہائش مکہ ٹاور ہوٹل میں تھی۔ جس کا مین گیٹ حرم شریف کے سامنے ہے۔ ان دنوں حرم شریف میں تعمیراتی کام ہو رہا ہے۔ جس کی وجہ سے نقشہ تبدیل سا لگا..... تعمیر مکمل ہونے کے بعد اس میں لاکھوں سا سکیں گے۔ ہم رمضان سے چند دن پہلے پہنچے تھے..... رش بڑھ رہا تھا بلکہ ہر روز بڑھ رہا تھا۔ اور رمضان کا چاند دیکھ کر تو بے حساب بڑھ گیا..... بفضل تعالیٰ عمرے بھی کیے، طواف بھی کیے اور آپ سب لوگ میری دعاؤں میں شامل رہے..... پیاری بہنو! یہ بات تو آپ جانتی ہی ہیں ناں کہ مجھے ہزاروں بہنوں کے نام ان کے شہروں کے نام کے ساتھ یاد ہیں۔ اس لیے آپ سب کے لیے خوب جی بھر کر دعائیں کی ہیں۔ بے شمار خواتین سے ملاقات بھی ہوئی جس میں مسز عجمیہ رمضان بھی شامل ہیں جو کراچی میں جگہ جگہ دستر خوان لگواتے ہیں، ادیبہ کی اسکول کی سہیلیاں ہر جگہ ملتی رہیں۔ عظمیٰ ہر جگہ میرے ساتھ رہی..... مگر ایک مرتبہ طواف کرتے ہوئے ایک ایسا بھی موقع ہوا کہ جب ایک عربی خاتون نے میرا ہاتھ تھام لیا اور بڑی تیزی سے طواف کرنا شروع کیا وہ شاید نابینا بھی تھیں بلند آواز میں دعائیں بھی پڑھ رہی تھیں..... ان کو مجھ پر یہ پیار شاید اس وجہ سے آ گیا تھا کہ دوران طواف میں نے انھیں پانی دے دیا تھا کہ گرمی اور رش کی وجہ سے وہ بھی پسینے میں ہو رہی تھیں..... اور عربی میں شکریے کے جملے ادا کرنے کے بعد انہوں نے بڑی محبت سے دوستانہ انداز میں اپنی ہاتھوں کی انگلیاں میری انگلیوں میں ڈال دیں اب عظمیٰ کہیں اور رہ گئی تھی اور میں بڑی سرعت کے ساتھ ان کے ساتھ طواف کر رہی تھی..... جب ساتواں چکر اختتام کے قریب تھا تو عظمیٰ بھاگنے کے انداز میں میرے پاس آئی اور کہا آپ کا طواف مکمل ہو گیا ہے ورنہ آپ کی یہ سہیلی تو گیارہ، بارہ چکر کروا دیں گی۔ تب میں نے اپنی اجنبی دوست کو انگریزی میں بتایا..... مگر وہ کچھ سمجھیں اور کچھ نہیں تب اشارے کی زبان

کام آئی۔ سعودی عرب قیام کے دوران یہ احساس ہوا کہ ان کی نئی نسل بھی عربی کے سوا کوئی زبان نہیں سیکھنا چاہتی۔ ہاں ایک بات جو بہت زیادہ مجھے محسوس ہوتی ہے..... وہ موبائل کا استعمال تھا۔ خواتین طواف کرتے ہوئے اپنی سعودی خود بنا رہی ہیں۔ اپنے شوہر سے تصویریں کھنچوا رہی ہیں، فون پر باتیں بھی ہو رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ موبائل کی اسکرین سے دعائیں پڑھتے ہوئے بھی لوگ نظر آئے۔ تصویروں کی ماڈلنگ میں پاکستان کی لڑکیاں بھی آگے آگے تھیں اور دوسرے ممالک کی بھی جو مجھے اچھا نہیں لگا کہ یہاں لوگ اللہ کو راضی کرنے آئے ہیں دعائیں مانگ رہے ہیں وہاں یہ سب بھی چل رہا تھا اس عمرے کی تفصیل تو انشاء اللہ بعد میں لکھوں گی اس وقت تو یہی بتانا تھا کہ میں نے پہلی مرتبہ وہاں کا رمضان بھی دیکھا اگر ہم یہ جان لیں کہ روزہ افطار کروانے کی کتنی فضیلت ہے تو ہر شخص روز سے داروں کی تلاش میں نکل جائے۔

اس دفعہ بھی مجھے یہی احساس ہوا کہ ہماری لوئر کلاس اور مڈل کلاس طبقہ امرا کے مقابلے میں زیادہ آتی ہے۔ ہمارے تمام صوبوں میں سے صوبہ پنجاب سے آنے والے سب سے زیادہ تھے۔ ہر مسلمان کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اللہ کا گھر ضرور دیکھے۔ اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ آپ عمرے کی نیت کر لیجیے۔ وہاں بلانے کی ذمے داری ہمارے پروردگار کی ہے۔ جی ہاں۔

اور اب آئیں اپنی سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالنے سے پہلے صرف ایک بار درود ابراہیمی پڑھتے ہیں جو ہر نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالم اسلام کی پریشانیوں کو دفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔

آیت کریمہ یہ ہے۔

لا الہ الا انت سبحانک انی کنت من الظالمین

ترجمہ: تیرے سوا کوئی معبود نہیں اور تو ہر عیب اور کمزوری سے پاک ہے۔ میں قصور واروں میں سے ہوں (نوٹ) یہ حضرت یونس کی مشہور دعا ہے کہ جو انہوں نے مچھلی کے پیٹ میں اللہ سے کی تھی یہ آیت کریمہ کہلاتی ہے۔ اس کے پڑھنے کے فوائد کثرت سے ہیں اور اب آپ اپنی مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی سرگرمیوں پر ایک نظر ڈالیں کہ کیا کچھ ہو رہا ہے۔

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ ہماری پیاری مصنفہ اور شاعرہ شگفتہ شفیق کی ہونہار بیٹی کنزل شفیق نے ایوی ایشن میڈیسن میں فرسٹ پوزیشن حاصل کی ہے۔ (ماشاءاللہ بے حد مبارک باد..... قابل ماں کی قابل بیٹی)

☆ ہماری پیاری مصنفہ اور شاعرہ عقیلہ حق کی دو نئی کتابیں شائع ہو گئی ہیں۔ عام عورت عقیلہ کے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جس میں ان کے چودہ افسانے شامل ہیں۔ جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے کہ ان کے یہ تمام افسانے آج کے معاشرے کی کہانیاں ہیں جس کا مرکزی کردار عام عورت ہے..... اور یہ تمام افسانے سچی کہانیاں ہیں جو ہمارے اطراف موجود ہیں۔ عقیلہ حق کی دوسری کتاب محبت رائگاں میری، ناول ہے۔ جس میں عورت کے وہ تمام دکھ نظر آتے ہیں جو بظاہر کسی کو نظر بھی نہیں آتے۔ خوب صورت منظر نگاری کے ساتھ کردار کی پختگی کا خوب صورت تنیج بھی دیا گیا ہے۔ خوب صورت سرورق اور صرف 300 روپے قیمت ہے۔ کاغذ بھی اچھا استعمال کیا گیا ہے۔ منگوانے کا پتا ویلکم بک پورٹ مفرید پبلشرز مارد و بازار، کراچی۔

☆ ہماری پیاری مصنفہ تسنیم منیر علوی، دوسری کا افسانوں کا مجموعہ بہت جلد آنے والا ہے۔ (پیشگی مبارک باد)

☆ ہماری پیاری مصنفہ ناہید فاطمہ حسنین نے لاہور میں الحبیب لٹریری فورم کی طرف سے عزیز نظامی ایوارڈ بشریٰ رحمٰن کے ہاتھوں وصول کیا دوسری خوشی ان کے حوالے سے یہ ہے کہ ناہید کے اعزاز میں شاعر اعتبار ساجد اور ریاض رومانی نے ایک شاندار مشاعرے کا اہتمام کیا کراچی کی یہ شاعرہ اور مصنفہ بہت سی خوشگوار یادیں لے کر لاہور سے کراچی واپس آ گئی ہیں۔ (ہماری جانب سے مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی تبصرہ نگار غزل ہاشمی، اتنک کے ہاں پیاری سی بیٹی ہوئی ہے جس کا نام سندس رحاب رکھا گیا ہے۔ (ماشاءاللہ)

☆ ہماری پیاری شاعرہ فریدہ جاوید فری یوسف زئی کا نیا مجموعہ کلام محبت یاد رکھوں کی شائع ہو گیا ہے۔ جس کا انتساب ہمارے نام ہے۔ فریدہ کی شاعری میں ایک اپنا پن ہے۔ کہیں وہ چاہت کے حصار پر سرشار سی کھڑی نظر آتی ہیں تو کہیں

وہ دکھ کے صحرا میں جھلسی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ہر موضوع کو اپنے اندر اتار کر شاعری کے پھول کھلائے ہیں جو بہت ہی خوب صورت اور مسحور کن ہیں۔ کتاب کی قیمت 300 روپے ہے۔ کتاب منگوانے کے لیے پرائم ٹائم پبلی کیشنز، لاہور سے اس نمبر پر رابطہ کیا جاسکتا ہے۔ 0333-4261878 یا 042-36367329۔

☆ پاکیزہ کی پیاری مصنفہ رفاقت جاوید، اسلام آباد پروین شاکر کی قریبی دوست رہی ہیں۔ رفاقت نے پروین شاکر کے بارے میں دو کتابیں لکھی ہیں پہلی جیسا میں نے دیکھا اور دوسری یادیں پھول بن کر کھلتی ہیں۔ دوسری کتاب کی تقریب پذیرائی انشاءاللہ عید کے بعد اسلام آباد کلب میں ہوگی۔ معروف اور مقبول شاعرہ پروین شاکر کی یادوں کے حوالے سے رفاقت کی یہ کتاب آئندہ تحقیق کے کاموں میں بھی کام آئے گی۔ (ماشاءاللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری فرزانہ شعیب، سوات عمرے کی سعادت حاصل کر کے آگئی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری کنول، پنجاب نے ٹیچنگ کا ڈپلوما لے لیا ہے۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار زریں زبیر کوٹھاری، کراچی اپنے نئے مکان میں شفٹ ہوگئی ہیں۔ (ماشاءاللہ، مبارک باد)

☆ ہماری پیاری مصنفہ نسیم فضل خالق، حیات آباد میں اپنی نئی کوٹھی میں شفٹ ہوگئی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار شیریں ظفر، ملتان کی بیٹی علینہ ظفر نے قرآن پاک مکمل کرلیا ہے اور اس سال ان کی دونوں بیٹیوں نے روزے بھی رکھے۔ (مبارکاں)

طالبے صحت کے لیے التماس ہے

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری شیریں، کراچی بلڈ پریشر اور ڈپریشن میں مبتلا ہیں۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری ڈاکٹر میمونہ غوری، کراچی کی ٹانگوں میں سخت تکلیف ہے۔

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری فوزیہ شہزاد، پشاور کی صحت کے لیے خصوصی دعا کی درخواست ہے۔

☆ مستقل تبصرہ نگار ثوبیہ ظہور، اٹک کی طبیعت کافی ناساز ہے۔

☆ پاکیزہ کی قاری عذرا بی بی، ساہیوال چند دنوں سے بیمار ہیں۔

☆ شاعرہ اور مستقل تبصرہ نگار امینہ عندلیب، ساہیوال کی طبیعت ان دنوں پھر شدید خراب ہوگئی ہے۔

☆ ہماری پیاری مصنفہ رفاقت جاوید، اسلام آباد ان دنوں بستر علالت پر ہیں۔

☆ ہماری پیاری شاعرہ شگفتہ شفیق، کراچی کی طبیعت قدرے ناساز ہے۔

☆ شاعرہ فریدہ خانم، لاہور کی چھوٹی سی بھانجی موٹر بائیک سے ٹکرا کر زخمی ہوگئی ہے۔

☆☆☆

ملیحہ ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ”نایاب جیلانی کی ترکِ وفا جرمنی کی سیر کے ساتھ جاسوسی انداز میں قاری کو اگلی قسط کا انتظار کرنے پر مجبور کردیتی ہے۔ سیکنہ فرخ کا کاشانہ الفت بہت پسند آیا۔ کیا کچھ نہیں تھا اس ناولٹ میں، ویل ڈن۔ شام شہر یاراں میں کہانی آگے بڑھی ہے۔ اس کے مرکزی کردار کو بہت اچھی طرح پیش کیا گیا ہے ورنہ سیاست داں اس طرح کے کہاں ہوتے ہیں۔ مجھے اس ناول میں دعا پر یقین بہت اچھا لگا ایک الجھی ہوئی کہانی کو صبیحہ نے سلجھا دیا ہے۔ غزالہ فرخ کی پہلی تاریخ بہت اچھا تھا۔ فرحانہ ناز ملک کی تحریر مجھے متاثر نہیں کرسکی۔ اسما قادری، تسنیم منیر علوی اور صائمہ قیصر کی تحریریں بس سو سو لگیں۔ کارنر میں جبیں ہاشمی کی دعا بہت اچھی لگی۔ دیگر کارنرز بھی بہت اچھے لگے۔ نزہت نے غزالہ نگار سے ملاقات کروائی، شکریہ۔ اس انٹرویو کو چھ ماہ کیوں لگے، حیرت ہوئی۔ بہر حال اچھا تھا۔ نیلوفر عباسی سے ملاقات مختصر مگر پُراثر رہی۔ نیلوفر کی باتیں تو ہمیشہ اچھی لگتی ہیں۔ اللہ نیلوفر کو صبر دے۔ ہاں نیلو کو کتاب کی بھی مبارک باد۔ عذرا رسول اور تمہارے ساتھ نیلوفر کی تصویر بہت اچھی لگی۔ تصاویر مزید ہونی چاہیے تھیں۔ شائستہ زریں کا سروے ماہ رمضان کے حوالے سے بہترین تھا۔ جلترنگ کے اس ماہ خاکے زیادہ تھے اس لیے مسکرانے کا مواد بھی زیادہ مل گیا...... اچھے گلے، مدینے کے سفر کو تحریری شکل میں کب لا رہی ہو۔ امید ہے کہ اچھی

دعاؤں میں یاد رکھا ہوگا۔" (تبصرے کا شکریہ آپ سب بہنیں اجتماعی دعاؤں کے ساتھ ساتھ انفرادی طور پر بھی شامل تھیں)

☆ مسز نزہت اشفاق، کراچی سے۔ "سرورق اچھا تھا مگر رمضان کے حوالے سے اگر اس کے سر پر دوپٹا بھی ہوتا تو مزید اچھا ہو جاتا۔ تینوں ناول ٹھیک ہی جا رہے ہیں۔ نیلوفر عباسی کو بہت عمدگی کے ساتھ خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ اس کو کہتے ہیں کوزے میں دریا بند کر دینا۔ وہ آئے بزم میں غزالہ نگار کا انٹرویو اچھا لگا۔ اگر ان کا کوئی افسانہ بھی شائع کر دیں تو ہمارے قارئین بھی ان کے اندازِ تحریر سے آگاہ ہو جائیں گے۔ شائستہ زریں کا سروے ہمیشہ بہت اچھا لگتا ہے اور اختر شجاعت کا نیا سلسلہ علم معرفتِ الٰہی بہترین ہے۔ بے حد سادگی کے ساتھ وہ موضوع کو لے کر چل رہی ہیں جس سے قارئین کی معلومات میں بھی یقیناً اضافہ ہوگا۔ روحانی مشورے رمضان کے حوالے سے ہیں اس لیے بے حد پسند آئے۔" (تبصرے کا شکریہ)

☆ فیروزہ بیگم، کراچی سے۔ "جون کے پاکیزہ کا تحفہ خاص آپ کے روحانی مشورے تھے۔ جو اس ماہ کی ضرورت تھے۔ اختر شجاعت علم کے بارے میں بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ شکر ہے اس ماہ ٹائٹل پر دلہن نہیں تھی۔ ورنہ ہر ماہ دلہن کو دیکھنا اچھا نہیں لگتا۔ امانت اب اختتام کی جانب نظر آرہا ہے۔ رفعت سراج نے بہت اچھا لکھا۔ عنیزہ سید کے ہاں الجھاؤ بہت نظر آتا ہے مگر وہ گرہیں کھولنا بھی جانتی ہیں۔ ان کا ناول بھی اچھا جا رہا ہے۔ افسانوں میں سکینہ فرخ اور غزالہ جلیل راؤ نے متاثر کیا۔ غزالہ نگار کے سادگی سے دیے ہوئے جوابات بہت اچھے لگے۔" (آپ یہ دیکھیے کہ ایک انگریزی پڑھانے والی استاد نے اپنے جوابات میں ایک لفظ بھی انگریزی کا استعمال نہیں کیا اور امریکا میں سر پر دوپٹا لیے وہ کتنی منفرد نظر آرہی ہیں، ماشاءاللہ)

☆ سائرہ رؤف، کراچی سے۔ "میں اور میری دونوں بیٹیاں سدرہ رؤف اور اقرا رؤف پاکیزہ باقاعدگی سے پڑھتے ہیں۔ جب میں نے پاکیزہ پڑھنا شروع کیا تھا تو صرف جلتر نگ اور ناولوں کی قسطیں پڑھ کر چھوڑ دیا کرتی تھی مگر جب میری باجی نے مجھے بتایا کہ اس میں سب سے خاص تو بہنوں کی محفل ہوا کرتی ہے تم وہ پڑھا کرو اور جب میں نے یہ محفل پڑھنی شروع کی تو مجھے ایک عجیب قسم کا لطف سا محسوس ہوا۔ پاکیزہ کی کہانیاں کوئی نہ کوئی اخلاقی سبق ضرور دیتی ہیں۔ میں اپنی بیٹیوں کو اس کی کہانیاں لازمی پڑھواتی ہوں کہ میں سمجھتی ہوں کہ پاکیزہ ہماری بچیوں کی ذہنی تربیت بھی کر رہا ہے۔ ہاں رفعت سراج کو میرا اسلام ضرور دیجیے گا۔" (سائرہ اس محفل میں خوش آمدید، آپ کی بچیوں کو بھی ہم کہیں گے کہ وہ بھی اپنی آرا سے ہمیں آگاہ کریں۔ پاکیزہ کی پسندیدگی کے لیے مشکور ہوں۔ ہاں رفعت سراج بھی آپ کو سلام کہتی ہیں اور اپنے ناول کی پسندیدگی کے لیے شکریہ بھی)

☆ مسز شیریں سلیم، لاہور سے۔ "غزالہ نگار اوسنزی کا انٹرویو اچھا لگا۔ نیلوفر عباسی کی تقریب کا احوال بھی پسند آیا۔ اپنے سینئرز کو ہمیشہ عزت دینی چاہیے۔ بہنوں کی محفل کے صفحات مجھے اب بھی کم سے لگ رہے ہیں۔ عنیزہ سید کا ناول شان سے آگے بڑھ رہا ہے۔ امانت بھی ٹھیک انداز میں ختم ہونے کو ہے۔ روحانی مشورے باموقع بھی تھے اس لیے سب ہی مستفید ہوئے ہوں گے۔ سب افسانے اچھے تھے اور تمام سلسلے عمدہ تھے۔" (پسندیدگی کا شکریہ)

☆ شگفتہ شفیق، کراچی سے۔ "جون کا شمارہ اچھا لگا اداریہ فرسٹ کلاس اختر شجاعت نے علم معرفتِ الٰہی بہت اچھا لکھا ہے۔ تینوں ناول اچھے رہے۔ شائستہ زریں کا سروے پسند آیا۔ افسانوں میں تسنیم منیر، غزالہ جلیل، اسما قادری اور غزالہ فرخ نے زیادہ متاثر کیا۔ بہنوں کی محفل لاجواب، کارنر بے حد شاندار تھے۔" (اور تمہارا تبصرہ بھی شاندار ہے)

☆ مسز اقصیٰ عمران، ملاہور سے۔ "شدید گرمی میں پاکیزہ نے ٹھنڈے موسم کی طرح سکون پہنچایا کیونکہ اسے پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے کسی اپنے سے ملاقات ہو رہی ہو۔ گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہو چکی ہیں اور کیونکہ میں بھی گورنمنٹ ٹیچر ہوں تو چھٹیوں کا نام سن کر میرا دل بچوں کی طرح باغ باغ ہو رہا ہے کہ چلو دو ڈھائی ماہ تو اپنے گھر کو مکمل وقت دے سکوں گی۔ آنٹی یقین کریں اس لوڈشیڈنگ نے تو چھٹیوں کا مزہ بھی خراب کیا ہوا ہے نہ کہیں جانے کو دل کرتا ہے اور نہ دل کرتا ہے کہ کوئی آئے۔ ویسے ایک بات بتائیں کہ کیا پاکیزہ کی پوری ٹیم اور تمام پاکیزہ پڑھنے والے اس لوڈشیڈنگ کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے جس نے تمام انسانوں کو نفسیاتی مریض بنا کر رکھ دیا ہے۔ مجھے کچھ کہنا ہے مئی میں آپ نے بجا فرمایا کہ ہمیں اپنے اردگرد لپٹا تنہائی کا خول توڑنا چاہیے مگر جہاں تک مجھے لگتا ہے کہ آج کے دور میں ملنا ملانا جو کم ہوا ہے اس کی اصل وجہ مہنگائی ہے کیونکہ گھروں کا بجٹ وہی ہوتا

ہے اور مہنگائی روز بروز بڑھتی جا رہی ہے۔ ایسے میں اگر کوئی آپ کے گھر آئے تو خاطر داری میں ہی اتنا خرچ ہو جاتا ہے کہ آپ کو باقی مہینہ سکون سے گزارنا مشکل نظر آتا ہے (ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ) افسانے تمام اچھے دن تھے۔ آسیہ ذرکامل کی کہانی تھی۔ خدا نے جزا سزا تو قیامت کے دن مقرر کر رکھی ہے مگر انسان کو اس کی غلطیوں کا احساس اس دنیا میں کروا دیا جاتا ہے۔ باقی تمام سلسلے بھی اچھے تھے۔ بہنوں کی محفل تو پاکیزہ کی جان ہے۔ جس میں مختلف بہنوں کے خطوط پڑھ کر ایسا لگتا ہے کہ ان سے آدھی ملاقات ہو گئی ہے اور آپ نے سچ کہا کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں بجائے بچیاں ٹی وی اور فیشن کی طرف متوجہ ہوں۔ انہیں گھرداری سیکھنی چاہیے کہ اصل زیور یہی ہے جو آگے جا کر سسرال میں کام آتا ہے۔" (مگر اس کے لیے ماحول اور لڑکیوں کو ذہنی طور پر تیار کرنا تو ماؤں کا ہی کام ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت غصہ آتا ہے جہاں بیٹیاں ماؤں کو چلا رہی ہوتی ہیں)

شہزادی کائنات یونس، کراچی سے۔ "رفعت آنٹی کا ناول امانت ہمیشہ کی طرح اسٹرانگ ہے۔ لو یو اینڈ بیسٹ رفعت آنٹی۔ آپ جو مصنفین اور مستقل تبصرہ نگار، شاعرات وغیرہ کی مصروفیات کا ذکر کرتی ہیں بہت مزہ دے جاتا ہے ورنہ عموماً ڈائجسٹوں میں ہم جس قاری بہن یا مصنفہ کے بارے میں تصوراتی خاکہ بناتے ہیں اس سے مختلف جب پتا چلتا ہے کہ وہ محترمہ نانی دادی کے عہدے پر فائز ہیں یا جسے ہم بزرگ سمجھتے ہیں وہ ینگ جنریشن سے تعلق رکھتی ہیں تو بہت عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔ پاکیزہ کے لیے ڈھیروں نیک خواہشات اور بیسٹ وشز۔" (نوازش)

مسز تبسم تاج، لاہور سے۔ "اپنے خط کا جواب بہنوں کی محفل میں پڑھ کر دلی خوشی کی لہر سارے جسم میں برقی رو کی طرح دوڑ کر ذہن و دل کو سرشار کر گئی۔ اس ماہ کا رسالہ بھی حسبِ معمول شاندار ہے۔ اداریہ واقعی لاجواب ہے۔ انسان معاشرتی حیوان ہے۔ اگر ہمیں محبتوں اور رشتوں کی رفاقت نہ ملے تو ہم بغیر پانی کے پودے کی طرح مرجھا کر بکھر جاتے ہیں۔ سچی محبت اور دوستی سے بڑھ کر قیمتی دولت کوئی نہیں ہے۔ امانت اور شام شہر یاراں اپنی درست رفتار رکھ رہی ہے۔ باقی افسانے کچھ اچھے لگے کچھ خاص معلوم نہیں ہوئے۔ میرا نصیب اچھا لگا۔ امینہ عندلیب اور ممتاز ضیا کے لیے خصوصی صحت کی دعائیں ہیں۔ روحانی مشورے تو ایمان کو اور تازہ اور مضبوط کر دیتے ہیں۔ سنڈے والا صفحہ اٹریکٹ نہیں کرتا اسے تو بند کر کے کوئی اور اچھا سلسلہ شروع کر دیں تو بہتر ہے (آپ ہمیں اپنی تجاویز دیں کہ کیا شروع کریں) جلترنگ میں مذاق بہت پسند آیا۔ آنٹی عظمیٰ آفاق کے اور آپ کے انٹرویو کا بہت شدت سے انتظار ہے۔ پلیز جلدی یہ فرمائش پوری کریں اور تمام تبصرہ نگار بہنوں کے لیے دل سے دعائیں اور سانجھے دکھ میں نیر شفقت نے جو پیغام دیا ہے کاش وہ ہم سب کے دل میں جڑ پکڑ لے اور بہت سی بیٹیوں کے نصیب خوشی سے جگمگا جائیں۔ دورۂ قرآن کی کلاس اٹینڈ کر کے دل سے بڑا بوجھ کم ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے گو کہ بڑی مشکلات کے بعد جا پاتی ہوں لیکن ربِ کریم کی شکر گزار ہوں کہ وہ استقامت دیتا ہے۔ میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش دعا اپنے شوہر کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کی ہے جو وسائل کی کمی کی وجہ سے پوری نہیں کر سکتی لیکن مجھے اپنے اللہ اور آقائے دو جہاں کی محبت پر پورا پورا یقین ہے کہ میری یہ حسرت ایک نہ ایک دن ضرور پوری ہو گی کوئی نہ کوئی ذریعہ یا راستہ نکل ہی آئے گا۔ آمین۔" (انشاء اللہ ضرور نکلے گا۔ آپ عمرے کی نیت کر لیں، کروانے کی ذمے داری باری تعالیٰ کی ہو گی اور آپ خود حیران رہ جائیں گی کہ وہ کتنا رحیم و کریم ہے)

ثنا اجالا، بھلوال سے۔ "شمارہ قدرے جلد ملا۔ اس وجہ سے سوچا کہ آپ کو خط لکھ کر رائے کا اظہار کروں۔ ایک بات وہ یہ کہ میرا نام ثناء ہے ثنا نہیں پلیز صحیح کر لیجیے گا ضرور۔ نگہت سیما کی پُراثر تحریر لیکن نایاب جی آپ نے ترکِ وفا کافی سلو کیا ہوا ہے۔ پلیز کہانی کو جلد واضح کریں۔ سمیرا حمید کو پاکیزہ میں دیکھ کر خوشی ہوئی۔ نگہت عبداللہ مزہ آ گیا جون کے شمارے کو پڑھ کر ایسا لگتا تھا

انتقالِ پُر ملال

قارئینِ پاکیزہ کو ہم نہایت دکھ کے ساتھ اطلاع دے رہے ہیں کہ ادارے کے دیرینہ ساتھی معروف مصور شاہد حسین طویل علالت کے بعد خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ تمام قارئین سے سورۂ فاتحہ کے لیے التماس ہے۔

جیسے عید نمبر پڑھ رہے ہوں افسانے بھی بہترین تھے۔ اُم ایمان "ویری ویلڈن" اس کے بعد جلترنگ کی طرف بڑھے جسے پڑھ کر مسکراہٹ ہونٹوں پر دوڑ جاتی ہے۔ پاکیزہ ڈائری میں اس بار بھی اپنی شاعری نہ تھی بہت دل ٹوٹا پہلے کیا کم ٹوٹا ہوا ہے۔" (ثریا اگر آپ کی شاعری لگ جاتی تو دوسرے لوگوں کے دل ٹوٹ جاتے۔ ہماری مؤدبانہ گزارش ہے کہ پلیز اپنے مراسلات نثر میں بھیجیں ویسے آپ کی ایک نظم چیک کر کے ہم لگا دیں گے)

بعد سنبل ملک اعوان، مشاہدہ سے۔ "مجھے اسپیشل شادیاں آپ سے مل کر بہت اچھا لگا۔ دو شوق تو مشترکہ ہیں ڈائجسٹ پڑھنا اور کوکنگ کرنا۔ گاؤں میں تو اوون وغیرہ نہیں ہوتے مگر گھر میں تندور چولہے ضرور ہوتے ہیں جن میں کھانا بنانے کا اپنا مزہ ہے۔ میں آپ کی فرینڈ بننا چاہوں گی اس فرینڈشپ کو ہیرے کی طرح سینت سینت کر رکھوں گی۔ اگر میری فرینڈشپ آفر منظور کرلی تو میں تفصیلاً اپنا تعارف بھیجوں گی۔ (جی ضرور) جلترنگ میں بڑے لوگ بہت اچھا لگا بلکہ معاشرے میں ہونے والی حقیقت کی عکاسی کرتا نظر آیا۔ میں اکثر گنگناتی ہوں میں حسب معمول کائنات عبدالحلیم، عرشیہ جنید، براجمان نظر آئیں۔ سندیسوں کو دل سے پڑھا۔ بے شک میرا سندیسہ شامل ہی نہیں تھا۔ شوا بے ہو میو کلینک، ایک بہت اچھی کاوش، اس سے بہت سوں کا بھلا ہو رہا ہے۔ جزاک اللہ۔ جب بات ہو بڑے بڑے لکھاریوں کی جیسے ہماری مشاں جیسی لکھنے والی آنٹی رفعت سراج تو جانے کیوں قلم بھی ان کی حقیقت میں رک سا جاتا ہے کیونکہ وہ الفاظ کو اس قدر خوب صورتی سے استعمال کرتی ہیں۔ بہنوں کی محفل سے آگے بڑھے تو پاکیزہ ڈائری سے لطف اندوز ہوئے۔ واہ آپی عظمیٰ آفاق سعید آپ کے کیا کہنے۔۔۔ مگر آپ ہیں خوش قسمت کہ ہیرا جیسی آنٹی انجم کی بیٹی ہیں۔" (ثریا ہم اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ آپ جیسی محبت کرنے والی اور مادہ سے دل ہماری بہنیں ہوں)

بعد نور افشاں شیخ، مشاہدہ پور سے۔ "یقین کریں اپنا نام دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ پاکیزہ نے اپنے حسین ناموں میں مجھے بھی یاد رکھا اللہ پاک آپ کو بہت ساری صحت دے آمین۔ باجی آپ کے مدد مانی مشورے پڑھ کر تو دل کرتا ہے آپ کے ان ہاتھوں کو چوم لوں جن سے آپ ہمارے لیے اتنی مفید باتیں لکھتی ہیں اگر تھوڑا بھی عمل کریں تو پتا نہیں کتنے آگے پہنچ جائیں۔ جیو ہزاروں برس باجی، آمین۔ مئی کے پاکیزہ سالگرہ نمبر میں شہلا نواز نے جو بولوں نے بڑا مزہ دیا اور بہت ہنسایا۔ تصویر بھی پیاری لگی۔ باقی سب تحریریں بھی بہت اچھی اور سبق آموز تھیں۔ سلامت اور شام شہریاراں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ اینہ عندلیب کے لیے یاد سے دعا کرتی ہوں اللہ پاک آپی اینہ کو صحت اور تندرستی دے۔" (آپ کی دعاؤں کے لیے جزاک اللہ)

بعد اُم دُعا، آزاد کشمیر سے۔ "ابھی قسم سے ابھی کاغذ قلم اٹھایا ہی تھا کہ بڑی بیٹی دعا نے چھوٹی بیہہ کو جگا دیا جس کو میں نے آدھے گھنٹے کے بعد بڑی مشکل سے سلایا تھا۔ بس یہ آج کل ماؤں کی حالت آپ سوچ سکتی ہیں کہ ہر ماہ تبصرہ لکھنا ہم ماؤں کے لیے کس قدر بھاری کام ہے۔ کتنے ماہ آئے، مجھے کتنی تحاریر ایسی جن کی تعریف میں لکھنے کو جی چاہا مگر وجہ یہ بچے، ماشاء اللہ میں نے کمپیوٹر سائنس میں ماسٹرز کیا ہے مگر اب تو یہ بھی یاد نہیں کہ کیا پڑھا تھا آپ نے بڑا اچھا ابتدائیہ لکھا کہ ان گرمیوں میں بچیوں کو گھر کا کام، کھانا پکانا، سلائی کڑھائی کی ابتدائی تربیت دینی چاہیے۔ میں نے تو جو بندہ مجھے ملا اسے ضرور مشورہ دیا۔ میری دو بیٹیاں ابھی بالترتیب ساڑھے تین سال اور چھ ماہ کی ہیں ورنہ ضرور ان پر آزما کر اوروں کو مشورہ دیتی لیکن گھر میں کام کرنے کے لیے دو تین لڑکیاں آتی ہیں بہت بیمار اور محنتی پانچ منٹ کا کام دو گھنٹے میں کرنا اور ماشاء اللہ پڑھائی میں بھی تیز ہیں امی کو جوڑوں کا درد ہے تو ان کی مدد کرنے آجاتی ہیں۔ میں نے ان کو کہا کہ اپنی سلائی مشین اٹھاؤ اور ہمارے گھر لے آؤ روزانہ ایک گھنٹا جب خوش قسمتی سے بجلی ہو تو امی سے سلائی سیکھو اب دیکھیں کیا نتیجہ ہوتا ہے اچھا مشورہ صدقہ جاریہ ہے۔ انجم آپا پلیز مسور کی دال اور چنے ان کی مختلف ترکیبیں تو لکھیں پتا نہیں یہ میاں نامی مخلوق ایک ذائقے اور ایک جیسی چیز سے اُوب کیوں جاتے ہیں۔ شاہی فرمان ہے کہ ان دو چیزوں کو مختلف مختلف طریقوں سے پکاؤ۔ جواب دیتی ہوں کوئی پورا ہفتہ مسور کی دال اور چنے کیسے کھا سکتا ہے؟ بہر حال میاں بیوی کے جب تک ہلکی پھلکی نوک جھونک کے جھگڑے نہ ہوں کھانا ہضم ہوتا ہے نہ چین کی سانس آتی ہے۔ اللہ نے رشتہ ہی اتنا پیارا بنایا ہے آخر میں یہی کہوں گی کہ آپ کی یہ محفل سچ میں دوستوں کی محفل ہے۔ بہن سے بھی ناراضی ہو سکتی ہے مگر جو بے تکلفی دوستی میں ہے وہ کسی اور رشتے میں نہیں۔ سب رشتے اپنی جگہ پیارے اور محترم۔" (اُم دعا اس محفل میں خوش آمدید۔ تمہارے

دلچسپ سے خط کو پڑھ کر مزہ آیا۔ فرمائش نوٹ کرلی گئی ہے جسے ہماری قاری بہنیں ہی پوری کریں گی)

٭ عطیہ زاہرہ، لاہور سے۔ "یہ بھی آپ کے ادارے کی قابلیت ہے کہ پرچہ ہمیشہ وقت پر ملتا ہے۔ خیریت سے پہلے سرورق کی ماڈل ہلکے میک اپ اور ہلکے رنگ کے کپڑوں میں خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کے بعد رسالہ کھولا تو سب سے پہلے مجھے کچھ کہنا ہے سے ابتدا کی۔ رمضان کے حوالے سے خوب لکھا پھر دین کی باتوں سے خود کو منور کیا اور اس کے بعد سیدھا بہنوں کی محفل میں چلی آئی۔ میری سالگرہ پر مبارک باد دینے کے لیے شکریہ اور دیگر بہنوں کو بھی مبارک جو جولائی میں اس دنیا میں آئیں۔ اس کے بعد سب کے خطوط پڑھے جو کہ مزہ دے گئے پھر شاعری اور دیگر سلسلے پڑھے جو کہ ہمیشہ کی طرح خوب صورت تھے۔ ہاں سب کو 14 اگست اور عید کی مبارک باد۔" (آپ کو بھی)

٭ لاریب ماہ زیب، چونیاں سے۔ "سالگرہ نمبر میں ہمیں بھی پاکیزہ کے باشعور لوگوں کی فہرست میں شامل کیا۔ ابتدائی سطور میں اپنے نام دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ انجم آنٹی کا بھی پیار تو ہے جو ہمیں اور سب قارئین پاکیزہ کو اور کہیں نہیں ملتا نتیجتاً کچے دھاگے سے بندھے سب چلے آتے ہیں۔ جی ہاں یہ دھاگا کچا نہیں بلکہ بہت پکا ہے جو ان شاء اللہ کبھی نہیں ٹوٹنے کا کیونکہ ہمیں پاکیزہ پڑھتے ہوئے چار سال ہو گئے ہیں پر خط کتابت ہم نے چند ماہ پہلے ہی شروع کی ہے لیکن اس کے باوجود جو مان اور پیار آپ نے دیا انجم آنٹی اسے آپ کا بڑا پن ہی کہہ سکتے ہیں اور ماشاء اللہ داد دیتے ہیں آپ کی ذہانت اور حافظے کو سیکڑوں بہنوں کے نام یاد رکھنا معمولی بات ہرگز نہیں ہے۔ ماڈل کی جھیل سی آنکھیں اور دلکش مسکراہٹ بہت پسند آئی۔ دین کی باتیں ہمیشہ کی طرح لاجواب تھیں کاش کہ ہم سب ان پر عمل کرنے والے اور ان سنہری اصولوں کو اپنی زندگی میں لاگو کرنے والے بن جائیں، آمین۔ اپنے اختتام کی طرف رواں دواں رفعت سراج کی امانت، کا انجام امید ہے کہ اچھا ہوگا۔ ہمارا اندازہ ہے کہ رانی اور رعنا گل جان اور اسمٰعیل خان کی اولاد ہیں۔ جابر علی، شاہ زمان اور وارث علی جیسے ظالم اور شدت پسند لوگوں کا انجام بہت برا ہونا چاہیے۔ نایاب جیلانی ترکِ وفا کو بہت عرق ریزی اور باریک بینی سے لکھ رہی ہیں۔ لفظوں سے تصویریں بنتی ہیں اور ہم گھر بیٹھے جرمنی بھی جھانک لیتے ہیں۔ ابھی کہانی میں جو کچھ بھی چل رہا ہے مگر ہماری دعا ہے کہ کہانی کے آخر میں مالا اور علی عیسٰی پھر سے ایک ہو جائیں۔ نگہت عبداللہ صاحبہ میرا نصیب میں ہمیں جیبی کا فیصلہ بالکل اچھا نہیں لگا۔ کتنی آسانی سے اس نے اپنی ذلت اور بے عزتی کو بھلا کر اپنا تھوکا ہوا پھر سے چاٹ لیا اگر جیبی کا ہونے والا احسن کا پاس نہ ہوتا تو شاید کبھی وہ دوبارہ جیبی کی طرف ہاتھ نہ بڑھاتا۔ عنیزہ سید بہت عمدگی سے کہانی کو آگے بڑھاتے ہوئے اس کے انجام کی طرف لے جا رہی ہیں جانے اب میرال کس کا مقدر ٹھہرتی ہے۔ جلوہ دانیال اور ہینش کی ناؤ تو پار لگی خدا کرے باقی سب بھی اچھا ہو۔ تانگے والا ایک اچھا افسانہ تھا لیکن اس کا عنوان بہت فضول تھا۔ سندیسے میں صائمہ سجاد کا شعروں میں ارم کمال، نگہت غفار اور صائمہ یاسر کی گنگناہٹ اور پاکیزہ ڈائری میں ام ثمامہ کا انتخاب بہت پسند آیا۔ باقی حمد و نعت اور اسلامی باتیں تو ہوتی ہی لاجواب ہیں۔ انجم آنٹی کافی پہلے جواہر اردو کا سلسلہ تھا پاکیزہ میں وہ پھر سے شروع کریں۔" (تبصرے کا شکریہ آپ کی تجویز نوٹ کرلی گئی ہے)

٭ شیریں ظفر، ملتان سے۔ "بہنوں کی محفل کے اسٹارٹ میں انجم آنٹی نے جو بھی آئیڈیاز دیے تھے عمل کر کے دل کو لگ گئے۔ میری بیٹی 5th میں پڑھتی ہے۔ میں نے اسے چھوٹے چھوٹے کام بتانا شروع کردیے ہیں اور وہ واقعی خوش دلی سے کر رہی ہے اور میرا بھی کافی کام کم ہو گیا ہے۔ درازوں میں چیزیں گن کر رکھنا، پانی کا کولر بھرنا، تازہ سلاد کاٹنا، چھوٹے بھائی کے کپڑوں کو تہہ لگا کر اس کی جگہ پر رکھنا، شو ریک کو سیدھا اور سیٹ رکھنا، فالتو لائٹس اور پنکھوں کی نگرانی کہ کہیں چلتے نہ رہ جائیں، چھوٹے موٹے برتن دھونا، سبزی بنانا، واہ انجم آنٹی دل خوش کردیا آپ کے مشوروں نے۔ اب ایک احسان کریں یہ بھی بتا دیں کہ جب میری [illegible] کی بیٹیاں دونوں مقابلہ کر کے کام کرنے کی کوشش کریں اور ہر وقت گھر لڑائی کا میدان بن جائے اور جب بچے گھڑی گھڑی پوچھیں ماما میں نے زیادہ اچھا کام کیا ہے یا بہن نے تب کیا کروں؟ (بچوں کو ان کے پسند کے انعامات دیجیے اس سے ان میں مزید نکھار آئے گی) رفعت سراج صاحبہ نے آخر امانت کی خاطر میدان میں اترنا قبول کیا اور کافی مدلل انداز میں اپنا موقف بیان کیا۔ واقعی ہمیں آرام سے اتنی محنت سے ہوئی رائٹر کی تحریر کو پڑھنا چاہیے۔ اب رفعت کافی میچور رائٹر ہیں ان سے ہیرو، ہیروئن کے اتفاقات پر

تھی نائٹ اور چھت کی ملاقاتوں والے سناٹوں کی توقع کی جگہ کچھ ہٹ کر لکھنے کی توقع تو خود ہم نے کی ہوئی تھی۔ اب بے صبری سے فضول خط لکھے جارہے ہیں۔ رفعت جی خود میں آپ سے معافی چاہتی ہوں اپنے اس احمقانہ فعل کی، رئیلی آئی ایم سوری۔ مصباح رضا سعید کے ابو کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ انہیں جنت کے اعلیٰ درجات میں مقیم کرے، آمین۔ نایاب جیلانی کی ترکِ وفا کا پانچواں حصہ بھی ملا اور علی عیسیٰ کے پیار بھرے تعلق کی وضاحت کرتے گزر گیا کہ ایک آدھ سال میں ان میں کتنا پیار ہو گیا تھا کہ اب جو مار کو سکتہ ہے یا خاموشی طاری ہے وہ کس جذباتی سانحے سے گزری ہے۔ اس کی شدت کا اندازہ قاری بہنوں کو بھی ہو جائے گا خیر ناول کچھ کچھ شکل نکال رہا ہے۔ بشریٰ گوندل کی تانگے والا ایک نارمل تحریر تھی۔ سعدیہ رئیس کا ماڈل گرل ایک رئیلی چھتک افسانہ تھا اور ہمارے دوہرے رویوں اور معیار کے منہ پر طمانچہ تھا۔ نیر شفقت کا افسانہ سانجھے دکھ اچھا تھا۔ صغیرہ سعید نے شامِ شہریاراں کی ایک شاندار قسط لکھی۔ اس ماہ کے شمارے میں نگہت سیما کے ناولٹ کیچڑ میں پھول اور سمیرا حمید کے آتش زدہ نے بازی ماری۔ اور آل زبردست شمارہ تھا۔ انجم آنٹی آپ کے پاکیزہ کا معیار پہلے سے بھی زیادہ بڑھتا جارہا ہے۔ عام رائٹرز کے لیے اس معیار کا مقابلہ کرنا مشکل ہے۔ منجھے ہوئے لکھاری اور آپ کا حسنِ انتخاب دونوں ہی ڈائجسٹ کو چار چاند لگا رہے ہیں اور اللہ سے دعا ہے کہ اسے نظر نہ لگے، آمین۔ دیپ دل کے جلے، عنبرین جبیں کا ناولٹ اچھا لکھا تھا۔ نگہت عبداللہ کا ناول میرا نصیب بھی نارمل تھا۔ اس ناول نے کوئی خاص اثر نہیں چھوڑا۔ اُم ایمان کا دھوپ کا سائبان بہت اچھی کاوش تھی۔ نزہت جبیں ضیا نے منگنی میرے بیٹے کی میں منگنی کا خوب صورت احوال لکھا۔ انہیں بیٹے کی منگنی کی بہت بہت مبارک باد۔ جلترنگ میں انجم آنٹی نے مذاق کے عنوان کے تحت جو سچوئیشن بیان کی ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ آنٹی کو ایسے کردار سوجھتے کہاں سے ہیں۔" (سب گرد و پیش ہی بستے ہیں)

☆ فرحین اشتیاق، منڈی سے۔" جون کا پاکیزہ ہاتھ میں، سرورق زبردست۔ سب سے پہلے ترکِ وفا پڑھی بھئی ترکِ وفا تھوڑے سے زیادہ صفحوں پر لگایا کریں ناں بہت ہی زبردست کہانی ہے یہ۔ امانت بدستور سست روی کا شکار ہے پر ہے اچھی کہانی پڑھے بغیر گزارہ بھی نہیں ہوتا۔ بہنوں کی محفل تو ویسے ہی ہمارا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ سب بہنوں کا خلوص اور پیار دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے اور اس لیے ہم نے بھی اس محفل میں شرکت کی ٹھانی ہے پلیز میرے چھوٹے سے خط کو ضرور جگہ دیجیے گا۔" (کڑیا خوش آمدید۔ آئندہ تمہارے تبصرے کی منتظر رہوں گی مگر تمام تحریروں کے بارے میں رائے دیا کرو ناں)

☆ قصیحہ آصف خان، ملتان سے۔" سب سے پہلے تو آپ کو عمرے کی سعادت حاصل کرنے کی مبارک باد دوں۔ رب کریم آپ کو بار بار اپنے گھر بلاتا رہے، آمین۔ رمضان المبارک کی آمد پر مصروفیات بڑھ گئی ہیں جتنا پڑھ رہی تبصرہ کر رہی ہوں۔ جولائی کا شمارہ جلد مل گیا۔ رمضان المبارک کی پُرسعادت ساعتیں قریب ہیں۔ جب آپ یہ خط پڑھ رہی ہوں گی تو عید سعید قریب ہو گی۔ آپ سب کو دلی مبارک باد ہو۔ جولائی کا سرورق مناسب تھا۔ روزے کے بارے میں آپ کی باتیں جامع و پُراثر ہیں۔ اختر شجاعت صاحبہ کا بصیرت افروز مضمون دلکش ہے مگر قرآن حکیم کا ترجمہ نامکمل رہ گیا۔ ایک صلوٰۃ ترجمہ اور ایک صلوٰۃ اختر صاحبہ کو دیں۔ امانت ابھی تک ٹکا سا لگا کہیں جابر کو پھانسی ہو جائے اور گھر والے برآمد، شاہ صاحب کے کردار کو سلام۔ کنواری ساس، بے تکی اور فضول تحریر لگی۔ لڑکیوں کو سبق آموز تحریر پڑھوائیں۔ ترکِ وفا جمود کا شکار لگی۔ کہانی آگے بڑھائیں۔ بے بسی حالات کی ماری ایک دکھیاری کی تحریر صائمہ قیصر کی پی پازیٹو اچھی تحریر لگی۔ اپنا محاسبہ کرنے کی پیشکش تھی۔ سکینہ فرخ کی کاشانۂ الفت پڑھ کر میری آنکھیں بھر آئیں۔ خون کے رشتے کیسے کیسے خون کے آنسو رلاتے ہیں۔ پاکٹ منی میں بھی ایک بہو کے لیے سوچ کے دروازے کھلے۔ واپسی میں فرح نے نادان لڑکیوں کے لیے دانائی کی بات کہی۔ آج کل کی نسل نے شادی بیاہ کو کھیل سمجھ لیا ہے۔ خدارا ہوش کے ناخن لو۔ واہ، واہ فرحانہ ناز کی ساحل ساحل زنجیر ہوئے اور ہم ان کی تحریر اسلوبِ بیان اور جملوں کے اسیر ہوئے، بہت خوب۔ نیلوفر عباسی کی مختصر ملاقات پسند آئی۔ خاص طور پر آپ کی تصویر بہت نفیس لگی۔ سروے ہمیشہ کی طرح بھرپور لگا۔ غزالہ نگار کا احوال انگوٹھی میں نگینے کی طرح جڑت رہا۔ ان کی مثبت اور پُرفکر باتیں دل میں اتر گئیں۔ بہت قابل خاتون ہیں۔ پشاور سے چلنے والا ڈراما بسالا مجھے آج بھی یاد ہے۔ بہنوں کی محفل کے ذریعے مجھے سعدیہ ہاشم سے یہ کہنا ہے کہ رابطہ کیوں ختم کر لیا ہے تمہارا نمبر بند ہے۔ پلیز ایسے نہیں کرتے جیسے بھی ہو رابطہ بحال کرو اور اللہ تمہیں مزید کامیابیاں

دے۔" (تبصرے کا شکریہ آپ کا پیغام پہنچایا جا رہا ہے)

٭ فرحت احمد، کراچی سے۔ "باجی سب سے پہلے تو اپریل کے شمارے میں افسانہ شائع کرنے پر ایک بار پھر شکریہ قبول فرمائیں کیونکہ اس کے لیے میں اللہ تعالیٰ کے بعد آپ کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے کیونکہ یہ میرے لیے بہت اعزاز کی بات ہے کہ پاکیزہ جیسے شمارے میں میرا افسانہ شائع ہو۔ میں اس قابل کہاں ہوں۔ہاں اگر آپ کی حوصلہ افزائی ملتی رہی تو یقیناً کسی قابل ہو جاؤں گی۔ بہت بہت شکریہ۔ باقی تمام بہنوں سے کہوں گی کہ میں ان کی تمام خوشیوں اور غموں میں برابر کی شریک ہوں۔ ان کی خوشیوں میں خوش ہوتی ہوں اور دکھوں پر افسردہ۔ بالاًخر افراد میں اپنا نام دیکھ کر بے انتہا خوشی ہوئی۔ یاد رکھنے کا ایک بار پھر شکریہ۔ اب آتے ہیں تبصرے کی جانب ناول اچھی لگی۔ مجھے کچھ کہنا ہے مسکراتے ہوئے پڑھا اور قہقہہ لگاتے ہوئے ختم کیا۔ بے شک زندگی کی ناکامیوں، پریشانیوں اور مشکلات کا اگر ہنستے مسکراتے مقابلہ کیا جائے تو وہ اتنی مشکل نہیں لگتیں۔ دین کی باتیں تعریف کے لیے الفاظ نہیں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ سلسلے وار ناول امانت اور شام شہر یاراں دونوں ہی خوب صورت طریقے سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ اس صدی کی محبت خوب صورت اینڈ کا ایک خوب صورت ناول۔ ایک نئے موڑ پر ٹریجڈی اینڈ والا ایک سبق آموز منی ناول ستارہ ہو کہ دل ایک اچھی اور پُراثر تحریر۔ ترک وفا تجسس سے بھرپور ایک اچھی تحریر جس کے اسرار سے پردہ اٹھنے کا بے چینی سے انتظار ہے۔ افسانوں میں احتجاج اور بے چارگی بہت پسند آئے۔ تو آپ، وحشت بھروسے کا اور تہی دست بھی اچھے لگے۔ مایہ ناز مصنفہ اقبال بانو صاحبہ کا انٹرویو بہت پسند آیا ایک سادہ سی شخصیت ذہن میں ابھری مجھے ان کی تحریریں بہت اچھی لگتی ہیں۔ اس کے علاوہ تمام مستقل سلسلے تو اچھے لگتے ہی ہیں۔ کارنرز بھی بہت خوب تھے باجی ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ ہومیو کلینک میں جو مسائل اور ان کی ادویات دی جاتی ہیں۔ ان میں مسائل بالکل زیادہ ہی کھل کر بیان کیے جاتے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ مسئلے کو ڈھکے چھپے الفاظ میں بیان کر کے دوائیاں لکھ دی جائیں کیونکہ دوائیں ان کا استعمال کرتی ہوتی ہیں جنہوں نے مسئلہ لکھا ہوتا ہے نام اور ایڈریس تو لکھا ہوتا ہے وہ سمجھ جائیں گے کیونکہ ایسا تو ہو نہیں سکتا کہ میں ان کا مسئلہ پڑھ کر ایسے ہی کسی مسئلے کے لیے بغیر سوچے سمجھے ان کی دوائیاں استعمال کرلوں کیونکہ ایک جیسے مسائل کے لیے بھی ہر شخص ایک جیسی دوائی نہیں لے سکتا۔ دوائی لکھتے وقت ہر چیز مدِنظر رکھی جاتی ہے۔ مسئلہ ایک جیسا ہو سکتا ہے مگر دیگر چیزیں جو مریض سے متعلق ہوں وہ تو ایک جیسی نہیں ہو سکتیں۔" (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

٭ تسنیم منیر علوی کورنگی سے۔ "بہت ہی پیاری سی انجم انصار..... ڈھیروں سلام محبت..... حال ہی میں ایوارڈ وصول کرنے کراچی آمد ہوئی تھی مگر وہاں بھی اتنی جلدی میں ہوئی کہ ملاقات نہ کر سکے انشاءاللہ عید پر آئیں گے تو ضرور ملاقات کریں گے۔ انشاءاللہ ۔۔۔ رفعت امانت میں بڑی چابکدستی سے کہانی کو سمیٹ رہی ہیں۔ رفعت کی وضاحت کے بعد اس پر کچھ کہنا نہیں چاہیے..... ایوارڈ تقریب میں رفعت سے بھی خوشگوار ملاقات رہی۔ نیر شفقت کا سانجھے کا دکھ عورت کا ایک درد مشترک ہے وہی پرانا جہیز کا مسئلہ مگر ایک ماں نے سابقہ تجربے سے آنے والے وقت کو اولادوں کے لیے آسان بنا دیا..... ایک سبق آموز کہانی تھی۔ نگہت سیما کا ناولٹ کیچڑ میں کنول بہترین تھا۔ ماحول کی منظر کشی نے دل موہ لیا اور اختتام قاری کے ذہن پر ایک سوالیہ نشان چھوڑ گیا..... دھوپ میں سائبان ام ایمان کا افسانہ مرد کا اکھڑ پن اور عورت کا نرمی سے کیا احتجاج کی منظر کشی کرتا ہے۔ مرد کو سمجھ ذرا دیر سے آئی ہے۔ میرا نصیب نگہت عبداللہ کا ایک اچھا افسانہ ہے، وہ منجھی ہوئی لکھاری ہیں۔ ڈرامائی سچویشن سے سجا اپنے اندر کہانی آثار چڑھاؤ لیے اختتام کی جانب بڑھا اور واقعی ہیروئن کے نصیب کے اندھیرے چھٹ گئے۔ اور بھی تمام سلسلے اچھے اور حسب سابق رنگارنگ دلچسپیاں لیے ہوئے تھے۔ سلسلے وار سلسلوں پر ان کے خاتمے پر تبصرہ کریں گے۔" (جی ضرور)

٭ کوثر خالد، جڑانوالہ سے۔ "عالیہ بشیر سے عرض ہے کہ وہ نعت و حمد لکھا کرے، ہم سب کو اس کی نعت بہت پسند آئی اور ڈیئر کیسی کے ساتھ جب میرا نام آتا ہے تو میری خوشی کا ٹھکانا نہیں رہتا۔ آپی میری چھ سات ڈائریاں نعتوں سے بھری پڑی ہیں مگر میں ابھی سے نئی لکھتی جاتی ہوں تو پرانی بھیجنے کی تو باری ہی نہیں آسکتی جبکہ میں چاہتی ہوں کہ میری پرانی حمد و نعت بھی شائع ہوں یا الگ سے ایک بک بنواؤں.....؟؟ انشاءاللہ آپ حوصلہ افزائی کرتی رہیں تو ہر ماہ باقاعدگی سے حمد و نعت بھیجتی رہوں گی۔ بس اللہ قبول فرمائے اور ہمیں ہدایت یافتہ اور امن و امان سے رہنے والا بنائے۔ (آمین) خدائے بزرگ و برتر سے دعا ہے کہ وہ ہمیشہ

صراط مستقیم پر چلائے۔ آمین۔ آپی آج میں نے کریلوں کے بھجڑے بنائے ہیں، کاش میں آپ کو کھلا سکتی جو آپ میرے اطراف میں کہیں رہتیں۔" (آپ نے کہہ دیا ہم نے کھا لیے..... میں بھاری بھرکم تو ضرور نظر آتی ہوں مگر خوش خوراک ہرگز نہیں ہوں، جی ہاں آپ حمد و نعت کے علاوہ دوسری تحریریں بھی ضرور بھیجیں)

☆ افسر سلطانہ، کراچی سے۔ "نایاب جیلانی کے ناولٹ کا انجام اب قریب معلوم ہوتا ہے۔ تسنیم منیر علوی، صائمہ قیصر، سکینہ فرخ، صائمہ سید، اسما قادری اور غزالہ فرخ کے افسانے، ناولٹ پسند آئے۔ باقی افسانے بھی ٹھیک تھے۔ پاکیزہ کی انفرادیت یہی ہے کہ دوسرے رسالوں کی طرح اس میں بھرتی کی تحریریں نظر نہیں آتیں اور یہ کمال کیپٹن انجم کا ہے۔ اختر شجاعت کی مستقل آمد دل کو بھائی۔ اللہ کرے ان کے قلم کی بھرپور طاقت ہم سب کے لیے رہنمائی ثابت ہو، آمین' اور غزالہ نگار کا انٹرویو..... سچ پوچھیں کئی سالوں پیچھے دھکیل دیا.....اور وہ بھی لمحوں میں غزالہ کی آمد میرے گھر میرے لیے ایک بہت بڑی خوشی کا باعث تھی۔ مجھے تو دیر تک یقین نہیں آرہا کہ غزالہ اور وہ بھی ہمارے گھر اور یہ پڑھ کر بھی یقین نہیں آرہا کہ میں غزالہ کی یادوں میں اب تک موجود ہوں..... ہم تو سمجھتے تھے کہ اقبال بانو ہی جواب دینے کی ماہر..... اِدھر سوال اُدھر جواب..... بے شک اقبال بانو کا انٹرویو بھی مکمل اور بھرپور تھا۔ اختر شجاعت سے سوالات کچھ کم کیے گئے تھے۔ اس لیے مجھے کم از کم تشنگی محسوس ہوئی ورنہ بے ساختگی وہاں بھی خوب تھی۔ تو وہ بھی واہ پر ختم کرکے لگا تھا اقبال بانو کی واہ اور غزالہ کے انٹرویو میں تو ختم کے ساتھ واہ بھی رہی۔ سوال بھی خوب اور جواب بھی جھنڈے گاڑنے والے، اتنا مکمل انٹرویو اور اتنی انکساری..... یونیورسٹی لیول پر انگلش پڑھانے والی پروفیسر نے انگلش کا ایک لفظ بھی استعمال کیا ہو..... معذرت کے ساتھ وہ رائٹرز بھی غور سے پڑھیں جو اکثر جملوں کے ساتھ اسپیلنگ بھی غلط لکھ جاتی ہیں۔ رائٹرز سے انٹرویو ایک بہترین سلسلہ ہے۔ انجم آپ بھی اپنا ایک انٹرویو دیں اور خود پاکیزہ کے صفحات میں بھرپور جولانیوں کے ساتھ آموجود ہوں۔ انٹرویو میں تصاویر بہت کم ہوتی ہیں۔ دو چار اور زیادہ ہوں تو اس چاند (انٹرویو) کو چار چاند لگ جائیں۔ 1992ء کا رسالہ ہاتھ لگا..... پچھلے رسالے ہاتھ لگیں تو جلتر تک ضرور پڑھتی ہوں کہ آج کے مرجھائے، پژمردہ، پریشان، بدحال، حال میں کس کا دل مسکرانے اور ہنسنے کو نہیں چاہتا ہے۔" وحیدہ خالہ کی بہو جب بھی ہنس کر بولتی ہے لگتا ہے ماجد خالو بول رہے ہیں..... کتنی ہی دفعہ تو محض اس کی آواز سن کر میں پردہ کرکے بیٹھ گئی۔" جتنا پڑھا جملہ اتنی ہی تازگی..... 1991ء میں کرن، شعاع اور خواتین میں لکھ رہی تھی۔ انجم ہی مجھے پاکیزہ میں کھینچ لائیں اور پھر میرے افسانے ایک..... بھلا ہو ان خواتین کا جو دوسروں کی چیزیں لے کر واپس کرنا نہیں جانتے..... تمام افسانے ان سب ہی کی نذر ہو گئے..... 95ء تک میں مستقل پاکیزہ میں لکھتی رہی تھی اگر کسی بہن کے پاس میرے افسانے ہوں..... خاص طور پر سیدہ طلمہا س (ہیروئن) اور مراد (ہیرو) والے افسانے تو مجھے بذریعہ خط یا اسکین کروا کے بھیج دیں..... میرا Email ایڈریس اور خط و کتابت کا پتا انجم کے پاس ہے۔" (افسر ایک طویل عرصے کے بعد تمہارا خط ملا ہے..... مگر اب غائب مت ہو جانا..... ہاں پریشان نہ ہو تمہارے افسانے مل جائیں گے اگر غزالہ پاکستان میں ہوتی تو اس کے پاس سے ہی مل جاتے..... اسے رسائل جمع کرنے کا شوق بھی تھا)

☆ غزالہ ہاشمی جعفر، واٹک سے۔ "آپی آپ کی صحت کیسی ہے؟ عذرا رسول، عظمیٰ، نزہت سب کیسے ہیں؟ سب کو میری طرف سے ایڈوانس عید مبارک۔ رمضان مبارک..... آپی میرا سیزر آپریشن ہوا ہے..... کسی بہن کو اگر آپریشن کے بعد پیٹ اور وزن کم کرنے کا کوئی نسخہ معلوم ہے تو ضرور بتائیں، انتظار رہے گا۔ انڈیا سے جو بہن، بہنوں کی محفل میں شریک ہوتی ہیں ان کو خصوصی سلام..... بہت شوق ہے انڈیا جانے کا۔ انڈین ساڑیاں اور جیولری کی ڈھیر ساری شاپنگ کرنے کا جو بہنیں اچھی دوست کی تلاش میں ہیں، ہم حاضر ہیں بھئی۔" (ابھی ماشاء اللہ تمہارے بچی ہوئی ہے اور وہ بھی آپریشن سے۔ اپنا اور اپنی بچی کا خوب خیال رکھو..... انڈیا بعد میں جانا..... پہلے اپنے آپ کو اور اپنی بچی کو دیکھو)

☆ عظمیٰ گیلانی، فتح جنگ سے۔ "پاکیزہ کی خاموش قاری ہوں..... ایک دفعہ آپ سے فون پر بات ہوئی تھی۔ اس سے مجھے تھوڑا سا حوصلہ ملا کہ آپ ہر کسی کی حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ پلیز آنٹی میں پہلی بار آپ کی بزم میں شریک ہو رہی ہوں مجھے یقین ہے کہ آپ مایوس نہیں کریں گی۔ پاکیزہ بہت اچھا رسالہ ہے۔ ہر کسی سے ہٹ کر اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم

ہے۔ یہ ہمارے گھر میں ایک فرد کی سی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ میری امی بہت شوق سے پڑھتی ہیں اور میں بھی...... اللہ تعالیٰ آپ کو اور پاکیزہ کو سلامت رکھے۔ اور آپ دونوں یونہی اچھی اچھی باتیں پھیلاتی رہیں۔“ (اس محفل میں خوش آمدید...... آپ ہر ماہ اس محفل میں شرکت کریں، مجھے دلی خوشی ہوگی)

☆ یاسمین اقبال، سنگھ پورہ لاہور سے۔ ”پہلے میں یاسمین گل کے نام سے لکھتی تھی لیکن ایک اور بہن بھی میری ہم نام ہے۔ اکثر غلط فہمی ہو جاتی ہے اس لیے میں اس مرتبہ یاسمین اقبال کے نام سے لکھ رہی ہوں۔ آپی ہم چالیس سال سے خاموش قاری ہیں کیا ہمارا اتنا بھی حق نہیں کہ کبھی، کبھار ہمیں بھی موقع دیا جائے۔“ (آپ کا یہ شکوہ بجا ہے اور آپ کو ان شاء اللہ ضرور موقع دیا جائے گا)

☆ روشانے عبدالقیوم یونیری، کراچی سے۔ ”آپ جیسے لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں مگر چاہنے والے زیادہ زیادہ ہوتے ہیں، اتنی خوش اسلوبی سے پاکیزہ کو چلانا، نئی رائٹرز کو مواقع دینا اور ہر کسی کے پیار کا اتنی محبت و عقیدت سے جواب دینا، بلاشبہ یہ آپ کی ہر دلعزیزی کا سبب ہے مجھے بلاشک وشبہ آپ سے دلی محبت ہے کیونکہ میں کتاب اور قلم سے بہت محبت رکھتی ہوں، آپ نے میرے اس شوق کو راستہ دیا، منزل بہت دور سہی مگر امید بہر حال ہے۔ سب سے پہلے تو اس رب کریم کا شکر کہ آپ کو بیماری سے شفایاب کیا۔ پھر آپ کا شکریہ کہ ماہ اپریل میں میرا افسانہ شائع کیا اور بہت زیادہ، شکریہ کہ مجھ ناچیز کو با اثر شخصیات میں نئی رائٹرز کے ساتھ یاد رکھا۔ کس، کس بات کے لیے آپ کا شکر یہ ادا کروں......؟ ساتھ تھوڑا شکوہ بھی کہ مجھے 28 جون کو اپنے افسانے چھپنے کا پتا چلا وہ بھی اپنی استاد سمرین کے میسج کے ذریعے...... اور میں حیران تھی کہ کہیں انہوں نے کسی اور کا افسانہ پڑھ کر میرا سمجھا ہوگا...... مگر یہ دراصل سچ تھا شاپ میں ماہنامہ پاکیزہ اپریل کا دیکھا تو واقعی بہت خوشی ہوئی، طویل انتظار کے بعد بالآخر پہلا افسانہ پاکیزہ میں چھپا۔ پاکیزہ سے میں نے لکھنا شروع کیا تھا اور عقیدت کی ہے اسی لیے خوشی بیان کرنا مشکل ہے۔ پھر صیرہ سید جیسی سینئر رائٹر کی مجھ ناچیز کی تحریر کو پسند کرنے کا ذکر خط صرف ایک ہی پڑھ سکی، آئندہ بھی جلد میری تحریر یں لگائیں کیونکہ میں اور بھی تحریریں بھجوانا چاہتی ہوں۔“ (پیاری روشانے آپ اپنے ہر خط اور ہر افسانے کے آخر میں اپنا مکمل ایڈریس ضرور لکھیں تا کہ آپ کو افسانے کا اعزازیہ وغیرہ بھجوایا جا سکے)

☆ شبنم کنول، گاؤں پاپا نگری سے۔ ”اچھا آپی اس دفعہ پھر میرا خط ہی شائع ہوا۔ آپی شاعری شائع کیوں نہیں کرتیں۔ آخر کیوں آپی...... جب میں نے پاکیزہ دیکھا تو میں نکھر ہی گئی۔ پھر جب حوصلہ ساتھ چھوڑ رہا تھا تو اپنا خط دیکھا پھر دل نے سوچا کہ آپی کو میری کچھ تو قدر ہے۔“ (دنیا میں آپ کی بے حد قدر ہے، بڑی عزت ہے آپ کی۔ ماشاء اللہ)

☆ بہنوں کی محفل کے صفحات کا کوٹا ختم ہوا۔ اگلا شمارہ دلہن نمبر ہوگا۔ جس کے لیے آپ اپنی دلہن بنی تصویر کے ساتھ اپنی شادی کا مختصر احوال بھیج سکتی ہیں مگر بہت جلد۔ اب آئیں دعا مانگنے سے قبل پہلے درود ابراہیمی پڑھ لیں۔ یا اللہ یا رحمٰن یا رحیم میرے جسم کو شفا دل کو اپنی ذات کا یقین کامل اور آنکھوں کو نور بصیرت عطا فرما اور جب تک میں زندہ رہوں اپنے ذکر کو صبح شام میری زبان پر جاری فرما دے اور ایسی جگہ سے مجھے رزق دے جو بلا رکاوٹ ہی ملتا رہے۔ یا رب العالمین تو مجھ سے اور میری آل اولاد سے ہمیشہ ہمیشہ راضی رہنا۔ ہر گناہ، ہر غلطی اور ہر کوتاہی کو معاف کرنا اور دونوں جہانوں میں مجھے خیر عطا فرمانا اور میرے عیبوں کی پردہ پوشی کرنا کہ تو سب سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے۔ بے شک میرا رب ہر چیز پر قادر ہے اور میرا رب برکت اور بلندی والا ہے۔

یا مجیب یا مجیب یا مجیب

دعاگو
آپ کی اپنی باجی
انجم انصار

پاکیزہ میں خط لکھنے کا پتا

مدیرہ ماہنامہ پاکیزہ۔ 63.c فیز II ایکسٹینشن، ڈیفنس۔ مین کورنگی روڈ۔ کراچی۔ پوسٹ کوڈ 75500

پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ فاروق سعید



حمدِ باری تعالیٰ

اس در کا دربان بنادے یااللہ
مجھ کو بھی سلطان بنادے یااللہ
ان آنکھوں سے تیرے نام کی بارش ہو
پتھر ہوں انسان بنادے یااللہ
سہما دل، ٹوٹی کشتی، چڑھتا دریا
ہر مشکل آسان بنادے یااللہ
میں جب چاہوں جھانک کر تجھ کو دیکھوں
دل کو روشن دان بنادے یااللہ
میرا بچہ سادہ کاغذ جیسا ہے
اِک حرفِ ایمان بنادے یااللہ

شاعر: بشیر بدر
مرسلہ: نجما صفدر، کراچی

نعت رسول مقبول ﷺ

مرا دل بس تڑپتا ہے مدینے کی زیارت کو
نگاہیں چومنا چاہیں روضے کی عمارت کو
درِ حبیبؐ پہ جاؤں فقط اتنی تمنا ہے
ترستی ہے سماعت بلاوے کی بشارت کو
میں فروتر، تہی دست لاچار ہوں یارب
تشنگی بڑھادے اور ایماں کی حرارت کو
جبیں میری، خاکِ عرب اور پھر مناجاتیں
ہمکتا ہی چلا جائے دل کعبے کی زیارت کو
ترے روضے پہ آکے تجھ سے اپنے رنج والم بانٹوں
ملے ٹھنڈک جگر کو چین آجائے بصارت کو
مرا دل بس تڑپتا ہے مدینے کی زیارت کو
نگاہیں چومنا چاہیں روضے کی عمارت کو

شاعرہ: زینت عبدالصمد، میرپور

مرحبا مرحبا

سید الانبیاءؐ، مرحبا مرحبا
لب پہ ہے یہ صدا، مرحبا مرحبا
ہر طرف روشنی سی بکھرنے لگی
نام تیرا لیا، مرحبا مرحبا
جب بھی مشکل پڑی، دل نے یہ ہی کہا
مصطفیٰؐ المدد، مرحبا مرحبا
کل دل کی کھلی، زندگی کو مری
اِک سہارا مل گیا، مرحبا مرحبا
وجہِ تخلیق کون و مکاں تو ہی ہے
یہ ہے ایماں مرا، مرحبا مرحبا
زندگی اس کی رشکِ قمر بن گئی
جس کو تو مل گیا، مرحبا مرحبا

کلام: سیدہ حیا عباس، تلہ گنگ

عید کا دن

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی خدمت میں عید سے ایک دن قبل آپ کی بیٹیاں حاضر ہوئیں اور بولیں۔ "بابا جان کل عید کے دن ہم کون سے کپڑے پہنیں گے؟"

آپؒ نے فرمایا۔ "یہی کپڑے جو تم نے پہن رکھے ہیں انہیں آج دھو لو اور کل پھر یہی پہن لینا۔"

معصوم بچیوں نے ضد کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں بابا جان آپ ہمیں نئے کپڑے بنوادیں۔"

آپؒ نے فرمایا۔ "میری پیاری بچیوں عید کا

دن اللہ کی عبادت کا دن ہے اور اس رب کا شکر بجالانے کا دن ہے۔ عید کے دن نئے کپڑے پہننا ضروری تو نہیں۔"

"بابا جان آپ کا کہنا درست ہے لیکن ہماری سہیلیاں اور دوسری لڑکیاں ہمیں طعنے دیں گی کہ امیر المومنین کی بیٹیاں ہیں اور کپڑے وہی پرانے پہن رکھے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے بچیاں رو پڑیں۔ یہ دیکھ کر حضرت عمر بن عبدالعزیز کا دل بھر آیا۔ آپ نے اسی وقت وزیر مال کو بلایا اور فرمایا۔

"مجھے میری ایک ماہ کی تنخواہ دے دو۔"

وزیر مال نے عرض کیا۔ "حضور کیا آپ کو یقین ہے کہ آپ ایک ماہ مزید زندہ رہیں گے؟"

آپ نے فوراً کہا۔ "اللہ تعالیٰ تمہیں جزا دے بے شک تم نے بہت عمدہ بات کی ہے۔" وہ چلا گیا تو آپ نے اپنی بیٹیوں سے فرمایا۔ "پیاری بیٹیوں اللہ اور اس کے رسول کی رضا پر اپنی خواہشات کو قربان کردو کیونکہ کوئی شخص اس وقت تک جنت کا مستحق نہیں بن سکتا جب تک وہ کوئی قربانی نہ دے۔"

مرسلہ: ثنا جالا، پنجاب

عید کارڈ

وفا کا سندیس لے کر اترے تمہارے آنگن میں
گواہ رفاقتوں کا، محبتوں کا بن کر ہلالِ عید
تمام روز و شب یونہی فروزاں رہیں ہر دم
ہر شب، شب برات ہو ہر روز، روزِ عید

مرسلہ: غزالہ چوہدری، ڈیرانوالا

دعا اور صدقہ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فقیر کو مال بھی دیتی تھیں اور دعا بھی۔ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کے پاس جب کوئی سائل آتا اور دعائیں دیتا تو... ام المومنین بھی اس فقیر کو دعائیں دیتیں اور بعد میں کچھ خیرات دیتیں۔ کسی نے کہا۔ "اے ام المومنین آپ سائل کو صدقہ بھی دیتی ہیں اور جس طرح وہ آپ کو دعا دیتا ہے اسی طرح آپ بھی دعا دیتی ہیں۔"

فرمایا۔ "اگر میں اسے دعا نہ دوں اور فقط صدقہ دوں تو اس کا احسان مجھ پر زیادہ رہے اس لیے کہ دعا صدقے سے کہیں بہتر ہے۔ اس لیے دعا دیتی ہوں کہ میرا صدقہ خالص رہے کسی احسان کے مقابلے میں نہ ہو۔"

از: بکھرے موتی جلد نمبر چہارم صفحہ نمبر 290

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

فیکٹ

پیار تیرا
چاہت ہے
کھجور کے درخت جیسی
جو دھوپ لگے
تو سایہ نہیں
اور بھوک لگے
تو پھل دور

شاعرہ: سعدیہ ہما شیخ، سرگودھا

افسوس

ایک بیمہ شدہ شوہر کا انتقال ہوگیا۔ انشورنس کمپنی کا نمائندہ بیمے کی رقم کا چیک لے کر ان کی بیگم کے پاس پہنچا مگر چیک دینے سے پہلے اس نے تعزیت ضروری سمجھی اور بولا۔ "مجھے افسوس ہے کہ آپ کے شوہر......"

"بس، بس رہنے دیں۔" بیگم بات کاٹ کر بولی۔ "جب بھی کسی عورت کو مالی فائدہ پہنچنے والا ہو مردوں کو افسوس ہونے لگتا ہے۔"

مرسلہ: منور شہزادی، گوجرانوالہ

عید کے روز

خوشیاں مناتے سے
فرصت ملے تو

یہ سوچنا ضرور

کہ

بہت مصروف ہونے کے باوجود

تمہاری یاد کا لمحہ لمحہ

کسی کے ساتھ رہا ہے

از: شافیہ پرویز، گوجرانوالہ

صرف پڑھکر ...... یہ کھیں

☆ اگر آپ چاہتی ہیں کہ آپ کے شوہر آپ کو اپنی تنخواہ دے کر بھول جائیں۔

☆ آپ اپنے شوہر کو ترکی بہ ترکی جواب دے کر انہیں ناک آؤٹ کر دیں۔

☆ عید اور دیگر تہواروں پر آپ صرف اپنے میکے میں جائیں اور سسرال والے آپ کے گھر آئیں تو انہیں منہ نہ لگائیں۔

☆ عید پر آپ بدمزہ سویاں بنائیں جسے ہر آنے والا واہ، واہ کر کے کھائے۔

☆ آپ کے تمام تر جھوٹے قصے سن کر آپ کے دوست احباب واہ، واہ کریں۔

☆ آپ جس کا دل چاہے مذاق اڑائیں اور کوئی آپ سے مذاق بھی کرے تو اسی وقت اسے ٹوک دیں...... تو فوراً سے پہلے خود کو چٹکی کاٹ کر دیکھ لیں کہ کہیں آپ یہ الٹا خواب تو نہیں دیکھ رہی ہیں...... ہاں جلدی سے لاحول بھی پڑھ لیں۔

از: کوثر خالد، جڑانوالہ

چھڈ یار

دو دوستوں کی ملاقات برسوں بعد ایک میلے میں اس حال میں ہوئی کہ دونوں اپنی، اپنی بیویوں کو ہجوم میں تلاش کر رہے تھے ایک نے دوسرے سے پوچھا۔ ''تمہاری بیوی کا حلیہ کیسا ہے؟''

اس نے کہا۔ ''میری بیوی بے حد خوب صورت ہے، گلابی رنگت، کانچ جیسی نیلی آنکھیں، دراز قد اور متناسب سراپا۔'' پھر اس نے بھی پوچھا۔ ''اور تمہاری بیوی کیسی ہے؟''

پہلے دوست نے کہا۔ ''ارے یار! میری بیوی کو چھوڑو، چلو تمہاری بیوی کو تلاش کرتے ہیں۔''

مرسلہ: ممتاز خانم، کراچی

عیدی

اجلی اجلی دھوپ کی چادر

عید کے دن بھی کیوں میلی ہے

دکھ کی کالی آندھی کیونکر

میرے دل میں پھیلی ہے

نہ کوئی سرخی میرے لب پر

نہ کوئی کاجل آنکھوں میں

نہ ہاتھوں میں کنگنا چوڑی

نہ پائل پیروں میں

میرے گھر کے دروازے پر

دستک دیتے آ جاؤ ناں

پوری کر کے ساری رسمیں

میری عیدی دے جاؤ ناں

شاعرہ: عطیہ زاہرہ، لاہور

ایک ساس کی کھٹی باتیں

☆ داماد وہ اچھا ہے جو بیٹی کے اشارے پر ناچے۔ بہو وہ اچھی جس کو ہم اپنی انگلیوں پر نچاتے رہیں۔

☆ داماد میری بیٹی کا بے دام غلام ہو اور میرا بیٹا صرف میرے ہی قدموں کو اپنی جنت جانے۔

مرسلہ: عنبر وسیم، گوجرانوالہ

پچھتاوے

دل کے اندر دور تلک

اک سناٹا سا بستا ہے

کچھ بھیگی بھیگی یادیں ہیں

کچھ سونی سونی راتیں ہیں

کچھ مدھم مدھم خاکے ہیں
کچھ بھولے بسرے وعدے ہیں
اشکوں میں بھیگے بھیگے
کچھ بے سبب لمحے ہیں
کاسۂ دل میں کچھ بھی نہیں
صرف درد کے کھوٹے سکے ہیں
اس بوسیدہ سے دل میں اب
پچھتاوے ہی بستے ہیں

کلام: عالیہ ضیا، کراچی

غزل

وقت کی روانی ہے
بخت کی گرانی ہے
درد کو چھپانا تھا
چپ کی چادر تانی ہے
گھر اِک بستا بستا تھا
اب چار سُو ویرانی ہے
دل میں درد کی دولت
تیری مہربانی ہے
تیری جیت کی خاطر پیار
ہم نے ہار مانی ہے
اب تجھے بھلا ہی دیں گے
دل نے بھی ٹھانی ہے
صحنِ دل میں تیری یادیں
اور رات کی رانی ہے
تیری طرف سے اور الزام
آنکھوں میں حیرانی ہے
تم سے موت تک کا رشتہ
زندگی تو آنی جانی ہے

شاعرہ: اُمِ ثمامہ، جھڈو سندھ

عید گفٹ

بیوی نے شوہر سے کہا۔ "اس عید پر میں نے تمہارے لیے اتنی پیاری چیز خریدی ہے، جب اسے تم دیکھو گے تو تمہارا سر فخر سے بلند ہو جائے گا کہ تمہاری بیوی نے عید کے موقع پر کیسی دریا دلی دکھادی۔"

شوہر نے خوش ہو کر کہا۔ "ارے واقعی..... ذرا مجھے دکھاؤ تو سہی کہ تم نے میرے لیے بھی کچھ خریدا ہے۔ پلیز جلدی سے دکھاؤ ناں میرا عید گفٹ۔"

بیوی مسکرا کر بولی۔ "پانچ منٹ رکو، صبر کرو میں ابھی پہن کر آتی ہوں اپنا خوب صورت عید کا جوڑا۔"

مرسلہ: نگہت شاہین، ڈی آئی جی خان

غزل

موسم نے کیا رنگ گھمائے، دھیرے دھیرے ہولے ہولے
سوکھے پتے ہوا اڑائے، دھیرے دھیرے ہولے ہولے
اخباروں میں شہ سرخی تھی آج بھی کچھ عام ہوا
کس کو سمجھانے جائے دھیرے دھیرے ہولے ہولے
لوگ جو بزم کی رونق تھے وہ کب کے خیال و خواب ہوئے
وقت کہاں سے ان کو لائے دھیرے دھیرے ہولے ہولے
ان کی خاطر پھول چُنے تھے دل کے ویراں خانے سے
اِک اِک کر کے سب مرجھائے دھیرے دھیرے ہولے ہولے
ہر طرف تھی سکھ کی چھاؤں ہر لمحہ تھا رقص کناں
نظر سب کو کھا گئی ہائے، دھیرے دھیرے ہولے ہولے

شاعرہ: عالیہ بشیر، اسلام آباد

سیر سوا سیر

ساجد نے کہا۔ "او یار بائیک کیوں تیز کر دی اے؟"

فواد بولا۔ "بریک فیل ہو گئے ہیں اس تو ں پہلے کہ ایکسیڈنٹ ہو جائے گھر پہنچ جاتے ہیں۔"

تب ساجد آنکھیں بند کر کے بولا۔ "شاباش شاباش فواد دبا کے رکھ۔"

مرسلہ: سیدہ وجیہا عباس، تلہ گنگ



غیر اہم

عید ملن پارٹیاں ہوں، شادی کی تقریبات ہوں، کامیابیوں اور کامرانیوں کی دعوتیں ہوں یا سوئم اور چہلم کے کھانے۔ ایسی تقریبات میں جانے کے لیے لوگ مختلف تیاریاں کرتے ہیں۔ کوئی کپڑوں کے بکھیڑوں میں پڑتا ہے تو کوئی میک اپ کے لوازمات میں الجھتا ہے تو کوئی جیولری کے لیے بے قرار رہتا ہے کہ خوب زیورات لاد کر شرکت ہو، بے شک اپنی شکل پر اچھا نہ لگے مگر اس کی مالیت کے اندازوں سے دوسروں کی شکلیں اتر جاتی ہیں۔ رضیہ ہاؤس جہاں چھ بھائی اپنی فیملیز کے ساتھ ایک ساتھ رہتے ہیں وہاں اس قسم کی تیاریاں ثانوی ہوتی ہیں۔ خاص تیاری یہ ہوتی ہے کہ تمام لوگ چوبیس گھنٹے پہلے ہی گھر میں کھانا پینا چھوڑ دیتے ہیں۔ ڈاکٹری نقطۂ نظر سے ہو۔ یہ عمل اس لیے صحیح ہے کہ آپریشن سے پہلے یہی ہدایات ڈاکٹرز بھی دیتے ہیں۔ بڑی چاچی تو حفظ ماتقدم کے طور پر پودینے کا پانی کئی دفعہ ابال کر پیتی ہیں کہ پیٹ صاف ہو کر ہلکا ہو جائے۔ تایا کی فیملی تو جلاب تک لینے سے پرہیز نہیں کرتی کہ اس سے طبیعت ہلکی رہتی ہے اور دل کھانے پر جلدی آمادہ ہو جاتا ہے۔ ماشاء اللہ گھر میں چار بڑی کوسٹرز اور چھ بائیک ہیں کہیں سے دو آدمیوں کا بلاوا بھی آ جائے تو رضیہ ہاؤس میں رہنے والے تمام مکین ہی بڑی خوشی سے جاتے ہیں۔ کئی بلانے والوں کو ہارٹ اٹیک تک ہو چکا ہے۔ رضیہ ہاؤس میں رہنے والوں کی یہ خوبی بہت بڑی ہے کہ بے شک ان میں آپس میں خانہ جنگیاں روزانہ چلتی ہوں۔ ایک دوسرے کا تیا پانچہ کر کے مسرتیں قدر بڑھاتی ہوں اور اتحاد، یقین اور تنظیم پارہ، پارہ ہو، مگر کہیں جاتے وقت ان کی یک جہتی دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ چھوٹی ممانی کے بلاوڈز کا مسئلہ چاچی حل کر دیتی ہیں۔ بڑی اماں کو اشیپ والی سینڈل بڑی بھابی مہیا کر دیتی ہیں۔ میک اپ باجی کر دیتی ہیں کہ آخر کئی سال بیوٹی پارلر میں کام کر چکی ہیں اور میچنگ جیولری تو چھوٹی بھابی رابعہ سب کو مہیا کر دیتی ہیں۔ ان کے بھائی کی دکان پر میچنگ جیولری پالش ہونے کے لیے آتی ہے اور ان کا مکان رضیہ ہاؤس کے بالکل پڑوس میں ہی ہے اور ان کے میکے والے اپنی اکلوتی بیٹی رابعہ کا واقعی بے حد خیال رکھتے ہیں۔ جس سے رضیہ ہاؤس کی خواتین تک خوش رہتی ہیں۔ یہ تم اسی دوسری بات ہے کہ رابعہ بھابی اپنی نندوں کو ایسے بھدے زیورات کو اینٹیک کا نام دے کر پہنا دیتی ہیں کہ انتہائی وحشت ہوتی ہے۔ جیسے ایک سالگرہ کی تقریب میں ان کی نندیں سانپ کے منہ والی مالائیں پہن کر اچھی خاصی ناگنیں سی لگ رہی تھیں اور اکثر لوگ ان کے پاس سے اس وجہ سے بھی ہٹ رہے تھے کہ کہیں ڈس نہ لیں۔ رضیہ ہاؤس کی خواتین جب ایک ساتھ کہیں جاتی ہیں تو ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر اتنی محبت سے تقریب میں انٹری دیتی ہیں کہ مارے رشک کے لوگ حق دق رہ جاتے ہیں۔ ہیں دیکھنے کی چیز ہمیں بار بار دیکھ۔ جوں جوں مہنگائی کی مار بڑھتی جا رہی ہے، اچھے اچھے سفید پوش ناپ تول کر پکانے لگے ہیں۔ اسی وجہ سے تقریبات میں کھانے کی کمی ہو جاتی ہے۔ پہلے سو آدمیوں کے کھانے میں سوا سو کھانا کھا لیتے تھے (یہ باورچی کا حساب کتاب ہے) اب سو آدمیوں کے کھانے میں پچاس کھا سکتے ہیں۔ (کہ اس دور کے لوگ کھانے کا زیاں کرتے ہیں) اکثر تقاریب میں کھانا کم پڑ جاتا ہے تو بعض مہمان بھوکے گھر آتے

ہیں مگر اللہ کا شکر ہے کہ رضیہ ہاؤس کا کوئی فرد بھوکا گھر نہیں آیا۔ اس میں میزبانوں کی حسن کارکردگی کا کوئی دخل نہیں۔ تقریب میں بے شک کھانا کم پڑ جائے، کسی کو ملے یا نہ ملے مگر یہ سب لوگ خوب رج کر کھانا کھا کر آتے ہیں۔ بڑی بھابی کی ڈیوٹی روسٹ بروسٹ پر لگ جاتی ہے وہ زمانۂ طالب علمی میں اپنے کالج میں ہاکی کھیلا کرتی تھیں۔ ان کی یہ کارکردگی تقاریب میں بے حد کام آرہی ہے۔ وہ قابوں کے ڈھکنے گرنے کی شائن سنتے ہی لنگڑی پالا کھیلتے ہوئے روسٹ کے دو تین کوڑے اٹھالاتی ہیں۔ اکثر میزبان تو..... ہیں..... ہیں کرتے رہ جاتے ہیں مگر وہ سنی ان سنی کرتے ہوئے اپنی فیملی کے مکینوں کو خوش خبری دے دیتی ہیں کہ وہ کامیاب لوٹی ہیں۔ چھوٹی بھابی دہی کا رائتہ اور سلاد کی سینی لے آتی ہیں۔ بچوں کی فوج آئس کریم کے باؤل اور کولڈ ڈرنکس کے کریٹ ہتھیا لاتی ہے۔ چھوٹی اور بڑی چاچی قورمے اور بریانی کی ڈشز اس انداز میں لاتی ہیں کہ لگتا ہے ڈائریکٹ دیگ سے اتروا کر لائی ہیں یوں یہ تمام ..... فیملی خوب رج کر کھاتی پیتی ہے۔ اماں تو وہیں بیٹھے بیٹھے کولڈ ڈرنکس کی بوتلوں سے ہاتھ تک دھو لیتی ہیں کہ کون اٹھ کر بیسن تک جائے۔ آئس کریم اور قلفی کے گلاس تو گھر تک لے آتے ہیں کہ گھر جا کر بستر پر لیٹ کر کھائیں گے (اس کا الگ ہی سواد ہوتا ہے) مگر ایک شام نہ جانے کیا ہوا..... سب کو نظر لگ گئی۔ شادی کی ایک تقریب میں جانا تھا۔ شادی کے قیمتی کارڈ سے سب کو اندازہ تھا کہ کھانے کا مینیو شاندار ہوگا۔ ابتدائی تیاریاں فائنل تک پہنچ گئی تھیں۔ ہمیشہ کی طرح چھوٹی بھابی کی ساڑی کا بلاؤز کھو گیا تھا جو چاچی نے اپنی کسی ساڑی کے ساتھ کا دے کر ان کا مسئلہ حل کر دیا۔ مغرب کے بعد سے نازو باجی نے سب کے جوڑے بنا کر میں بنادی تھی۔ رابعہ بھابی سب کے من پسند رنگوں کی میچنگ جیولری فراہم کر چکی تھیں۔ بڑے بھائی اپنی کوسٹر کے ٹائر پنکچر تک لگوا چکے تھے۔ اچانک ہی گھر کے سب لوگوں کی طبیعت میں ایک تناؤ سا گھل گیا اور بلاوجہ ہی ایک دوسرے سے لڑنے لگے۔

”تمہارے پورشن سے بلی نے آکر ہماری پتیلی کا دودھ پی لیا۔“

”تم نے ڈسٹنگ کی تھی ساری خاک ہمارے برآمدے میں آگری۔ یہ بھی کوئی بات ہے آئندہ ایسا ہوا ناں تو.....“

”یہ مغرب کے وقت واشنگ مشین لگا کر کر دیا ناں میرے سر میں درد۔“

”ارے، یہ تمہارے مہمان ہمارے والی کال بیل کیوں بجایا کرتے ہیں؟“ جیسی باتیں بھی سر اٹھانے لگیں۔ اس معاملے کی تحقیقات کی گئی تو معلوم ہوا کہ بڑی آپا کی اپنے منگیتر سے فون پر کھٹ پٹ ہوگئی تھی۔ ابا میاں کی اسی دن شاپ پر جیب کٹ گئی تھی۔ چھوٹے بھیا کا موبائل گن پوائنٹ پر چھین لیا گیا تھا۔ منجھلی بھابی کا الٹیاں چلنے کا سیزن چل رہا تھا۔ چچی کی کمیٹی نہیں کھلی تھی۔ پرچیوں میں ان کا نام ہی شامل نہیں کیا گیا تھا۔ تائی کا ایک پھندہ کہیں گر گیا تھا جو مل کر ہی نہیں دے رہا تھا۔

”بس آج کوئی نہیں جائے گا۔“ اماں نے جیسے اعلان کر دیا۔

”ٹھیک ہے، دل بھی نہیں چاہ رہا۔“ ساری بھابیاں یک زبان بولیں۔

”سوچ لو، دیگ کے پکے کھانے اور گھر کے پکے کھانوں میں خاصا فرق ہوتا ہے۔“ چھوٹے بھائی نے بے دلی سے کہا۔

”آج گھر میں مرغی پکی ہے اور بریانی بھی۔ کیا کریں گے جا کر خواہ مخواہ کا نیوتا بھی ضائع ہوگا۔“ اماں نے سمجھایا۔

”ٹھیک ہے، کوئی نہیں جا رہا۔“ چاچی نے ہاں میں ہاں ملائی۔ تب خوب سیر ہو کر کھانا کھایا گیا پھر بوتلیں پی گئیں۔ بھابی سب کے لیے ملائی والی چائے بنا لائیں چائے بھی خوب شوق سے پی گئی۔ آپا نے فروٹ چاٹ بنائی تو وہ بھی ان کی خوشی کے لیے سب

نے ہنس، ہنس کر کھائی، چاچی نے مسالا چینل سے کھوپرے کا حلوا بنانا سیکھا تھا وہ بھی اپنی کارکردگی دکھانے کے لیے خوب سارا حلوا بنالائیں۔ چکھم چکھی میں وہ بھی خوب سارا کھالیا گیا اس اثنا میں پڑوس سے خوب سارے شاہی ٹکڑے آگئے وہ بھی کھالیے گئے۔

''اللہ آج بہت کھالیا۔'' ہاضمے کی گولیاں اماں نے خود بھی کھائیں اور بطور تبرک سب میں تقسیم بھی کیں۔

''بہت گرانی سی محسوس ہو رہی ہے۔'' چاروں بھابیاں، ممانی اور چچی کار یورچ میں ٹہلنے لگیں۔ آپا کے منگیتر کا سوری کا فون آگیا تو ان کا ناراض سا چہرہ قوس قزح کی طرح چمکنے لگا۔ اس اثنا میں ابا میاں کا پرس بھی مل گیا ان کا جو ملال تھا وہ بھی جاتا رہا۔

''ظہیر صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔ ہمارے ہاں ہر تقریب میں سب سے پہلے آتے ہیں ابھی تو رات کے گیارہ بجے ہیں بارات تو رات بارہ بجے کے بعد آئے گی چلو شرکت کر آتے ہیں۔'' ابا میاں نے عقل مندی کی بات کی۔

''مگر سب نے کھانا کھالیا ہے۔ اگر وہاں چلے گئے تو کوئی بھی کچھ بھی نہیں کھاسکتا ایسے میں جانے کا فائدہ۔'' اماں نے کہا۔

''کوئی بات نہیں نیوتا تھم دے دینا مگر شرکت تو ہو جائے گی۔'' الٹی کرنے کے بعد بھابی کی طبیعت میں بھی ہلکی ہوئی تو آکر وہ اماں سے بولیں۔

''مجھے تو ظہیر صاحب کی بیگم بہت اچھی لگتی ہیں، بے حد مہذب سی خاتون ہیں اتنی آہستگی سے ملائمت سے بولتی ہیں کہ دل خوش ہو جاتا ہے۔ واقعی لوگ سچ کہتے ہیں کہ لکھنؤ سے تعلق رکھنے والے لوگ بے حد مہذب ہوتے ہیں۔ ان کے لہجوں میں ملائمت سی گھلی ہوتی ہے۔'' آپا نے اپنا غرارہ سب کو دکھاتے ہوئے کہا اگر جانا ہوا تو یہ پہن لوں گی۔

''چلو سب دس منٹ میں تیار ہو جاؤ۔ آج زندگی میں پہلی کسی تقریب میں یہ سوچ کر جارہے ہیں کہ وہاں کچھ بھی نہیں کھایا جائے گا۔'' بڑے بھیا نے خواتین کے گروپ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا جو سونف چھالیہ سے شغل کر رہی تھیں۔

آدھے گھنٹے بعد جب تقریب میں پہنچے تو مہمانوں کی آمد جاری تھی۔ مووی بننے کے چکر میں کھانے میں تاخیر پہ تاخیر ہو رہی تھی۔ آپا لوگ، بھابیاں اور چاچی سب مہمانوں سے ملنے کے لیے اس وجہ سے چل دیں کہ اپنے لباس اور زیورات کی بھی داد پاسکیں۔ کچھ دیر بعد مائیک پر کھانے کے لیے استدعا کی گئی سب مہمان آہستہ روی سے اٹھنے لگے بلکہ قطار در قطار۔ رضیہ ہاؤس کے مکینوں کے لیے یہ حیرت کی بات تھی۔ پہلے آپ لیجیے، پہلے آپ لیجیے کی صدائیں کانوں میں عجب سی وحشت کر رہی تھیں سب مہمانوں کو بڑھتا دیکھ کر رضیہ ہاؤس کے رہنے والوں کے قدم بھی از خود کھانے کی ٹیبلوں کی طرف بڑھنے لگے۔ پہلے آپ...... پہلے آپ کی تکرار کا سلسلہ جاری تھی۔ پہلے آپ لے لیں ماحول سے متاثر ہو کر بچوں اور بھابیوں کے لبوں سے بھی یہ جملے پھسل گئے۔ اس سے اچھی زبان بھی اپنی نہ لگی۔

ذرا سا سالن، تھوڑا سا سلاد، چائے کے چمچ چاول اور آدھا نان کا ٹکڑا لے کر خواتین حضرات واپس اپنی جگہوں پر بیٹھ رہے تھے۔ بروسٹ کے کونڈے، بریانی کی ڈشز، کبابوں کے تھال بھرے کے بھرے رکھے تھے۔ نہ ہنگامہ نہ پریشانی نہ ہی لوٹ مار کا سماں۔

''واہ کتنی اچھی جینٹری ہے سب لوگ کتنی تمیز سے کھانا کھا رہے ہیں۔'' ابا میاں نے حیرت سے کہا۔

''ہمارے خاندان میں تو شادی بیاہ کی تقاریب میں لنگر پر جھپٹنے کا سماں ہوتا ہے مگر اس تقریب میں سارے کے سارے مہمان اس قدر مہذب ہیں کہ اپنی پلیٹوں میں بھی کسی نے کوئی چوٹی کھڑی نہیں کی۔''

''ارے یہ بات نہیں ہے۔'' چھوٹی بھابی، چاچی اور آپا نے چاروں طرف کا ایک راؤنڈ لگانے کے بعد کہا۔

''بات کچھ اور ہے؟'' لہجے میں رازداری حرتین تھی۔

''کیا بات ہے؟'' ہم سب نے یک زبان پوچھا۔

"یا تو یہ سب لوگ ہماری طرح اپنے گھروں سے کھانا کھا کر آئے ہیں یا......؟"

"یہ سب کے سب بے حد بیمار ہیں۔"

"کیا کہہ رہی ہیں، ایک ہزار مہمان ایک ساتھ بیمار ہوں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"کیوں نہیں ہو سکتا؟"

"بعض مرتبہ مجبوری میں بھی تو آنا پڑتا ہے جیسے ہم آئے ہیں۔" بھابی نے ہنس کر ایک آنکھ میچ کر کہا۔

"ہم تو غیر لوگ ہیں رشتے داروں کی مجبوریاں تو زیادہ ہو جاتی ہیں دل نہ چاہتے ہوئے بھی ملنا پڑتا ہے جس کا منہ توڑنے کا دل چاہے اسے منہ لگانا پڑتا ہے۔"

"مگر کیا بیماری ہے؟" اماں نے کھیر کا پیالہ صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

"آج کل سب اخبار اور ٹی وی کے تمام چینلز چیخ، چیخ کر کہہ رہے ہیں کہ ان دنوں یرقان اور ہیضہ پھیل رہا ہے۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہیں آپ لوگ ورنہ اتنا اچھا کھانا ہو اور بھگدڑ نہ ہو۔ یقین نہیں آتا۔" بھابی اماں نے تجزیہ کر ڈالا اور رضیہ ہاؤس کے تمام مکین اپنے سر یوں ہلانے لگے جیسے ان کی بات سو فی صد درست ہو۔

دیورانی کے نام عید کارڈ

"گو کہ عید کارڈ بھیجنے کا فیشن ختم ہو گیا ہے اب موبائل پر ہی ایس ایم ایس بھیجے جاتے ہیں مگر مجھے معلوم ہے کہ تمہارا موبائل اب تمہارے میکے والے استعمال کرتے ہیں کتنی ہی دفعہ تم کو فون کیا مگر تمہاری بہن کی آواز سن کر حیرت اور رنج دونوں ہی ہوئے۔ تم نے تو کہا تھا کہ ڈاکو نے چھینا تھا واقعی سچ کہا تھا تم نے۔ اب تمہاری بات کا مطلب سمجھ کر ہنسی آتی ہے۔ میں نے یہ عید کارڈ اس وجہ سے بھی بھیجا ہے کہ تمہیں یاد دلا دوں کہ اس سال اپنی رشتے داریوں کو اچھی طرح سے یاد رکھنا۔ میری طبیعت پچھلے کئی مہینوں سے خراب چل رہی ہے۔ اس لیے تم کم از کم اس عید پہ اتنا تو خیال کرنا کہ ساس صاحبہ کو اپنے ہاں رکھنا پچھلے سال تو تم نے انہیں میرے ہاں ٹہلا دیا تھا۔ بڑی بی نے کیسے، کیسے میری ناک تلے چنے چبوائے تھے میرا دل ہی جانتا ہے۔ بھئی میرا دل چاہتا ہے کہ اپنے بھائی بھاوجوں، اپنی بہنوں، بھانجیوں کو دل کھول کر عیدی اور تحائف دوں اور انہیں حلق تک کھلاؤں۔ اپنے گھر میں بار بار عید ملن کروں۔ اپنے میکے والوں کے لاڈ اٹھاؤں مگر ساس صاحبہ میں کہاں برداشت بار بار مجھ سے کہتی رہیں۔ دلہن اپنی نندوں کو بھی فون کر دو۔ اپنی سسرال کے لوگوں کو بھی بلا لو۔ اچھا لگے گا بھئی ضروری تو نہیں جو لوگ انہیں اچھے لگتے ہوں وہ مجھے بھی اچھے لگیں۔ وہ ہمارے میکے والوں کو دیکھ کر کون سا خوش ہوتی ہیں جو ہم ان کے میکے والوں کو دیکھ کر خوش ہوں۔ پچھلے سال میں نے اپنی بہنوں اور بھانجیوں کو ایک، ایک سوٹ کے ساتھ ایک، ایک چینٹ دیا تھا گولڈ کا تو بڑی بی اپنا چپاتی سا پیٹ کوٹ کر اس قدر روئی تھیں کہ اللہ کی پناہ اور جو میاں جانی کے کان بھرے تھے وہ اس کے علاوہ تھے اور میاں جانی کی طبیعت بھی عجیب ہے۔ شادی سے قبل میرے سوا انہیں دنیا بھر میں کچھ نظر نہیں آتا تھا اور شادی کے بعد میں انہیں نظر نہیں آتی۔ کانوں کے اس قدر کچے ہیں کہ اپنی بیوی سے زیادہ اپنی ماں سے محبت کرتے ہیں اور بیوی کے روکنے پر بھی نہیں رکتے۔ اب بھی دیکھو پچھلی عید کا پھڈا ابھی تک چل رہا ہے۔ ہماری لڑائیاں تو ٹی وی سوپ کی طرح چلتی ہیں بات اتنی سی تھی کہ گزشتہ سال چار نندیں رمضان میں رہنے کے لیے آئی تھیں اور میں نے افطاری نہیں بنائی تھی۔ ویسے تو بڑی سادگی کے سبق دیتے ہیں اگر میں نے سادگی اپنائی تو انہیں ناگوار گزرا۔ اب اس سال رمضان میں میری بہنیں میرے گھر آئیں تو مجھ سے کہنے لگے۔ تم تو فوڈ فیسٹول منا رہی ہو۔ پیاری بھابی آپ کو کیا بتاؤں نپا تلا جیب خرچ دیتے ہیں اگر بٹوے پر ہاتھ نہ ماروں تو میری زندگی تو خس و خاشاک سے بھی بدتر ہو جائے، ارے میں بھی باتوں میں کہاں سے کہاں چلی گئی۔ آپ کو دلی عید مبارک۔

آپ کی ریحانہ؟"



میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆ مسز اقصیٰ عمران...... لاہور

کچھ ستارے اس کی پلکوں پر بھی روشن ہوں گے
کچھ مجھے بھی رُلائے گا اس کا غم عید کے دن

☆ کوثر خورشید...... یوکے

ہر اہلِ جور کی خواہش رہی ہے میں نہ رہوں
مگر میں ہوں کہ مرا شعلۂ نوا نہ بجھا

☆ پروین افضل شاہین...... بہاولنگر

یوں نہ جھانکو غریب کے دل میں
حسرتیں بے لباس رہتی ہیں

☆ گلِ شاہین...... رحیم یار خان

لہرا رہی ہے برف کی چادر ہٹا کے گھاس
سورج کی شہ پہ تنکے بھی بے باک ہو گئے

☆ تابندہ قیصر...... پاک پتن

رنگ اُڑ جاتا ہے پھولوں سے ستاروں سے ضیا
آپ کا دل کے بچھڑنا بھی غضب ہوتا ہے

☆ عظمیٰ عنبرین...... ڈی جی خان

فکرِ دنیا سے منقطع ہو کر
آؤ بارش میں رقص کرتے ہیں

☆ لاریب، ماہ زیب...... چونیاں

اندھیری رات میں رہتے تو کتنا اچھا تھا
ہم اپنی ذات میں رہتے تو کتنا اچھا تھا
دکھوں نے بانٹ لیا ہے تمہارے بعد ہمیں
تمہارے ہاتھ میں رہتے تو کتنا اچھا تھا

☆ نفیسہ آرا...... راس الخیمہ

عمر کاٹ دی لیکن بچپنا نہیں جاتا
ہم دیے جلاتے ہیں اب بھی تیری آہٹ پر
گھنٹیاں سی بجتی ہیں رقص ہونے لگتا ہے
در و جگمگاتے ہیں اب بھی تیری آہٹ پر

☆ کوثر خالد...... جڑانوالہ

جو اعلیٰ ظرف ہوتے ہیں ہمیشہ جھک کے ملتے ہیں
صراحی سرنگوں ہو کر بھرا کرتی ہے پیمانہ

☆ صائمہ کوثر...... قصور

پالتے ہیں جو گلاب چٹانوں میں پرورش
آتی ہے پتھروں سے بھی خوشبو کبھی کبھی

☆ جبیں نیاز...... ملتان

ہم اوس کے قطرے ہیں کہ بکھرے ہوئے موتی
دھوکا نظر آئے تو ہمیں رول کے دیکھو

☆ فرحانہ ناز ملک...... ڈی جی خان

نہ کوئی عہد نبھائے نہ ہم نوائی کرے
اسے کہو کہ تسلی سے بے وفائی کرے

☆ اقصیٰ احمد...... کراچی

کیسے ممکن ہے بھول جاؤں تجھے
کوئی قصہ نہیں سلسلہ ہو تم

☆ مہرین ضیا...... کراچی

روح میں کوئی غم ہے پوشیدہ
زندگی بے وجہ اداس نہیں

☆ تحسین منہاج...... پشاور

میں کہیں ہجر میں چپ چاپ مر نہ جاؤں شکیب
اس کی گلیوں میں پڑی خاک بنائے مجھ کو

☆ارم کمال......فیصل آباد
چھوڑنے میں نہیں جاتی اسے دروازے تک
لوٹ آتی ہوں کہ کون اسے جاتا دیکھے
☆صبا کمال......فیصل آباد
نظر سے قتل کر ڈالو نہ ہو تکلیف دونوں کو
تجھے خنجر اٹھانے کی ہمیں گردن جھکانے کی
☆زرین ارمان......جہلم
عمر بھر سوکھے پتوں کی طرح بکھرے رہے ہم
مدتوں بعد کسی نے سمیٹا بھی تو جلانے کے لیے
☆ثمر احمد......کراچی
زاہد نے اس خیال سے تسبیح ہی توڑ دی
کیا گن کے اس کا نام لوں جو بے حساب دے
☆مسز نگہت غفار......کراچی
پتھر ہے مگر برف کے گالوں کی طرح ہے
وہ شخص اندھیروں میں اجالے کی طرح ہے
الجھا ہوا ایسا کہ کبھی کھل نہ وہ پائے
سلجھا ہوا ایسا کہ مثالوں کی طرح ہے
☆نزہت جبیں ضیا......کراچی
جب یاد تری آجاتی ہے منہ بستر میں کر لیتی ہوں
سب کہتے ہیں کہ سوتی ہے میں چپکے چپکے روتی ہوں
☆صائمہ سجاد بخش......کوہاٹ
جاتے سے اس کا پلٹ کر دیکھنا
وہ ایک لمحہ ہمیں زندگی سے پیارا ہے
☆مسز تسنیم......جہلم
ایک پل کے سکو چین کی خاطر ساری عمر رُلاتے ہیں
دور کہیں جا بسنے والے دل میں کیوں بس جاتے ہیں
☆نویرا علی......حضرو
مرنا بھلا کیا اس کا جو اپنے لیے جیے
جیتا وہی ہے مرتا ہے جو غیر کے لیے
☆ثوبیہ ظہور......اٹک
تیرے جانے سے جو ایک دھول اٹھی تھی غم کی
ہم نے اس دھول کو آنکھوں میں بسا رکھا ہے

☆فرحت احمد......کراچی
اثر کچھ بھی نہیں رکھتی مدلل گفتگو میری
وہ بازی مار لیتا ہے ہمیشہ خوش بیانی سے
☆درخشندہ ریاض الدین......پشاور
اے دوست کبھی تنہائی میں جب یاد تری آجاتی ہے
جس شے پہ نظر جم جاتی ہے تصویر تیری بن جاتی ہے
☆انجم شیر عالم خان......پشاور
نہیں تجھ سے شکایت کہ دکھ دیا تو نے
ہمیں تو شوق تھا آنچل ذرا بھگونے کا
☆سیدہ جیا عباس......تلہ گنگ
تم میری آنکھوں کے تیور نہ بھلا پاؤ گے
ان کہی بات کو سمجھو گے تو یاد آؤں گا
ہم نے خوشیوں کی طرح دکھ بھی اکٹھے دیکھے
صفحۂ زیست کو پلٹو گے تو یاد آؤں گا
☆الیا شیر از......کراچی
اس کی وفا کے باوجود اس کو نہ پا کے بدگماں
کتنے یقیں بچھڑ گئے، کتنے گماں گزر گئے
اب یہی طے ہوا کہ ہم تجھ سے قریب تر نہیں
آج ترے تکلفات دل پر گراں گزر گئے
☆ثوبیہ علی......خیر پور
شام تک صبح کی نظروں سے اتر جاتے ہیں
اتنے سمجھوتے پہ جیتے ہیں کہ مر جاتے ہیں
☆جمیلہ لودھی......بلوچستان
کارِ فریاد و فغاں کس لیے موقوف ہوا
تیرے کوچے میں ترے با ہنروں کے ہوتے
جز سزا اور ہو شاید کوئی مقصود ان کا
جا کے زنداں میں جو رہتے ہیں گھروں کے ہوتے
☆شائستہ رضا......چکوال
کھو کر اسے پانے کی رہی دل میں تمنا
اس پیار کی بازی میں کبھی مات نہیں ہے
اس نے بھی نجانے آج پلٹ کر نہیں دیکھا
شاید میرے اخلاص میں وہ بات نہیں ہے

خوش ذائقہ

پاکیزہ بہنیں



چکن ونگز

اشیا: چکن ونگز، دس سے بارہ عدد۔ سرکہ، ایک کپ۔ چلی سوس، تین کھانے کے چمچ۔ سویا سوس، تین کھانے کے چمچ۔ اسٹیک سوس، دو کھانے کے چمچ۔ مسٹرڈ پیسٹ، ایک کھانے کا چمچ۔ نمک، حسب ضرورت (کیونکہ ان سب سوس میں بھی نمک ہوتا ہے)۔ کالی مرچ، حسب ذائقہ۔ انڈا، دو عدد۔ کارن فلاور، آدھی پیالی۔ میدہ، ایک پیالی۔ تیل، تلنے کے لیے۔

ترکیب: ونگز دھو کر خشک کرلیں پھر ایک کپ سرکے میں بھگو کر دو گھنٹے کے لیے رکھ لیں۔ اب ایک باؤل میں مندرجہ بالا تمام اشیا اچھی طرح یکجان کرلیں اور ونگز کو اس میں میرینیٹ کر کے مزید دو گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ تلنے کے وقت پر کڑاہی میں تیل اچھا گرم کر کے آنچ تھوڑی کم کرلیں اب ایک، ایک ونگ کو آمیزے سے نکال کر ڈیپ فرائی کریں یہاں تک کہ براؤن ہوجائیں پھر خاکی کاغذ پر اتارلیں اور حسب ذائقہ ہری چٹنی یا چلی گارلک سوس کے ساتھ پیش کریں۔

فضہ بتول، بہارہ کہو

دم پخت بریانی

اشیا: گوشت مرغی، ایک کلو۔ چاول، تین پیالی۔ نمک، حسب ذائقہ۔ ادرک لہسن پسا ہوا، تین کھانے کے چمچ۔ پیاز، دو عدد درمیانی۔ ہرا دھنیا، ایک گٹھی۔ پودینہ، آدھی گٹھی۔ ہری مرچیں، دس سے بارہ عدد۔ سفید زیرہ، دو کھانے کے چمچ۔ لیموں کا رس، تین سے چار کھانے کے چمچ۔ دہی، ڈیڑھ پیالی۔ تیل، آدھی پیالی۔

ترکیب: گوشت کو اچھی طرح دھو کر چھلنی میں رکھ کر خشک کرلیں۔ دہی میں ہرا دھنیا، پودینہ اور ہری مرچیں ملا کر بلینڈ کرلیں اور اس مکسچر سے گوشت کو میرینیٹ کر کے فریج میں رکھ دیں پھر پین میں تیل ڈال کر درمیانی آنچ پر گرم کریں اور اس میں باریک کٹی ہوئی پیاز کو سنہری فرائی کرلیں پھر اس میں زیرہ اور ادرک، لہسن ڈال کر فرائی کریں اور ایک سے دو منٹ کے بعد اس میں میرینیٹ کیا ہوا گوشت ڈال دیں۔ شروع میں تیز آنچ پر پکائیں پھر پانچ سے سات منٹ کے بعد آنچ درمیانی کر کے اتنی دیر پکائیں کہ تیل علیحدہ ہوجائے۔ اس دوران چاولوں کو نمک ملے پانی میں ایک کنی ابال لیں۔ چولھے سے اتارتے ہوئے ان میں لیموں کا رس شامل کردیں اور چھان لیں۔ اب الگ پتیلی میں تھوڑا تیل لگا کر اس میں آدھے چاول پھیلا کر ڈالیں پھر اس پر گوشت رکھ کر آخر میں چاول ڈال دیں اور ڈھک کر ہلکی آنچ پر بارہ سے پندرہ منٹ دم پر رکھ دیں۔

جبین نیاز، ملتان

چکن اور سبزی کے کباب

پیاری بہنو! آج کل بچے صرف اور صرف چکن اور گوشت سے بنی ڈشیں کھانا زیادہ پسند کرتے

ہیں مگر حقل مند مائیں، بہنیں انہیں مختلف طریقوں سے سبزیاں کھلا سکتی ہیں۔

اشیا: بون لیس چکن، آدھا کلو۔ آلو، گاجر، کرم کلہ، شملہ مرچ، مٹر، لوکی، پالک یا کوئی اور سی بھی سبزی مثلاً اروی، شلجم، مٹر سے وغیرہ اس طرح کی ابلی ہوئی مکس سبزیاں، تین کپ۔ چنے کی دال، آدھی پیالی۔ نمک، حسبِ ضرورت۔ لال مرچ، حسبِ ذائقہ۔ پسی ہوئی کالی مرچ، اجینو موتو، حسبِ ذائقہ۔ بریڈ کرمز، ایک کپ۔ انڈا، ایک سے دو عدد۔ پیاز، باریک کٹی ہوئی آدھا کپ۔

ترکیب: مرغی کے ساتھ چنے کی دال اور لوکی کو ابال لیں ورنہ دیر سے گلیں گی۔ ابلی ہوئی سبزیاں، دال اور بوٹیوں کو خوب باریک پیس لیں۔ ہاتھ سے کر سکتی ہیں تو کانٹے کی مدد سے ہو جائے گا۔ اب اس میں نمک، مرچ، اجینو موتو اور کٹی ہری پیاز مکس کر کے گول، گول ٹکیاں بنالیں اور انڈا پھینٹ کر اس کے آمیزے میں ڈبو کر پھر بریڈ کرمز میں الٹ پلٹ کر فرائنگ پین میں کم تیل میں تل لیں۔ آنچ درمیانی رکھیں ایک طرف سے گہرے گولڈن ہو جائیں تو پھر پلٹ دیں۔ یہ کباب آپ کے دسترخوان کی رونق بڑھائیں گے۔ انہیں سینڈوچ میں بھی استعمال کریں اس طرح ناپسندیدہ سبزی بھی بچے آسانی سے کھالیں گے۔ اسے مزید ذائقے دار بنانا آپ کا کمال ہے۔ انڈے میں ڈبو کر کر سبز لگا کر کے فریز بھی کیے جا سکتے ہیں۔

کوثر خورشید نیو کے

انڈوں کا حلوا

اشیا: انڈے، چھ عدد۔ گھی، چھ کھانے کے چمچ۔ چینی، ڈیڑھ پاؤ یا حسبِ ذائقہ۔ بالائی، ایک پیالی۔ بادام، ایک پیالی۔ پستہ، مغز، چار، چار

آپ کا باورچی خانہ ماہرِ حسن بھی

خوش ذائقوں سے لطف اندوز ہونے والی پیاری، پیاری صحت مند بہنوں کے لیے کچن سے ہی کچھ نسخے بھی حاضر ہیں۔ اپنی جلد کی خوب صورتی کو نکھارنے کے لیے مہنگی کریموں کے بجائے قدرتی اجزا استعمال کریں اور سونے سے آدھا پون گھنٹا قبل معمولات انجام دینے کے بعد صرف اپنی ذات پر توجہ دیں۔

پپیتا: کچے پپیتے کو کھائیں بھی اور اس کے گودے میں آدھا لیموں اور ایک چھوٹا چمچ شہد ملا کر چہرے، گردن اور ہاتھوں پر ملیں اور پندرہ منٹ بعد سادے پانی سے دھو لیجیے۔ جلد بھی صاف ستھری اور نکھری نکھری ہو جائے گی۔

کھیرا: چھلکے سمیت کھائیں، رائتہ بنائیں اور اس کے گودے اور عرق سے جلد کی صفائی کیجیے۔ اس کے ویسے سے چہرے پر مساج کیجیے۔ خشک ہونے پر چہرہ دھو لیں کھیرے کے دو ٹکڑے آنکھوں پر رکھ کر سکون سے پندرہ منٹ لیٹ جائیں۔ تازگی کا احساس ہوگا۔

لیموں: اس کے تو بے شمار فوائد آپ کو ازبر ہوں گے۔ اس کے رس کا مشروب بنا کر پئیں اور چھلکوں کو چہرے، ہاتھوں، کہنیوں اور گھٹنوں پر ملیں اور انگلیوں کی پشت پر ملیں۔ کچن میں دیگر کام کرتے ہوئے یہ عمل جاری رکھ سکتی ہیں۔ لیموں کا رس بالوں کے لیے کنڈیشنر ہے۔ چائے کی استعمال شدہ پتی کو ایک دفعہ اور ابال دیں اب اسے چھان کر اس میں لیموں کا رس نچوڑ کر شیمپو کرنے کے بعد بال اس محلول سے دھو لیں۔ چمک دار ہو جائیں گے۔

ٹماٹر: قدرتی بلیچ ہے۔ اس کا گودا بہترین ٹانک ہے جلد کے لیے۔ کھائیں اور لگائیں بھی۔ چہرہ شاداب اور کھلا کھلا ہوگا۔ آدھا ٹماٹر کاٹ کر چہرے، گردن اور پاؤں پر ملیں پھر اسے دھو کر فریج میں رکھ لیں اگلے دن پھر اسی ٹماٹر کو استعمال کریں جب تک کہ ختم نہ ہو جائے۔

چمچ۔ سبز الائچی، چار عدد۔ کیوڑا، ایک کھانے کا چمچ۔

ترکیب: انڈوں کو اچھی طرح پھینٹ لیں۔ بالائی بھی پھینٹ لیں پھر چینی کو انڈوں اور بالائی میں ملا کر اچھی طرح مکس کریں کہ چینی اس میں مکمل حل جائے اب کھلے منہ کی پتیلی میں گھی گرم کریں اور اس میں الائچیاں ڈال کر تل لیں۔ پھینٹا ہوا آمیزہ کترے ہوئے آدھے بادام، پستہ گری بھی اس میں ڈال دیں۔ آنچ ہلکی رکھیں اور چمچ چلاتے رہیں۔ جب شیرہ گاڑھا ہو کر جذب ہو جائے، پانی خشک ہو جائے، بالائی کا دودھ خشک ہو جائے اور حلوا گھی چھوڑ دے تو کیوڑا ڈال کر اتار لیں چند منٹ کے لیے ڈھانک کر رکھ دیں آخر میں ڈش میں نکال کر بقیہ بادام اور پستے اوپر چھڑک دیں۔ اب عید پر پیش کریں اور داد وصول کریں۔

اقرا کلثوم، سمبڑیال

مزیدار سویاں

یوں تو مزعفر شیر خورما اور دودھ سویاں مشہور ہیں مگر آج ہم مزیدار اور آسان ترین سویوں کی ترکیب بتاتے ہیں کہ دس منٹ میں بنا کر سرو کر سکتی ہیں۔

اشیا: باریک سویاں، آدھا کلو۔ چینی، آدھا کلو سے دو گھی کم کر لیں۔ میوہ جو پسند ہو، کوٹ لیں۔ دودھ، ایک پاؤ۔ کھویا، بالائی، قلاقند یا کوئی اور گھر میں دستیاب مٹھائی، ایک پیالی۔ ناریل پاؤڈر، دو کھانے کے چمچ۔ زرد رنگ، ایک چائے کا چمچ۔ گھی، تھوڑا سا۔ سبز الائچی اور لونگ، دو، تین عدد۔

ترکیب: گھی میں لونگ اور الائچی کڑکڑا کر سویاں بھون لیں، رنگ گہرا نہ ہو۔ اب اس میں زرد رنگ، دودھ، بالائی کھویا یا مٹھائی جو بھی ہو قلاقند، رس گلے، گلاب جامن، برفی وہ توڑ کر ڈالیں ساتھ ہی چینی بھی ڈالیں اور چلاتی رہیں آنچ دھیمی رکھیں۔ ذرا سا چیک کریں اگر سویاں ابھی نرم نہ ہوئی ہوں تو میوہ ڈال کر بالکل ہلکی آنچ پر پانچ منٹ پکائیں۔ ہلکا سا دودھ کا مزید چھینٹا بھی ڈال سکتی ہیں۔ مزیدار سویاں تیار ہیں خیال رہے کہ بالکل نرم لیدا سا نہ بن جائے۔

ثمین عباس، کراچی

آم اور پنیر کا کریمی کیک

اشیا: ابلے ہوئے جو، آدھا کپ۔ مارجرین، تین کھانے کے چمچ۔ شہد، تین کھانے کے چمچ۔ آم، دو عدد پکے ہوئے۔ پنیر، سوا کپ۔ دہی، دو تہائی (پون سے تھوڑا کم) کپ۔ لیموں کا چھلکا، ایک عدد باریک کترا ہوا۔ سیب کا رس، تین کھانے کے چمچ۔ جلاٹن پاؤڈر، چار چائے کے چمچ۔ آم اور لیموں کترے سلائس، سجانے کے لیے۔

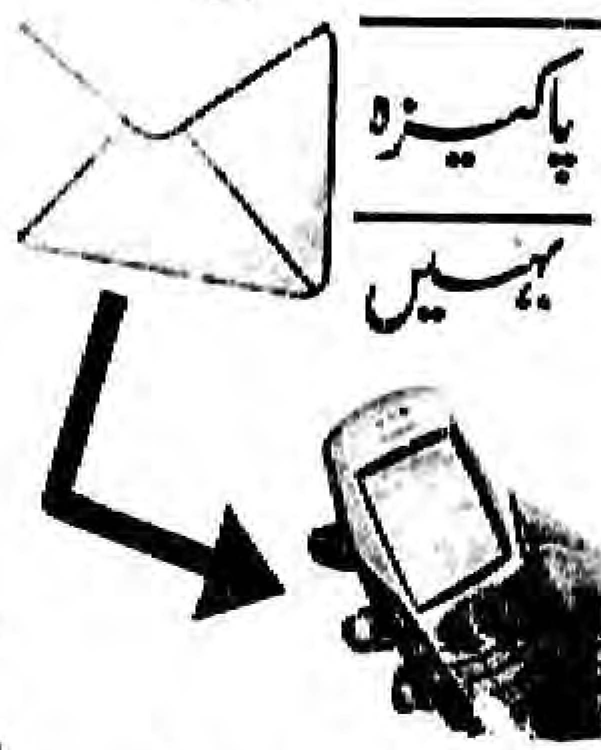
ترکیب: اوون کو 400oF پر گرم کر لیں۔ جو، مارجرین اور شہد کو اچھی طرح مکس کر کے کیک کے سانچے میں ڈال کر پھیلا دیں اور تقریباً بارہ سے پندرہ منٹ بیک کر لیں یہاں تک کہ ہلکا سنہرا ہو جائے پھر اسے اوون سے نکال کر ٹھنڈا کر لیں۔ آم کی گٹھلی نکال کر گودے کو اچھی طرح میش کر لیں۔ آم کا گودا، پنیر، دہی اور لیموں کے چھلکے فوڈ پروسیسر میں ڈال کر خوب پروسیس کر لیں۔ سیب کے رس کو گرم کریں جب ابلنے لگے تو جلاٹن پاؤڈر ڈال کر اچھی طرح حل کریں پھر اسے پنیر کے آمیزے میں ڈال دیں۔ پنیر کے اس آمیزے کو تیار شدہ جو کے کیک پر سانچے میں ڈال کر ریفریجریٹر میں رکھ دیں جب بالکل سرد ہو جائے تو پلیٹ میں نکال لیں۔ لیموں کے ٹکڑے اور آم کے سلائس سے سجا کر پیش کریں۔

ضروری نوٹ: اگر اوون نہ ہو تو ایک بڑے پتیلے میں پتھر ڈال کر ہلکی آنچ پر بیس منٹ پتیلا گرم کریں پھر اس میں کیک کا سانچا رکھ کر مزید بیس منٹ ہلکی آنچ پر رکھیں اگر پتھر نہ ہو تو اس میں کوئی اونچا اسٹینڈ رکھ کر اس پر سانچا رکھ لیں اور کیک تیار کر لیں۔ گرم پتیلے کو موٹے کپڑے سے پکڑیں اور سانچا بھی احتیاط سے نکالیں؛ ہاتھ جلنے کا ڈر رہتا ہے۔

عرشیہ جنید، کراچی

سنئیے

پاکیزہ بہنیں



رزق کی قدر

ایک بار حضرت محمد گھر تشریف لائے تو روٹی کا ٹکڑا گرا ہوا دیکھا۔ آپ نے اٹھا کر صاف کیا اور کھالیا پھر فرمایا۔ "اے عائشہ عزت دار چیز کی عزت کرو۔ جب اللہ تعالیٰ کسی قوم کا رزق چھین لیتا ہے تو واپس نہیں کرتا۔" (ابن ماجہ)

مرسلہ: لاریب، ماہ زیب، چونیاں

وجۂ تسمیہ

جو آج اپنی ہی بیگم پہ ہم کو پیار آیا
یہ بھولپن تھا انہیں ہم پہ اعتبار آیا
وہ بولیں آج مجھے مارکیٹ لے چلیے
یہ بات سن کر مجھے خوف سے بخار آیا

شاعر: مرزا عابد عباس

مرسلہ: بختاور بلوچ، لوہی

منتظر ہوں

پس منظر میں ہمیشہ ایک ہی منظر تحریر کرتی ہوں
دریچے پہ کھڑی عورت، لاحاصل سا انتظار

مرسلہ: صائمہ سجاد نقش، کوہاٹ

رحم دلی

دو چیونٹیوں میں سے ایک چیونٹی نے ہاتھی سے کہا۔ "کیوں بھئی، ہم سے کشتی لڑو گے؟" ہاتھی ابھی جواب دینے ہی والا تھا کہ دوسری چیونٹی بولی۔ "رہنے دو بے چارہ اکیلا ہے اور ہم دو ہیں۔"

اس طرح تو ہوتا ہے

امیر کا بیٹا۔ "پپا آج بہت گرمی ہے۔"
پپا۔ "ہم آج ہی اے سی لگوا لیتے ہیں۔"
غریب کا بیٹا۔ "ابا، آج کتی گرمی اے۔"
ابا۔ "چل تیری ٹنڈ کروا دوں۔"

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

☆☆☆

چھوٹی سی بات

زندگی ایک ایسا کھیل ہے، جس میں آپ جیت نہیں سکتے، برابر نہیں ہو سکتے اور یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ ہم نہیں کھیلتے۔

مرسلہ: ممتاز خانم، کراچی

ہماری عید

ہماری عید ہے ہم ہر طرح منائیں گے
ہمارا شیخ کے فتوے پہ اختیار نہیں
ہمارے ڈپٹی کمشنر نے چاند دیکھا ہے
ہمیں یقین ہے وہ غیر ذمے دار نہیں

مرسلہ: شہلا نواز، لاہور

بدترین لوگ

فرمانِ نبوی ہے کہ لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ ان کا مقصد پیٹ ہوگا، دولت ان کی عزت ہوگی۔ عورت ان کا قبلہ ہوگی روپیہ ان کا دین ہوگا اور وہ لوگ بدترین ہوں گے آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوگا۔

روحانی مشورے



ادارہ

رمضان کی آخری رات میں بخشش

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔" رمضان کی آخری رات میں امت محمدیہ کی مغفرت کردی جاتی ہے۔" عرض کیا گیا۔" یا رسول اللہ کیا اس سے شب قدر مراد ہے؟" فرمایا۔" نہیں (یہ فضیلت آخری رات کی ہے شب قدر کی فضیلتیں اس کے علاوہ ہیں) بات یہ ہے کہ عمل کرنے والے کا اجر اس وقت پورا دے دیا جاتا ہے جب کام پورا کر دیتا ہے اور آخری شب میں عمل پورا ہو جاتا ہے لہٰذا بخشش ہو جاتی ہے۔"

صدقۂ فطر

حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے فرمایا۔" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صدقۂ فطر روزوں کو لغو اور گندی باتوں سے پاک کرنے کے لیے مساکین کی روزی کے لیے مقرر فرمایا۔"

صدقۂ فطر کی مقدار

صدقۂ فطر کی مقدار پونے دو سیر گندم ہے۔ اگر گندم دینا مشکل ہو تو پونے دو سیر گندم کی قیمت دینا جائز ہے۔

شوال کے چھ روزے

فخر کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔" جس نے رمضان کے روزے رکھے اور اس کے بعد چھ (نفل) روزے شوال (یعنی عید) کے مہینے میں رکھے تو (پورے سال کے روزے رکھنے کا ثواب ملے گا اگر ایسا ہی کیا کرے تو) گویا اس نے ساری عمر کے روزے رکھے۔"

دعائے انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اردو ترجمہ

یہ دعا آپ ہر نماز کے بعد پڑھ سکتے ہیں۔ عربی میں بھی اور اردو میں بھی۔ آج ہم آپ کو اردو ترجمہ بتا رہے ہیں تاکہ بعد میں جب آپ عربی پڑھیں تو آپ کو پڑھتے ہوئے لطف بھی آئے (ہم جب عربی میں دعا مانگتے ہیں تو اس کا مطلب و معنی ہمیں معلوم ہونا چاہیے)

ترجمہ یہ ہے۔ اللہ کی ذات سب سے بڑی ہے، اللہ کی ذات سب سے بڑی ہے۔ اللہ کی ذات سب سے بڑی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نام کی برکت میری جان پر اور میرے ذہن پر، اللہ تعالیٰ کے نام کی برکت میرے گھر والوں پر اور میرے مال پر، اللہ کے نام کی برکت ہر اس چیز پر جو میرے پروردگار نے مجھ کو عطا کی، اللہ تعالیٰ کے نام سے جو سب ناموں سے بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نام سے جو رب ہے زمین و آسمان کا، اللہ تعالیٰ کے نام سے جس کی برکت سے کوئی بیماری نقصان نہیں پہنچا سکتی، اللہ تعالیٰ ہی کے نام کی برکت سے میں نے شروع کیا اور اللہ تعالیٰ ہی کی ذات پر میں نے بھروسا کیا۔ اللہ ہی میرا پروردگار ہے، میں کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہراتا/ٹھہراتی، اے اللہ! میں تیرے خیر کے وسیلے سے تجھ سے مانگتا/مانگتی ہوں۔ وہ بھلائی جو تیرے سوا کوئی نہیں دے سکتا۔ تیری پناہ عزت والی ہے اور تیری ثنا بڑی ہے اور معبود نہیں کوئی سوائے تیرے..... مجھ کو اپنی پناہ میں لے لے، ہر برائی سے اور شیطان مردود سے۔ اے اللہ میں تیری پناہ لیتا/

لیتی ہوں ہر اس مخلوق سے جو تو نے بنائی اور تیری حفاظت مانگتا / مانگتی ہوں ان سب سے اور اپنے آگے رکھتا اور رکھتی ہوں (اپنے لیے ڈھال بناتا ہوں) اس سورۃ کو (جس کا ترجمہ یہ ہے)

"آپ کہہ دیجیے کہ وہ اللہ ایک (ہی) ہے، اللہ بے نیاز ہے۔ اس کی اولاد نہیں اور نہ ہی وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ کوئی اس کے برابر کا ہے۔"

اپنے سامنے سے، پیچھے سے، دائیں سے، بائیں سے، اوپر سے اور نیچے سے امامی، خلفی، یمینی، شمالی، فوقی اور تحتی و ہر ایک کے بعد سورۃ اخلاص مع بسم اللہ مکمل پڑھ کر دعا مانگیں۔

حاجات کو پورا کرنے کے لیے دعا کا ایک طریقہ

ہر لمحہ حق تعالیٰ سے معافی مانگتے رہیں اقراری مجرم بن کر اور ہر فرض نماز کے بعد مصلے پر بیٹھ کر تین بار درود شریف پڑھ کر حسب ذیل تسبیح ایک بار پڑھیں۔

یا سُبُّوحُ یاقدُّوس یا غفُورُ یا وَدُودُ یاصَمَدُ یا عزیزُ یا مُغنِی یاناصِرُ

پھر تین بار درود شریف پڑھ کر اپنی حاجت طلب کریں اور ایک وقت مقرر کر کے روزانہ بیٹھ کر۔

لاحَولَ وَلا قُوَّۃَ اِلا بِاللہِ العَلِیِّ العَظِیم

500 بار پڑھ کر بھی دعا کریں اور گناہ سے بہت بچیں کہ اس سے اثر اور بڑھ جاتا ہے۔

دعائے وسیلہ برائے حاجت براری

حضرت ابو امامہؓ سے روایت ہے کہ ایک نابینا شخص نے آکر نبی کریم ﷺ سے درخواست کی اے اللہ کے نبی ﷺ آپ میرے لیے دعا فرمائیں کہ میری بیماری (اندھا پن) دور ہو جائے۔ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ یہی بیماری بہتر ہے کہ تم اسی حالت میں رہو اور تم جنت میں جاؤ۔ اس نے پھر درخواست کی کہ آپ میرے لیے دعا فرمائیں کہ میری بیماری (اندھا پن) دور ہو جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ وہی جواب دیا۔ اس نے تیسری دفعہ دعا کے لیے درخواست کی تو آپؐ نے فرمایا اچھی طرح وضو کرو اور دو رکعت نماز حاجت ادا کرو پھر یہ دعا پڑھو۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ وَاَتَوَجَّہُ اِلَیْکَ بِنَبِیِّکَ مُحَمَّدٍ نَبِیِّ الرَّحْمَۃِ یَا مُحَمَّدُ اِنِّیْ اَتَوَجَّہُ بِکَ اِلٰی رَبِّکَ اَنْ یَّکْشِفَ لِیْ عَنْ بَصَرِیْ شَفِّعْہُ فِیَّ وَفِیْ نَفْسِیْ

(عمل الیوم واللیلۃ، نسائی)

(اور اگر کسی اور حاجت کے لیے دعا کرنا چاہے تو یکشف لی عن بصری کی جگہ۔ ان یقضی حاجتی ھذہ فلانتہ ...... اپنی مطلوبہ حاجت کا نام لے (اور پھر اپنی مادری زبان میں اللہ کو اپنی حاجت بھی بتا دے)

ترجمہ: اے اللہ! میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور تیری طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ تیرے نبی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نبی رحمت کے وسیلے سے اپنے رب کی طرف اپنی حاجت کے بارے میں متوجہ ہوتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ وہ پوری ہو جائے میرے بارے میں آپ کی سفارش قبول کر اور میری بیماری (اندھا پن) کو دور کر دے۔

فائدہ: حضرت ابو امامہؓ نے کہا کہ اس نابینا آدمی نے آپ کے حکم کے مطابق دو رکعت نماز ادا کی اور مذکورہ طریقے سے دعا کی اللہ تعالیٰ نے اس کی بیماری (اندھے پن) کو دور فرما دیا۔ اس میں ایک بات تو یہ ذکر ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کا طریقہ بتایا دوسری بات یہ ہے کہ اپنی شفاعت کا ذکر کر کے دعا کے لیے فرمایا۔ تیسری بات اس شخص کا الحاح وزاری اور اخلاص بھی کامل تھا پھر اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی اور اندھے پن جیسی بڑی بیماری دور ہو گئی۔

◆●◆



شوابے ہومیو کلینک





اس بات کی ضرورت کافی عرصے سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق، ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جا سکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

بال کالے ہو جائیں

ام امامہ۔ بکھر

میرا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ میرے سر کے تقریباً 80% بال سفید ہو چکے ہیں جس کی وجہ سے میں بہت پریشان ہوں۔ آپ پلیز کوئی اچھی سی دوا تجویز کریں کہ میرے بال کالے جائیں۔ میرا دوسرا مسئلہ لیکوریا ہے۔ یہ تقریباً 14 سال سے ہے۔ میرا پیٹ بڑھ گیا ہے۔ میں نے لیکوریا اور پیٹ کے لیے کافی دفعہ لیڈی ڈاکٹر سے بھی رابطہ کیا مگر دوائیوں سے وقتی طور پر افاقہ ہوتا ہے پھر بعد میں پہلے سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔

جواب: غم، فکر، ناقص غذا، پانی، غیر معیاری شیمپو، تیل اور کچھ جسمانی تبدیلیاں جو وقت و عمر کے ساتھ ہوتی ہیں بالوں پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ہمیں لگتا ہے کہ آپ لگ کر علاج نہیں کراتیں، وقتی افاقہ ہونے پر علاج ... چھوڑ دیتی ہیں۔ ایسا نہ کریں بلکہ مستقل مزاجی کے ساتھ علاج کریں ورنہ مسئلہ گمبھیر ہو جائے گا۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

ستمبر 2014

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی۔ اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ____________________

پتا: ____________________

____

استعمال کریں۔ Lycopodium-30، Borax-30، Pulsatilla-30، Calc. carb-30۔ ہر بوتل میں سے 7-7 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ دو ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

اندرونی خرابی

عاصمہ یوسف۔ فیصل آباد

مجھے ماہانہ ایام کے وقت الٹیاں آنا شروع ہو جاتی ہیں اور کچھ کھایا پیا نہیں جاتا۔ یوں لگتا ہے کہ جان نکل جائے گی۔ انگریزی دوائی کھانے سے ایام میں بہتری آتی ہے۔ میری کمر کے نچلے حصے اور پٹھوں پنڈلیوں میں بھی درد ہوتا ہے۔ میرے سر کے بال بھی گرتے ہیں۔ میرے جسم پر سرخ دانے نکل رہے ہیں اور کبھی کبھی ہاتھ بھی کانپتے ہیں۔ ناف کے نیچے والا حصہ پیٹ اور کولہے پھیلتے جا رہے ہیں۔ رنگ بھی خراب ہو گیا ہے۔ کبھی صاف لگتا ہے اور کبھی کالا۔ صرف چہرے اور ہاتھوں کا رنگ خراب ہوتا ہے۔ پانی پینے سے مجھے اپھارا ہو جاتا ہے۔ آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے بھی ہیں۔ چہرے پر بال نکل آئے ہیں جو پہلے نہیں تھے۔

جواب: پانچ وقت نماز کی پابندی کریں۔ صبح چہل قدمی کیا کریں۔ پانی کا استعمال کم از کم 12 گلاس روزانہ کریں۔ متوازن غذا دودھ، گوشت، سبزیاں اور پھلوں کا استعمال بڑھائیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک استعمال کریں اور پھر اپنا حال تفصیل سے لکھیں۔ Sulphur-200 کی ایک خوراک سب سے



پہلے لیں۔ صبح نہار منہ 5 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر لیں ہر 3 ہفتے بعد۔ اس سے ایک دن پہلے اور بعد کوئی اور دوا نہیں لیں۔

Ferrum met.-30، Calc. flour-30، Calc. phos-30، Pulsatilla-30 کے 7-7 قطرے آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔

معدے کا مسئلہ

محمد اشفاق۔ کوٹ ادو

میرا مسئلہ معدے کا ہے اور یہ تقریباً 4 سال سے ہے۔ یہ تقریباً سیلاب کے دنوں ہوا تھا۔ میں نے اس کا علاج کرایا ہے۔ کوئی ڈاکٹر کہتا ہے کہ گردے کا مسئلہ ہے اور کوئی کہتا ہے کہ فلاں چیز کا مسئلہ ہے لیکن اس کا کوئی مناسب علاج نہیں ہوا۔ اب ایک ڈاکٹر نے کہا ہے کہ آپ کو معدے کا السر ہے۔ الٹرا ساؤنڈ کرلیا تھا، رپورٹ منسلک کر رہا ہوں۔ برائے مہربانی میرا کوئی اچھا سا علاج تجویز کریں۔ میں ڈاکٹروں سے نا امید ہو چکا ہوں اور میں نے سوچا کہ ایک دفعہ آپ کو بھی خط لکھوں۔ آپ وہ دوائی تجویز کریں جس کے سائڈ افیکٹ نہ ہوں۔

جواب: محمد اشفاق آپ نے کہانی تو بیان کر دی لیکن اس میں اپنا حال نہیں بتایا کہ آپ کو ہوتا کیا ہے؟ لہٰذا اپنے حال کی تفصیل بیان کریں۔ الٹرا ساؤنڈ میں کوئی قابلِ ذکر بات نہیں کہ دوا آپ کے حال کے مطابق تجویز کی جائے اور قارئین بھی اس کو نوٹ کرلیں۔



ویری کوسل اور جوڑوں کی آوازیں

محمد اسماعیل۔ ضلع جہلم

ڈاکٹر صاحب میرا مسئلہ ویری کوسل ہے اور یہ عارضہ 2007ء سے ہے۔ ایلو پیتھک ڈاکٹرز اس کا حل آپریشن بتاتے ہیں جبکہ میں آپریشن نہیں کرانا چاہتا۔ ڈاکٹر صاحب مجھے بچپن سے ہی گھٹنوں کے جوڑوں میں درد رہا ہے۔ جب میں ہلاتا تھا تو ٹک ٹک کی آواز آتی تھی اور مجھے سکون مل جاتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اب مجھے درد تو نہیں ہوتا البتہ اٹھتے اور بیٹھتے وقت گھٹنوں کے جوڑوں سے ٹک ٹک کی آوازیں آتی ہیں جیسے جوڑ کی دونوں ہڈیاں آپس میں رگڑ رہی ہیں۔ میں پاک فوج میں جانے کا خواہش مند ہوں لیکن میرے دونوں مسئلے ویری کوسل اور جوڑوں سے آواز آنا کہیں مجھے ان فٹ نہ قرار دے دیں۔ ڈاکٹر صاحب جلد از جلد مجھے اس کا علاج بتائیں اور یہ بھی بتائیں کہ علاج کتنا عرصہ جاری رکھنا ہے۔

جواب: جب ہم بالغ ہوتے ہیں تو ہمارے جسم میں اور جذبات میں تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں۔ والدین اور بڑے بزرگوں سے شرم و گھبراہٹ کے باعث ہم ان تبدیلیوں کا ذکر نہیں کرتے بلکہ اپنے ہم عمر لوگوں سے کرتے ہیں جن کو خود کچھ نہیں پتا ہوتا۔ نتیجتاً غلط معلومات پر گمراہ ہو جاتے ہیں اور غلط عادات میں پڑ کر اپنی زندگی اور صحت کو خراب کر دیتے ہیں۔ یہ ایک بہت عام مسئلہ ہے۔ ہم میں سے ہر ایک فرد کو اس جانب سنجیدگی سے سوچنا چاہیے کہ اپنے نوجوان بچوں اور بچیوں کی حدود کے اندر رہتے ہوئے کیسے رہنمائی کی جائے کہ وہ اس بے راہ روی کا شکار نہ ہوں۔

محمد اسماعیل قرآن و حدیث کا مطالعہ کیجئے۔ نماز کی پابندی کیجئے۔ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگیے اور پھر اپنی صحت کے لیے دعا کیجئے۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات 3 ماہ تک استعمال کریں اور پھر تمام حالت تفصیل سے لکھیں۔

Staphisagria-30، Calc. phos-30

کے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔

گردے کی پتھری

سمیرا عمران۔ ضلع مظفر گڑھ

میرا مسئلہ یہ ہے کہ مجھے عرصہ 8 سال سے گردے میں بار بار پتھری بن جاتی ہے۔ پہلی مرتبہ جب پتھری ہوئی تو ہومیو پیتھک ڈاکٹر سے دوائی لی جس سے پتھری نکل گئی۔ سال کے بعد پھر بن گئی علاج کرایا پھر نکل گئی۔ پتھری تقریباً ہر سال ہو جاتی ہے۔ آخری مرتبہ جب پتھری ہوئی تو الٹرا ساؤنڈ کرایا اس وقت تقریباً 19cm کی پتھری تھی دائیں گردے میں۔ اس وقت ڈاکٹر نے کہا کہ کوئی علاج نہ کروانا صرف آپریشن ہوگا۔ آخر تنگ ہو کر آپریشن کرایا۔ اب تقریباً دو سال ہو گئے ہیں آپریشن کو۔ اب دونوں گردوں میں درد اور کھنچاؤ رہتا ہے۔ پیشاب ٹیسٹ کرایا تو ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس میں کرسٹل نہیں آتے۔ بائیں گردے میں تقریباً چنے کے برابر پتھری ہے۔ برائے مہربانی کوئی اچھی سی دوائی تجویز کر دیں تاکہ آپریشن نہ کرانا پڑے۔

ستو، لسی اور تازہ پھلوں کے جوس مفید ہیں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات استعمال کریں۔ Ferrum .Calc. sulph-30 met-30 کے 5-5 قطرے آدھے گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔ جبکہ Alfalfa-Ø کے 11 قطرے ہر کھانے کے بعد آدھے کپ پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ استعمال کریں۔ دو ماہ بعد کیفیت سے مطلع کریں۔

عید کی بیماریاں

ویسے تو رمضان بھی کچھ لوگوں کے بیماریوں میں گزرتے ہیں غذائی بد اعتدالیوں کے باعث اور جب عید آتی ہے تو ایسے لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور یہ ہر اس کھانے پینے کی چیز پر ٹوٹ پڑتے ہیں جو ان کی دسترس میں ہوتی ہے۔ گو کہ رمضان کا پورا مہینا کھانے پینے میں گزارہ ہوتا ہے۔ رمضان میں لوگوں کو عموماً دو فکروں میں دیکھا ہے۔ پہلی کہ سحری کیا کریں گے اور افطار میں کیا ہوگا؟ دوسری عید کی تیاری کیسے کریں اور اس کے لیے کیا کیا کریں؟ باقی رمضان کے مہینے کا جو مقصد ہے صبر، برداشت اور نظم و ضبط یہ افطار کرنے اور عید کا چاند دیکھنے تک ہی ہوتا ہے اسی لیے تو ہر روزہ دار کو بڑا غصہ آرہا ہوتا ہے کہ وہ بھوک پیاس برداشت کر رہا ہوتا ہے اسی لیے وہ کچھ اور برداشت نہیں کرنا چاہتا۔ بات ہم کر رہے تھے عید کی لیکن عید کا تعلق رمضان سے ہے۔ اسی وجہ سے بات رمضان پر آ گئی۔ بہر حال اب ہم واپس عید ہی کا ذکر کریں گے۔

عید کی ابتدا چاند رات سے ہو جاتی ہے۔ گرمی کی وجہ سے کولڈ ڈرنکس، قلفی، آئسکریم، فالودہ اور گولا گنڈا وغیرہ کا استعمال بڑھ جائے گا۔ عید کی صبح شیر خورمہ، کیک، مٹھائیاں، پکوڑیاں، وغیرہ کا استعمال ہوگا۔ ذرا غور کریں ان کھانے پینے کی چیزوں میں شوگر کتنی ہے؟ کولسٹرول کتنا ہے؟ ان چیزوں کو کھانے کے بعد آپ کتنا ورزشی کام کر رہے ہیں؟ یا بیٹھ کر لیٹ کر ٹی وی کے آگے یا عزیز رشتے داروں کے ساتھ وقت گزارتے ہیں۔ (یہاں میرے نوجوان اور بچے برگر، پیزا، بریانی، فرائز وغیرہ کو بیان کردہ غذاؤں سے بہتر نہ سمجھیں کہ وہ ان چیزوں کا استعمال کرنے لگیں)

بلڈ پریشر، دل کے دورے، یورک ایسڈ کی زیادتی، شوگر کا بڑھنا، کولسٹرول کی زیادتی اس کی وجہ سے گردے کا فیل ہونا، گلے کی خرابی، بدہضمی (الٹی و دست) وغیرہ، ہماری ان بد اعتدالیوں کے باعث عید کے موقع پر بہت بڑھ جاتی ہیں۔ اور عید کا دن ان بیماریوں کی وجہ سے ہسپتال میں گزرتا ہے۔

اسی لیے عید کے دن اپنے آپ کو اور اپنے عزیز رشتے داروں کو صحت مند رکھیے۔ یاد رکھیے کہ صحت ہے تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں لہٰذا خوشی کے اس موقع پر دوسروں کی خوشیوں کو خراب کرنے کا باعث نہ بنیں۔ صبر اور حوصلے سے کام لیتے ہوئے اعتدال میں رہیں۔ یہ ذہن میں رکھتے ہوئے کہ آنے والے دنوں میں بھی آپ ان چیزوں کو کھا اور پی سکتے ہیں۔

☆☆☆

جواب: لگتا ہے کہ آپ بھی علاج بے قاعدگی سے کراتی ہیں جبھی تو یہ بار بار بن رہی ہے۔ کیلشیم کی گولی یا اس کے مرکبات کے استعمال سے بھی پتھری بننے کے چانسز بڑھتے ہیں۔ پیشاب آنے پر اس کو روکنے سے بھی پتھری بنتی ہے۔ پانی کا کم استعمال کیا جائے تو بھی پتھری بنتی ہے۔ 19cm کی پتھری جیسا کہ آپ نے لکھا ہے ناممکن ہے 19mm تو ہوسکتی ہے۔ کیلشیم کی گولیاں استعمال نہ کریں۔ پانی کم از کم 15 گلاس روزانہ پئیں۔ پیشاب جیسے ہی آئے ویسے ہی کریں روکنے کی عادت ترک کردیں۔ کیلا، پالک، ٹماٹر، دودھ کا استعمال فی الحال نہ کریں۔ وزن نہ اٹھائیں۔ البتہ چلتی پھرتی ضرور رہیں بلکہ سیڑھیاں اترنے چڑھنے کی ورزش کیا کریں۔ ڈاکٹر ولمار شوابے جرمنی کی مندرجہ ذیل ادویات ایک ماہ استعمال کریں پھر کیفیت سے مطلع کریں۔

Calc. carb-30، Lycopodium-30 کے 7-7 قطرے آدھے گلاس پانی میں ملا کر۔ Berberis vulg-Ø کے 11 قطرے ایک گلاس پانی میں ڈال کر دن میں 3 مرتبہ پئیں۔

کئی مسائل

م۔ح۔ ضلع اٹک گاؤں لنگر

کافی عرصے سے پاکیزہ میں آپ کا کالم پڑھ رہی ہوں۔ سوچا آج اپنا مسئلہ بلکہ مسائل آپ کو لکھوں۔ مہربانی فرما کر مجھے میرے مسئلے کا حل بتادیں۔ میں بہت پریشان ہوں اور اب تو شدید مایوسی کا شکار ہوچکی ہوں۔ میرے موجودہ مسائل جن کا میں جلد حل چاہتی ہوں وہ ہیں چہرے کے دانے اور داغ دھبے، چہرے اور سینے پر بالوں کا



آنا، پیٹھ پر بھی دانے ہیں جن کی وجہ سے زیادہ بیٹھنے سے جلن ہونا شروع ہو جاتی ہے، معدے کا مسئلہ، بالوں کا گرنا، سفید ہونا، دبلا پتلا جسم بالکل ہڈیاں ہیں گوشت بالکل بھی نہیں، نسوانی حسن بھی بالکل نہیں۔ خون کی کمی اور کیلشیم کی بہت کمی ہے۔ بلڈ ٹیسٹ، الٹرا ساؤنڈ، پیشاب ٹیسٹ رپورٹس بھجوارہی ہوں۔ کوئی کریم یا میڈیسن بتادیں۔ چہرے اور جسم کے لیے بھی دوا تجویز کردیں۔ آپ کی بہت نوازش ہوگی آپ کی احسان مند رہوں گی۔ اگر ممکن ہو تو جواب جلد دے دیں کیونکہ دو ماہ بعد میری شادی ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ رنگت صاف ہوجائے اور جسم بھی بھر جائے۔

جواب: اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ اگر ہم صحیح تشخیص کر کے صحیح قسم کا علاج کریں (ہومیو پیتھک) تو کوئی وجہ نہیں کہ مرض سے نجات نہ ملے۔ ہاں صحت کے اصولوں کی پابندی یقیناً حصولِ صحت کے لیے شرط ہے۔ متوازن غذا کا استعمال کریں۔ لال گوشت (بکرا، گائے) ٹماٹر، پالک، سلاد، کدو، چھولے، آم، چیری، فالسہ، آلو بخارا وغیرہ کا بھرپور استعمال کریں۔ صبح سویرے اٹھیں۔ نمازوں کی پابندی کریں۔ کوشش کریں کہ صبح کی نماز کے بعد کسی باغ میں چہل قدمی کریں۔ پانی کا استعمال زیادہ سے زیادہ کریں، کم از کم 2 گلاس روزانہ نہار منہ پئیں۔ کھانے سے پہلے اور کھانے کے دو گھنٹے بعد پانی کا استعمال کریں۔ شربت اور کولڈ ڈرنکس بالکل استعمال نہ کریں ان سے بھی دانے نکلتے ہیں۔ البتہ